
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
اگست 2014
WWW.PAKSOCIETY.COM



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے

اگست 2014
جلد 42 شمارہ 4
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

کہی ان کہی

مدیرہ

خواتین ڈائجسٹ کا اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اپنا وطن اور آزادی سے بڑھ کر قیمتی چیز کیا ہو سکتی ہے۔ اس کی قدر و قیمت ان سے پوچھیں، جو اس سے محروم ہیں۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ انسان نے سب سے زیادہ قربانیاں آزادی کی خاطر دی ہیں۔ جانوں کے سودے کیے ہیں اور آج بھی سب سے زیادہ لہو آزادی کے لیے ہی بہایا جا رہا ہے۔

14 اگست 1947ء برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے جب قدرت نے ہمیں ایک خطہ زمین عطا کیا جہاں ہم آزادی سے اپنے مذہب اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اپنی تہذیب اپنی روایات کا تحفظ کر سکیں۔ یہ حسین اتفاق ہے یا پاکستان کی قدر و قیمت اور عظمت کہ جب 14 اگست 1947ء کو اعلان آزادی ہوا اور پاکستان وجود میں آیا تو 27 رمضان المبارک کے حوالے سے متوقع لیلۃ القدر تھی۔

پاکستان واقعی ہمارے لیے قدرت کا انعام اور تحفہ تھا۔ جو لوگ ہجرت کرکے پاکستان آئے انہوں نے بلاشبہ قربانیاں دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر طرح سے نوازا۔ وطن سے محرومی کیا ہوتی ہے' یہ وہ فلسطینی جان سکتے ہیں جن کے پھول سے بچوں کے جسم بارود سے چھلنی ہیں۔ ان کے جوان شہید کیے جا رہے ہیں۔ ان کشمیریوں کو دیکھیں جو ساٹھ سالوں سے آزادی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے دے رہے ہیں۔ بھارت کے مسلمانوں کی حالت زار پر نظر ڈالیں جو تیسرے درجے کے شہریوں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کے اتحاد کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔ اس لیے نشانہ ہمارا اتحاد ہی تھا۔ لسانیت اور قومیت کے نام پر تقسیم ہوئے تو آدھا ملک گنوا بیٹھے اور افسوس یہ ہے کہ آدھا ملک گنوا کر بھی سبق نہیں سیکھا۔ تقسیم در تقسیم کا سلسلہ جاری ہے۔

ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بحران تخلیق کیے جاتے رہے ہیں تاکہ ملک مستحکم نہ ہونے پائے۔ جذباتی تقریریں، مار دھاڑ، جلاؤ گھیراؤ، دھرنوں کی سیاست میں آزاد میڈیا بھی اپنا کردار بخوبی ادا کر رہا ہے۔ تجزیوں، مذاکروں کے ذریعے حالات کو زیادہ سے زیادہ مایوس کن بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کیے جا رہے ہیں تاکہ حکومت عوامی مسائل پر توجہ نہ دے سکے۔

اس وقت جبکہ فوج حالت جنگ میں ہے، کراچی اور بلوچستان لہولہو ہے۔ عوام کو مہنگائی، بجلی، بے روزگاری کے مسائل کا سامنا ہے۔ حکومت کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ انقلاب کا نعرہ لگانے سے انقلاب نہیں آتا۔ مذہبی، جذباتی تقریروں سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ اس کے لیے خلوص نیت اور سنجیدگی سے کام کرنا ہوتا ہے۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول۔ عہد الست،
- سمیعہ صدف کا مکمل ناول۔
- نایاب جیلانی اور نازیہ جمال کے ناولٹ،
- ثمینہ عظمت علی، صباحت یاسمین، نزہت شبانہ حیدر اور شاہجہاں گل کے افسانے،
- عفیفہ سید اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- خاتون ایس ایچ او سیدہ غزالہ سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار بلال قریشی سے باتیں،
- خاموشی کو بیاں ملے۔ قارئین سے تعارف کا سلسلہ،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

اجتہاد

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جب حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد سے کام لے' پھر اجتہاد سے وہ درستی کو پہنچ گیا تو اس کے لیے دگنا اجر ہے اور جب وہ فیصلہ کرے اور اجتہاد میں اس سے غلطی ہو جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ جن معاملات میں کوئی نص شرعی نہ ہو' ان کی بابت ان سے ملتی جلتی شکلوں کو سامنے رکھ کر جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اجتہاد وہی شخص کر سکتا ہے جسے قرآن و حدیث کی صحیح سمجھ ہو۔

2۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کے حاکم' قاضی اور مجاز افسر کو قرآن و حدیث کا عالم ہونا چاہیے' تاکہ حسب ضرورت وہ اجتہاد کر سکے۔ اس اجتہاد میں وہ اخلاص اور نیک نیتی سے کام لے گا تو اس کے لیے ہر صورت میں اجر ہے' بلکہ درستی کی صورت میں دہرا اجر ہے۔

بخار

حضرت عائشہ رضی اللہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بخار' جہنم کی شدید حرارت سے ہے۔ چنانچہ تم اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔" (بخاری و مسلم)

فوت شدہ کے روزے

"جو شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمے (نذر کے) روزے ہوں تو اس کا قریبی اس کی طرف سے روزے رکھے۔" (بخاری و مسلم)

اس حدیث کی رو سے فوت شدہ شخص کے ذمے

روزے ہوں تو پسندیدہ بات اس کی طرف سے روزہ رکھنے کا جواز ہے۔ اور ولی سے مراد قریبی عزیز ہے' چاہے وہ وارث ہو یا نہ ہو۔

فوائد و مسائل :

شیخ البانی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نذر کے روزے ہیں نہ کہ رمضان کے روزے۔ گویا شیخ موصوف نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی حدیث کے عموم کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دوسری حدیث سے خاص کر دیا جس میں نذر کے روزوں کی صراحت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدنی عبادت میں نیابت جائز نہیں' جس طرح زندگی میں کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے کوئی بدنی عبادت ادا نہیں کر سکتا' اسی طرح موت کے بعد بھی ایسا کرنا جائز نہیں۔ البتہ جس کی بابت نص میں صراحت ہو تو اس میں نیابت جائز ہو گی اور اسے صرف نص کی صراحت کی حد تک محدود رکھا جائے گا' جیسے نذر کے روزوں کی بابت حدیث میں صراحت ہے کہ میت کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے تو نذر کے روزے میت کی طرف سے رکھنے جائز ہوں گے' کوئی اور بدنی عبادت اس کی طرف سے جائز نہیں ہو گی۔

نذر

حضرت عوف بن مالک بن طفیل بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی سودے یا عطیے کے بارے میں جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دیتی تھیں' کہا۔

"میری خالہ' (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما) یا تو اس طرح (بے دریغ) خرچ کرنے سے رک جائیں' نہیں تو میں ان پر پابندی عائد کر دوں گا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ سن کر فرمایا۔

"کیا عبداللہ نے واقعی ایسا کہا ہے؟"

"لوگوں نے کہا' ہاں۔"

انہوں نے فرمایا۔ "مجھ پر اللہ کے نام کی نذر ہے' اب میں کبھی عبداللہ بن زبیر سے بات نہیں کروں گی۔"

جب یہ ترک تعلق لمبا ہو گیا تو حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ کی طرف سفارش کروائی' تو انہوں نے فرمایا۔

"اللہ کی قسم! میں ابن زبیر کے بارے میں کبھی سفارش نہیں مانوں گی اور نہ اپنی نذر توڑنے کے گناہ کا ارتکاب کروں گی۔"

چنانچہ جب ابن زبیر پر یہ معاملہ مزید لمبا ہوا تو انہوں نے حضرت مسور بن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن اسود بن عبدیغوث سے گفتگو کی اور ان سے کہا کہ۔

"میں تم دونوں کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم مجھے (میری خالہ) عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس لے چلو' اس لیے کہ ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مجھ سے قطع تعلق کی نذر پر قائم رہیں۔"

تو حضرت مسور اور عبدالرحمٰن دونوں ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے گئے' حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے کہا۔

"السلام علیک ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ کیا ہم اندر آ جائیں؟"

حضرت عائشہ نے فرمایا۔ "آ جاؤ۔"

انہوں نے پوچھا۔ "ہم سب آ جائیں؟"

انہوں نے فرمایا۔ "ہاں تم سب آ جاؤ۔"

اور انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کے ساتھ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی ہیں' چنانچہ جب یہ اندر گئے تو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ پردے کے اندر چلے گئے اور حضرت عائشہ سے لپٹ کر انہیں قسمیں دینے لگے اور رونے لگے اور (پردے کے باہر) حضرت مسور اور عبدالرحمٰن بھی انہیں قسم دے کر کہنے لگے کہ وہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے بات کریں اور ان کا عذر قبول کر لیں۔ وہ کہتے تھے نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے قطع تعلق سے منع فرمایا ہے' جو آپ کے علم میں ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تین راتوں سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے بول چال اور تعلق منقطع رکھے۔

جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سامنے وعظ و نصیحت اور ترک تعلق کے گناہ ہونے کی باتیں کثرت سے کیں تو انہوں نے بھی وعظ و نصیحت شروع کر دی اور رونے لگیں اور فرمانے لگیں۔

"میں نے تو نذر مانی تھی اور نذر کا معاملہ بڑا سخت ہے۔"

مگر یہ دونوں برابر اصرار کرتے رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے حضرت ابن زبیر سے کلام فرما لیا اور اپنی اس نذر کے توڑنے کے کفارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے چالیس گردنیں آزاد کیں اور اس کے بعد جب بھی وہ اپنی نذر کو یاد کرتیں تو خوب روتیں۔ حتیٰ کہ ان کے آنسو ان کی اوڑھنی (دوپٹے) کو تر کر دیتے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سگے بھانجے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ان سے گفتگو نہ کرنے کی نذر مانی تھی' تو وہ یہ سمجھتی تھیں کہ ایسا کرنا ان کے لیے جائز ہے' کیونکہ حضرت ابن زبیر نے اپنی خالہ کے جائز تصرفات پر پابندی لگانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن پھر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ اپنی خالہ (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو منانے کے لیے دو سفارشیوں کو ساتھ لے کر گھر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ان کے لیے یہی مناسب تھا جو انہوں نے کیا کہ نذر توڑ دیں اور ابن زبیر سے ٹوٹے ہوئے تعلق کو بحال کر لیں۔

2۔ نذر توڑنے کا کفارہ وہی ہے جو قسم توڑنے کا ہے۔ ایک گردن آزاد کرنا' یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا ان کی پوشاک کا انتظام کر دینا۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو تین دن کے روزے۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک کے بجائے چالیس گردنیں آزاد فرمائیں۔

دنیا سے رغبت

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد کے شہدا کی طرف تشریف لے گئے اور ان کے لیے آٹھ سال بعد اس طرح دعا فرمائی جیسے زندوں اور مردوں کو رخصت کرنے والا دعا کرتا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور فرمایا۔

"میں تمہارا پیش رو (یا میر سامان) ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں گا اور تمہارے وعدے کی جگہ حوض (کوثر) ہے اور بلاشبہ میں اسے اپنے اس مقام سے دیکھ رہا ہوں۔ (کشف کے طور پر) خبردار! مجھے تم سے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ تم شرک کرو گے۔ لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ تم دنیا میں زیادہ رغبت کرنے لگو گے۔"

حدیث کے راوی بیان کرتے ہیں کہ یہ آخری نظر تھی جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالی (اس کے بعد جلد ہی آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔)" (بخاری و مسلم)

اور ایک اور روایت میں ہے۔

"میں تم سے دنیا کی بابت خوف محسوس کرتا ہوں کہ تم اس میں زیادہ رغبت کرو گے اور (اس کی وجہ سے) باہم لڑو گے تو ایسے ہی ہلاک ہو جاؤ گے جیسے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے۔" حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری دیدار تھا جو میں نے منبر پر کیا۔

ایک اور روایت میں ہے۔

"بلاشبہ میں تمہارا پیش رو ہوں اور تم پر گواہ ہوں گا اور بلاشبہ اللہ کی قسم! میں اب اپنے حوض کی طرف

دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی یا (فرمایا) زمین کی چابیاں عطا کی گئی ہیں اور میں تمہاری بابت اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تم میرے بعد شرک کروگے، لیکن مجھے تم سے یہ اندیشہ ہے کہ تم اس دنیا میں خوب رغبت کروگے۔"

1۔ مرحومین اور شہداء کے لیے ہمیشہ مغفرت اور رفع درجات کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔ بشرطیکہ ان کا خاتمہ ایمان پر ہو۔

2۔ دنیا میں کشف کے ذریعے سے بہت سے حقائق اخروی کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم دیا گیا۔

3۔ اس میں حوض کوثر کا بھی اثبات ہے۔

4۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے پیش رو یا میر سامان ہوں گے۔ فرط کے معنی ہیں، قافلے سے آگے جانے والا، یعنی آپ قافلہ آخرت کے پیش رو ہیں۔

5۔ اس میں آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے جو فرمایا ہے کہ مجھے تم سے شرک کا اندیشہ نہیں ہے تو یہ صحابہ کرام اور قرون اول کے اعتبار سے ہے، ورنہ دوسری احادیث سے ثابت ہے کہ آخری زمانے میں لوگ پھر بتوں کو پوجیں گے، اس لیے اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ امت محمدیہؐ کے افراد کبھی شرک کا ارتکاب نہیں کریں گے، صحیح نہیں ہے۔ اس کا تعلق اسلام کے قرون خیر سے ہے یا پھر اس کا مطلب تمام امت کے مشرک ہونے کی نفی ہے، یعنی پوری امت شرک کا ارتکاب نہیں کرے گی۔ کچھ گروہ یا فرقے اگر مشرکانہ عقائد و اعمال اختیار کریں گے بھی جیسا کہ اس وقت بہت سے مدعیان اسلام کا عقیدہ و عمل ہے، تو دوسرے گروہ توحید و سنت پر ضرور قائم رہیں گے۔

7۔ زمین کی یا زمین کے خزانوں کی چابیوں سے مراد وہ خوش خبری ہے جو کفار کے ممالک فتح ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو غنیمت کا مال ملنا تھا جیسا کہ بعد میں ہوا۔

خطبہ

حضرت ابو زید عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور منبر پر تشریف فرما ہو گئے۔ ہمیں خطبہ دیا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ تو آپؐ نیچے اترے اور نماز پڑھائی، پھر منبر پر رونق افروز ہو گئے اور ہمیں خطبہ دیا، یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا، پھر آپؐ نیچے اترے اور نماز پڑھائی اور پھر منبر پر چڑھ گئے۔ (اور خطبہ دیا) یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ آپؐ نے ہمیں ماضی اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی خبر دی۔ چنانچہ ہم میں سب سے بڑا عالم وہی ہے، جو ہم میں سب سے زیادہ ان باتوں کو جاننے والا ہے۔ (مسلم)

نذر

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اس بات کی نذر مانے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اسے اللہ کی اطاعت کرنی چاہیے اور جو شخص اللہ کی نافرمانی کی نذر مانے تو وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل

مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں کی نذر پوری کرنا چاہیے اور نافرمانی کی نذر پوری نہ کی جائے۔

چھپکلی مارنا

حضرت ام شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چھپکلیوں کے مارنے کا حکم فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ ابراہیم علیہ السلام (کی آگ) پر پھونکیں مارتی تھی۔" (بخاری و مسلم)

نیکیاں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو چھپکلی کو پہلی چوٹ میں مار دے، اس کے لیے اتنی اتنی نیکیاں ہیں اور جو اس کو دوسری چوٹ میں مارے، اس کے لیے پہلے شخص سے کم اتنی اتنی نیکیاں ہیں اور اگر تیسری چوٹ میں مارے تو اس کے لیے اتنی اتنی نیکیاں ہیں۔"

ایک اور روایت میں ہے۔

"جو شخص کسی چھپکلی کو پہلی چوٹ میں مار دے، اس کے لیے سو نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ دوسری چوٹ میں مارنے پر اس سے کم اور تیسری چوٹ میں مارنے پر اس سے کم۔" (مسلم)

1۔ اس میں چھپکلی کو پوری قوت سے ایک ہی چوٹ میں مارنے کی فضیلت کا بیان ہے۔ دوسرے موذی جانوروں کا بھی یہی حکم ہوگا، جیسے بچھو، سانپ، اژدھے وغیرہ۔

2۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیکی یا برائی میں تھوڑا سا تعاون بھی عند اللہ محسوب (شمار) ہوگا اور اس کی جزا اور سزا ملے گی، کیونکہ عند اللہ مقدار کی اہمیت نہیں، اصل چیز نیت اور ارادہ ہے۔

صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک آدمی نے کہا۔ میں ضرور (آج رات) صدقہ کروں گا۔

چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور ایک چور کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

صبح کے وقت لوگ باتیں کرتے تھے کہ آج رات ایک چور پر صدقہ کیا گیا ہے تو صدقہ کرنے والے نے (سن کر) کہا۔

"اللہ! تیری تعریف! (آج رات) میں پھر ضرور صدقہ کروں گا۔"

چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا تو وہ اس نے ایک بدکار عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ صبح کے وقت لوگ باتیں کرتے تھے۔

"آج رات ایک بدکار عورت پر صدقہ کیا گیا ہے۔"

تو صدقہ کرنے والے نے (سن کر) کہا۔ "اللہ! تیری شان! بدکار عورت پر (صدقہ ہو گیا ہے) میں (آج رات) پھر ضرور صدقہ کروں گا۔"

چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور ایک مال دار آدمی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ صبح کے وقت لوگ باتیں کرتے تھے کہ

آج رات ایک مال دار پر صدقہ کیا گیا ہے، تو اس نے کہا۔

"اللہ! تیری حمد! ایک چور، ایک بدکار عورت اور ایک مال دار پر (صدقہ ہو گیا!) چنانچہ رات کو اسے خواب آیا اور اسے بتلایا گیا (کہ تیرا صدقہ بے کار نہیں گیا ہے، بلکہ۔۔۔) تیرا صدقہ جو چور پر ہوا تو شاید اس کی وجہ سے وہ چوری کرنے سے باز آجائے اور بدکار عورت شاید وہ بدکاری سے تائب ہو جائے اور مال دار آدمی، شاید وہ عبرت حاصل کرلے اور وہ بھی اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

صدقہ دینے والے کی نیت اگر صحیح ہو تو اس طرح کی بے خبری میں غیر مستحق لوگوں پر بھی صدقہ ہو جائے تو عند اللہ مقبول ہوگا علاوہ ازیں اللہ چاہے گا تو اس میں بھی ان لوگوں کے اندر خیر کے پہلو پیدا فرمادے گا جو مستحق نہ ہونے کے باوجود صدقے سے نواز دیے جائیں، یہ واقعہ پہلی امتوں میں سے کسی کا ہے۔

اَب موسم کا حال سنیے

انشاجی

یہ جو ہم اتنے دن کالم نہیں لکھ سکے' اس کی وجہ یہ نہیں کہ کہیں باہر چلے گئے تھے۔ جائیں ہمارے دشمن۔ ہم کیوں ملک سے باہر جائیں۔ بس یہیں کراچی میں بیٹھے بارش کا انتظار کررہے تھے۔ ایک ہاتھ میں ہمارے چھاتا' دوسرے میں برساتی۔ کوئی ہاتھ خالی ہوتا تو لکھتے۔ چھاتا تو ہم نے اسی روز تان لیا تھا' جس روز پہلی بار ٹیلی ویژن پر اناؤنسر ضیاء الحسن صاحب نے بشارت دی کہ کل نہ صرف مطلع ابر آلود رہے گا' بلکہ گرج چمک کے ساتھ بارش بھی ہوگی۔ خیر ایک دن کی غلطی ہم سب کو معاف کردیتے ہیں' کیونکہ سیر چشم آدمی ہیں۔ دوسرے دن خورشید طلعت صاحبہ نے اس بشارت کو دہرایا۔ ہم نے کہا۔ یہ لڑکی جھوٹ نہیں بول سکتی' کیونکہ ابھی اس کی عمر جھوٹ بولنے کی نہیں ہوئی۔ پس ہم نے گھر والوں کو للکارا کہ آج تو جو ہوا سو ہوا۔ اب یہ تمہاری سل انگاری نہیں چلے گی۔ چارپائیاں اٹھا کر ڈرائنگ روم میں رکھو۔ (ہمارے ہاں اور کہیں جگہ نہیں) تاکہ بان بھیگ کر اکڑ نہ جائے اور لان پر دریاں بچھا دو' کیونکہ زیادہ پانی سے گھاس گل جاتی ہے۔

اس سے اگلے روز علی الصبح ہم اٹھ کر نہار منہ ملہار گانے بیٹھ گئے۔ جب گا گا کر گلا بیٹھتا معلوم ہوا تو ہم نے پوچھا۔

"کیوں بھئی لوگو! بارش بند ہوگئی؟"

جواب ملا۔ "ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔"

تان سینی گولیاں منہ میں رکھ کر اور ایک اور تان اڑا کر "اُمڑ گھمڑ گھر آئے بدرا" ہم نے کہا۔

جواب ملا۔ "جی نہیں۔ بادل ابھی نہیں آئے۔"

ہم نے کہا۔ "کم از کم پروائی تو چلی ہوگی۔ نرم نرم پروائی۔ کوئل کوکی ہوگی۔ پپیہا بھی بولا ہوگا۔ پی.... پی.... پی۔"

معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پاپی پپیہا تک دغا دے گیا۔ غالباً "احمد رضا قصوری گروپ میں شامل ہوگیا۔

اگلی شام پھر خورشید طلعت نے بتایا کہ کل گرج چمک کے ساتھ بارش ہوگی۔ شاید اولے پڑنے کا بھی کہا تھا۔ کچھ یاد نہیں ہے۔ ہم احتیاط پسند آدمی ہیں۔ انٹرنیشنل ہیر کٹنگ سیلون کے خلیفہ اللہ دتا سہارنپوری سے جاکر سر بھی منڈوا آئے کہ ویسے نہیں پڑتے تو یوں پڑیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکیاں' جو سڑک کے رخ کھلتی ہیں' وہ ہم نے پہلے روز بند کرادی تھیں' تاکہ پانی اندر نہ آئے۔ ہمارے گھر والے

کچھ ٹیڑھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ حجت کرنے لگے کہ آپ خوامخواہ کو ہلکان کررہے ہیں۔ بارش نہ آئی نہ آئے گی۔ ہم نے کہا' تو یہ موسمیات والے اور ٹیلی ویژن والے جھوٹ کہتے ہیں؟ جواب ملا۔ دیکھا نہیں خورشید طلعت صاحبہ بارش کی بشارت دینے کے بعد خود بھی مسکرا رہی تھیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ وہ موسمیات والوں پر نہیں مسکرا رہی تھیں۔ ان کو ٹیلی ویژن کی طرف سے آرڈر ہوتا ہے' بات بے بات مسکرانے کا۔ ہمارے گھر کے لوگ ایسے وہمی ہیں کہ منڈیر پر بھنبیری چھوڑ کوا بھی آ بیٹھے تو یہ جان کر کہ ساون آیا اور بارش ہوگی' مال پوڑوں کے لیے آٹا گھولنے بیٹھ جاتے ہیں اور موسمیات والوں نے جو ہزاروں' لاکھوں روپوں کی مشینیں موسم کا حال معلوم کرنے کے لیے لگا رکھی ہیں' ان کو کھڑاگ سمجھتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ آدمی ایک دن غلط بیانی کرسکتا ہے' دو دن کرسکتا ہے۔ آج تیسرا دن ہے۔ کان دھر کر سن لو۔ آج تو انہوں نے نہایت ہی وثوق سے کہہ دیا کہ پورے جنوبی علاقے میں گرج چمک کے ساتھ بارش ہوگی۔ جل تھل ہوجائے گا۔ لوگ ڈبکیاں کھاتے پھریں گے۔ اس پر ایک عزیز نے کہا۔ جنوبی علاقے کا مطلب آپ نے کراچی کیوں فرض کرلیا۔ مراد پاکستان کے جنوب سے ہے۔ جہاں سمندر ہے۔ خط استوا ہے۔ لنکا ہے۔ بلکہ ممکن ہے' جنوبی علاقے سے مراد خط استوا سے جنوب کا علاقہ ہے۔

ہم ایسے کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ دوسرے دن صبح چھاتا لے کر بارش کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ آپ کہیں گے' کمرے کے اندر چھاتا لے کر بیٹھنے کا کیا مطلب؟ آپ لوگ نہیں جانتے۔ گرمی میں جب بارش آتی ہے تو بہت آتی ہے۔ دیواریں رسنے لگتی ہیں اور چھتیں ٹپکنے لگتی ہیں اور ہمارے پاس ایک ہی سوٹ ہے۔ کوئی نو یا دس بجے ہوں گے کہ ایک صاحب آئے' نچڑتے ہوئے۔ ہم نے کہا۔ بھئی تم بڑے بے وقوف ہو۔ ایسی بارش میں گھر سے



چھاتے بغیر نکل آئے۔ ارے بارش کی پیشن گوئی نہیں سنی تھی کیا؟ اب دیکھو تم نے فرش خراب کردیا۔ سارا پانی تمہارے انگرکھے کا ہمارے قالین پر بہہ گیا۔

بدتمیزی سے بولے۔

"جناب یہ بارش نہیں پسینہ ہے اور یہ قالین نہیں دری ہے۔"

ہمارے یقین کی ایک وجہ یہ تھی کہ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن والوں نے اخباروں میں لمبا چوڑا اشتہار چھپوا دیا تھا کہ موسلا دھار بارش کی وجہ سے بجلی خراب ہوجائے تو فلاں علاقے والے فلاں ایمرجنسی سینٹر پر فون کریں اور فلاں علاقے والے فلاں ایمرجنسی سینٹر کو کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔ سنا ہے اخبار والوں نے بھی پار سال والی تصویریں بارش کی نکال رکھی تھیں اور اداریے بھی لکھ کر کاتب کو دے دیے تھے کہ بارش سے جھونپڑیوں کا ازحد نقصان ہوا ہے۔ ایڈمنسٹریشن والے اپنے فریضہ سے غافل ہیں۔ حالانکہ ان کو ٹیلی ویژن پر بارش کا اعلان سنتے ہی رضائیاں اور کھانے کی دیگیں لے کر مختلف کالونیوں میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ قصہ پار سال کی تصویروں کا یہ ہے کہ اخبار والے ایک سیٹ بارش کی تصویروں کا رکھتے ہیں' تاکہ دوسرے اخباروں سے پیچھے نہ رہیں۔ آپ نے شاید غور سے نہ دیکھا ہو یہ تصویریں جن میں دو آدمی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چھاتا لیے سڑک پار کررہے ہوتے ہیں یا پانی میں پھنسی ہوئی موٹریں اور پانی میں کھیلتے ہوئے بچے اور گرے ہوئے مکان اور جھونپڑیاں ایک بار بنالی جاتی ہیں اور برسوں کام آتی ہیں۔ کیونکہ ہر بارش میں فوٹوگرافر کا نکلنا مشکل ہے۔ کیمرا پانی سے خراب ہوجاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ریڈیو والے دراز میں سے نکال کر جھٹ سے ریکارڈنگ دیتے ہیں اور آپ اپنی سادہ لوحی میں سمجھتے ہیں کہ بھائی چھیلا پٹیالے والا مائیکروفون کے سامنے اسٹوڈیو میں بیٹھا گا گا کر بے حال ہورہا ہے۔

ایک دن تو ہم نے حضرت آرزو لکھنوی کا نسخہ بھی آزمایا۔

آج یہ کس نے ساغر پھینکا موسم کی بے کیفی پر
ایسا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب گیا میخانہ بھی

ساغر کا مطلب ہے پیالہ۔ پیالے تو ہمارے ہاں کوئی نہیں ہیں اور اگر چائے کی پیالیوں سے مطلب ہے تو انہیں ہمارے گھر والے تالے والی الماریوں میں رکھتے ہیں۔ ایک گلاس مل گیا تو اسی کو ہم نے کھینچ مارا۔ المونیم کا گلاس تھا۔ آواز ہوئی تو لوگ بھاگے بھاگے آئے۔ بولے آج پھر بلی آگئی تھی دودھ پینے؟ ہم نے جب دیکھا کہ آسمان پر بادل کے ٹوٹ کر برسنے کے آثار ابھی ہویدا نہیں ہوئے تو کہا۔ ہاں بلی ہی تھی' بڑی نابکار ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ شراب والے ساغر سے مراد ہے اور پھینکنے سے اس میں شراب ہونی چاہیے' چاہے دیسی ہو اور آس پاس میخانہ بھی ہونا چاہیے۔ میخانہ نہیں ہوگا تو ڈوبے گا کیا؟ تو یہ قصور ہمارا ہی تھا۔ نسخہ کے سارے اجزا بہم نہیں کیے۔ تاہم مایوسی کی کیا بات ہے۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔

صاحبو! اتنا ہم نے اس لیے لکھ دیا کہ بہت دن سے لکھا نہیں تھا اور صورت قدرت کی طرف سے یہ بنی کہ ایک مہربان دوست اس پر تیار ہوگئے تھے کہ ہمارا چھاتا تانے کھڑے رہیں گے تاکہ چھت ٹپکنے پر ٹپکا ہمارے سر پر نہ آئے۔ دم تحریر بھی وہ کھڑے ہیں' لیکن کہہ رہے ہیں کہ میں تھک گیا ہوں۔ اب اپنا چھاتا خود تھامیے۔ لا بھئی لا۔ دے دے چھاتا ہمیں۔ ارے قرون اولیٰ کے دوست تو اپنے دوستوں پر جان تک قربان کردیتے تھے۔ تو گھڑی بھر کو چھاتا بھی پکڑ کر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ اچھا بھئی ہم قلم ہاتھ سے رکھتے ہیں اور چھاتا تھامتے ہیں اور ہماری تان سینی گولیوں کی شیشی کہاں گئی؟ مل گئی۔ اب جا بھاگ جا۔ ہمارے گانے کا ٹائم ہوگیا ہے۔

اُمڑ گھمڑ گھر آئے بدرا....



صوبہ سندھ کی پہلی خاتون ایس ایچ او

سیدہ غزالہ سے ملاقات

شاہین رشید

ہماری خواتین زندگی کے ہر شعبے میں فعال ہیں۔ پولیس کا شعبہ جو کہ بہت اہم شعبہ ہے مگر ہمارے یہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔اس میں بھی خواتین اپنی کارکردگی دکھا رہی ہیں اور کوشش کر رہی ہیں کہ اپنی بہترین کارکردگی سے اسے ایک ایسا شعبہ بنا دیں جس پر لوگ اعتماد کریں اور جہاں آکر سب کی مشکلات دور ہو جائیں۔

ہم آج سندھ کی پہلی خاتون ایس ایچ او سے آپ کی ملاقات کرا رہے ہیں۔

★ "یہاں ہم یہ بات اپنے قارئین پہ واضح کردیں کہ سیدہ غزالہ صاحبہ کا انٹرویو ایک نشست میں مکمل نہیں ہوا بلکہ آپ یہ سمجھیں کہ کئی مہینوں میں مکمل ہوا۔ کیونکہ ان کی مصروفیات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ ان کا ہاتھ آنا مشکل ہوتا ہے۔۔۔ یہ بھی شکر ہے کہ ہمیشہ فون پر ہی بات ہوئی اگر تھانے کچہری میں جا کر بات ہوتی یا فیلڈ میں یا گھر جا کر تو لوگ سمجھتے کہ شاید شاہین رشید کسی پرابلم کا شکار ہو گئی ہے اس لیے اتنے چکر لگ رہے ہیں غزالہ کے پاس۔۔۔ خیر اب آپ انٹرویو پڑھیے"

★ "سیدہ غزالہ صاحبہ! کیسی ہیں آپ؟"

✳ "الحمدللہ۔"

★ "بہت مصروف رہتی ہیں آپ؟"

✳ "جی۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ جاب ہی ایسی ہے۔ کبھی کہیں تو کبھی کہیں۔ اب آپ نے کچھ دن پہلے فون کیا تھا تو شہر میں کشیدگی تھی تو ہر جگہ کا راؤنڈ لینا پڑا۔ کیا کریں جی ڈیوٹی بڑی ٹف ہے۔"

★ "مزا آرہا ہے یا بور ہو رہی ہیں؟"

✳ "نہ مزا نہ بور۔۔۔ فرض پورا کر رہی ہوں۔ اور مزا کس بات کا؟ شہر کے حالات خراب ہوں ' لوگ مشکلات کا شکار ہوں تو بھلا مزا کیا آئے گا۔"

★ "تھکن تو ہو جاتی ہوگی؟"

✳ "جی ایسی ویسی۔۔۔ مگر یہ ہماری ڈیوٹی ہے اور ہمارا فرض ہے کہ موقع پر پہنچیں۔"

★ "آپ ماشاءاللہ اتنی خوش اخلاق ہیں 'سب سے ہنس ہنس کر بات کرتی ہیں۔ لوگ ڈرتے تو نہیں ہوں گے؟"

✳ قہقہہ "نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ پولیس کی دہشت ہی بہت ہوتی ہے۔ لوگ خود بخود ڈرنے لگتے ہیں۔ ویسے سچ بات بتاؤں۔ لوگ مجھے اپنے مسائل بتانے میں گھبراتے نہیں ہیں۔ ٹیچر سخت ہو تو پھر لوگ ڈرتے ہیں اپنی بات بتاتے ہوئے جبکہ میں ایسی ٹیچر ہوں کہ لوگ ڈرتے بھی ہیں اور کھل کر بات بھی کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ٹیچر کلاس لینے والا ہی ہو ' جس سے کوئی کچھ سیکھے 'وہ بھی ٹیچر ہی ہوتا ہے۔"

★ "بالکل ٹھیک کہا۔ ورنہ پولیس کا نام تو سنتے ہی نہ صرف لوگ خوف زدہ ہو جاتے ہیں بلکہ ان کے ذہنوں میں یہی خیال آتا ہے کہ سامنے ایک سخت گیر شخصیت ہوگی؟"

✳ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ ویسے نہ صرف مجھے ہنستے مسکراتے لوگ اچھے لگتے ہیں' بلکہ میرا خود بھی یہی دل چاہتا ہے کہ میں ہر وقت ہنستی مسکراتی رہوں۔ ہاں۔۔۔ مگر میں مجرموں کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتی ہوں وہاں پھر خوش اخلاقی کو بالائے طاق رکھ دیتی ہوں۔"

★ "پولیس میں آنے کا کیا بچپن سے شوق تھا۔۔۔ عموماً" یہ سوال فنکاروں سے پوچھا جاتا ہے۔۔۔ لیکن میں اس لیے آپ سے یہ سوال پوچھ رہی ہوں کہ کوئی ایک دم اس شعبے میں نہیں آتا؟"

✳ "بات آپ کی بھی ٹھیک ہے۔ مگر کوئی جذبہ 'کوئی شوق اچانک ہی جنم لیتا ہے اور مجھے یہ شوق اسکول کے زمانے میں ہوا وہ بھی اس طرح کہ 1994ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید صاحبہ نے "ویمن پولیس اسٹیشن کا افتتاح کیا۔ اس زمانے میں ویمن پولیس کا تصور ہی کچھ اور تھا۔۔۔ تو جب انہوں نے افتتاح کیا تو مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی عورتوں کا پولیس اسٹیشن دیکھوں۔۔۔ تو اتفاق دیکھیں کہ ہمارے اسکول والے بچوں کو لے کر وزٹ پہ گئے تو میں بھی ساتھ تھی۔ وہاں خواتین کو وردی میں دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔ پھر سب سے مل کر میرے بھی دل میں شوق جاگا کہ میں بھی اس فیلڈ میں آؤں اور پھر میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو مجھے پولیس میں بھرتی کر لیا گیا۔"

★ "آپ نے کہا کہ دیکھوں کہ عورتوں کا پولیس اسٹیشن کیسا ہوتا ہے تو کیا فرق پایا اور یہ بھی بتایئے کہ گھر والوں نے منع نہیں کیا پولیس میں آنے سے؟ کیونکہ کہتے ہیں یہ خواتین کے لیے بھی ایک خطرناک شعبہ ہے؟"

✳ "بالکل ٹھیک کہا کہ یہ ایک خطرناک شعبہ ہے اور گھر کے لوگ ڈرتے ہیں اپنی بیٹیوں کو اس فیلڈ میں بھیجتے ہوئے۔۔۔ لیکن پہلے میں آپ کو یہ بتاؤں کہ خواتین اور مردوں کے پولیس اسٹیشن میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔۔۔ خیر جب میں نے پولیس میں بھرتی ہونے کی خواہش ظاہر کی تو گھر والے راضی نہیں تھے۔ مگر میری ضد کے آگے مجبور ہو گئے اور مجھے اجازت دے ہی دی۔"

★ "ایس ایچ او کے عہدے تک کیسے آئیں؟"

✳ "اس عہدے تک آنے میں بھی کافی محنت کرنی پڑتی ہے اور کئی امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔ مختصراً" بتاتی ہوں کہ میں 1998ء میں بطور اے ایس آئی کراچی میں آئی اس سے پہلے شہداد پور میں تین سال کا ٹریننگ کورس کیا تھا شہداد پور میں ہماری ٹریننگ بڑی سخت تھی نہ گرمی دیکھی جاتی تھی نہ سردی 'لیکن میں نے اپنی محنت سے فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔۔۔ اس کے بعد میں نے بلڈ ویکسنگ میں ایک سال کا ڈپلومہ کورس کیا اور اپنے محکمے کے لیے ایک بلڈ بینک

بنایا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ پولیس والوں کی بلڈ اسکریننگ کی جائے تاکہ بہ وقت ضرورت بغیر کسی مشکلات کے پولیس کو اور پبلک کو خون فراہم کیا جا سکے۔ اس فلاحی کام کو ایک سال تک انجام دینے کے بعد نارتھ ناظم آباد میں بطور انچارج کمپینگ میں تعینات کردی گئی۔ یہاں میرا کام یہ تھا کہ میں پولیس کے خلاف آنے والی شکایات پر ایکشن لوں۔ اس کے بعد صدر میں میرا تقرر ہوا اور پھر 2003ء میں جنوبی زون پولیس اسٹیشن میں بہ حیثیت ایس ایچ او میری تعیناتی ہوئی اور اب ایس ایچ او کلفٹن ہوں۔"

★ "گڈ۔۔۔۔اور اب مزید کیا ارادے ہیں؟"

⁕ "مرد پولیس اسٹیشن میں جب بہ حیثیت ایس ایچ او میری تعیناتی ہوئی تو ایک طرح سے تھوڑی اپ سیٹ تھی کہ پتا نہیں کیسا ماحول ہوگا۔ لوگ کیسے ہوں گے کیونکہ ہمیشہ خواتین کے ساتھ بیٹھ کر کام کیا۔۔۔۔ تو خیر یہاں آکر اچھا ہی لگا۔۔۔۔ کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔"

★ "آپ چاہیں گی کہ اس فیلڈ میں مزید لڑکیاں آئیں؟"

⁕ "بالکل جی۔۔۔۔ بالکل چاہوں گی کہ لڑکیاں اس فیلڈ میں آئیں، بہت باعزت شعبہ ہے اور میرا ایمان ہے کہ اگر پڑھی لکھی، تعلیم یافتہ لڑکیاں اس فیلڈ میں آئیں گی تو یہ شعبہ بہت اچھا ہو جائے گا کیونکہ پڑھی لکھی لڑکیوں سے ماحول بھی اچھا ہوگا۔"

★ "مگر والدین گھبراتے ہیں اپنی بیٹیوں کو بھیجتے ہوئے؟"

⁕ "یہی تو میں واضح کرنا چاہتی ہوں کہ یہ بہت اچھا شعبہ بھی ہے اور پروفیشن بھی ہے، جب تک اچھے گھرانوں کی لڑکیاں نہیں آئیں گی یہ شعبہ ترقی نہیں کرپائے گا ابھی ہمارے پاس لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہے۔۔۔۔ اور اس تاثر کو کہ پولیس کا محکمہ لڑکیوں کے لیے سازگار نہیں ہے ہمیں آپ لوگوں کا تعاون چاہیے ہوگا۔ پرنٹ میڈیا میں بھی اور الیکٹرونک میڈیا میں بھی اس بات کو اجاگر کیا جائے کہ ویمن پولیس کا شعبہ لڑکیوں کے لیے بہت باعزت شعبہ ہے اور لڑکیوں کو اس طرف آنا چاہیے۔"

★ "آپ کی اپنی تعلیم کتنی ہے؟"

⁕ "میں نے بی گریجویشن کیا ہے اور "سی پی" اور پی ٹی سی کیا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ کسی بھی شعبے میں ترقی کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔"

★ "آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکیں گی۔ پھر مردوں کے تھانے میں ایک خاتون ایس ایچ او کے آجانے سے سب کا رویہ کیسا ہے؟"

⁕ "ان شاءاللہ مجھے پوری امید ہے کہ اپنے فرائض بخوبی نبھالوں گی اور نبھاتی ہی چلی آرہی ہوں تب ہی تو اس عہدے تک پہنچ پائی ہوں۔ ہاں جب یہاں مردوں کے پولیس اسٹیشن پہ آئی تو تھوڑا سا یہ ڈر خوف تھا کہ پتا نہیں سب کا رویہ کیسا ہو۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ سب کا رویہ بہت اچھا ہے۔"

★ "آپ کی عزت زیادہ ہے یا آپ کے عہدے کی؟"

⁕ "انسان کی عزت اس کے عہدے سے ہی ہوتی ہے۔ انسان تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے جسم پہ جو وردی ہے اور میرے کاندھے پر جو اسٹارز ہیں لوگ انہیں سلیوٹ کرتے ہیں مجھے نہیں۔۔۔۔ اور مجھے اپنے ان اسٹارز کی لاج رکھنی ہے۔ عزت رکھنی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرا کام، میرا کردار سب کے لیے ایک رول ماڈل ہو اور سب میری مثالیں دیں۔"

★ "کس کام میں بہت مشکل ہوتی ہے؟"

⁕ "اسنیپ چیکنگ پہ مشکل ہوتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی بہت مشکل ہوتی ہے بعض لوگ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے کام کو سراہتے ہیں، ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ بگڑ جاتے ہیں کہ جی آپ ہمیں کیوں روک رہی ہیں، جبکہ دوسرے لوگ تو چلے جارہے ہیں۔ تو میں یہی کہتی ہوں کہ جو غلطی کرے گا اسے ہی روکوں گی۔ سب کو کیسے روک لوں۔"



★ "آپ نے کہا کہ آپ رول ماڈل بننا چاہتی ہیں۔ مگر ہمارے یہاں پولیس کو لوگ پسند ہی نہیں کرتے' جبکہ دوسرے ممالک میں لوگ پولیس کے نام سے ڈرتے ہیں۔ کیوں؟"

✻ "یہی تو سارا مسئلہ ہے کہ پولیس کا امیج خراب ہو چکا ہے اور لوگ ہر پولیس والے کو ایک جیسا سمجھتے ہیں' جبکہ ایسا نہیں ہے "آپ نے بالکل ٹھیک کہا' باہر کے ملکوں میں لوگ پولیس کو بہت عزت دیتے ہیں۔

ہمارے یہاں سمجھا جاتا ہے کہ پولیس کو رشوت دیں گے تو سارے کام آسان ہو جائیں گے جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے اور میں ایک بار پھر کہوں گی کہ لوگوں کی سوچ کو میڈیا بدل سکتا ہے۔ ہم پولیس کو عزت دیں گے تو وہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس شعبے میں زیادہ تر لوگ اچھے ہیں۔ آپ میرا یقین کریں۔"

★ "بڑے مسائل کیا ہیں ہمارے ملک میں؟"

✻ "ہمارے ملک میں مسائل کا انبار ہے' ہمیں بنیادی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ ہمارے پاس نفری بہت کم ہے۔ پٹرول اور دیگر سہولیات نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں کرپشن بہت ہے۔ نظام ٹھیک نہیں ہے اور اس میں قصور صرف محکمے یا حکومت کا نہیں ہے۔ ہمارے عوام بھی ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرتے یا درپیش مسائل کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے مجرموں کی نشان دہی کرنے سے گھبراتے ہیں جس کی وجہ سے جرائم اور مجرم پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔"

★ "آپ خود کچھ کر رہی ہیں؟"

✻ "مجھ سے تو جتنا کچھ ہو سکتا ہے کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ عوام کے دلوں میں ہمارے لیے جو منفی رویہ ہے' وہ بدلنا چاہیے۔"

★ "آپ نے بتایا کہ 1994ء میں بے نظیر بھٹو نے ویمن پولیس اسٹیشن کا افتتاح کیا تھا۔ بے نظیر کو اتنا قریب دیکھ کر کیسا لگا تھا؟"

✻ "بہت اچھا بلکہ بہت زیادہ اچھا لگا تھا اور تب ہی سے بے نظیر بھٹو شہید میری پسندیدہ شخصیت ہیں۔۔۔ اور ہمیشہ رہیں گی۔ وہ اگر برسراقتدار ہوتیں تو یقیناً ویمن پولیس اور بھی زیادہ ترقی کرتی اور میری خواہش تھی کہ مجھے ان کی سیکورٹی کا موقع ملے۔ مگر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا اور ان کی شہادت کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔۔۔ اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ وہ ایک بہترین انسان اور بہترین لیڈر تھیں۔"

★ "چلیں جی۔۔۔ اب کچھ ہلکے پھلکے سوال ہو جائیں آپ سے۔۔۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔۔۔؟"

✻ "جی۔ میرا تعلق سید گھرانے سے ہے اور کراچی میں جنم لیا۔ والدین کی شادی کے تقریباً" دس سال بعد' اس لیے گھر بھر کی لاڈلی رہی۔ لیکن والدین کی تربیت نے میری شخصیت کو بگاڑا نہیں بلکہ سنوارا ہی ہے۔ مجھ سے چار سال چھوٹا ایک بھائی ہے۔ میری پیدائش کے لیے والدین نے بہت منتیں مانیں لیکن افسوس کہ جب میں دس سال کی تھی' میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے ہمت نہیں ہاری' صدمہ برداشت کیا اور ساتھ ہی ساتھ ہم دونوں بہن بھائی کی پرورش بھی اس انداز میں کی کہ آج میرا ایک نام ہے اس معاشرے میں۔"

★ "شادی۔۔۔ اور بچے؟"

✻ "الحمدللہ شادی شدہ ہوں۔ شوہر بہت محبت کرنے والے اور تعاون کرنے والے ہیں۔ ماشاءاللہ میرے چار بچے ہیں۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔"

★ "گھریلو لائف ڈسٹرب ہوتی ہے؟۔۔۔ شوہر ناراض ہوتے ہوں گے کہ گھر کو ٹائم نہیں دیتیں؟"

✻ "ارے نہیں' شوہر بالکل بھی ناراض نہیں ہوتے' بلکہ ان کے تعاون کی وجہ سے ہی تو میں آج اس فیلڈ میں ہوں۔ گھریلو لائف تو ڈسٹرب نہیں ہوتی' البتہ بچے ضرور کبھی کبھی شکایت کرتے ہیں کہ آپ ہمیں ٹائم نہیں دیتیں۔"

★ "کیا اب ڈیوٹی زیادہ سخت ہو گئی ہے؟"

✻ "جی بالکل۔۔۔ جب ویمن پولیس اسٹیشن میں تھی تو مغرب کے وقت ہماری ڈیوٹی آف ہو جایا کرتی تھی اور پھر میں ہوتی تھی اور میری فیملی۔ اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا کرتی تھی۔ مگر اب چھٹی کا کوئی تصور بھی باقی نہیں رہا۔ صبح نو بجے ڈیوٹی پہ پہنچنا ہوتا ہے جبکہ واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو رات گئے واپسی ہوتی ہے۔"

★ "پھر تو بچوں کا شکوہ کرنا بجا ہے؟"

✻ "جی بالکل' بچے اب اکثر شکوہ کرتے ہیں کہ آپ کے پاس ہمارے لیے وقت نہیں ہے۔۔۔ اب آپ خود ہی دیکھیں کہ آپ کو انٹرویو میں کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔"

★ "اتنی ٹف ڈیوٹی کی وجہ سے آپ تو کبھی بھی نہیں چاہیں گی کہ بچے اس فیلڈ میں آئیں؟"

✻ "نہیں' ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ اگر بچے اس فیلڈ میں آنا چاہیں گے تو میں کبھی بھی نہیں روکوں گی۔ اچھا ہے' ملک و قوم کی خدمت کریں گے۔ میرے لیے تو خوشی کی بات ہو گی۔"

★ "اور امور خانہ داری سے کتنی دلچسپی ہے؟"



✻ "امور خانہ داری سے بہت دلچسپی ہے۔ کوکنگ میں ماہر ہوں' ہر طرح کا کھانا پکا لیتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ خود ہی پکاؤں اور اپنے بچوں کی اسی طرح پرورش کروں' جس طرح ہماری ماں نے کی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے پکا پکا کر کھلایا تو میں بھی چاہتی ہوں کہ انہیں اپنے ہاتھوں کا پکا ہوا کھلاؤں تاکہ وہ ایک اچھے انسان ثابت ہوں۔"

★ "اس فیلڈ نے آپ کی شخصیت پہ کیا اثرات چھوڑے؟"

✻ "اچھے ہی چھوڑے ہیں۔ سنجیدگی بھی آ گئی ہے۔ سوبر بھی ہو گئی ہوں اور پہلے سے زیادہ سادگی پسند بھی ہو گئی ہوں۔ خدمت کا جذبہ بھی پہلے سے زیادہ زور پکڑ گیا ہے۔"

جی۔۔۔ یہ تھا سید غزالہ کا انٹرویو۔۔۔ امید ہے آپ کو پسند آیا ہو گا۔

✡



باتیں محمد بلال قریشی سے

شاہین رشید

1 "اصلی اور پورا نام؟"
"محمد بلال شہزاد قریشی۔"
2 "مختصر نام؟"
"بلال قریشی۔"
3 "پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"
"پیار سے تو جی کچھ بھی بلا لیں۔ ویسے جب اسکول میں تھا تو سب بلو کہتے تھے۔ گھر میں اب بھی سب مُنی کہتے ہیں۔"
4 "جنم دن/ سال/ شہر؟"
"9 فروری جدہ سعودی عرب۔ جبکہ بنیادی طور پر لاہوری ہوں۔"
5 "قد/ ستارہ؟"
"5 فٹ 7 انچ/ دلو۔"
6 "فیملی ممبرز؟ آپ کا نمبر؟"
"امی ابو۔ ایک بڑا بھائی' ایک بڑی بہن' تین چھوٹی بہنیں۔ میرا نمبر تیسرا ہے۔"
7 "تعلیمی قابلیت؟"
"کچھ ادھورے ادھورے سپنوں جیسی ہے۔"
8 "شادی؟"
"بس دعا کریں کہ ہو جائے۔"
9 "شوبز میں آمد؟"
"بہت جدوجہد کے بعد ہوئی۔"
10 "پہلا پروگرام/ وجہ شہرت؟"
"ٹیلی فلم "ننھا سا دل" ایک طالب علم کا رول کیا اور کچھ اندازہ نہیں کہ شہرت کس نے دی۔"
11 "پہلی کمائی/ کہاں خرچ کی؟"
"100 ڈالر اور آئی لو یو مام والا مگ خرید کر امی کو 100 ڈالر کے ساتھ بھیج دیا۔"
12 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"میں تو سوتا ہی صبح ہوں جی' مجھے شاید کسی کی بددعا ہے کہ مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔"
13 "سو کر اٹھتے ہیں تو کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ بس جلدی سے شادی ہو جائے (قہقہہ) ایسا کچھ نہیں۔ پانی پینے کو دل چاہتا ہے۔"
14 "کیا بات بُری لگتی ہے؟"
"ویسے تو زندگی میں سب کچھ اچھا ہے مگر گھر والوں سے دوری بُری لگتی ہے۔"
15 "ملکی قوانین میں کیا بُرا لگتا ہے؟"
"قوانین بُرے نہیں لگتے' ان پر عمل نہ کرنا بُرا لگتا ہے۔"
16 "قومی تہوار کس طرح مناتے ہیں؟"
"بڑے جوش و خروش کے ساتھ' مگر گھر بیٹھ کر کیونکہ شہر کے حالات تو عموماً خراب ہی رہتے ہیں۔"
17 "کیا برداشت نہیں ہوتا؟"
"مجھ سے نیند برداشت نہیں ہوتی۔ ہاں بھوک برداشت ہو جاتی ہے۔"
18 "کس دن کا انتظار کرتے ہیں؟"
"کہ بس کوئی دو چار دن کی چھٹی ملے اور میں لاہور اپنے والدین کے پاس جاؤں۔"
19 "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟"
"سینما ہاؤس میں موووی دیکھنے کے لیے۔"
20 "خوش ہوتے ہیں تو اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"
"سب سے پہلے الحمد وللہ پھر اس وقت جو بھی طریقہ سمجھ میں آئے۔"
21 "دوسرے ملکوں کی کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"ہر بات اچھی ہے۔ قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ جھوٹ نہیں بولتے۔ لوگ ایمان داری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ چیزیں خالص ملتی ہیں۔"
22 "دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟"
"اوئے ہوئے..... پہلے تو بہت زیادہ گھومتا تھا۔ اب بڑا ہو گیا ہوں تو کنٹرول میں رہتا ہوں۔"
23 "غصے کا ردعمل؟"
"پہلے تو جنونی ہو جاتا تھا۔ اپنے آپ کو زخمی کر لیتا تھا۔ مگر اب خاموش ہو جاتا ہوں۔"
24 "خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"مجھے خواتین ویسے ہی بہت اچھی لگتی ہیں۔ آئی لوو ومن' آئی ریسپکٹ وومن اور مجھے لگتا ہے کہ اللہ نے دنیا میں سب سے پیاری چیز ہی خواتین بنائی ہیں۔ میں اپنی امی سے بہت پیار کرتا ہوں' اپنی بہنوں سے' اپنی بہنوں اور بھائی کی بیٹیوں سے بہت پیار کرتا ہوں اور یہ بات اچھی لگتی ہے کہ سب کا بہت خیال رکھتی ہیں۔
25 "کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟"
"گھورتی رہے۔ کوئی مسئلہ نہیں۔"
26 "پرائز بانڈ سے شغف ہے؟"
"کبھی ٹرائی نہیں کیا۔ شغف بھی کوئی خاص نہیں۔"
27 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"اوئے..... امی کے غصے سے۔"
28 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"
"نہیں' کچھ نہیں' مجھے ہر چیز تھوڑی دیر سے ملتی ہے۔"
29 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے؟"
"شادی کے بعد ہونا چاہیے۔"
30 "محبت کا اظہار کھل کر کرتے ہیں؟"
"بہت زیادہ کھل کر کرتا ہوں۔"
31 "شاپنگ کے وقت سب سے پہلے کیا خریدتے ہیں؟"
"کچھ نہیں' پہلے کھانے پینے پر توجہ دیتا ہوں۔"
32 "آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟"
"پتا نہیں جی۔ لیکن کوشش کرتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی کو فائدہ ہو' نقصان نہ ہو۔"
33 "پیسہ خرچ کرتے وقت کنجوسی آڑے آتی ہے؟"
"اپنے اوپر خرچ کرتے وقت کنجوسی آڑے آتی ہے۔ مگر فیملی اور دوستوں کے لیے نہیں۔"
34 "تحفہ کیا دیتے ہیں؟"
"عموماً" پرفیوم۔"
35 "کوئی بُرا وقت جو آپ نے گزارا؟"
"بالکل گزارا ہے' کیونکہ بُرا وقت ہر کسی کی زندگی میں ضرور آتا ہے۔"
36 "کب موڈ بہت اچھا ہو جاتا ہے؟"

"جب کوئی میری اور میری پرفارمنس کی تعریف کرتا ہے۔"

37 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"مجھے تو اپنے پروفیشن سے بہت پیار ہے۔"

38 "مخلص کون ہوتے ہیں؟"

"کوئی مخصوص نہیں ہے۔ اپنے اور پرائے دونوں ہو سکتے ہیں اور کبھی دونوں ہی نہیں ہوتے۔"

39 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"

"صرف اور صرف اپنے بیڈ پر۔"

40 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"لباس ہوتے ہی کتنے ہیں۔ (قہقہہ) ویسے شلوار قمیص زیادہ پسند ہے۔"

41 "اپنی شخصیت کے لیے ایک جملہ؟"

"میں ایک دوست انسان ہوں۔"

42 "سکون کہاں ملتا ہے گھر میں یا دوستوں کی محفل میں؟"

"گھر میں۔۔۔ گھر کا ہر کونا سکون دیتا ہے۔"

43 "کس آرٹسٹ کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"شاہ رخ خان کے ساتھ۔"

44 "کس کے ایس ایم ایس کا جواب فوراً" دیتے ہیں؟"

"ہونے والی بیگم کے یعنی مسز قریشی کے۔"

45 "فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"انٹرنیٹ، فیس بک اور مطالعہ۔۔۔ میری تنہائی کے ساتھی ہیں۔"

46 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"بہت بار، لڑکیاں نمبر لے کر کہتی ہیں کہ ہم آپ کو پریشان نہیں کریں گے لیکن پھر۔۔۔ توبہ!"

47 "مہمانوں کی اچانک آمد؟"

"بہت اچھی لگتی ہے کیونکہ میں مہمان نواز ہوں۔"

48 "اگر آپ برسرِاقتدار آجائیں تو؟"

"کوشش کروں گا کہ ملک کے حالات بہتر کردوں۔"

49 "کیا جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"محبتیں جمع کرنے کا شوق ہے۔"

50 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"کوئی ایک نصیحت نہیں، کافی نصیحتیں بُری لگتی ہیں۔"

51 "وقت کی پابندی۔۔۔؟"

"کوشش کرتا ہوں، مگر ہمیشہ دیر کردیتا ہوں۔" یہ خوب صورت نظم بھی ہے جو میں نے ایک ڈرامہ سیریل میں پڑھی بھی تھی۔

52 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتا ہوں؟"

"سوائے اپنے، سب پر بہت دل کھول کر خرچ کرتا ہوں۔"

53 "کھانا کھانا کہاں اچھا لگتا ہے؟"

"جہاں مینرز کا سوال ہو یا کوئی تقریب تو پھر ڈائننگ ٹیبل پہ اور گھر میں تو ہم کھانا کھاتے ہی چٹائی پہ بیٹھ کر ہیں۔"

54 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گے؟"

"جدوں ساری دنیا سو جائے گی تے فر میں کی کرنا اے جاگ کے۔"

55 "انسان محنت کس کے لیے کرتا ہے؟"

"صاف بات ہے دوسروں کے لیے۔۔۔ انسان اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ اپنے لیے تو انسان صرف سوتا، جاگتا اور کھاتا ہے۔۔۔ سارا دکھاوا، ساری محنت دوسروں کے لیے ہوتی ہے۔"

56 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"بہت زیادہ ہے۔"

57 "فیوچر پلاننگ؟"

"شادی، فیملی اور ہیپی لائف، کمانے کا عمل تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

58 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"

"مرد جی مرد (قہقہہ) مرد کے اندر معاف کرنے کی



صلاحیت ہے لیکن اگر عورت کے دل میں کچھ آجائے تو پھر اللہ اللہ تے خیر صلا ہی ہو گا۔"

59 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"

"بھئی' یہ غلط سوال ہے..... میں اس قسم کا بندہ ہی نہیں ہوں۔"

60 "کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"اپنے غصے سے ڈر لگتا ہے۔"

61 "خود کشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"

"میرے نزدیک بزدل ترین ہوتا ہے۔"

62 "بہت دکھ ہوتا ہے؟"

"جب کوئی جھوٹ بولے' جب کوئی اگنور کرے اگنورس تو برداشت ہی نہیں ہوتی۔"

63 "شادی دھوم دھام سے ہونی چاہیے یا.....؟"

"میرے خیال میں تو شادی سادگی سے ہونی چاہیے فیملی کے درمیان تھوڑا ہلا گلا ہو' باقی کچھ نہ ہو۔"

64 "شادی میں تحفہ بہتر رہتا ہے یا کیش؟"

"تحفہ جی تحفہ..... تحفے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

65 "ناشتا اور کھانا کس سے بنواتے ہیں؟"

"امی سے۔ کیا بات ہے جی امی کے ہاتھ کی' مزا آجاتا ہے۔"

66 "خود کھانا پکانا کیسا لگتا ہے؟"

"میں کراچی میں رہتا ہوں فیملی سے دور تو خود ہی پکاتا ہوں۔"

67 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"آپ سے..... (قہقہہ)۔"

68 "اپنا نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"

"نہیں کیا۔ گزشتہ دس سال سے ایک ہی نمبر ہے۔"

69 "گھر سے نکلتے وقت کیا لینا نہیں بھولتے؟"

"موبائل' موبائل اور موبائل۔"

70 "اپنے آپ کو کس میں شمار کرتے ہیں۔ خاص یا عام؟"

"عام لوگوں میں' کیونکہ میں بھی عام لوگوں کی طرح ہنستا بھی ہوں' روتا بھی ہوں' عام لوگوں کی طرح بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی۔ کوئی فرق نہیں ہے مجھ میں۔"

71 "غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"

"بالکل کر لیتا ہوں اور کرنا بھی چاہیے۔"

72 "آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟"

"بری عادتیں تو بہت زیادہ ہیں اور میری ہونے والی بیگم کو میری بری عادت یہ لگتی ہے کہ جب مجھے غصہ آتا ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں اور یہی اچھی عادت ہے۔"

73 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"

"کبھی حد کراس ہو جائے تو..... ورنہ گالیاں نہیں دیتا۔"

74 "غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟"

"تیری..... (قہقہہ) سمجھ تو گئے ہوں گے سب۔"

75 "کب کھانے پینے کا بائیکاٹ کیا؟"

"غصے میں..... غصے میں میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچایا ہے۔"

76 "مارننگ شو کے لیے تاثرات؟"

"نو کمنٹس۔"

77 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب لوگ خوامخواہ آپ کے بارے میں کوئی غلط رائے رکھیں یا کوئی غلط جملہ بول دیں تو پھر لگتا ہے کہ مشہور ہونا بُرا ہے۔"

78 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے کیا؟"
"بستر پر لیٹتے ہی مجھے "وہ" یاد آجاتی ہے۔"

79 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟"
"لیپ ٹاپ، اسکرپٹ، پانی کی بوتل، موبائل فون۔"

80 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"ہائے۔۔۔ ابھی تو اچھی ہی لگ رہی ہے۔"

81 "ویلنٹائن ڈے شوق سے مناتے ہیں؟"
"اف۔۔۔ آپ کو نہیں پتا، ویلنٹائن ڈے کے دن ہی میں نے شادی کرنی ہے۔"

82 "زندگی بدلی؟"
"جی بالکل بدلی، جب امریکا گیا تھا اس وقت طالب علم تھا۔ اب میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہوں تو زندگی بدلی نا۔"

83 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"بس جی۔ فرا دوں خیر نہیں۔"

84 "جھوٹ بولتے ہیں؟"
"(گلا صاف کرتے ہوئے) کبھی کبھی بولنا پڑ جاتا ہے، دوسروں کو بچانے کے لیے۔"

85 "اپنے آپ میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟"
"میں تھوڑا نیک انسان بننا چاہتا ہوں۔ مذہب کے قریب ہونا چاہتا ہوں۔"

86 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتے ہیں؟"
"شام کو اور رات کو۔"

87 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"جلدی سے میری شادی ہو جائے اور میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہو۔"

88 "کون سے چینلز شوق سے دیکھتے ہیں؟"
"میوزک چینلز۔"

89 "موبائل سروس آف ہو تو؟"
"اف نہ پوچھیں۔ نہ پوچھیں۔ جب اُن سے بات نہیں ہوتی تو بس۔۔۔ کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔"

90 "سی این جی کی لائن میں لگے؟"
"بالکل لگا۔ مگر اب میں فجر کے ٹائم جاتا ہوں۔ اس وقت کوئی لائن نہیں ہوتی۔"

91 "فقیر کو کچھ دیتے ہیں؟"
"میں خود فقیر آدمی ہوں۔ ویسے حسب توفیق کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہوں۔"

92 "لائیٹ چلی جائے تو؟"
"یار!"

93 "اچانک چوٹ لگ جائے تو؟"
"امی کو پکارتا ہوں۔۔۔ کہیں بھی ہوں۔"

94 "لوگ کن باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں؟"
"میں تو فیس بک اور انٹرنیٹ پہ اپنا وقت ضائع کرتا ہوں۔"

95 "حجاب لینا چاہیے یا نہیں؟"
"خواتین میں شرم و حیا ان کی سوچ اور نظر میں ہونا چاہیے۔"

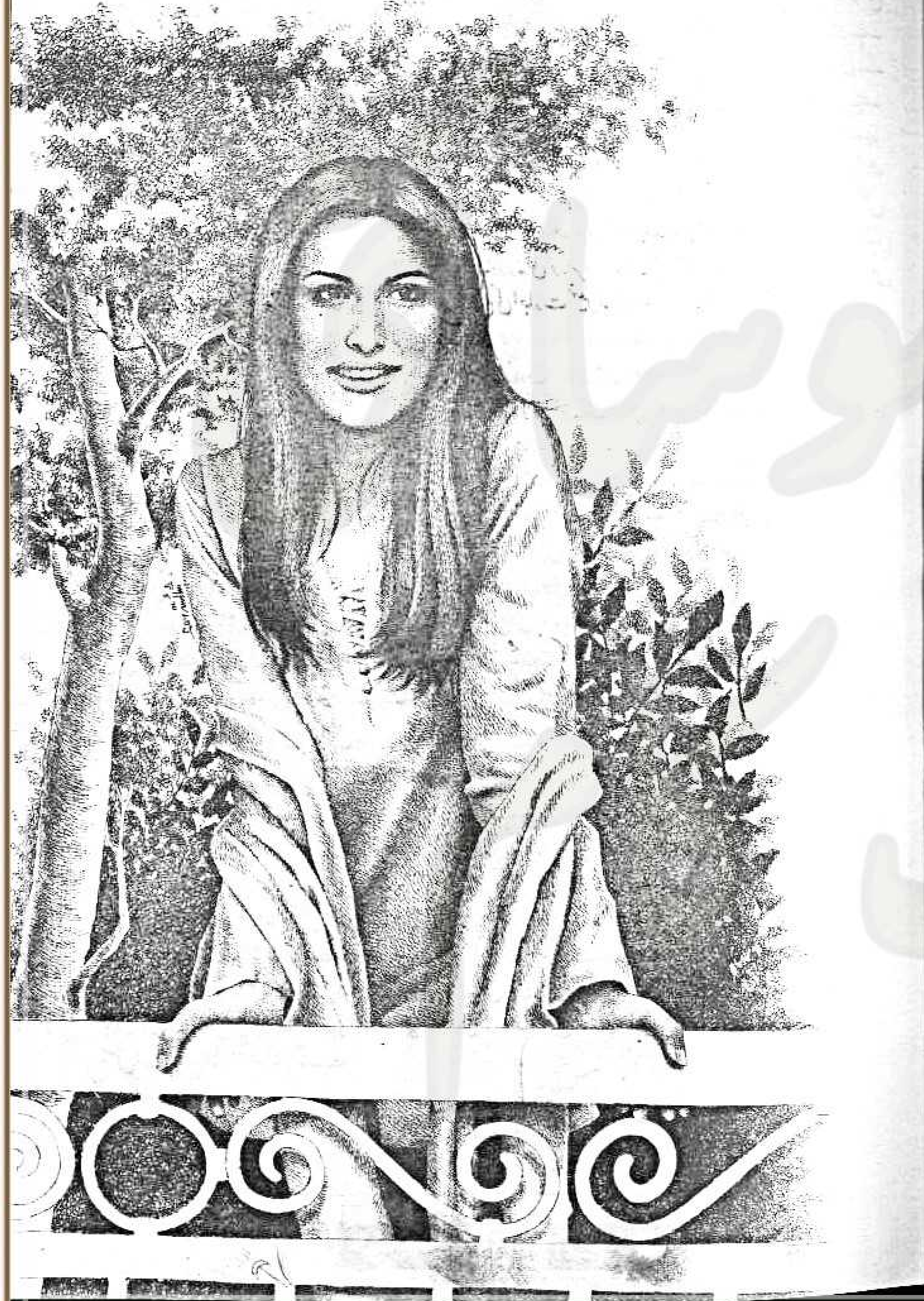
96 "شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟"
"میں شاپنگ پرسن نہیں ہوں، سنڈے بازار سے بھی کوئی چیز پسند آگئی تو خرید لوں گا۔"

97 "شاپنگ کے لیے کسی وقت بھی جاسکتے ہیں؟"
"نہیں۔ موڈ بنا کر جاتا ہوں۔"

98 "فلم کے لیے آپ کی سوچ؟"
"مجھے جنون ہے فلم میں کام کرنے کا۔"

99 "ماڈلنگ؟"
"جلدی دیکھیں گے سب مجھے ماڈلنگ میں۔"

100 "آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"تو کوئی بات نہیں، پھر عروج کے لیے کوشش کریں گے۔"



عفت سحر طاہر

بِن مانگی دُعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہوسکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الہڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کردیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کرکے صالحہ کا راستہ صاف کردیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہوجاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کرلیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کردیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کرلیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کردیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کرکے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کردیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی



دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر نا خوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے ان سے پیسے بٹور کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔

ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کر پاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سرپٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار مقرر کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

11
گیارہویں قسط

ابیہا کے حواس ٹھٹھر گئے۔

اس نے سفینہ بیگم کے ردعمل کے بارے میں انتہا تک سوچ ڈالا تھا مگر آتے ہی وہ اس پر یوں بھوکی شیرنی کی طرح حملہ آور ہوں گی یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

لمحہ بھر کو تو خود معیز بھی ششدر رہ گیا مگر پھر فوراً" ہی اس نے آگے بڑھ کر غصے میں کف اڑاتی ماں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔

"پلیز ماما! کیا کر رہی ہیں آپ۔"

"ہٹو تم بھی یہاں سے۔ باپ سے کم نہیں کیا تم نے میرے ساتھ۔" وہ معیز پر الٹ پڑیں۔

اسی اثنا میں اندر سے زارا اور ایزد بھی نکل آئے اور ماں کو سنبھالنے لگے۔ ابیہا پر نظر پڑتے ہی انہیں معاملہ سمجھ میں آگیا تھا۔

وہ دونوں جلد ہی سفینہ کو اندر لے گئے۔

معیز نے بے اختیار گہری سانس لی۔ اسے ماما کے غصے کا اندازہ تو تھا مگر وہ اس طرح پھٹیں گی یہ پتا نہیں تھا۔

وہ ابیہا کی طرف پلٹا تو ماتھے پہ تیوریاں تھیں۔ جا کے اس کا بیگ اٹھا کے لایا۔

"چلو۔" بس ایک لفظ۔ وہ شاید انیکسی کی طرف بڑھا تھا۔ سفید پڑتی ابیہا لرزتے قدموں کے ساتھ اس کی تقلید میں بڑھی تو دل مستقبل کے خدشات سے بوجھل اور بے حد مایوس تھا۔

☼ ☼ ☼

ایزد اور زارا مسلسل ماں کی دل جوئی کر رہے تھے مگر سفینہ کو کسی پل چین نہ تھا۔

"دیکھا تم نے۔ کتنے دعوے سے آگئی ہے وہ اس گھر میں۔ اپنی ملکیت جتانے۔"

"کام ڈاؤن ماما۔ وہ انیکسی میں رہے گی۔ اس کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" ایزد نے انہیں تسلی دی۔

"کوئی تعلق نہ ہوتا تو وہ یہاں نہ ہوتی۔ وہ ایک تلخ حقیقت ہے ایزد۔" وہ مچلیں۔

"اتنی کم عمر اور حسین بیوی۔ امتیاز احمد نے کہاں تک صرف نظر کیا ہوگا؟"

اس سوچ سے وہ پچھلے کئی ماہ سے تڑپ رہی تھیں مگر آج ابیہا کے کم عمر حسن کو دیکھ کر تو گویا ان کا دل ہی شکنجے میں آگیا تھا۔

"آپ بے فکر رہیں ماما! اس کے حصے کی رقم اس کے حوالے کر کے ہم اس سے پیچھا چھڑوا لیں گے۔ یہ کارروائی بھی بہرحال ضروری تھی۔"

زارا نے بھی ماں کا حوصلہ بڑھایا تو وہ جو قدرے بہل کر دوپٹے سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ اندر آتے معیز کو دیکھ کر پھر سے آگ بگولہ ہونے لگیں۔

"لے آئے ہو اپنی سگی کو یہاں۔ اپنی ماں کے سینے پر مونگ دلنے کو۔" معیز سے بات کرنا مشکل ہونے لگا۔

"بس کچھ دنوں کی بات ہے ماما!"

"اسے باہر ہی سے فارغ کر کے دفع نہیں کر سکتے تھے تم۔ میرے گھر میں یہ ناپاکی لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ابو کی وصیت ہے ماما۔ اگر وہ خود یہاں سے جانا چاہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں اسے اپنی مرضی سے نہیں نکال سکتا۔" وہ بہ دقت تمام بولا۔ ماں سے تو نظر نہ ملائی جاتی تھی۔

"ہنہ۔ وصیت۔ زندہ ہوتا امتیاز احمد تو پھر اسے بتاتی میں۔" وہ غرائیں۔

"ماما پلیز۔" ان تینوں کے دل کو کچھ ہوا۔ باپ کے متعلق ماں کا یہ انداز گفتگو در حقیقت ان کا دل دکھا گیا تھا۔

"ہاں تو کیا غلط کہہ رہی ہوں میں۔ جیتے جی زندگی جہنم بنا گیا میری اور یہ چار دن کی لڑکی۔ دیکھنا کیسے اس کی زندگی بھی عذاب بناتی ہوں میں۔ خود ہی بھاگے گی یہاں سے۔" وہ چلا رہی تھیں۔ اور کمرے کی طرف تھکے قدموں سے بڑھتا معیز سوچ رہا تھا۔۔۔ کاش۔۔۔

☼ ☼ ☼

گھر کی عمارت کے پچھلے حصے میں الگ سے انیکسی کے دو کمرے اٹیچ باتھ اور کچن تھا۔
اس کا کپڑوں والا بیگ یونہی دروازے کے پاس پڑا تھا جیسے معیز چھوڑ کے گیا تھا اور وہ کسی بت کی طرح ساکت و جامد صوفے کے کونے پر ٹکی ہوئی تھی۔ مانو ہاتھ بھی لگاؤ تو توازن کھو کے نیچے جا گرے اور چکنا چور ہو جائے اور پھر اس مجسمے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جو اس یک لخت ہی پگھلے۔ چکنا چور ہی تو ہو گئی تھی وہ۔
کیا خرابی تھی اس میں۔۔۔؟ اس کی ذہنی رو بھٹکی۔ وہ ایک بیٹی تھی؟ یا وہ صالحہ کی بیٹی تھی؟
تو کیا بیٹیاں خوب صورت ہوں تو باپ انہیں بیچ دیا کرتے ہیں؟
اس کا دل ایک ایک سوال پہ تھوڑا تھوڑا کٹنے لگا اور ایک ہی بار کٹنے کی تکلیف سے تھوڑا تھوڑا کٹنے کی تکلیف یقیناً" کئی گنا زیادہ تھی۔ وہ ماضی کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا ماضی ذلت کے نشان کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔
وہ اٹھی اور اپنے بیگ کی طرف بڑھی اور بیڈ روم میں آ گئی مگر ہاں۔۔۔ کچھ تھا جو اس کے ماضی میں چمکتا تھا۔
ایبہا نے اپنے کپڑے بیگ میں سے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کیے۔ سب سے نچلی تہہ میں ایک کاغذ بہت سلیقے سے تہہ کیا رکھا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے ایبہا نے وہ کاغذ اٹھایا اور اس کا متن پڑھنے لگی۔
یہ اس کا اور معیز احمد کا نکاح نامہ تھا۔ وہی فوٹو کاپی جو معیز نے عون کو دی تھی اور بعد میں ثانیہ نے احتیاط کے ساتھ رکھنے کی نصیحت کرتے ہوئے ایبہا کے بیگ میں ڈال دی۔ یہی ایک چمکتا روشن ستارہ تھا جس کے سہارے وہ یہاں تک آن پہنچی تھی۔ اس نے اس کاغذ کو ویسے ہی تہہ لگا کر بیگ کے اندرونی زپ والے خانے میں رکھ دیا۔
مگر آزمائشیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ سفینہ کا رویہ بہت حوصلہ شکن تھا اور معیز احمد! ایبہا کا دل سوچ کر لرزا۔ وہ تو امتیاز احمد کی زندگی میں ہی اس پر طلاق کا مطالبہ کرنے کے لیے دباؤ ڈالتا رہتا تھا۔ اب تو کوئی رکاوٹ ہی نہ تھی۔
"اور اگر میرے بس میں ہو معیز احمد! تو میں آپ کے پاؤں پکڑ لوں اور کہوں کہ مجھے خود سے الگ مت کرنا باہر دنیا بہت گندی ہے۔"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
انیکسی کے خوب صورت در و دیوار بھی اداس نظر آنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میرے ساتھ چائے پی سکتی ہو؟" عون کا مسیج آیا تھا۔
جواباً" عون کو مسیج ملا۔
"میں بس پینے ہی والی تھی۔ تم بھی کپ پکڑ لو اور میرے ساتھ ساتھ پیو۔"
"تمہاری تو ایسی کی تیسی۔" عون نے دانت پیسے "ایک منٹ میں یہ لڑکی رومانٹک موڈ کا کباڑا کرتی تھی، جھنجلا کر اس نے کال ملائی۔

"کیا ہوا۔ تم نے اتنی جلدی پی لی؟" ثانیہ نے معصومیت سے پوچھا۔
"دوستی کا پہلا اصول مروت ہوتا ہے بائی داوے۔" عون کڑھا۔
"یعنی منافقت۔" وہ چوکی نہیں تھی۔
"مروت' منافقت نہیں ہوتی۔ نا چاہتے ہوئے بھی کسی کی خاطر کوئی کام کر دینا مروت ہے اور یہ محبت کی ہی ایک قسم ہے۔" عون کا اپنا ہی فلسفہ تھا۔
"جبکہ میرے نزدیک وہ منافقت ہے۔ کسی کام کا نہیں دل کر رہا تو اسے نہ کریں۔ یہ کھرا پن ہے اور سچائی۔" ثانیہ نے اطمینان سے کہا۔
"اچھا بی بی فلاسفر۔ ایک کپ چائے ساتھ پینے کو کہا تھا' لے کے اتنا لمبا لیکچر دے دیا۔" وہ تنک کر بولا۔
"سوری بھئی۔ فی الحال تو میں۔۔۔" وہ صفاچٹ انکار کرنے والی تھی، مگر عون نے اس کی بات کاٹ دی۔
"دو منٹ میں ریڈی ہو جاؤ ورنہ جیسے بھی حلیے میں ہو گی گاڑی میں لاد کے لے جاؤں گا۔" اور فون بند۔
ثانیہ کو غصہ آیا، مگر دو دفعہ نمبر ملانے پر بھی فون سوئچ آف ملا۔ تو اسے اپنے ملگجے حلیے کا خیال آیا۔ خالہ جان سے تیل کی چمپی کروا کے ابھی وہ نہانے کے ارادے سے بیٹھی تھی۔ وہ بے اختیار کپڑے بدلنے کے خیال سے اٹھی، مگر پھر ٹھٹک کر رک گئی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ہم تو ایسے ہی ہیں۔ لے جاؤ اگر دل چاہتا ہے تو۔" عون کی گاڑی کے ہارن پر وہ اندر سے یوں نکلی جیسے تیار ہی تھی۔
"تھینک گاڈ! میں تو سوچ رہا تھا" آدھا گھنٹہ ضائع کراؤ گی۔"
وہ جو جان بوجھ کر مصروفیت ظاہر کرنے کی خاطر بیگ کی زپ کھول بند کر رہی تھی۔ اس کی طرف متوجہ ہو گئی بلیک پینٹ گرے لائننگ کی سفید شرٹ۔۔۔ وہ بے حد فریش لگ رہا تھا۔ اس کے حلیے پر ایک بھی کمنٹ پاس کیے بغیر وہ اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولے منتظر کھڑا تھا۔
"تم نے ٹائم ہی نہیں دیا تیار ہونے کا۔" ثانیہ نے اس کا دھیان دلانے کی پوری کوشش کی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا۔
"ہم کون سا ولیمہ پہ جا رہے ہیں۔ چائے ہی تو پینی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ تو ثانیہ کو افسوس ہونے لگا۔ جسے چڑانے کی خاطر اس برے حلیے میں باہر نکلی تھی اس کو کوئی فرق بھی نہ پڑا تھا۔
مگر ایک اچھے سے ریسٹورنٹ کی اوپن ایر چھت کی سیڑھیاں چڑھتے وہ خفت کا شکار ہونے لگی۔
"تم تھوڑی دیر پہلے مجھے اپنا پروگرام نہیں بتا سکتے تھے۔" سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ اس پر الٹ پڑی۔ عون نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"تھوڑی دیر پہلے ہی تو بتایا تھا۔ تم نے سیریس ہی نہیں لیا۔"
وہ خفگی سے منہ پھیر کر جنگلے سے باہر نیچے کا منظر دیکھنے لگی۔ عون نے مسکراہٹ دبائی۔ وہ اس کی جھنجلاہٹ کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور اپنی اداکاری پر خود کو داد بھی دے رہا تھا۔ ورنہ ثانیہ کو اس حلیے میں دیکھ کر خود عون کو بھی غصہ آیا تھا، مگر پھر فوراً" ہی کچھ سوچ کر اس نے خود کو بالکل متوازن کر لیا۔ اور اب رزلٹ اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔
"کیا ہوا یار۔ اب چائے بھی اسی موڈ کے ساتھ پیو گی؟"
وہ یوں بن کے کہہ رہا تھا جیسے کچھ پتا ہی نہ ہو۔
"تم مجھے بتاتے تو کہ اتنی اچھی جگہ لے کے جا رہے ہو کم از کم بال دھو کے چینج ہی کر لیتی میں۔"

وہ ناراضی سے بولی تو اب کی بار عون اپنی ہنسی روک نہیں پایا۔

”مجھ سے اچھی توقعات وابستہ کرتیں تو ایسی ناگہانی صورت حال نہ پیش آتی۔“

وہ یونہی خفا نظروں سے دیکھتی رہی۔ عون کو مزہ آنے لگا۔

”میں نے تو اس لیے نہیں ٹوکا کہ تمہیں بناوٹ پسند نہیں' سوچا' شاید تم اپنے اصلی حلیے میں ہی آنا چاہتی ہو۔“ وہ بڑی فرصت سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ثانیہ جز بز ہوئی۔

”یہ میرا اصل حلیہ نہیں ہے۔ وہ تو میں خالہ جان سے تیل لگوا کے۔ اور تمہیں کیا ضرورت تھی بیچ میں چائے لے کے آنے کی؟“ وہ بات کرتے کرتے اسی پر الٹ پڑی۔

عون ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ ثانیہ نے دیکھا ان کے داہنی سائیڈ کی ٹیبل پر بیٹھا تین لڑکیوں کا گروپ پوری طرح ان ہی کی طرف متوجہ تھا بلکہ اسے فوراً" ہی احساس ہو گیا کہ عون کی طرف۔

”اچھا بس۔ اب چائے منگواؤ۔ میں زیادہ دیر کے لیے نہیں آئی ہوں۔“ ثانیہ کو اپنا دھیان ہٹانے میں دقت محسوس ہوئی۔

”ہاں۔ جا کے نہانا بھی ہو گا۔“ عون نے لطیف سا طنز کیا۔ پھر اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی مزید لقمہ دیا۔

”حالانکہ اگر نہا کے آجاتیں تو بھی میں ساتھ لانے سے انکار نہ کرتا۔“

”اگر اب تم ایک لفظ بھی مزید بولے تو میں اس جنگلے سے کود جاؤں گی عون۔“

ثانیہ نے دانت پیس کر کہتے ہوئے اسے دھمکایا تو وہ ہنس دیا۔

تین گردنیں پھر سے ان کی طرف مڑیں۔ اب کی بار ثانیہ نے باقاعدہ گھور کر ان لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

”فرینڈز ہیں؟“ عون نے ایک نظر ان ہنستی کھلکھلاتی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتی لڑکیوں پر ڈالی۔

”تمہاری لگ رہی ہیں۔“ ثانیہ نے طنز کیا۔

”اوہو۔“ عون نے جگمگاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

(اندر سے وہی خالص لڑکی تھی۔ جیلس)

”تمہیں میرے ساتھ دیکھ کے انہیں رشک آرہا ہو گا۔“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔ نظروں کی گرفت میں اس کا چہرہ تھا۔ جھنجلایا ہوا۔ گویا اپنی کسی حرکت پر پچھتا رہی ہو۔

”ہنہ!“ ثانیہ نے سر جھٹکا۔ ”کہہ رہی ہوں گی ماسی کے ساتھ ڈیٹ پہ آیا ہے۔“ وہ پھر ہنسا۔

”تو اتنا رئیل بننے کو کس نے کہا تھا۔ تھوڑی سی بناوٹ کے بعد تم خاصی خوب صورت لگ سکتی تھیں۔ یعنی ماسی کے بجائے ملکہ لگتیں۔ پھر یہ لڑکیاں رشک سے نہیں حسد سے ہمیں دیکھتیں۔“

وہ بہت فرصت میں تھا۔ چہرے پہ ٹھہری مسکراہٹ اسے بہت خاص بنا رہی تھی۔ ثانیہ نے عجیب سے احساس میں گھرتے ہوئے خوامخواہ ہی مینیو کارڈ اٹھا لیا۔

”سنڈے کو میرا تمہیں ڈنر پہ لے جانے کا پروگرام ہے تب تک پلیز نہا لینا۔“

عون کی غیر متوقع بات پر ثانیہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس کا ہنستا چہرہ مینیو کارڈ کے پیچھے سے برآمد ہوا تو وہ شرارت سے بولا۔

”اب تو نہیں کہو گی کہ پہلے بتانا چاہیے تھا؟“ ثانیہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ عون کا مستقل ہلکا پھلکا انداز بہرحال اس کا موڈ بھی بہتر بنا ہی گیا تھا چائے آنے تک وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہے۔

”معیز بھائی سے رابطہ نہیں ہوا؟“ ثانیہ کو دھیان آیا۔

”اس روز کے بعد تو نہیں۔“

”میں سوچ رہی تھی ان کے گھر جاؤں۔ ایبہا سے ملنے۔“ ثانیہ نے سوچ ظاہر کی۔

”ہاں۔ تو میں لے چلوں گا۔ تم اپنا پروگرام بتا دینا۔“ عون نے رضامندی ظاہر کی۔ تو ثانیہ نے اسے ہلکا سا گھور کے دیکھا۔

”اب کیا میں ہر جگہ تمہارے ساتھ جانے کی پابند ہو گئی ہوں؟“

”دوست ہر پروگرام مل کے بناتے ہیں بے وقوف لڑکی! مگر تم جیسی آدم بے زار کو کیا معلوم۔ کبھی مجھ جیسا دوست ملا ہو زندگی میں تو نا۔“ عون نے ملامتی انداز اپنایا۔ تو وہ گہری سانس لے کر بولی۔

”اللہ شکر۔“

”بس جی۔ اللہ نے شکر خورے کو شکر دے دی ہے اور کیا۔“ عون نے اس پہ طنز کیا تھا جسے وہ صفائی سے نظر انداز کر گئی۔

”میرے خیال میں ہمیں ایبہا کا وکیل بننا پڑے گا اور اسے معیز بھائی کی زندگی اور ان کے گھر میں حق دلانا پڑے گا۔“

”میرے خیال میں تو یہ کوشش اسے خود کرنی چاہیے میری طرح۔“ عون نے آخری دو الفاظ آہستگی سے کہے کہ ثانیہ سن نہ سکے۔

”وہ اس قابل ہوتی تو معیز بھائی یوں دندناتے نہ پھرتے اور نہ یوں اس کی زندگی کو ایک کھیل بناتے۔“ ثانیہ کو غصہ آیا۔

”ٹھنڈے دماغ سے سوچو ثانی۔ وہ اس نکاح پر مجبور ہوا تھا۔“

”جو بھی ہو' مگر ہر مرد کے لیے نکاح کا ایک ہی مطلب ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے تمام حقوق و فرائض ادا کرے گا۔ اگر یہ سب کرنا تھا تو طلاق دے دیتے۔“ وہ اپنی رائے میں اٹل تھی۔

”طلاق ہی تو نہیں دے سکتا غریب۔“ عون بے ساختہ بولا۔ پھر زبان دانتوں تلے دبالی' مگر سننے والی مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور اب جانے بغیر چھوڑنے والی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چار دنوں سے فریج میں رکھے انڈے ڈبل روٹی اور دودھ پہ گزارہ کر رہی تھی اور یہ سب بھی یقیناً" معیز ہی کی مہربانی کی وجہ سے یہاں رکھا تھا' مگر اس کے بعد معیز نے ادھر جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا۔

ابھی ابھی وہ ڈبل روٹی کے آخری دو توس اور چائے پی کے فارغ ہوئی تھی۔ صبح' دوپہر' رات۔ ڈبل روٹی اور انڈے کھا کھا کر اس کا دل اوب گیا تھا۔ چھوٹے سے نفیس کچن میں برتن تو تھے مگر کھانا پکانے کو نہ دال تھی نہ سبزی اور نہ ہی آٹا چاول۔ سر پہ چھت کا سکون ہوا تھا تو اب آٹے دال کی فکر نے آلیا۔ اسے اپنی قسمت پہ ہنسی آنے لگی اور پھر رونا۔ چار دنوں سے وہ اس قید تنہائی میں تھی اور زبان ایک لفظ نہ بولی تھی۔

رات اس اکیلے پن میں وہ کیسے گزارتی تھی' یہ اسی کو معلوم تھا۔ درختوں کے سائے اس کی کھڑکی کے شیشوں پر عجیب عجیب سی اشکال بناتے تو وہ سر شام ہی کھڑکی مضبوطی سے بند کر دیتی۔ اس نے گھبرا کر اونچی آواز میں درود پاک صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا۔ پھر ماں کو آواز دی۔

”امی۔ کہاں ہیں آپ؟“ خالی کمرے میں اسے اپنی ہی آواز عجیب سی لگی اور کچھ اتنے دنوں خاموش رہ کر آواز میں بھاری پن سا آگیا تھا۔ تب ہی اسے موبائل کا خیال آیا تو اس نے جلدی سے اٹھ کر بیگ میں سے موبائل نکال کے چیک کیا۔ اس کی بیٹری ڈاؤن تھی۔ موبائل چارجنگ پہ لگاتے ہوئے وہ ثانیہ سے رابطہ کرنے کا پکا ارادہ

کرچکی تھی۔

کمرے سے باہر تو وہ سفینہ کے ڈر سے نکلتی ہی نہ تھی۔ بس کھڑکی کھول کر دن کی روشنی دیکھ کر خوش ہولیتی۔ ابھی بھی وہ کھڑکی کے پٹ کھول کے وہاں آکھڑی ہوئی۔ یہ انیکسی گھر کی عمارت سے الگ پچھلی سائیڈ پہ بنی ہوئی تھی۔ وہ رشک وحسرت سے اس خوب صورت عمارت کو دیکھنے لگی۔ کاش۔۔۔ اس میں رہنے والوں کے دل بھی اتنے ہی بڑے اور خوب صورت ہوتے۔

اپنی آئندہ زندگی کا سوچ کر اس کا دل بند ہونے لگتا تھا۔ اس لیے وہ آئندہ کے متعلق سوچنے سے گریز ہی کرتی تھی۔ وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ معیز احمد اسے طلاق دے کر اس گھر سے نکال دے گا اور شاید وہ پھر کسی "میم" کے ہتھے چڑھ جائے۔ تب ہی وہ چونکی۔ اس نے فارمل سی ڈریسنگ میں معیز احمد کو تیز قدموں سے روش پہ چلتے انیکسی کی طرف آتے دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

☼ ☼ ☼

"کیوں۔۔۔ اسے کیا طلاق دینی نہیں آتی؟" ثانیہ نے ٹیبل کی سطح پر بازو ٹکاتے ہوئے اطمینان سے پوچھا تو وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔

"دوستوں کے راز بتایا نہیں کرتے۔"

"مگر دوستوں کو بتادیا کرتے ہیں۔" وہ اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولی۔ عون نے گہری سانس بھری۔

"انکل نے وصیت کے طور پر معیز کے نام ایک خط بھی چھوڑا ہے۔ جس میں انہوں نے معیز سے ریکوئسٹ کرتے ہوئے اسے پابند کیا ہے کہ وہ ایبہا کو طلاق دے کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ کرے۔ اسے ٹائم دے۔ اگر ایبہا کو کوئی اور پسند آجائے تو بہت بہتر ورنہ معیز خود اس کے لیے بہترین سا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کروادے۔"

"ویل ڈن۔۔۔" ثانیہ کی آنکھیں چمکیں۔ اس نے خوش ہو کر ہلکی سی تالی بجائی اور پھر جلدی سے پوچھا۔

"اور اس وصیت کے بارے میں معیز بھائی کا کیا خیال ہے؟"

"باپ کے آخری لفظوں کا یقینا" پاس رکھے گا۔ ورنہ گھر لانے سے پہلے ہی طلاق دے دیتا۔" عون نے تجزیہ کیا۔

"مگر طلاق دینا ضروری تو نہیں عون۔" وہ پراسراریت سے مسکرائی۔ عون چونکا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ۔۔۔" وہ رک کر آگے ٹیبل پر جھکی۔

"اس عرصے میں ہم ان دونوں کے درمیان محبت بھی تو کرواسکتے ہیں۔" وہ جو مارے تجسس کے اسی کی طرح آگے کو جھک آیا تھا۔ اسے گھورنے لگا۔

"تم کیوں ہم دونوں دوستوں کی زندگی کو ایک ہی ٹریک پہ چلانے کی کوشش کررہی ہو۔۔۔؟"

"کیوں۔۔۔ میں تمہارا داؤ تمہارے دوست پہ نہیں چلاسکتی؟" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔ عون نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

"ارے۔۔۔ رے۔ دوست ہی کیا۔ تم چاہو تو مجھ پر بھی یہ داؤ آزما سکتی ہو۔ میں تو دل و جگر سمیت راضی ہوں۔" مگر ثانیہ کا دھیان کہیں اور تھا اور اس کی آنکھوں کی چمک بتاتی تھی کہ وہ بہت کچھ "اور" سوچ رہی ہے عون کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ جلدی سے کھڑکی سے ہٹ گئی۔ دل گویا ہاتھوں پیروں میں دھڑکنے لگا۔

"یاالٰہی۔۔۔ یہ ادھر کیا کرنے آرہا ہے؟ کہیں فیصلے کی گھڑی تو نہیں آگئی۔" وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ ٹانگیں بے جان سی ہونے لگی تھیں۔ پھر ڈور بیل بجائی گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ظاہر ہے کہ ایبہا ہی کو اٹھ کر دروازہ کھولنا تھا۔ دروازے کا لاک کھول کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ معیز نے تاب گھما کر دروازہ کھولا تو اس کی خائف سی شکل دکھائی دی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔۔۔ میں اندر آسکتا ہوں۔۔۔؟" وہ خشک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ایبہا کا دم نکلنے لگا اس نے بولنا چاہا، مگر اسے احساس ہوا کہ ان چار دنوں میں اس کی زبان بولنا بھول چکی تھی۔ اس نے بدقت تمام سر اثبات میں ہلایا تو وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلا آیا۔ اندر آکر وہ لاؤنج کے وسط میں کھڑا تھا اور ایبہا کھلے دروازے کے پاس۔ وہ جیسے الفاظ ترتیب دے رہا تھا اور ایبہا کی جان فنا ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا ادھر وہ اسے رہائی کا اذن دے گا اور ادھر اس کا بدن اس کی روح کو۔

وہ کھنکھارا۔

"تم جانتی ہو کہ یہ سارا ڈرامہ میری مرضی کے بغیر مکمل ہوا ہے۔ میں تمہارا جتنا ساتھ دے سکتا تھا' دے چکا ہوں۔ اب میری بھی ایک لائف ہے جسے میں اسٹیبل کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی زندگی کے لیے اپنی مرضی کا فیصلہ کرو۔ میں ابو کی وصیت کا پابند ہوں۔ تم کسی کو اپنی زندگی کے ساتھی کے طور پہ پسند کرو' اس کا ہاتھ پکڑ کے میرے سامنے لاؤ۔ میں اسی وقت تمہاری اس سے شادی کروادوں گا اور اگر نہیں تو میں خود یہ فرض سرانجام دوں گا۔ تب تک تم یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے ہو۔"

بہترین ڈریسنگ اور مہنگے ہیر کٹ میں۔۔۔ وہ معیز احمد تھا۔ امیر لوگ سارے ہی اتنے خوب صورت ہوا کرتے ہیں شاید۔۔۔ یا اس کے ایبہا کو اچھا لگنے کی کوئی اور وجہ تھی؟

وہ ایک ٹک اسے بولتے دیکھ رہی تھی۔۔۔ شاید سن بھی رہی تھی۔

"کچھ چاہیے تو نہیں۔۔۔؟" وہ مروتا" پوچھ رہا تھا۔

بھاری دل کے ساتھ ایبہا نے نفی میں سر ہلایا۔ جو اس سے سب کچھ چھیننے آیا تھا' اس سے وہ کیا مانگتی؟ ساری عمر کی ہم سفری مانگتی تو کیا وہ دے دیتا؟

نہیں نا۔۔۔ تو پھر وہ اللہ سے ہی سب کچھ مانگنا چاہتی تھی۔ ایبہا چونکی۔

وہ جاچکا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہاں سے گھر کا پورچ دکھائی دیتا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یقینا" کسی فنکشن یا پارٹی میں جارہا تھا۔ ایبہا نے دروازہ بند کرکے اس سے ٹیک لگالی۔ اس کا تنفس تیز تھا اور دل میں تکلیف دہ سا احساس اپنی پسندیدہ چیز کھودینے کا۔۔۔؟ اس نے جاگتے ذہن کے ساتھ اپنی کیفیت کا تجزیہ کرنا چاہا۔ کچھ جاننے کی کوشش کی۔ یہ معیز احمد کی شخصیت کی کشش تھی۔۔۔ ان کے مابین بندھے رشتے کا احساس تھا۔۔۔ یا فقط ایک چاردیواری کا لالچ؟ مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کھانے کی میز پر پہنچا تو ہاٹ ٹاپک تھا' تایا جان کے گھر سے آنے والا شادی کارڈ۔

"آؤ عون۔۔۔!"

امی نے اسے دیکھ کر کہا تو ابا نے اسے عینک کے اوپر سے گھور کے دیکھا۔

"پہلے برخوردار سے یہ پوچھو کہ ساری شام کہاں گزار کے آیا ہے۔ چار بجے ضروری کام کہہ کے گیا تھا اور اب آرہا ہے۔"

"چلو بچو۔ جلدی سے کھانا ختم کرو۔" اس نے ثنا اور عبداللہ کو ڈانٹتی عاصمہ بھابھی کی مسکراہٹ اچھی طرح دیکھی تھی۔

وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے منمنایا۔ "دوست کے ساتھ چائے پینے گیا تھا ابا!"

بات ختم تو کیا ہوتی' نئے سرے سے شروع ہوئی۔ عون کے سامنے بریانی کی ڈش رکھتی امی کا بے اختیار اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارنے کا جی چاہا۔ ورنہ شاید عون کو تو ایک لگا ہی دیتیں۔

"واہ۔۔۔ خوب۔ بہت خوب۔" ابا کی تو گویا کرسی میں کیلیں اگ آئیں۔

"یعنی۔۔۔ اپنا ریسٹورنٹ چھوڑ کے یہ موصوف اپنے دوست کو کہیں اور چائے پلوانے لے گئے تھے۔" وہ بھڑک کر بولے۔

عون کو بھی فی الفور اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ والد محترم کے سامنے یہ اعتراف ایک جرم بن سکتا تھا۔ عاصمہ بھابھی ماحول کی گرماگرمی دیکھ کر بچوں کو کھانا ختم کروا کے اندر دھکیلنے لگیں۔ چاچو کی ہونے والی متوقع بے عزتی ان پر برا اثر ڈال سکتی تھی۔ خود تو وہ وہیں ڈٹ کے بیٹھتیں پورا شو دیکھتیں۔

"اپنے ریسٹورنٹ میں چائے پلواتا تو لگتا' فری میں بھگتا رہا ہوں۔" اس نے صفائی پیش کی۔ امی نے فوراً" اس کی تائید کی۔

"ہاں۔ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"کیا خاک ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ تو وہی لطیفہ ہوا کہ کسی نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں۔ پتا چلا' موصوف اپنی دوا لینے کسی اور ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔" غصے میں ابا اچھے خاصے "طنز نگار" بن جایا کرتے تھے۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔" بے چاری امی۔ پہلے تو ابا کی بیوی تھیں نا۔ کمزور لہجے میں بولیں۔

"ایسے تو کاروبار پہ برا اثر پڑتا ہے بیٹا۔ بڑا بے وقوف دوست تھا جو یہ سمجھتا۔"

"خردماغ کہیے۔۔۔" عون جھنجلایا۔ ایک تو مجال تھی جو اس گھر میں کوئی بات راز ہی رہ جاتی۔ پھر منہ پھلا کر بولا۔

"ان کی بھتیجی کو لے کر گیا تھا۔"

"ثانی کو۔۔۔" ابا کے تاثرات فی الفور بدلے۔ "اچھا کیا۔ ذرا "ہوا بدلی" ہوگئی تمہاری بھی۔ یہ کارڈ آیا ہے فراست کی طرف سے ذرا دیکھ لو۔"

"واہ۔" عون کا سر دھننے کو جی چاہا۔ کیسے منٹ میں ٹریک بدلا تھا ابا نے۔ وہ عاصمہ بھابھی کی چڑانے والی ہنسی نظر انداز نہیں کرپایا تھا۔

"آپ کو بڑی ہنسی آرہی ہے۔" دھیمی آواز میں دانت پیس کر کہا تو وہ شرارت سے بولیں۔

"میں تو ہمیشہ سے ہی خوش مزاج ہوں۔" نہیں ہلکا سا گھور کر عون نے سنہری عبارت سے سجا سرخ شادی کارڈ اٹھالیا۔

تایا جان سے جائیداد کے تنازعہ کے بعد پوری فیملی ہی کے تعلقات خراب تھے۔ نہ تو یہاں سے کوئی آنا جانا تھا اور نہ ہی تینوں پھپھوؤں کے گھر سے۔

اور اب یوں کارڈ کا آنا۔۔۔ چہ معنی دارد۔

"اچھا۔۔۔ تو تازیہ موٹو کی شادی ہورہی ہے۔" اس نے اونچی آواز میں تبصرہ کیا۔

"اونہوں۔" ابا نے کھنکھارتے ہوئے چشمے پر سے گھورا۔ وہ فوراً" شرافت کے جامے میں آگیا۔

"تو اب کیا کرنا ہے؟"

"میں تو کہہ رہی تھی ختم کریں اس بلا سبب ناراضی کو۔ ان کی طرف سے بائیکاٹ تھا۔ انہوں نے خود ہی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔" امی دل کی بہت صاف تھیں۔ ورنہ تائی جان کے ساتھ گزارا ماضی بہت تکلیف دہ تھا۔

"ہوں' مگر یہ بھی تو دیکھو کہ تاریخ چن کے وہی رکھی ہے' جو تمہاری بھتیجی کی شادی کی ہے۔" ابا نے ان کی توجہ دلائی۔

"خاندان میں کبھی کبھار ایسا ہو ہی جاتا ہے' مگر کوئی حل نکل ہی آتا ہے۔"

عون اپنا کھانا ختم کرنے لگا۔ اسے فی الحال تو بریانی میں دلچسپی تھی جو ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو تین چمچے چاولوں کے بھر کے منہ میں ڈالے۔

"کیوں بھئی عون! تمہارا کیا خیال ہے؟" اب عون صاحب کا منہ نوالوں سے بھرا ہوا تھا۔

"مجھے تو کچھ اور ہی چکر لگ رہا ہے۔" بھرے منہ کے ساتھ وہ بولا تو ابا نے گھور کے اسے دیکھا۔

"ہیں۔ کسے چکر آرہے ہیں؟" عاصمہ بھابھی کی مشہور زمانہ قلقل کرتی ہنسی بے اختیار آزاد ہوئی۔ عون نے جلدی سے نوالہ نگلا اور بات بدلی۔

"میں کہہ رہا ہوں' چکر لگا ہی لینا چاہیے کسی کو۔ خیرسگالی کے طور پر۔"

"ہوں۔۔۔" ابا نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

"بہنوں سے مشورہ کرتا ہوں پہلے۔ پھر دیکھتے ہیں۔" ابا کارڈ جاتے ہوئے ساتھ لے گئے۔

"آپ کا مقدمہ تو میں شمعون بھائی کی عدالت میں فرانس میں پیش کروں گا۔" عون نے ان کے جاتے ہی بھابھی کو دھمکایا تو وہ ہنسیں۔

"یہ بھی کر دیکھو۔۔۔ اور اپنی رازداری کی ملاقاتوں کا بھی حال لازمی بتانا۔"

"خاک رازداری۔ جس کا بھانڈا پھوڑنا بھی پڑے تو والد محترم کے سامنے۔" وہ جلا بھنا تھا۔

"ثانی کیسی ہے۔۔۔ لے ہی آتے اسے ساتھ۔" امی نے پیار سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اس کے ساتھ تو ضرور ہی آتی۔" بھابھی نے مذاق اڑایا۔

"دیکھنا آپ۔ کچے دھاگے سے بندھی آئے گی۔" عون کے ہونٹوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی اور انداز میں پر یقین دعوا۔

بھابھی نے دل ہی دل میں آمین کہا' مگر دیور کو چڑانا بھی تو ضروری تھا اس لیے گہری آہ بھری۔ وہ انہیں گھور کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

ابیہا کی کال بہت غیر متوقع تھی۔ واپس آکر وہ اپنے کپڑے نکال کے فوراً" نہانے گھس گئی۔ اسے رہ رہ کر عون کے ساتھ اپنے یوں بے کار حلیے میں جانے پر افسوس ہو رہا تھا' مگر اس سے بھی زیادہ غصہ اسے اس افسوس پر آرہا تھا۔

"میں کیوں اتنا کانشس ہو رہی ہوں۔ چاہے جو مرضی سوچتا پھرے۔ میری بلا سے۔"

اس نے اب تک دسیوں مرتبہ سوچا' مگر ہر بار اسے خیال آتا کہ اگر وہ صرف کپڑے ہی بدل کر چلی جاتی تو شاید تیل لگا سر پس منظر میں چلا جاتا۔ بال تولیے سے خشک کرنے کے بعد ابھی وہ گیلا تولیہ کرسی کی پشت پر پھیلا ہی رہی

تھی جب اس کا موبائل بجنے لگا۔
"عون ہی ہوگا۔" اس کا پہلا اندازہ تھا، مگر ابیہا کے نام پہ نظر پڑتے ہی اس نے فوراً "کال ریسیو کرلی۔
"کیسی ہو۔۔۔؟ موبائل کیوں آف کر رکھا تھا۔ میں تو اس دن سے بار بار کال کر رہی ہوں تمہیں۔ کیسی ہو
تم؟" ثانیہ نے بے اختیار ہی ڈھیروں سوال کر ڈالے۔
"موبائل چارجنگ کے لیے لگانا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟" ابیہا کی آنکھیں کسی
کی اتنی فکر پہ نم سی ہو گئیں۔ وہ دنیا میں تنہا تھی۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی بہن۔ ایسے میں ثانیہ کا انداز اسے اپنی
بہن جیسا ہی لگتا تھا۔
"اللہ کا شکر ہے۔ تم وہاں کے حالات سناؤ۔ کیسا استقبال ہوا تمہارا۔ سسرال کیسی ہے تمہاری؟" وہ اطمینان
سے فلور کشن پہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"ٹھیک ہے سب۔ میں تو انیکسی میں ہوں۔۔۔" وہ قدرے جھجک کر مجرمانہ انداز میں بولی۔
"ہاں۔ سوری۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ عون نے بتایا تھا مجھے۔" ثانیہ نے اسے ریلیکس کرنا چاہا۔
"کیا آپ مجھ سے ملنے آسکتی ہیں یہاں؟" ابیہا کا لہجہ آس بھرا تھا۔ اور ثانیہ تو پہلے ہی ان ہی چکروں میں تھی۔
فی الفور بولی۔
"ہاں ہاں۔ تم بے فکر رہو۔ میں تو پہلے ہی پروگرام بنا چکی ہوں اور ہاں۔ کسی سے بھی ڈرنا مت۔ یوں سمجھو
اب میں تمہارا میکہ ہوں بلکہ میں اور عون دونوں۔"
دوسری طرف نم آنکھوں کے ساتھ ابیہا ہنس دی اور ادھر ادھر کی کتنی ہی باتوں کے بعد فون بند کرتے ہوئے
ثانیہ کو دھیان آیا کہ اس نے عون کا نام اپنے ساتھ کیوں لیا تھا؟ ساتھ ہی اسے یاد آیا۔ آج وہ کتنا ہینڈسم لگ رہا
تھا اور اسے بار بار دیکھتی وہ تینوں لڑکیاں۔ ثانیہ کے دل میں پھر سے جیلسی ابھری۔ تو وہ لاحول پڑھتی اٹھ گئی۔
"کم ہی ملنا پڑے گا تم سے عون عباس! دماغ خراب کر رہے ہو تم میرا۔۔۔ اور شاید دل بھی۔" اس نے تہیہ کرلیا
تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیپی برتھ ڈے۔۔۔" معیز کا میسیج رات بارہ بجے اسے اپنے موبائل پہ موصول ہوا تھا۔
"اور پروگرام۔۔۔؟" رباب نے کھل کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"جو تم کہو۔۔۔" معیز کا جواب آیا۔
"جی نہیں۔ جو تم چاہو۔" رباب نے بڑے ناز سے جواب لکھا۔
"او کے۔ ویٹ اینڈ سی۔" معیز کا جواب تھا۔
ارباب طمانیت سے مسکرانے لگی۔ اسی وقت اس کے موبائل کی میسیج ٹون بجی۔
"ہیپی برتھ ڈے سویٹ ہارٹ۔" میسیج پڑھتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ یہ سیفی کا میسیج تھا۔
"تھینکس۔۔۔" روکھا سا جواب بھیج کر اس نے فوراً "ہی موبائل آف کر کے بیڈ پہ ڈال دیا۔
وہ بہت کامیابی سے سیفی اور معیز کی کشتیوں میں سوار تھی۔ سیفی دولت کے لحاظ سے خوابوں کی تعبیر تھا تو
معیز خوابوں کا شہزادہ۔ کسے چھوڑنا تھا اور کسے تھامنا۔ یہ تو وقت ہی بتانے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ثانیہ کو اگلے ہی روز اپنے دروازے پر پا کر اتنی حواس باختہ ہوئی کہ اس کے گلے لگ کے رو ہی پڑی۔ ثانیہ

اس قدر جذباتی صورت حال کا اندازہ کر کے نہیں آئی تھی۔ سٹپٹا گئی۔
"کم آن بیا۔۔۔ ریلیکس۔" وہ اس کی پشت تھپتھپانے لگی۔
"اچھا۔ اندر تو آنے دو۔" وہ جھینپ کر ثانیہ سے الگ ہوئی۔ دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔
"آئیں نا۔" ثانیہ اس کے ہمراہ اندر آگئی۔
"ہوں۔ رہائش تو اچھی ہے۔" اس نے ستائشی نظروں سے کمرے کی سیٹنگ دیکھی۔ مختصر سی راہداری کے
بعد ایک کمرہ ٹی وی لاؤنج کے طور پہ تھا اور اس سے ملحقہ بیڈ روم۔ اٹیچ باتھ اور کچن سائیڈ پہ تھا جس کی بڑی سی
کھڑکی گھر کے پچھلی سائیڈ پہ کھلتی تھی۔
"وائے۔۔۔" وہ یقیناً "ابیہا کو بہلا رہی تھی، مگر ابیہا کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ ثانیہ کو کچھ کھانے پینے کو بھی نہیں
پوچھ سکتی تھی۔ گھر میں کچھ تھا ہی کب۔ لانے والا اسے یہاں ڈال کے اپنا فرض نبھا چکا تھا۔
"مجھے تو یہ تنہائی بہت فیسی نیٹ کرتی ہے۔" ثانیہ بے تکلفی سے ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ یونہی چلتے پھرتے
اس نے فریج کا دروازہ کھولا۔ روم سائز فریج میں محض پانی کی ایک بوتل اور دودھ کا چھوٹا ڈبہ تھا۔ اس کی مسلسل
چلتی زبان رک سی گئی۔ کچھ سوچ کر وہ کچن میں آئی اور تمام درازیں اور کیبن کھول کے چیک کیے۔ کٹلری کے
سامان کے علاوہ وہاں اور کچھ نہ تھا۔ وہ واپس ابیہا کے پاس آئی تو انداز میں بے یقینی اور تاسف تھا۔
"تم کیا یہاں ہوا کھا رہی ہو؟" وہ جی بھر کے شرمندہ ہوئی۔ جیسے قصور اسی کا ہو۔
"نہیں۔ انڈے بریڈ اور دودھ تھا۔ آج ہی ختم ہوئے ہیں۔" وہ اور چیخی۔
"کیا۔ یعنی تم چار دنوں سے محض انڈے بریڈ کھا کے زندہ ہو؟"
ابیہا سٹپٹائی۔
"مجھے معیز بھائی جیسے ڈیسنٹ بندے سے یہ امید نہیں تھی۔ انہیں تو چاہیے تھا یہاں فل سائز فریج
رکھواتے اور اسے لبالب اشیائے صرف سے بھر دیتے۔ کچن میں اتنا کچھ ہوتا کہ تمہیں مہینوں کوئی فکر نہ ہوتی۔"
ثانیہ کے انداز میں غصہ تھا۔
"اتنی فکر تو صرف اللہ کو اپنے بندے کی ہوتی ہے۔ بندے بندوں کی فکر کرنے لگیں تو ساری لڑائی ہی ختم
ہو جائے۔" ابیہا آزردگی سے بولی۔ ثانیہ نے غصے سے بیگ ٹٹول کر اپنا موبائل نکالا۔ وہ کوئی نمبر ملا رہی تھی۔
"ہاں۔۔۔ حال چال کو چھوڑو اور سیدھے یہاں پہنچو۔۔۔" اس کا لب و لہجہ تیز تھا۔ پھر قدرے جھنجلا کر بولی۔
"میں تمہارے عزت مآب دوست معیز احمد کے گھر کی انیکسی میں موجود ہوں۔ ایڈریس لیا تھا نا تم سے۔"
اس کے انداز میں طنز تھا۔
"ہاں۔ غلطی ہو گئی بہت بڑی۔ تمہارے ساتھ ہی آنا چاہیے تھا۔ تم بھی اپنے دوست کی "اعلا ظرفی" دیکھتے تو
یقیناً "متاثر ہوتے۔" ابیہا متحیر سی اس کی شعلہ بیانی دیکھ رہی تھی۔ وہ یقیناً "عون پر برس رہی تھی۔
"فوراً "یہاں آؤ بلکہ اپنے دوست کو بھی لائن حاضر کرو۔" اور اب وہ مسلسل ادھر ادھر ٹہلتی بڑبڑاتے ہوئے
ابیہا کا بی پی لو کر رہی تھی۔ اور اپنا ہائی۔
"جانے دیں۔ آپ بات کو خواہ مخواہ بڑھا رہی ہیں۔" ابیہا نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا تو وہ رک کر اسے
گھورتے ہوئے بولی۔
"بات پہلے ہی بڑھی ہوئی ہے بے وقوف! اب تو تمہاری زندگی داؤ پہ لگ رہی ہے۔" ابیہا کے دل میں جیسے
کوئی نوکیلا تیر سا کھب گیا۔
"تو کون سی نئی بات ہے۔ میں نے تو ہوش ہی ان ہی حالات میں سنبھالا ہے۔"

"مگر اب نئی بات ہونا چاہیے۔" وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولی۔ "تم ان کے نکاح میں ہو۔"
"کب تک...؟" ایہا کا لہجہ زخمی تھا۔
"جب تک بھی یہ رشتہ برقرار ہے۔ ان پر اپنے فرائض کی ادائی فرض ہے۔" ثانیہ کا لہجہ دھیما ہوگیا۔
چلتی زندگی کے اس موڑ تک پہنچی تھی۔
اسے یاد آیا' وہ کانوں پہ
"رشتوں کی اہمیت انہیں تسلیم کرنے سے ہوتی ہے۔" ایہا نے اسے یاد دلایا۔ وہ چپ ہوگئی۔
عون آیا تو ثانیہ نے اسے خالی فریج کھول کے دکھایا۔ کچن کی ساری درازیں' سارے خالی کیبن دکھائے اور
عون بے چارہ ایہا کے سامنے اس کنجائی پر یوں شرمندہ ہو رہا تھا جیسے اس سارے میں اسی کا قصور ہو۔
"اور اس دوست کی تعریف میں تم زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہو۔" ثانیہ نے طنز کیا۔
"مجھے تو اس صورت حال کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ میں ضرور اس سے پوچھوں گا۔ اس کی مذمت کروں گا۔" عون
شرمسار تھا۔ ثانیہ تڑخی۔
"معاف کرنا ویسے تمہارے دوست کو مذمت کی نہیں بلکہ مرمت کی ضرورت ہے۔"
"وہ... آئے تھے۔ مجھ سے پوچھا تھا' کسی چیز کی ضرورت تو نہیں...." ایہا نے مجرمانہ انداز میں کہا تو عون نے
فخریہ انداز میں ثانیہ کو دیکھا' مگر وہ متاثر نہیں ہوئی تھی۔
"لا کے ہی کیا رکھا ہے یہاں جو مزید لانے کا پوچھ رہے تھے۔ ضروریات زندگی بھی پوچھنے کی چیز ہے؟ غضب خدا
کا۔ انہیں کھانا کھاتے ہوئے بھی خیال نہیں آیا کہ یہ بے چاری کیا کھا رہی ہوگی۔" ثانیہ کو واقعتاً "معیز" پر بہت
غصہ تھا۔
"اچھا۔ تم تمام چیزوں کی لسٹ بناؤ۔ میں خود لا کے دیتا ہوں۔ معیز سے بھی بات ہو جائے گی۔" عون نے
شرافت سے کہا۔ اور پھر وہ دونوں بیٹھ کر فریج اور کچن میں بھری جانے والی چیزوں کی لسٹ بنانے بیٹھ گئے۔
اگلے دو گھنٹوں میں عون تمام سامان لا چکا تھا اور ثانیہ نے ایہا کے ساتھ مل کے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا اور
جب وہ دونوں جانے لگے تو وہ ثانیہ کے ہاتھ تھام کے رو دی۔
"مجھے زندگی میں اچھے لوگ بہت کم ملے ہیں اور ان میں میری ماں اور امتیاز انکل کے ساتھ آپ بھی شامل
ہیں۔" ثانیہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔
"تم بے فکر رہو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔ تب ہی حالات کا مقابلہ کر سکو
گی۔"
"اور یہ اتنا خرچا...؟" وہ ہچکچائی — جتنا سامان وہ دونوں خرید کے لائے تھے' وہ ہزاروں کا تھا۔
"وہ آپ اپنے دیور کی طرف سے تحفہ سمجھ لیں۔" عون نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا۔
"دیور نہیں بھائی۔" ثانیہ نے طنز سے لقمہ دیا۔ تو وہ برجستہ بولا۔
"ہاں۔ بھائی اور بھابھی کی طرف سے۔"
اس نے اپنی اور ثانیہ کی طرف اشارہ کیا تو ثانیہ کا چہرہ پل بھر میں رنگ بدل گیا۔
ایہا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کزن شپ کا تو اسے پتا تھا مگر یہ بھائی بھابی والا سلسلہ۔
"اچھا۔ اب موبائل آف مت ہونے دینا۔ میں کال کرتی رہوں گی۔"
ثانیہ نے بدقت تمام موضوع بدلا۔ تو ایہا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گاڑی کے مین روڈ پہ آتے ہی وہ بھی
"اسٹارٹ" ہوگئی۔
"میں نے تم سے کہا تھا کہ ہر بات میں نکاح نامے کو مت گھسیٹا کرو۔ اور یاد ہے نا تم نے کیا کہا تھا؟" وہ جتانے

والے انداز میں بولی۔
"یہی کہ اب ہم اچھے دوست ہیں۔" عون نے مسکراہٹ دبائی۔ پھر بھول پن سے بولا۔
"اچھے دوست میاں بیوی بھی تو ہو سکتے ہیں۔"
"مگر میاں بیوی اچھے دوست نہیں ہو سکتے۔" وہ برجستہ بولی۔
"تم آزماؤ تو سہی۔" وہ شرارت پر آمادہ ہوا۔
"آزمائے ہوئے کو کیا آزمانا۔" وہ بڑے اطمینان سے طنز کرتے ہوئے بولی۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔ پھر
وہ بولا۔
"تایا جان کی طرف سے نازیہ کی شادی کا کارڈ آیا ہے۔"
"ہوں۔ امی بھی بتا رہی تھیں۔ اور ادھر بڑی خالہ کی طرف بھی آیا ہے۔" ثانیہ نے بتایا۔
"موقع تو اچھا ہے پھر سے رابطے استوار کرنے کا۔" عون نے رائے دیتے ہوئے اسے استفہامیہ نظروں سے
دیکھا۔ گویا اسے بھی اظہار رائے کا موقع دیا ہو۔
"ہوں...." ثانیہ نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بے چین سا ہوا۔
"میں کسی اور نظریہ سے بات کر رہا ہوں۔"
"میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" ثانیہ نے آرام سے کہتے ہوئے شانے اچکائے۔
تایا جان یعنی ثانیہ کے بڑے ماموں کی تیسرے نمبر کی بیٹی ارم (جو نازیہ سے چھوٹی تھی) عون کو بہت پسند کرتی
تھی۔
بلکہ جب عون نے ثانیہ سے شادی سے انکار کیا تو تبادل کے طور پر ارم ہی کا نام دیا تھا۔
"اس دہقان سے بہتر ہے کہ ارم ہی سے میری شادی کرا دیں۔"
اور عون کے انکار کے ساتھ یہ اعلان بھی خاندان بھر میں خوب اچھلا۔ حالانکہ تایا جان کی فیملی کے ساتھ
تعلقات بالکل ختم تھے۔ مگر فتنہ پرور قسم کے رشتہ داروں نے اس بات کو خوب پھیلایا اور ظاہر ہے کہ تایا جان کی
فیملی تک بھی بات پہنچی ہوگی۔
"بعض لوگوں کی دور کی نظر کمزور ہوتی ہے اور بعض کی قریب کی۔ تم کیوں نہیں سوچ لیتیں کہ تمہارے
معاملے میں میری قریب کی نظر کمزور نکلی۔"
عون خفگی سے بولا تو مثال بھی الگ ہی ڈھنگ کی تھی۔

"ہاں۔ میں نے سوچ لیا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ پھر اضافہ کیا۔
"تب ہی تو دکھ بھی زیادہ نہیں ہوا۔"
عون لب بھینچے سامنے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی ثانیہ کا رویہ بہت روکھا اور تکلیف دہ ہونے لگتا تھا۔ اسے لگتا، وہ ضبط کھو دے گا مگر۔
"عون۔۔۔ وہ دیکھو۔ معیز بھائی کے ساتھ گاڑی میں۔ وہ خوبصورت سی لڑکی کون ہے؟"
سگنل پہ گاڑی رکی تو اچانک ہی ثانیہ نے اس خاموشی کو جوشیلی آواز سے توڑا۔ عون چونکا۔ گاڑیوں کے ہجوم میں اس نے معیز کی گاڑی کو ڈھونڈ لیا تھا۔ اور اس کے ساتھ بے فکر اور بے تکلفانہ انداز لیے بیٹھی رباب۔
عون نے گہری سانس لے کر گرین سگنل پر نگاہ ڈالی اور گاڑی آگے بڑھادی۔ عون کی خاموشی پر حیرت کی بات تھی کہ ثانیہ بھی خاموش ہو گئی۔ عون نے اسے گھر کے باہر ہی ڈراپ کیا۔
"اندر نہیں آؤ گے؟" عموماً وہ اسے پوچھا نہیں کرتی تھی۔ مگر آج پوچھا۔ اور یوں تو سر کے بل چل کے جاتا مگر آج انکار کر دیا۔
"نہیں۔ ریسٹورنٹ جانا ہے۔ پہلے ہی بہت لیٹ ہوں۔ ٹیک کیئر۔" ایک نرم سی نگاہ اس کے صبیح و ملیح چہرے پر ڈال کر عون نے گاڑی آگے بڑھادی۔ اور اس ایک نگاہ میں جانے کیسا فسوں تھا کہ وہ دور تک اس کی جاتی گاڑی کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہترین ڈریسنگ کے ساتھ بے حد فریش اور پر جوش تھی۔
معیز نے نہ صرف رات اسے وشنگ میسج بھیجا بلکہ آج اسے لانگ ڈرائیو کے بعد ڈنر بھی کروانے والا تھا۔
اور ابھی جب آتے ہوئے اس نے راستے میں گاڑی روکی تو جگہ تقریباً "سنسان ہی تھی۔ اور پھر ایک خوبصورت اور نازک سی ڈائمنڈ کی انگوٹھی اس نے رباب کے سامنے کی تو اس کا چہرہ اپنی فتح کے احساس سے تمتما اٹھا۔ یا شاید معیز کی شکست کے احساس سے۔
اس نے بڑے ناز سے اپنا ہاتھ معیز کے سامنے پھیلا دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کو انگوٹھی پہنانے لگا۔ رباب نے ازخود رفتگی کے عالم میں آگے ہو کر اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔
معیز لحہ بھر کو تو حیران ہی رہ گیا مگر پھر شاید وہ بھی لمحوں کی گرفت میں آنے لگا۔
معیز نے نرمی سے اس کے بالوں کو سہلایا۔ پرفیوم اور شیمپو کی مہک اس کی سانسوں کو معطر کرتی ذہن کو دھندلا رہی تھی۔ مگر رباب کی نسبت وہ حواس میں تھا۔
"او کے۔۔۔ لیٹس گو فار اے لانگ ڈرائیو۔" نرمی سے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ اور رباب کا دل اس مسکراہٹ میں کہیں کھو گیا۔
ایک بہترین لانگ ڈرائیو کے بعد وہ دونوں ڈنر کے لیے ہوٹل آئے تھے۔ معیز نے ایک مینیو کارڈ اسے تھمایا۔ وہاں خوشیوں کا ڈیرا تھا۔ مسرتوں کے گلاب کھل رہے تھے۔ وہ دونوں مینیو ڈسکس کر رہے تھے جب کوئی ایک دم سے ان کی ٹیبل کے قریب آیا۔
"ہیلو ڈیر۔۔۔"
ان دونوں نے بے اختیار آنے والے کو دیکھا۔ معیز کی آنکھوں میں حیرت تھی جبکہ رباب خوف و پریشانی کا شکار ہو گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



شاہجہاں گل

میکے اور سسرال کی خوشبو

"عادی! تم ہی جاؤ بیٹا!" غالباً "کچن سے امی پکاری تھیں۔
"سونو کہاں ہو تم۔۔۔ بیل ہو رہی ہے۔" کہیں دور سے عمارہ چلائی تھی۔ اسے ہنسی آگئی وہ بیل پر انگلی جمائے کھڑی رہی۔
"عمر! دروازے پر دیکھو۔۔۔" اندر سے فوراً "دادی کی آواز آئی۔
اس نے ایک نظر گلی کا موڑ مڑتی ثوبان کی بائیک کو دیکھا اور دوسری نظر سامنے گھر کے دروازے پر ڈالی۔
یہ دروازہ۔۔۔ اور اس کے اس پار جو گھر تھا۔
اس کے ماں باپ کا گھر یعنی میکہ۔ یہ سوچ کر ہی اس کی رگ و پے میں سکون ہی سکون اتر گیا۔
بچپن اور جوانی کی یادوں کا مسکن۔ اس کے لبوں پر بچوں کی سی مسکراہٹ آگئی۔
وہ گھر جس میں بے ساختگیوں اور بے فکریوں کا تمام عرصہ گزرا۔ وہ دروازے کو انگلیوں سے چھو رہی تھی۔ انگلیوں کی پوریں تک گنگنانے لگیں۔۔۔ اندر جانے کے بجائے وہیں کھڑے رہ کر ان خوب صورت و خوشگوار احساسات میں گھر کر کچھ لمحے سو جانے کو دل کر رہا تھا۔ ٹھنڈک ہی ٹھنڈک۔۔۔ نم ہوا کے جھونکے سے کہیں سے آنے لگے تھے۔ ملگجی روشنی خیالوں کے نرم بستر کا تصور سا ارد گرد باندھنے لگی۔
اس کا دل یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اس چوکھٹ پر بیٹھ جائے اور اپنے بچپن اور گزرے دنوں میں کھو جائے۔
کوئی کندھا نہ ہلائے، کوئی نہ سسرال کی محنت، مشقتیں، بے آرامی، پریشانیاں جیسے ثوبان کی بائیک سے لپٹا غبار اپنے ساتھ لے گیا تھا۔
اب تو جسم ہلکا پھلکا تھا۔ سانسیں دھیمی اور رواں تھیں۔ ذہن و دل میں خوشبوؤں سی خوشبوئیں تھیں۔ ہر لڑکی شادی کے موقع پر کیوں روتی ہے؟ اس کے رشتے دار کیوں روتے ہیں؟ بڑی بوڑھیاں۔۔۔ خالائیں، مامیاں پھوپھیاں۔ سب کو اپنا اپنا وہ وقت یاد آنے لگتا ہے، جب میکے کی دہلیز سے نکل کر لڑکی ہر اس چیز کو وداع کر جاتی ہے۔۔۔ جو دوبارہ ویسی نہیں ملتی۔۔۔ بعد میں ویسی نہیں رہتی۔ یادیں رشتے بدلنے سے، گھر بدلنے سے زندگی کے انداز بدلنے سے نہیں بدلتیں۔ وہ تبدیلی سے مشروط نہیں ہوتیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ پرس کندھے پر ڈال کر اس نے بیل پر انگلی رکھی۔

"توبہ توبہ کون ہے؟" دادی چیخیں۔
"جانے کون ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے...." امی پکاریں۔
"یہ جنید ہی ہو گا۔ لفنگا جلد باز۔" عمارہ بڑبڑائی اور پھر مسلسل ہوتی بیل پر بوکھلا کر سب ہی دروازے کی جانب لپکے تھے۔ دروازے کی دوسری جانب سے کئی آوازوں کے ساتھ دروازہ کھولا گیا۔ اس کا پورا میکہ استقبال کے لیے دروازے پر موجود تھا۔ وہ ہنستے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ دروازے پہ کھڑے سب لوگوں کی چیخیں بے ساختہ تھیں۔
"مہر آئی ہے۔"
"مہر آپا۔"
"ارے مہرانو!"
"مہو تم؟" اس کے آس پاس سب ہی اکٹھے ہو گئے اور اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ ہر کسی کا خوشی کے اظہار کا اپنا انداز تھا۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے وہ آئی بھی تو پورے چھ ماہ بعد تھی۔ پورے چھ ماہ بعد۔
دوسری بار چیخوں سے صحن تب گونجا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ وہ دو دن رکنے آئی ہے۔
"ہرے...."
"ارے واہ۔"
"یہ ہوئی نا بات۔"
"کیوں نہیں.... سدا خوش رہو، جیو خوش رہو۔"
"میں نے فروٹ کسٹرڈ بنانا سیکھا ہے۔ تمہارے لیے بناؤں گی۔ تمہیں میٹھا بہت پسند ہے نا۔" عمارہ نے اس کے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے کہا۔
"مل کر کوئی اچھی سی موووی دیکھیں گے۔"
"چھت پر پارٹی بھی کریں گے۔"
"اور دیر تک جاگیں گے بھی۔"

"کراچی والے کزنز سے اسکائپ پر محفلیں لگائیں گے۔" اپنے اپنے طور سب اس کی آمد پر پروگرام سیٹ کیے جا رہے تھے۔ اس کے اندر زندگی مسکرا رہی تھی۔
میکے کا ہر موسم ہی نرالا ہوتا ہے۔

سب سے پہلی نشست دادی، چچی اور امی کے ساتھ لگی۔ چچی کچن میں مصروف ہونے کے باوجود بھی باتوں میں شامل ہو رہی تھیں۔ دادی اور امی البتہ تخت پر باتوں کے ساتھ ساتھ لحافوں کی مرمت میں بھی لگی ہوئی تھیں۔ بالوں میں تیل لگائے بغیر دوپٹے کے وہ ان کے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ اک عجب بے فکری تھی جس میں مزا ہی مزا تھا۔
"تمہاری ساس کی بہن عمرے سے واپس آگئیں؟"

"ثوبان کی پروموشن کا کیا ہوا؟"
"نادرہ آپا بیٹے کی منگنی کر رہی ہیں۔ تمہیں بھی بلاوہ دیں گی۔ تم اجازت لے کر رکھنا۔ ورنہ تمہاری ساس عین وقت پر بیمار پڑ جاتی ہیں۔"
"تمہاری نندوں کے رشتے ہوئے کہیں۔"
"تمہارا دیوار اور کتنے سال فیل ہوتا رہے گا۔ بلاوجہ خرچہ کروا رہا ہے بھائی کا۔"
"اور تم.... یہ سوٹ پہن کر آگئیں۔ ڈھونڈ کر پہنا ہو گا.... میکے آ رہی تھیں۔ یہ حلیہ بنا کر آتے ہیں ماں باپ کے گھر....؟"
"آنکھیں دیکھو.... جیسے کسی بڑی بیماری سے اٹھی ہو۔"
"پریشان نہ رہا کرو۔ ان شاء اللہ سب بہتر ہو گا۔"
"اللہ خوش رکھے۔ سکھی رہو۔ بڑوں کا ادب اور گھر والوں سے محبت سے رہا کرو۔"
"سسرال میں تو شروعات میں یونہی ہوتا ہے۔ کئی سال لگ جاتے ہیں معاملات سمجھنے اور سنبھالنے میں سکھ کے موسم بھی بالآخر آ ہی جاتے ہیں۔"
"ارے تمہیں تو نیند آ رہی ہے.... چلو اندر چل کر لیٹو میرا بچہ۔"
وہ کمرے میں آ کر لیٹی اور چند ہی لمحوں میں بے خبر ہو گئی۔ لمبی نیند لے کر اٹھی تو اپنے ساتھ لایا واحد جوڑا پہننے کے لیے نکالا اور فریش ہونے چل دی۔
پورا گھر سنسان پڑا تھا.... گیلے بالوں کے ساتھ کھڑی وہ گھر کا جائزہ لینے لگی۔ نظروں کے سامنے ٹھنڈا

میٹھا پُرکیف سا منظر تھا۔ اس کے میکے کے گھر کا.... شام کے خاموش لمحوں میں خوابناک رات قدم رکھنا ہی چاہتی تھی۔
اردگرد کے گھروں کے کچن میں کھٹر پٹر کی آوازیں کبھی تیز تو کبھی مدھم سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے صحن کی لائٹس آن کیں....
"سب لوگ کہاں ہیں؟" یہ سوچ اتنی بھی حاوی نہیں ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں سب اکٹھے ہونے لگے۔ ہنستے اور خوش باش۔
"پڑوس والی ثانیہ کے پورے دس سال بعد بیٹا ہوا ہے۔ ہمیں سن کر اتنی خوشی ہوئی کہ سب ہی دیکھنے چلے گئے۔ تم کھانا کھا لو پھر مل کر چائے پیتے ہیں۔"
چائے پینے کے بعد امی تین خوب صورت رنگوں والے سلے ہوئے سوٹ لے آئیں۔
"تمہارے لیے بنوائے تھے۔ پسند آئے؟"
"یہ رکھ لو.... کام آئیں گے۔" تھوڑی ہی دیر بعد دادی نے دو ہزار اپنی مٹھی سے اس کے ہاتھ میں منتقل کر کے اس کی مٹھی بھی بند کر دی۔
"یہ بیڈ شیٹ۔ میرے بھائی نے گوادر سے بھیجی ہے۔ تم اپنے بیڈ پر بچھانا بہت خوب صورت لگے گی۔" یہ چچی تھیں۔
"اس بار ہاکر شعاع کے دو پرچے دے گیا ہے.... ایک تم لے جاؤ رات کے وقت ڈائجسٹ پڑھنے کا مزا ہی اور ہے۔" عمارہ نے سب سامانوں کے اوپر اس ماہ کا شعاع رکھا۔ وہ اتنی نہال ہوئی کہ رو ہی پڑی۔
سسرال میں بھی سب ہی پیار کرتے ہیں۔ سب ساتھی ہوتے ہیں۔ رشتے بنتے ہیں۔ پر یہ پیار.... اتنا انوکھا، اتنا اپنا، اتنا سچا کیوں لگتا ہے؟

☼ ☼ ☼

شعاع پڑھنے میں وہ اتنی محو تھی کہ پاس پڑے موبائل پر میسج ٹون بجی تو اس کا دھیان ہی نہ گیا۔ قریب بیٹھے اپنے اپنے کاموں میں مصروف بہن بھائی اور چچازاد بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتے۔
"مہو یقیناً" نبیلہ جوادی کی کہانی پڑھ رہی ہے۔"

عمارہ نے سونو کو مخاطب کر کے کہا۔
"کس کی....؟" ڈائجسٹ نیچے رکھ کر مہو اور سونو نے مل کر پوچھا۔ بات تو کوئی نہیں تھی مگر تینوں ہی ہنس پڑیں۔
ہنسی کے دوران دوبارہ میسج ٹون بجی۔ جنید، عادی اور عمر اس کے لیے آئس کریم اور چاکلیٹس لائے تھے۔ دونوں چیزوں فریج میں رکھ کر سب نے رات کا کھانا مل کر بنانے کا فیصلہ کیا۔ سب ہی نے کچن میں دھاوا بول دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک ہڑبونگ مچ گئی۔
فروٹ کسٹرڈ بنانے کے لیے کسی نے فروٹ دھو کر کٹنگ کی، کسی نے بریانی بنانے کے لیے عمارہ کی مدد کی۔ کسی نے رائتہ بنایا۔ جب کہ بریانی کو دم پر رکھنے کے بعد آخر میں مہر نے سب کے لیے چائے بنائی۔
"کھانے سے پہلے چائے پینے کی کیا تک تھی بھلا؟"

"کیوں کہ کھانے کے بعد ہم کولڈ ڈرنک پئیں گے۔"

"آج بہت کام کر لیا ویسے...."
"کام.... کام.... کام دن رات کریں ہم کام
جب کام سے تھک جائیں تو خوب کریں آرام۔"

سب ہی نے بچپن کی یاد تازہ کرتے ہوئے لہک لہک کر کمرشل کو گنگنایا۔ باتیں تھیں۔ ہنسی تھی۔ مزا تھا۔ سکون تھا۔
اس دوران مہر کے موبائل اسکرین پر بہت سے میسجز جمع ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ابھی رات کے نو بج رہے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد سب ہی مل کر بیٹھے تو باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ برآمدے کے فرش پر بیٹھ کر وہ عادی کے ساتھ لوڈو کھیلنے لگی۔ عمارہ دادی کی ہدایت پر اس کو دیے جانے والے تحائف اور سامان

وغیرہ ایک جگہ اکٹھے کرنے لگی۔ کیونکہ کل اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔

فریج سے لیموں کا شربت' اسٹور سے اچار کے دو ڈبے۔۔۔ بیڈ شیٹ' کپڑے' کتاب' اس کا پرس۔۔۔ سونو' جنید اور عمران اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔

"اور کیا رہتا ہے؟" شاپر کے اندر ایک نظر ڈال کر تخت پر بیٹھی عمارہ کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

مہر کا دل ایک لمحے کو تیز دھڑک کر سمٹا تھا۔ گیم سے توجہ ہٹنے لگی۔ آزادی اور بے فکری کی مدت پوری ہونے والی تھی۔ مشینی زندگی اس کی منتظر تھی۔ دھڑکنیں مدھم ہونے لگیں۔ ذہن و نظر ہر منظر سے بددل ہونے لگے۔

"مہو! تمہارے نیو میسجز کی تعداد پچیس ہو گئی ہے۔" تھوڑی ہی دیر میں عمارہ اس کا موبائل لیے اس کے پاس آ بیٹھی۔

"تم اوپن کر کے پڑھتی جاؤ۔ میں سن رہی ہوں۔" اس نے ہر احساس سے نظر چرا کر فی الحال لوڈو پر توجہ مرکوز کر دی۔

"ہوں۔۔۔ سارے ہی ثوبان بھائی کے ہیں۔۔۔ تو میسج نمبر ون ہے۔"

"آفس کے بعد کھانا کھا کر سونے لگا ہوں۔"

"میسج نمبر ٹو۔۔۔ فریش ہو کر دوستوں میں جا رہا ہوں۔"

"رات کے دو بج رہے ہیں۔ میں کمپیوٹر پر کام کر رہا ہوں۔"

"مس یو مہو!"

"لو یو مہو!"

"تم اپنے امی ابو کے پاس جا کر میرے امی ابو کو بھول گئی ہو۔ امی کی طبیعت کل سے خراب ہے۔"

"بہن کی شادی کے موقع پر چھوٹا بھائی باپ سے ۔۔۔ پاپا! آپی اتنا کیوں رو رہی ہیں۔ دولہا بھائی کیوں نہیں رو رہے؟ باپ ۔۔۔ "بیٹا! آپی گیٹ تک روئیں گی۔ دولہا بھائی قبر تک روئے گا۔"

ثوبان کی امی کی طبیعت کا سن کر سب خاموش ہو گئے تھے۔ فی میسج پر سب ہنس دیے۔

قاصد! پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل
کہنا فقط یہ ان سے کہ آنکھیں ترس گئیں

"او۔۔۔ ہو۔۔۔ و۔۔۔" سب مل کر شروع ہو گئے۔ وہ سر جھکائے گوٹیں چلاتی رہیں۔

"تمہارے بغیر نیند نہیں آتی مہو! تم دو دن۔۔۔"

"بس باقی میں خود پڑھ لوں گی۔" اس نے موبائل لے کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

اب سارا دھیان ثوبان اس کے گھر اور اس کے گھر والوں کی طرف چلا گیا تھا۔

"ثوبان نے الماری بے ترتیب کر دی ہو گی۔"

"چولہا گندہ ہو گیا ہو گا۔"

"امی وقت پر دوا نہیں لیتی ہوں گی تب ہی بیمار۔۔۔"

"آپا! تمہاری گوٹ مر گئی۔" جنید چیخا تھا۔

"اللہ نہ کرے۔۔۔ وہ تو معمولی سی بیمار ہیں بس۔" دہل کر اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"کون؟" سب ہونق بن گئے۔

"ثوبان کی امی۔۔۔" اس نے کہا اور سب ہی ہنسنے لگے۔

"بدتمیز۔۔۔" اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہے۔ خفیف سا ہو کر موبائل اٹھا لیا۔

"مہر! میں پانچ دن کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔ امی کی طبیعت بھی بہتر ہو گئی ہے۔ تم چاہو تو کل آ جانا۔۔۔ چاہو تو میرے آنے تک مزید رہ لو۔"

ابھی بہت سارے میسج نیو بھی تھے۔ مگر اسی میسج کو اس نے دوبارہ پڑھا۔۔۔ پھر پڑھا۔

"یا۔۔۔ آ۔۔۔ ہو۔" لوڈو پر ہاتھ مار کر گوٹیں بکھیر دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد صحن ہنسی' قہقہوں اور گنگناہٹوں سے گونج رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نمبر ملاتے ملاتے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت پر پاؤں رکھا تھا۔ تب ہی ادھر سے کال ریسیو کی گئی۔

"آ گئی یاد میری؟" ثوبان کا لہجہ شکوہ لیے ہوئے تھا۔

"تو آپ نے کون سا مجھے دن میں دس دس بار کال کر کے بات کی۔" جواباً وہ بھی فوراً تپ گئی۔

"تمہارے پاس میرے ایک میسج کے جواب کا بھی ٹائم نہیں تھا۔"

"میسج کو چھوڑیں۔ یہ بتائیں مجھے کال کیوں نہیں کی۔ یاد ہی نہیں آئی ہو گی نا میری۔"

"تمہاری یاد۔۔۔ میرے میسج کھول کر۔۔۔"

"میسج میسج مت کریں۔۔۔ مجھے بتائیں مجھے کال۔۔۔"

"پاگل ہو تم۔۔۔"

"ہاں ہوں۔۔۔ پاگل سمجھ کر لاتعلق بن گئے ہیں۔ نہ بات کرتے ہیں نہ لینے آئے ہیں۔۔۔" ثوبان اس کی بات کاٹ کر وضاحت دینا چاہ رہا تھا اور وہ شکوے کیے جا رہی تھی۔

عادی ہاتھ میں بلا لیے اوپر آیا۔ ہوا میں بال اچھالتا پھر کیچ کرتا جنید اس کے پیچھے تھا۔

"آئیں آپا! کرکٹ کھیلیں۔" جنید پاس آیا۔ اس نے توجہ نہیں دی۔

"تم آنا چاہ رہی ہو؟" دوسری طرف ثوبان کی آواز آئی۔

"تو میں نہیں آنا چاہ رہی؟" غصے میں اس نے فوراً سوال کیا۔

"مہو آپا واپس جا رہی ہیں۔" جنید الٹے قدموں نیچے بھاگا۔ اطلاع پاتے ہی ایک ایک کر کے سب اوپر آنے لگے۔۔۔ جیسے وہیں سے چلی جائے گی۔

اس منظر پر اسے ہنسی نہیں آئی۔ ان سب کی آمد نے اسے ذرا متوجہ نہیں کیا۔

"کل شام ہی کراچی سے واپس آیا ہوں۔۔۔ اس وقت تمہارے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑا میڈیکل اسٹور سے امی کی دوائیں لے رہا ہوں۔ تم تیار رہو۔ شام میں آ رہا ہوں لینے۔" ابھی ثوبان کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ جھٹ کھڑی ہو گئی۔

"ابھی آ جائیں۔ میں تیار کھڑی ہوں۔" تیزی سے زینے کی طرف بڑھتے اس نے عجلت میں کہا۔

"یار! امی اور دادی لوگ کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیں گی میں ذرا جلدی میں ہوں۔"

"او کے آپ وہیں رکیے۔ میں میڈیکل اسٹور تک پانچ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔۔۔" اس نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ سب کے بیچ سے رستہ بناتی نیچے اتر آئی۔

"اچھا ٹھیک ہے محترمہ پاگل۔" ثوبان کی ہنسی سنائی دی۔

"میں جا رہی ہوں دادی!" تخت کے پاس رک کر اس نے دادی سے عجلت بھرا پیار لیا۔

"ارے ارے۔۔۔ رکو تو۔" امی اور چچی باورچی خانے سے دوڑی آئیں۔

"اپنی ساس کو سلام کہنا' میں آؤں گی ان کی عیادت کو۔" امی نے پکڑ کر سینے سے لگایا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" چچی نے پیار کیا۔ عمارہ نے لپک کر اسے شاپر تھمایا۔

"پاگلوں کی سنگت کا کچھ تو اثر ہو گا نا!" اس نے ثوبان کو جواب دیا تھا۔ ادھر سے سونو اس کا پرس کندھے پر ڈال رہی تھی۔ عادی' جنید اور ظفر کے منہ لٹک گئے۔

"لو کے رکھتا ہوں۔ اللہ حافظ۔"

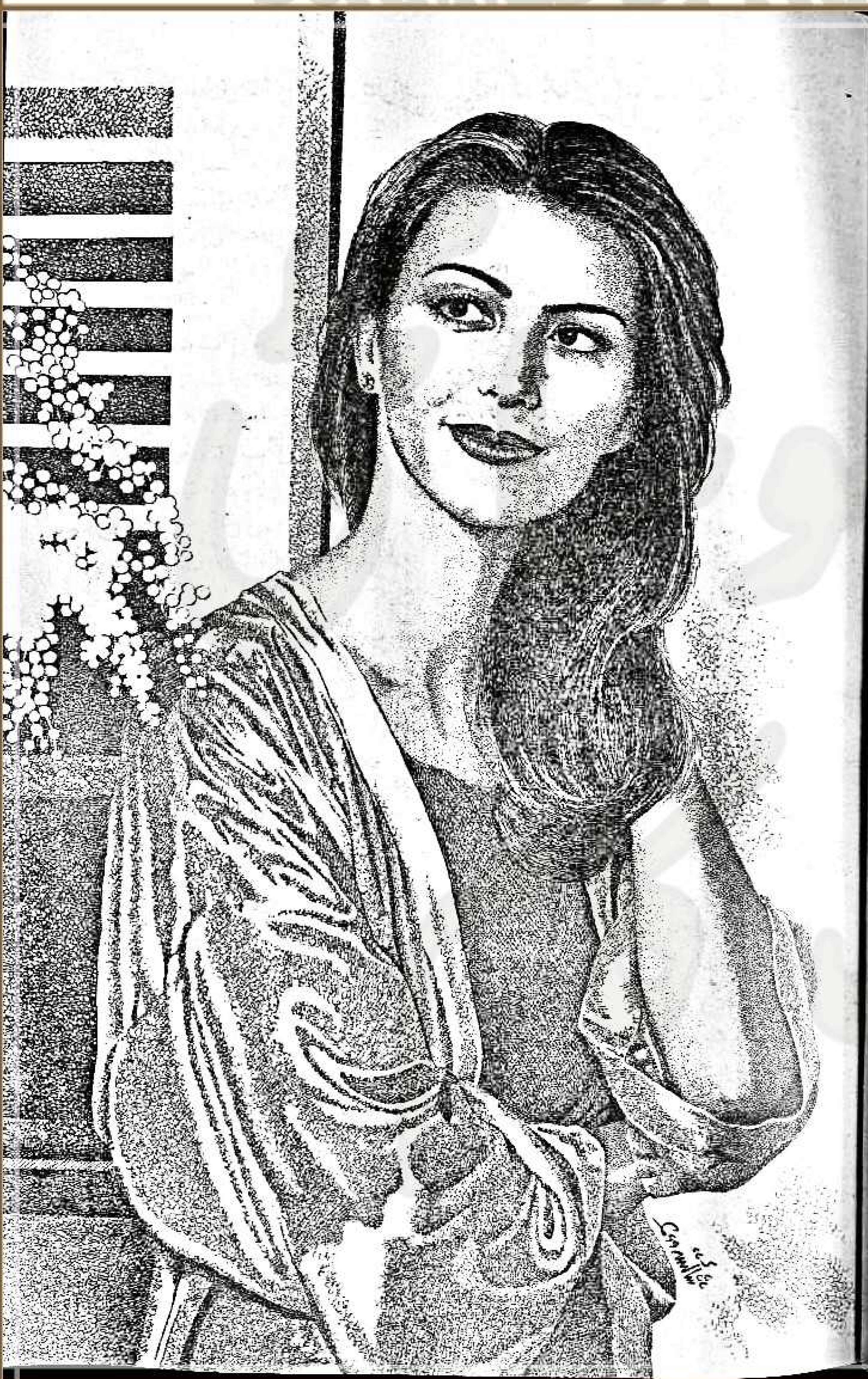
"اللہ حافظ امی' دادی چچی!"

"اللہ حافظ۔۔۔" پیچھے سے سب کی مشترکہ آواز آئی تیزی سے برآمدہ عبور کیا۔۔۔ بھاگ کر بیرونی دروازے تک آئی۔

چھ ماہ بعد آنے والی مہو چھ دن بھی میکے میں نہ رہ سکی۔ گلی میں تیز تیز آگے بڑھتی مہو نے ایک لمحے کو بھی مڑ کر اس دروازے کو نہیں دیکھا' جس پر وہ پانچ دن پہلے بچوں کے سے احساسات لیے دیر تک کھڑی گزرے دنوں میں کھوئی سونے کی خواہش رکھتی تھی۔ مہو انوکھی نہیں تھی۔

کیونکہ۔۔۔ ہر شادی شدہ لڑکی مہو ہی ہوتی ہے۔ جس کی آدھی سانس میکے میں تو آدھی سانس سسرال میں اٹکی ہوتی ہے۔

☼



ثمینہ عظمت علی

ہم انگریز چھوڑ گئے ہیں

امی بڑی دلچسپی سے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ ہر چینل پہ مدرز ڈے کے پروگرام آرہے تھے۔

"نئی نئی باتیں دیکھو تو ذرا۔" انہوں نے خود کلامی کی "ماؤں کا عالمی دن" ہاں بھئی کیوں نہیں آخر اتنے دن منائے جاتے ہیں۔ ہمارا بھی تو کوئی دن منایا جانا چاہیے۔" انہیں خود پہ فخر محسوس ہوا۔

"لیکن میرے بچے۔۔۔؟" انہیں ہلکی سی افسردگی نے آگھیرا "کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ آج مدرز ڈے ہے۔" انہوں نے ذرا اوپر ہو کر دروازے سے باہر جھانکنے کی سعی کی تاکہ گھر کی صورت حال کا جائزہ لیا جاسکے۔ ہمیشہ کی طرح اس زاویے سے ہال میں لگی تصویر کا آدھا حصہ نظر آیا۔ گھر میں اس وقت معمول کی خاموشی طاری تھی۔ ان کے بیٹے آفس اور پوتے پوتیاں اسکول جاچکے تھے۔ بہوئیں شوہروں اور بچوں کو گھر سے روانہ کرنے کے بعد والی نیند لے رہی تھیں۔ گھر کی ملازمہ عموماً" اس وقت پچھلے حصے میں کپڑے دھویا کرتی تھی یا پھر استری لیکن فارا؟

وہ تو صبح ان کو خدا حافظ کہہ کر گئی تھی۔ حسب معمول ہوا کے گھوڑے پہ سوار اور اسکول سے لیٹ ہوتی ہوئی۔۔۔ ادھر سلائس پہ ہاتھ مارتی' دوسرے ہاتھ سے آئی پیڈ اور نہ جانے کیا کیا سنبھالتی۔ بیگ الگ ٹھنسا ہوا' چارٹس ورک شیٹس۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کے دس ہاتھ ہوتے۔

"امی! آج تو بہت کام ہے۔" اس نے آج صبح بھی کسی معمول کی طرح یہ جملہ دہرایا تھا۔

"تمہیں کس دن کام نہیں ہوتا!" امی کو کبھی اس کی ہڑبونگ سمجھ نہیں آئی تھی۔ صرف امی کی کیا انہیں تو کسی کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر اس قدر افراتفری کیوں ہے؟ سب کو اتنی جلدی کاہے کی ہے' کہاں سے آرہے ہیں' کہاں بھاگے جارہے ہیں' گویا فلم میں کسی نے فاسٹ فارورڈ کا بٹن دبادیا ہو۔۔۔ ایک ہاتھ سے کئی چیزیں پکڑنے کی جستجو' منزل پر جلد از جلد پہنچنے کی تگ و دو۔۔۔ لیکن کونسی منزل؟ وہ بھی سمجھ نہیں پائیں۔

"اور۔" انہیں تعجب ہوا۔ فارا جیسی پڑھی لکھی' ذہین' ماڈرن اور اعلیٰ تعلیمی ادارے میں جاب کرنے والی لڑکی کو کیونکر یہ معلوم نہیں تھا کہ آج ماؤں کا عالمی دن منایا جارہا ہے۔ ورنہ ہوتا تو یوں تھا کہ وہ جب کوئی بات کرتیں' فارا کہتی "امی! آپ کو کیا پتا۔۔۔" نہیں لگتا کہ واقعی وہ اتنی بے علم ہیں اور ہر بات گویا فارا ہی کو پتا ہے۔ پھر آج کیا ہوا؟ خود آرٹ ٹیچر ہونے کے باوجود اس نے امی کو نہ کوئی کارڈ دیا' نہ پھول دیئے نہ وش کیا آئی لو یو امی بھی نہیں کہا اور نہ ہی اور کوئی پروگرام ظاہر کیا۔

اور آیان؟ وہ کہاں ہے؟ وہ تو آج خدا حافظ کہنے بھی نہیں آیا۔ بڑے بیٹے تو ناشتے' آفس اور بچوں کے شور شرابے میں اکثر ماں کو خدا حافظ کہنا بھول جاتے تھے لیکن آیان جو ابھی غیر شادی شدہ تھا اور میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہاؤس جاب کر رہا تھا' لاکھ جلدی ہولیکن ماں سے دو باتیں تو کر ہی لیتا تھا۔

ان کی نظر ٹی وی اسکرین پر پڑی جہاں ایک مشہور اداکارہ اپنی ماں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے

آنسو پونچھ رہا تھا۔ وہ بڑی متاثر ہو کر دیکھنے لگیں کہ سامنے سے آیان آتا دکھائی دیا۔

"السلام علیکم امی۔۔۔!"

"وعلیکم السلام۔۔۔ جیتے رہو۔"

"چلتا ہوں امی! آج بہت دیر ہو گئی اور واپسی میں بھی دیر ہو جائے گی۔"

"وہ کیوں بھلا؟"

"آج مدرز ڈے ہے امی' ماؤں کا عالمی دن۔ ہمارے ہاسپٹل میں پروگرام ہے اور مفت میڈیکل کیمپ بھی ہے۔ ہمیں وہاں کام کرنا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ ہاں وہ تو میں نے بھی ٹی وی پر دیکھا لیکن میرے بچے تو میرے ساتھ یہ دن نہیں منا رہے؟" ان کے دل کی بات زبان پر آہی گئی۔

"ارے امی۔۔۔" وہ ہنستا ہوا بولا۔ "ہم کوئی انگریز تھوڑا ہی ہیں۔" وہ ہنسا۔

"الاں' فلاں ڈے۔۔۔ یہ سارے مغرب کے چونچلے ہیں' ہمارا میڈیا ان کی تقلید میں مزید ان کو ہوا دیتا ہے۔ ہم کوئی ان کی طرح سال میں ایک بار اپنی ماں سے ملنے جاتے ہیں کیا؟ ہمارے تو سارے دن ہماری ماں کے ہیں اچھا چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔" وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نکل گیا۔

امی کے کلیجے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ "جیتا رہ میرا چاند۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ ماں کے لیے بھلا کوئی ایک دن ہے واقعی ہمارا ٹی وی تو ایسے ہی پاگل ہے۔" انہوں نے ذہن سے خیالات جھٹکے اور ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے گویا میڈیا کے پروپیگنڈے کا انتقام لے لیا۔

خاموشی سے لیٹ کر وہ تسبیح گھمانے لگیں۔

"کتنے دن ہو گئے' عروسہ نے چکر نہیں لگایا۔"

تسبیح کے گرتے ہوئے دانوں پر کوئی اور ہی گنتی شروع ہو گئی۔ عروسہ' ان کی سب سے بڑی بیٹی' پہلی اولاد' دوست زندگی کا سرمایہ ویسے تو ساری اولاد سے محبت تھی فطری بات۔۔۔ لیکن عروسہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے کتنے دن ہو جاتے ہیں اسے ملے ہوئے دیکھے ہوئے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ کوئی لمبی چوڑی ظالم سسرال تھی اس کی جہاں اس کو سارا دن کام میں جتے رہنا پڑتا تھا۔ بڑے پڑھے لکھے خوشحال اور لبرل لوگ تھے' کوئی کسی کی تیری میری میں نہیں پڑتا تھا سو بڑی بے فکری اور مزے کی سی زندگی تھی اس کی' بے تحاشہ محبت کرنے والا شوہر' کھلا ہاتھ' پیارے بچے۔۔۔ امی اس کی زندگی پر دن میں لاکھوں مرتبہ اللہ کا شکر ادا کرتیں اور اسی بے فکر زندگی نے تو عروسہ کو اور زیادہ لاپرواہ بنا دیا تھا۔ دکھ ہوتے تو دن رات ماں کے پاس بیٹھ کر دکھڑے روتی سکھ تھے سو اپنی زندگی میں مگن تھی۔

"عروج' دوسری بیٹی' فاصلہ ہی کتنا ساتھ والے پورشن میں۔۔۔ اس کی شادی اپنے چچا زاد سے ہوئی تھی۔ ساس سسر کا انتقال ہو چکا تھا نند بیرون ملک مقیم تھی سو وہ اپنے میاں کے ساتھ اکیلی ہی رہتی۔

اس کا کوئی بچہ نہیں تھا اور سرگرمیاں بے شمار' بے حد سوشل' مصروف' شوقین' شاپنگ' ہوم ڈیکور' انٹرنیٹ ہر طرح کے مشاغل تھے اس کے' یہاں آتی بھی تو تیز تیز چلتی تیز تیز بولتی۔۔۔ اس کو ہائے اس کو ہیلو' وہیں سے بائے' فارا سے جلدی جلدی بات کی بھتیجے کو Kiss کیا' ماں کو hug کیا اور یہ جا وہ جا۔ اکثر یہ سب کرتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ کی انگلی اپنے موبائل پر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں حرکت کرتی رہتی۔ کبھی اپنی تصویریں دکھاتی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے تیزی سے چھوٹی' بڑی ہوتی تصویریں گویا جادو۔

امی تو بس اس نسل کی پھرتیوں پر حیران ہوتیں رہتیں' ابھی کچھ زیادہ سال تو نہیں گزرے تھے کہ کیمرہ میں رول ڈلوائے جاتے تھے' خاص خاص مواقع پر بنوا کر چھتیس تصویریں پوری کی جاتی تھیں۔ پھر ان کی دھلائی کا انتظار ہوتا۔ خراب ہو جانے والی تصویروں پر اظہار افسوس۔

"ارے اس میں تو میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اوفو! روشنی زیادہ پڑ گئی۔"

"میرا منہ اس طرف ہو گیا وغیرہ۔"

پھر البمز سجائے جاتے اور شوق سے سب کو دکھائے جاتے۔ کسی کی شادی کا البم ہوتا تو سب کی باریاں لگتیں کہ آج کس کے گھر جائے گا اور اب۔۔۔ کلک سے موبائل سے تصویر لی' خراب ہوئی تو وہیں کے وہیں ضائع کر دی اور دوسری لے لی۔ اسی وقت چھوٹی بڑی' جو چاہا کر لیا اور اسی لمحے لندن' نیویارک لاہور' ہر جگہ پہنچ بھی گئی۔ دولہن ابھی رخصت بھی نہیں ہوئی کہ پوری دنیا سے کمنٹس بھی آ گئے۔

امی کی سوچیں گھومنے نکلیں تو ان ہی تصویروں کی طرح جانے کہاں کہاں نکل گئیں۔ سوچیں تو ان کی طرح اس کمرے اور گھر کی قید میں نہیں تھیں۔ وہ دوبارہ عروج کے بارے میں سوچنے لگیں۔

"اسے تو معلوم ہو گا کہ آج مدرز ڈے ہے۔" وہ ٹی وی بند کر کے بھی ان سوچوں سے چھٹکارا حاصل نہ کر پائیں اور یہی تو میڈیا کا کمال تھا۔ ٹی وی آف کرتے کرتے بھی کسی سوچ کا بیج تو آپ کے ذہن میں بو ہی دیا جاتا ہے۔

"عروج تو نہ جانے کیا کیا کرتی اور مناتی رہتی ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"چلو' میں ہی چکر لگا آتی ہوں۔ میں کون سا ایسی معذور یا بیمار ہوں۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے سوچا۔

انہوں نے کافی متحرک زندگی گزاری تھی اور اب بھی ایسی کوئی بیمار یا ہمت نہیں تھیں۔ بس گزشتہ چند سال سے ان کے بیٹے اور بہو ان کا بہت زیادہ خیال" رکھنے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب انہیں گھریلو معاملات کی فکر ترک کر کے زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔ ان کی ضروریات وہیں پوری کر دی جائیں گی۔ کچن سے بھی ان کا عمل دخل رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ بہوؤں کے طریقے ان سے نہ ملتے اور بچے جو کھاتے' ان چیزوں کے تو ان کو نام بھی نہیں آتے تھے۔ بڑی دعوتیں ہوٹل یا کیٹرنگ کے ذریعے نمٹائی جاتیں اور وہ دعوتیں ایسی ہوتیں جہاں امی کے مشہور زمانہ یخنی پلاؤ' پالک گوشت' نرگسی کوفتوں یا قیمہ بھرے کریلوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔

عروج حسب معمول اور حسب توقع اپنے ٹیب پر انگلیاں ادھر سے ادھر گھماتی ہوئی ملی۔ امی کو ڈائل والا فون یا زیادہ سے زیادہ پش بٹن والا فون تو یاد تھا لیکن انگلیوں پر ناچنے والا یہ آلہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ ان کے پاس ایک سادہ موبائل تھا جس پر وہ کال اٹینڈ کر لیتی تھیں اور گنتی کے چند نمبر جو اس میں تھے ان پر کال کر بھی لیتی تھیں لیکن اس سے زیادہ وہ اس جادو کو سمجھنے تک سے قاصر تھیں' اسی پر فون' اسی پر خط' اسی پر تصویر والا فون' کیمرہ اس میں' کلینڈر اس میں' الارم اس میں' آفس کا کام اس میں' دنیا بھر کا وقت اس میں' اعشاری نظام اس میں' قرآن پاک کی تلاوت بھی اس میں سن لو اور گانے بھی۔۔۔ فلمیں اس میں دیکھو۔۔۔

کیا کچھ نہیں تھا اس میں حتیٰ کہ دوست اقارب بھی اسی میں یعنی جو ساتھ جسمانی طور پر بیٹھا ہے اس کی فکر نہیں اور موبائل پر دور دراز بیٹھے کسی شخص سے باتیں ہو رہی ہیں کھیل اس میں کھیلے جا رہے ہیں' کتابیں اس پر پڑھی جا رہی ہیں۔۔۔ اف۔۔۔

"اوہو! امی! آپ اتنا چل کر کیوں آئیں؟ آپ کی ٹانگوں میں تکلیف ہو گی۔"

"کوئی نہیں ہوتی۔۔۔ میری کیا ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔" خاصی متحمل مزاج ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں ان کو غصہ آ گیا۔ "خود تو تمہیں آنے کی توفیق نہیں۔"

"ارے امی۔۔۔!" وہ ان کے اچانک غصے پر بوکھلا گئی۔ "ابھی تو آئی تھی۔" اس نے کہہ تو دیا۔ لیکن خود وہ اس "ابھی" کا تعین نہیں کر سکی۔

"اب اس مصیبت سے تو ذرا آنکھیں ہٹا لو۔" وہ جھلا گئیں۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ امی!" وہ بمشکل ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ "بس ایک منٹ۔۔۔ ضروری کام ہے۔"

کچھ دیر کے بعد آخر اس نے اس جام جم سے نگاہیں ہٹا ہی لیں۔

"کیا بتاؤں امی۔۔۔ کس قدر مصروفیت ہے' ابھی

پرسوں میری دوست کی شادی تھی' کل سلمان کے دوست آئے ہوئے تھے' کبھی یہ' کبھی وہ' سارا دن سوچتی ہی رہتی ہوں کہ ابھی امی کے پاس جاتی ہوں لیکن سارا وقت پتا نہیں کیسے اتنی جلدی گزر جاتا ہے' پھر آپ کا خیال آتا ہے کہ کہیں آپ سو ہی نہ رہی ہوں۔"

"لو! میں کیا سارا دن سوتی ہی رہتی ہوں۔" وہ چڑ ہی تو گئیں "اتنا لمبا دن۔۔۔ بس دیکھتی رہتی ہوں کہ۔۔۔"

"امی! آپ کی ماشاء اللہ خود اتنی مصروفیات ہیں' نماز' تلاوت پھر ٹی وی ہے' بچ امی آپ انٹرنیٹ چلانا سیکھ لیں تو پھر دیکھیں۔۔۔ آپ سے بھی بڑی عمر کی آنٹیاں میری دوست ہیں آپ کو۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا' وہ پھر اس میں لگ گئی۔ اس کا ٹی وی بھی آن تھا۔ لیکن آواز بند تھی۔

"عروج! یہ مدرز ڈے کیا ہے بھلا۔۔۔ بہت شور ہے کہ ماؤں کا دن منایا جا رہا ہے۔ لیکن میرے بچوں کو تو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ آکر ماں کے ساتھ یہ دن منائیں یہ دیکھو تو ذرا۔" جوں ہی عروج فارغ ہوئی' امی نے جھٹ سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

وہ ان کی بات سن کر ہنسنے لگی۔

"امی جان' اب بے چارے یہ ٹی وی چینلز کیا کریں' کھول تو لیتے ہیں لیکن اب چوبیس گھنٹے کے پروگرامز کہاں سے لائیں۔ بس جو نئی چیز ہاتھ لگی پورا مہینہ اس کے پیچھے خاص کر اگر کوئی انگریزوں کی بات ہو تو بس کیا ہی بات ہے' باؤلے ہی ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کیا ہم نے اپنی امیوں کو گھروں سے نکال کر اولڈ ہومز میں بھیجا ہوا ہے۔ ہمارا تو جب جی چاہے گا اپنی امی سے ملیں گے۔ ہمارے ہاں کی مائیں تو عزت سے اپنے بیٹوں کے گھر رہتی ہیں۔" اس نے اچھی خاصی تقریر جھاڑی۔

ابھی وہ اپنی باعزت زندگی پر غور ہی کرنے لگی تھیں کہ وہ بولی۔ "امی پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔ مجھے ایک انٹرویو کے لیے جانا ہے۔"

"کیسا انٹرویو۔۔۔؟"

"جاب انٹرویو۔۔۔"

"تمہیں کیا جاب کی سوجھی' اچھا خاصا کماتا ہے سلمان' گھر پر بیٹھو آرام سے۔"

"اوہو امی!" وہ جھلا ہی گئی۔ "ایک تو آپ کو ہر بات پر اعتراض ہوتا ہے۔ جاب کیا صرف کمانے کے لیے کی جاتی ہے۔ اتنا پڑھا ہے میں نے۔ میری ڈاکٹر نے بھی کہا ہے کہ جاب کر لوں ورنہ ڈپریشن کا شکار ہو جاؤں گی۔" اس کا اشارہ اپنی بے اولادی کی طرف تھا۔

امی غم زدہ سی ہو گئیں۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے عروج۔۔۔ میری بچی اپنی محرومی کو مصروفیات میں چھپاتی ہے۔" وہ بے حد ملول ہوئیں۔

"کتنی دعائیں' کتنی منتیں' کتنے وظیفے۔۔۔ بس اللہ کی مرضی۔۔۔ جب نوازے۔۔۔" وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آنے لگیں تو ملازمہ نظر آئی۔

"کھانا دے دوں جی آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"بھئی یہ سب لوگ کہاں ہیں آخر مہرین' راحیلہ" انہوں نے اپنی بہوؤں کا پوچھا۔

"وہ تو جی آج بچوں کے اسکول میں کوئی پروگرام ہے وہاں گئی ہیں' صاحب لوگ بھی وہیں گئے ہیں۔"

"اچھا!" انہوں نے سوچا۔ مجھے معلوم ہی نہیں اور نہ ان کے جانے کا پتا چلا۔

"کوئی کب مجھے کچھ بتاتا ہے۔" انہوں نے کمرے میں جاتے ہوئے آزردگی سے سوچا۔

"امتحانات کا مہینہ بھی نہیں کہ رزلٹ ہو گیا' پتا ان انگریزی اسکولوں کا۔۔۔ آئے دن یہ ڈے وہ ڈے۔۔۔ جیسا کہ آج مدرز ڈے۔۔۔" ان کی سوئی آکر پھر وہیں اٹکی۔

ماؤں کا عالمی دن۔۔۔

اور میں۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

میں بھی تو ایک ماں ہوں۔

میرے بچے اس قدر مصروف ہیں کہ ماں کے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں۔ شادی شدہ بیٹے ہیں تو اپنی فیملی میں مگن۔ ٹھیک ہے بیویوں کے حقوق ہیں' بچوں کے۔۔۔ آج کل روزگار کے حالات بھی سخت ہیں۔ مہنگائی' بہت مصروف رہتے ہیں' عروسہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں میں مصروف ہے تو اچھی بات ہے۔ میں کیوں روز اس کا انتظار کرتی ہوں' شادی شدہ بیٹی روز ماں کے پاس آ کر بیٹھ جائے گی تو اپنا گھر کیسے بچائے گی؟ فارا بھی میری خاطر سارا دن گھر بیٹھ جائے تو کون سی اچھی بات ہو گی بہتر تو یہی ہے کہ کوئی مناسب رشتہ ملنے تک اپنی جاب کرتی رہے عروج لاکھ ساتھ میں رہتی ہو' ہے تو شادی شدہ۔۔۔ اس کے اپنے سو کام ہیں۔

وہ خود ہی اپنے الزامات کے خلاف اولاد کے حق میں دلیلیں دے دے کر ان کو بری کرتی رہیں۔

ماں کے دل کی عدالت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں۔

لیکن آج یہ کیا تھا کہ دل کا کوئی حصہ بحث پر اتر آیا تھا۔

"کتنی بھی مصروفیت ہو' ماں کی اہمیت تو ہے اپنی جگہ۔۔۔" دل نے کہا۔

"کیا نہیں ہے میرے پاس۔۔۔" انہوں نے جواب دیا۔ شوہر کے انتقال کے بعد بیٹوں کا ساتھ' آرام' آسائش" انہوں نے اپنے آرام دہ بیڈ' صوفہ' اے سی ٹی وی' ڈسپنسر پر نظر ڈالی۔

"ہاہا۔۔۔ کیا یہ سب چیزیں اولاد کا نعم البدل ہیں؟ کیا یہ چیزیں مہیا کرنے کا مطلب کہ وہ ان کی کمپنی سے محروم رہ جائیں۔۔۔ گھر ان کے شوہر کا بنایا ہوا' آج تک انہیں اپنے شوہر کے پیسے ملتے تھے' علاوہ آئے دن کسی نہ کسی بچے کی مالی معاونت کرتی رہتی تھیں۔"

وہ اس دلیل پر ذرا کمزور سی پڑ گئیں۔

"گھر میں روایتی ساس بہو والی چخ چخ نہیں اس لیے کہ وہ خود ان کی مرضی کے مطابق گھریلو معاملات سے دستبردار ہو گئی ہیں۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے' کون آ جا رہا ہے' کیا سیٹنگ بدل رہی ہے انہیں کچھ پتا نہیں۔۔۔"

انہوں نے خیالات سے سخت گھبرا کر نماز کی نیت باندھ لی۔

فارا دھپ سے آکر صوفے پر لیٹ گئی تھی۔ ویسے تو اس کا کمرہ الگ ہی تھا لیکن اکثر گرمی میں وہ امی کے کمرے میں ہی آکر لیٹتی تھی کیونکہ اس کے کمرے میں اے سی نہیں تھا۔

"آج تو بہت ہی تھک گئی۔"

"کیوں؟" امی نے پوچھا۔

"ارے امی!" وہ بیزاری سے بولی۔ "مدرز ڈے کا فنکشن تھا اسکول میں توبہ۔۔۔ اتنے کارڈ بنائے ہماری میڈم بھی نا! بچوں نے ماؤں کو کارڈز دینے ہیں اور بنائیں ہم۔" وہ سخت بیزار نظر آرہی تھی۔

"تمہارے اسکول میں فنکشن تھا' تم نے بتایا نہیں۔"

"امی! وہاں تو آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ کیا کیا بتاؤں۔۔۔"

"لیکن یہ تو مدرز ڈے کا پروگرام تھا' کیا اس میں ٹیچرز کی ماؤں کو دعوت نہیں تھی۔" فارا نے کچھ حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"آپ نے چلنا تھا کیا امی؟"

"تم کہتیں تو میں ضرور چلتی۔۔۔"

"امی! آپ تو ویسے ہی آج کل کے انگلش میڈیم اسکولز کے اتنا خلاف ہوتی ہیں' آپ کیا ان کے دن منائیں۔۔۔"

"ماں تو ماں ہی ہوتی ہے' مشرق کی ہو یا مغرب کی۔" انہوں نے اداسی سے کہا۔ "میں نے تو یہی سنا کہ مدرز ڈے پر بچے ماں سے ملنے آتے ہیں' دن مناتے ہیں۔"

"امی! میں نے تو بھائی جان اور آپی لوگوں سے کہا تھا کہ سب مل کر گھر پر ڈنر رکھتے ہیں لیکن انہوں نے توجہ ہی نہیں دی۔ اور منع کر دیا کہ امی کیا اب اس عمر میں انگریزوں والے دن منائیں گی اور امی تو گھر پر ہی ہوتی ہیں روز ملتے ہیں۔"

"روز۔۔۔" امی نے دل میں سوچا "ایک گھر میں رہنے والے بھی روز نہیں ملتے۔"

"عروسہ نے فون تک نہیں کیا۔" انہوں نے پھر کہا۔

"آپی تو بہت مصروف ہیں' عبیر کے رشتے کی بات چل رہی ہے شاید۔" اس نے سرسری طور پر کہا۔

"عبیر کا رشتہ؟" انہیں جھٹکا سا لگا۔ پہلی نواسی کا رشتہ ہونے جارہا ہے اور انہیں کسی نے بتانا تک گوارا نہیں کیا۔

"ابھی تو وہ اتنی چھوٹی ہے۔" وہ بولیں۔

"امی! کوئی ہائی فائی رشتہ ہی ہو گا اور ویسے بھی آج کل پھر سے چھوٹی عمر میں شادیاں کرنے کا ٹرینڈ آتا جارہا ہے۔"

امی نے بغور فارا کو دیکھا۔

"کیا اس نے ان کو کچھ جتایا ہے۔ ان کی نظر میں تو خود فارا ابھی اتنی بڑی نہیں تھی۔ ہاں شادی کی عمر بھی مناسب لیکن اوور ایج نہیں تھی۔"

"اور یہ عروسہ ___ غیر شادہ شدہ بہن ہے ابھی بیٹی کی ایسی کیا جلدی اتنے لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی ہے فارا کے لیے ہی کوئی ___"

ان کو عجیب سے ملال نے آگھیرا۔

فارا اب اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے مکمل طور پر اس میں گم ہو چکی تھی۔ اسے اپنے status لکھنے تھے کہ ان کے اسکول میں کتنی شان و شوکت سے مدرز ڈے منایا گیا۔

امی نے اپنی بے چینی پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو کر آخر کار عروسہ کا نمبر ملا ہی لیا۔

"ارے امی! میں آپ کو فون کرنے ہی والی تھی۔"

"جب تمہیں فون کیا جائے تم یہی کہتی ہو۔" امی نے طنزاً" کہا۔

عموماً" ان کا یہ انداز گفتگو نہیں ہوتا تھا لیکن آج وہ تلخی کلام پر مائل تھیں۔

"آج تو واقعی کرنے والی تھی امی!" عروسہ نے کھلکھلا کر کہا۔ خوشی اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

"عبیر کا رشتہ ___" امی نے پوچھنا چاہا "جی امی' وہی تو بتانا تھا' اتنا اچھا رشتہ ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے' خوب صورت اعلا تعلیم یافتہ' ویل آف میں تو اتنی جلدی نہیں چاہ رہی تھی لیکن بس عبیر کو جب سے دیکھا انہوں نے گھر ہی پکڑ لیا ہے' ہمارا مانتی ہی نہیں ___ کہتے ہیں منگنی ہی کردیں۔"

"تو ___" امی نے پوچھا۔

"ہم نے ہاں کردی ہے امی!"

"مجھ سے ذکر تک نہیں کیا عروسہ' میں استخارہ کر لیتی عبیر کے لیے۔" عبیر ان کی لاڈلی نواسی تھی۔ خدشات تو لازم تھے۔

"ارے امی! اللہ سب اچھا کرے گا' اسی کا نام لے کر کرتے ہیں ہم سارے کام' لیکن آج تو انہوں نے مجھے بوکھلا ہی دیا ہے۔" عروسہ نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" امی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"بھئی' وہ عمار ہے نا' وہی میرا ہونے والا داماد' اکلوتا ہے تو اس لحاظ سے بہت لاڈلا ہے۔ ماں کی تو جان ہے اس میں اور اس کی ماں میں' اس کا اصرار ہے کہ چونکہ آج مدرز ڈے ہے اور یہ اس کی ماں کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے تو آج کوئی چھوٹی موٹی رسم ضرور کر دی جائے۔ میں نے کہا بھی کہ اچانک ہم کیسے کریں میری ماں ہیں' بہن بھائی' سسرال ___ لیکن بس اس کی ضد ہے کہ آج صرف فیملی میں ہی کچھ ہو جائے' بڑی منگنی بعد میں دھوم دھام سے کریں گے ___ اب اگر صرف فیملی بھی ہو تو ایک دم ارینج منٹ' ظاہر ہے کہ ایسے ہی تو ___"

عروسہ تو نہ جانے کیا کیا تفصیل بتاتی رہی لیکن امی بس ایک لفظ مدرز ڈے پر اٹک کر رہ گئیں۔

"آخر یہ لفظ آج میری جان کیوں نہیں چھوڑ رہا نہ آج صبح صبح ٹی وی کھولتی اور نہ یہ اس شوشے کا علم ہوتا" انہوں نے خود کو کوسا "لیکن ___ اس سے کیا ہوتا زیادہ سے زیادہ مجھے ہی پتا نہ چلتا' نہ میرے بچے مجھے بتاتے' باقی تو ساری دنیا لگتا ہے اپنی ماؤں کے لاڈ اٹھانے میں لگی ہوئی ہے۔"

"عروسہ! اور تم مدرز ڈے پر میرے پاس نہ آئیں۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"ارے امی۔ ہم کوئی انگریز ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

وہ چپ سی ہو گئیں۔ یہ نہ کہہ سکیں کہ یہی جواب اپنے داماد کو کیوں نہ دیا' لیکن کہنے سے کیا ہوتا۔ بیٹی سوچتی کہ ماں اس کی اولاد کی خوشی پر خوش نہیں ہے' شکوہ جو بھی تھا' ایسا تو ہرگز نہیں تھا۔

"اللہ خوش رکھے بیٹا! اللہ عبیر کو بہت خوشیاں دکھائے۔" انہوں نے دل سے دعا دی اور فون بند کردیا اور خاموش ہو کر لیٹ گئیں۔

ٹھیک ہے جاب کرنا غلط نہیں' نہ فارا کے لیے نہ عروج کے لیے ___ لیکن ماں اکیلی پڑی ہے۔ ڈپریشن جاب کرنے سے دور ہو گا؟ کوئی ڈاکٹر یہ تجویز نہیں کرتا کہ اپنی ماں کے ساتھ وقت گزارو' ان کی خدمت کرو تو دل کو تسکین ملے گی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو جہاد کی اجازت مانگنے والوں سے بھی پہلے یہ ہی دریافت فرمایا کرتے تھے کہ گھر میں ماں ہے یا نہیں؟ جاکر اس کی خدمت کرو۔ ماں کی آغوش سے بڑھ کر کوئی چیز اینٹی ڈپریسنگ ہو سکتی ہے بھلا ___

جاب' جاب کی تھکن ___ بس یہی ہے زندگی؟ ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے انہیں نیند نے آگھیرا۔

☼ ☼ ☼

مختلف آوازوں کی وجہ سے ان کی آنکھ کھل گئی تو وہ ٹائم دیکھ کر چونک گئیں۔ وہ کافی دیر سو گئی تھیں۔ انہوں نے مغرب کی نماز ادا کی کچھ دیر کسی کے آنے کا انتظار کیا پھر خود ہی باہر نکل آئیں۔

ان کے بیٹے' بہوئیں' بچے سب ہال میں جمع تھے' گھما گھمی سا ماحول تھا۔ فارا ابھی وہیں بیٹھی تھی۔

"امی ___! آیئے ___" ان کے بیٹے نے کھڑے ہو کر ان کو جگہ دی۔

"ارے امی ___ آپ کیوں باہر آئیں۔" ان کی بڑی بہو نے جو شوہر کے یوں فوراً" کھڑا ہونے پر جز بز ہو رہی تھی فوراً" کہا۔

"کوئی کام ہے کیا؟ میں ابھی چائے بھیجنے ہی والی تھی۔"

"بس ایسے ہی اکیلے بیٹھ بیٹھ کر گھبرا گئی تھی۔"

"دادو' یہ دیکھیں' مجھے پرائز ملا' میں نے اسپیچ کی تھی ان کے پوتے نے ایک پیکٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

"جیتا رہ میرا بچہ۔" وہ نہال ہو گئیں اور اسے خود سے لپٹا کر چٹا چٹ اس کے بوسے لینے لگیں ___ ان کی بہوویں پہلو بدل کر رہ گئیں جن کو پیار کے یہ روایتی اور دقیانوسی طریقے پسند نہیں تھے۔

"کیا موضوع تھا؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مدر ___ ماں۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا! تم نے اپنی تقریر میں کیا کہا؟"

"دادو' میں نے تو انگلش میں اسپیچ کی تھی۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا تو سب ہنسنے لگے۔

"اسٹوپڈ' تھوڑی سی اردو ٹرانسلیشن بتا دو نا۔" اس کی بہن نے اس سے کہا جو اس سے ایک سال سینئر تھی۔

"اچھا میں بتاتی ہوں ___"

"دادو جو مدر آئی مین ماں ہوتی ہے اس کے پیروں میں جنت ہوتی ہے۔ مدر کے بڑے رائٹس ہوتے ہیں ان کو ہمیشہ ادب کرنا چاہیے ورنہ اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی ماں کی خدمت کریں۔"

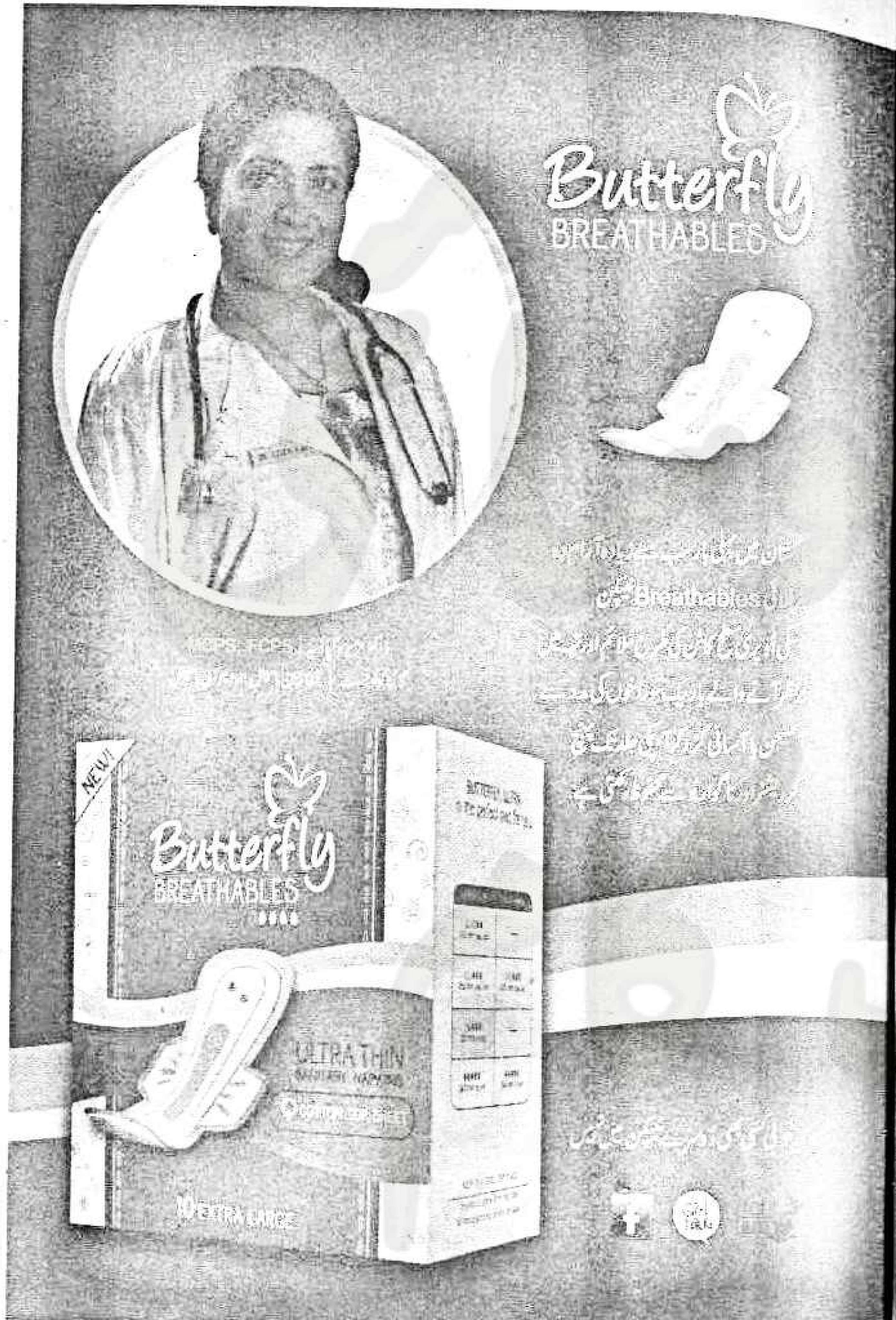
"شاباش!" وہ بہت خوش ہوئیں۔

"دادو! ہم نے اپنی ممی کو کارڈ بھی دیا۔" ان کے دوسرے پوتے نے جوش سے بتایا۔

"اچھا! لیکن میرے بیٹوں نے تو مجھے کارڈ نہیں دیا۔" انہوں نے اپنے بیٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کی بہووں نے منہ دوسری طرف کر کے اپنی ہنسی چھپائی۔

"امی! یہ آج کل کے بچے' اسکولز میں ٹی وی پر' نیٹ پر جو دیکھتے ہیں بس وہی فالو کرتے ہیں اب انہیں



کوئی کیا سمجھائے کہ ماں تو ہر روز ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ کسی ایک دن کو ماں کے لیے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بس آج کل کا چلن ہے۔ آج کی جنریشن ہے لیکن ہم تو جانتے ہیں کہ یہ ہمارا کلچر تھوڑا ہی ہے۔"

امی خاموش سی ہو گئیں۔

آہستہ آہستہ کر کے سب وہاں سے اٹھتے چلے گئے اور وہ وہاں اکیلی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

کتنا عرصہ ہو گیا' ایک دن ایسا نہیں آیا کہ میرے سارے بچے ایک ساتھ گھر پر اکٹھے ہوں میرے کمرے میں بیٹھیں' مجھ سے باتیں کریں انہوں نے اپنے کمرے کی دیوار پر لگی مختلف تصویریں دیکھتے ہوئے سوچا۔

حتیٰ کہ عید پر بھی ایسا نہیں ہوتا سب کی مصروفیات الگ' عید کی نماز کے بعد سب سو جاتے' پھر جب تک عروسہ یا عروج آتیں' بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ سسرال چلے جاتے۔ چار سال پہلے ایک دن باپ کی برسی پر سب موجود تھے۔ اس کے بعد وہ دن بھی کسی نہ کسی تحفے کے بغیر گزرنے لگا۔

مدرز ڈے منانا ہمارا کلچر نہیں.....

ماں کو ایک کونے میں عضوئے معطل کر کے ڈال دینا ہمارا کلچر ہے!

کتنا دل چاہتا' مہرین' راحیلہ' عروج' عروسہ سب ان کے پاس آکر بیٹھیں۔ وہ اپنی بہوؤں کو اپنے بیٹوں کے بچپن کے قصے سنائیں۔ انہوں نے ان کو کس طرح بچ بچ جوتیاں گھسا کر تلاش کیا اس زمانے کے اپنے ارمانوں کی داستان سنائیں نت نئے ڈیزائنز ویر پہننے والی اپنی بیٹیوں اور بہوؤں کو بتائیں کہ انہوں نے ان کے جہیز اور بری کے کپڑے کتنے شوق سے بنوائے تھے کہاں کہاں سے کام کروائے تھے لیکن ان آج کی خواتین کو نہ تو الماریوں میں بند ان کپڑوں سے دلچسپی تھی اور نہ ان کے ایک ایک ٹانکے میں سلی ہوئی ماں اور ساس کی یادوں سے..... متروک کپڑے' متروک ماضی۔

پوتے اور پوتیوں کو گود میں لے کر کہانیاں سنانے کی حسرت ہی رہ گئی کہ کینڈی کرش ساگا کی جنریشن کو ان اولڈ اسٹوپڈ اسٹوریز میں کوئی چارم نظر نہیں آتا تھا۔

گھر میں رکھی میز' الماری' کرسی کی طرح کی کوئی چیز تھیں وہ بھی.....

ممتا کی پیاس اولاد کے چند رٹے رٹائے جملوں سے نہیں بجھتی تھی۔

آہ! وہ بے چین ہو کر بیٹھ گئیں۔

گھر میں ایک بار پھر خاموشی کا راج تھا۔ ان کے اندر بھی سناٹا اترا ہوا تھا۔

ان کے بیٹے اپنے بچوں کے پرزور اصرار پر ان کی امیوں کو ڈنر کروانے لے گئے تھے..... ایان کیمپ سے شدید تھک کر آیا تھا سو سو گیا تھا۔ عروج اور سلمان ایسے ہی کسی موضوع پر منعقد کیے گئے سیمینار میں جا چکے تھے۔ اور فارا عبیر کی چھوٹی خالہ ہونے کی وجہ سے اس کی دوست بھی تھی' وہ عروسہ کے گھر جا چکی تھی۔

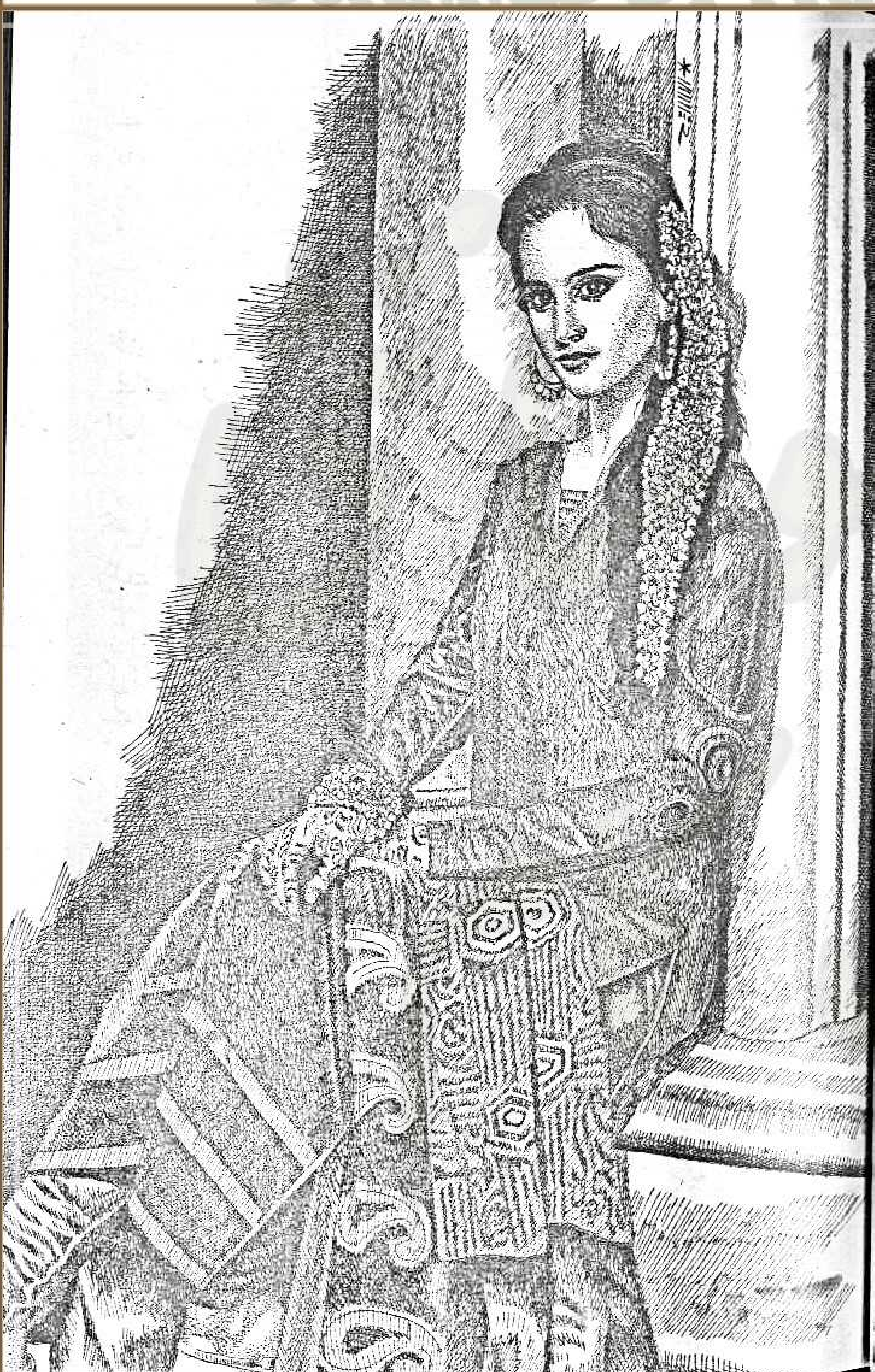
"اس سے تو اچھا تھا ہم انگریز ہی ہوتے' میرے بچے کم از کم ایک دن تو میرے ساتھ گزارتے۔" اس ایک دن کی یاد میں' میں پورا سال گزار دیتی۔ پورا سال اس ایک دن کا انتظار کرتی۔ جب میرے بچے ہار پھول لیے میرے پاس کھڑے ہوتے' میرے ساتھ کھانا کھاتے' میرے ساتھ تصویریں بنواتے مجھے تحفے دیتے ضروریات پوری کرنے اور تحفہ دینے میں تو فرق ہوتا ہے نا! لیکن واقعی!....."

انہوں نے ہال سے نظر آنے والی ادھوری تصویر پر نظر ڈالی اور پھر اپنے کمرے میں لگی سب کی تصویریں دیکھیں۔ ان کی نظر دھندلا گئی۔

ہلکی سی نمی کو صاف کرتے وہ بے بسی سے مسکرائیں۔

"ہاں واقعی! ہم کوئی انگریز تھوڑا ہی ہیں۔"

☼



نایاب جیلانی

مقدر سے دل

داناؤں کا قول ہے "محبت محض ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا نام نہیں' بلکہ ایک ہی سمت میں دیکھنے کا نام ہے۔ جہاں دیکھا' بس وہیں دیکھا' جسے چاہا' بس اسی کو چاہا۔ جسے سوچا' بس اسی کو سوچا' جس سے محبت کی بس اسی سے محبت کی۔ سمتیں بدلنے والے' راہیں بدلنے والے' جزیرے بدلنے والے اور جگہ جگہ پڑاؤ ڈالنے والے بھلا محبت کی رمزوں کو سمجھ سکتے تھے؟"

اسے جرمن دستائیل کا ایک اور قول بھی یاد آرہا تھا۔

"پیار ابدیت کا علم ہے۔ یہ وقت کے ہر احساس کو خلط ملط کر دیتا ہے۔ آغاز کی ہر یاد کو مٹا دیتا ہے اور انجام کے ہر خوف کو ختم کر دیتا ہے۔"

مگر چونکہ یہ کتابی باتیں تھیں اور حقیقی زندگی میں ان پر عمل کرنا خاصا مشکل ترین امر تھا اور پھر ویسے بھی اس واہیات' بے ہودہ اور انتہائی کیچڑ سی محبت نے ایک طویل عرصے تک اس کی انا' وقار اور عزت نفس کو تھپک تھپک کر گہری نیند سلائے رکھا تھا۔ مگر اس نازک گھڑی میں جب اس کی بے ہوش انا اپنے حواسوں میں آچکی تھی اور وہ ببانگ دہل جگہ جگہ کھڑے ہو کر اعلان کرتی پھر رہی تھی کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔

تب سب سے پہلے اس کی لاڈلی' دلاری نازک اندام تھوڑی کملی' تھوڑی سیانی بھابھی نیند بھری آنکھوں کو مسلتی گرتی پڑتی اسے کچن میں تلاش کرتی اس کی گردن تک پہنچ ہی گئی تھی۔

"وہ آگیا ہے۔ یعنی کچے دھاگے سے بندھے

ناولٹ



سرکار چلے آئے ہیں۔"

چونکہ سرکار کو کچے دھاگے سے نہیں فون کے تار سے کھینچ کر بلایا گیا تھا اور اس کامیابی کا سہرا اکلو بھابھی اور مائلہ کے سر بندھتا تھا۔ سو وہ اپنی تعریفوں میں رطب اللسان ہو چکی تھی۔ مگر نازک اندام بھابھی کی چلتی زبان کو بریک تب لگے تھے جب اکلوتی نند صاحبہ نے شعلہ فشاں نگاہوں سے گھورتے ہوئے مختلف اخباروں، جرائد اور رسائل میں سے چوری کیے مختلف اقوال ایک کے بعد ایک سنانا شروع کر دیے تھے، تب بھابھی نے ایک بلند چیخ کے ساتھ دونوں ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

"اب خدا کے واسطے! یہ مت بتانا مجھے، محبت عورت کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے اور مرد کی زندگی کا محض ایک واقعہ، یہ بھی جرمن دستائیل کا قول ہے اور میں نے خود پچھلے مہینے کسی پرانے جریدے میں پڑھا تھا۔"

اپنی دلاری بھابھی کے منہ سے پھڑکتا سچ سن کر اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ تب اس کا دھیان بٹانے کے لیے اور اپنے اندر کا زہر اگلنے کے لیے اس نے انتہائی غیض سے کہا۔

"بھاڑ میں جائیں سارے اقوال۔ ذرا اپنے اور میرے دشمن کو بتا آؤ۔ میں دس ماہ پہلے جوڑے گئے اس رشتے کو خود توڑ رہی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ اونچے، بلند اور گھنے درخت کسی شان سے کھڑے تھے۔ جن کے چمکتے پتوں پر نرم نرم چاندنی ٹہل رہی تھی۔ جب کوئی ننھا سا سفید بگولا مہتاب سے شرارت کرتا تو نرم نرم چاندنی سوسی کی اوٹ میں جا چھپتی۔

ایسی قیمتی گراں قدر، بیش بہا، بہتی چاندنی میں ڈوبی رات کبھی کبھی میسر آتی تھی۔ یہاں کوئی ایسا دن نہیں گزرتا تھا جب بارش نہ ہوتی ہو۔ جس دن بارش نہیں ہوتی تھی۔ اس دن وہ لوگ، ہر ونگ میں اودھم مچاتے تھے۔ یہاں بارش نہ ہونے پر بھی لطف اندوز ہوا جاتا تھا۔

بائیں ونگ کی بالکونی میں کھڑے ہو کر اس حسین، طلسماتی رات سے محظوظ ہونے کے بجائے داخلی دروازے کے سائن بورڈ کو تلملاتی نظروں سے گھور رہا تھا۔ بورڈ پر لکھے لفظ واحد سلطان کو احساس دلا دیتے تھے کہ وہ کلر کہار کی اس وادی میں ہنی مون منانے یا فیملی ٹرپ کے ساتھ نہیں آیا۔ وہ یہاں حصول علم کے لیے آیا ہے بلکہ زبردستی بھیجا گیا ہے۔ وہ اس سینٹرل جیل میں کبھی نہ آتا، اگر اس کی پیاری ماں زندہ ہوتی یا شفیق باپ پردیس جا کر ڈالر نہ کما رہا ہوتا۔ اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ اسے ایک ہٹلر ٹائپ چاچی اور انتہائی پڑھاکو چاچو کے زیر تربیت رہنا پڑا تھا۔

عماز چاچو بس نام کے ہی مہربان تھے۔ اسی طرح سمیعہ چاچی جن کو وہ ان کے چاروں لائق فائق بیٹوں اور اکلوتی انتہائی افلاطون بیٹی آئمہ کی طرح ممی ہی کہا کرتا تھا، بالکل اسم بامسمیٰ تھیں۔ انتہائی بلند و بالا خیالات کی مالک بہت عمدہ ترین ذہن رکھنے والی بہت اعلا وارفع اور اونچی قسم کی سوچ کی حامل، بے حد عالم فاضل اور قابل ترین ہستی تھیں۔ پھر ان کے چاروں بیٹے احد، ودید، موحد اور واعد بھی کمال کے لائق فائق بچے تھے۔ پھر آئمہ کے بھی کیا ہی کہنے تھے۔ جب سے پیدا ہوئی تھی، کتابیں گھول گھول کر پینے کے علاوہ اسے کوئی اور دوسرا کام نہیں تھا۔ وہ احد اور ودید سے چھوٹی جبکہ موحد اور واعد سے بڑی تھی۔ اسی طرح وہ ڈیڑھ دو سال واحد سے بھی بڑی تھی مگر خود کو واحد سے دس سال بڑا سمجھتی تھی۔ اپنے چھوٹے اور بڑے بھائیوں کی رہبر، رہنما تو تھی ہی واحد کی رہنمائی کے لیے بھی مری جاتی تھی۔

واحد کو پورا یقین تھا وہ مستقبل میں انتہائی بھیانک "داستانی" کے روپ میں سامنے آنے والی تھی۔ جبکہ آئمہ کے خیالات بھی واحد کے لیے کچھ مختلف نہیں

تھے۔ وہ اسے مستقبل کا مکینک کہتی تھی۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ واحد گاڑیوں کے چھوٹے موٹے کام سے لے کر گھر کی موٹروں کی خرابی تک ٹھیک کر لیتا تھا۔ تاہم اس کے ہنر پر فخر کرنے کے بجائے سمیعہ چچی اور آئمہ دونوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتی تھیں۔ دراصل وہ سمجھتی تھیں وہ اپنے کیریئر کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ ان کے اپنے بچوں کی طرح ہر وقت کتابوں میں سر دیے نہیں رکھتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ لائق یا ذہین نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس کا تعلیمی ریکارڈ بہترین تھا، مگر پھر بھی ممی کے نزدیک وہ کافی نالائق اور لاپروا لڑکا تھا۔ درپردہ اسے نہ صرف ممی بلکہ اکلوتے چاچو سے بھی بہت شکوے تھے، سو یہی وجہ تھی ممی کی طنزیہ گفتگو، دل جلانے والی باتوں کے باعث وہ مہینہ وار تعطیل پہ بھی لاہور اپنے گھر جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ لوگ گھر خوشی خوشی جایا کرتے تھے۔ ہفتہ پہلے ہی تیاریاں شروع کر دیتے تھے اور ایک واحد سلطان تھا جس کے لیے گھر کا تصور ہی محال تھا۔

گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنے والی ممی کے منظم ماحول کو لہو سہر کرنے کا معمولی سا جرم بھی ایک بڑی سزا سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ممی تو اپنے ڈاکٹر بیٹے تک کو اصول توڑنے کے جرم میں بے بھاؤ کی سنا دیتی تھیں، پھر ودید اور واحد کو تو ابھی بھی ممی شرارتیں کرنے، گھر سے باہر زیادہ وقت گزارنے اور رات دیر تک بغیر وجہ جاگنے پر جوتے سے دھلائی کر دیا کرتی تھیں۔ اکثر نہ صرف ان کا کھانا بند کر دیتی تھیں۔ بلکہ جیب خرچ بھی کھینچ لیا جاتا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک واحد ممی کے کئی طرح کے مظالم کا شکار ہوا تھا۔ اپنے اصولوں پر وہ کبھی بھی سمجھوتا نہیں کرتی تھیں۔ سو واحد کا بچپن ممی کے اصولوں، قاعدوں اور بلاوجہ کے قوانین کی نذر ہو گیا تھا۔ ممی اپنے بچوں کے لیے تو ایک سخت گیر ماں تھیں ہی مگر بن ماں کے اس معصوم بچے پر بھی انہوں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے تھے۔ وہ سونے کا نوالہ کھلا کر جب شیرنی کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ تب ان کا کھایا ہوا سونے کا نوالہ بھی ابل کا باہر آ نکلتا تھا۔

واحد کی بدقسمتی کی شروعات تب ہوئی جب اس کی پیاری ماں اسے بہت کم سنی میں بلکتا چھوڑ گئی تھی۔ تب وہ ممی کی ہٹلر ٹائپ گود میں خود بخود منتقل کر دیا گیا تھا۔ اسے آج تک یاد نہیں پڑتا تھا۔ ممی نے کبھی اسے شفیق نظروں سے دیکھا ہو۔ انہیں شاید الہام ہو گیا تھا کہ اگر انہوں نے واحد کے ساتھ کم از کم نرمی کی تو وہ اتھرا گھوڑا کبھی بھی قابو میں نہیں آ سکے گا۔ وہ فطرتاً شرارتی تھا، مگر یہ بہت بچپن کی بات تھی۔ ممی کے ظالمانہ، جابرانہ سلوک کے بعد تو اچھے اچھوں کے کس بل نکل گئے تھے۔ وہ تو پھر بے چارا سا واحد سلطان تھا۔ وہ فطری طور پر نہیں محض اس ظالمانہ سلوک کی بدولت خاصا اکھڑ اور بددماغ ہوتا چلا گیا تھا۔ پہلے وہ ممی کو شرارتوں سے زچ کیا کرتا تھا بعد میں اس نے ممی کو کچھ دوسرے ہتھکنڈوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا، جن میں سرفہرست اسکول سے ڈنڈی مارنا، بہانہ بنا کر چھٹی کرنا۔ یعنی ہفتے میں ایک آدھ دن اگر وہ اسکول چلا بھی جاتا تو واپسی میں اسے دوستوں سے ملاقاتوں کا خیال آ جاتا۔ غرض وہ رات کو جب ممی کے خوف سے تھر تھر کانپتا گھر میں داخل ہوتا تو ممی اس کی ٹھیک ٹھاک دھنائی کر کے رکھ دیتی تھیں۔

یہ اور بات ہے کہ واحد جیسے ڈھیٹ پر کم ہی کسی بات کا اثر ہوتا تھا۔ ہر روز اس کی حرکتوں کے باعث گھر کا ماحول خراب ہوتا تھا، نہ وہ دوستیاں ترک کرتا تھا نہ باقاعدگی سے اسکول جاتا تھا۔ پھر بھی کلاس میں پہلی پوزیشن اسی کی ہوتی تھی۔ مگر ممی کو ایسی پوزیشن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سارا سال کھیل کود میں ضائع کر کے آخری دنوں میں رٹے مار کر پوزیشن لینے والے لوگ بھلا ممی جیسی لائق فائق ہستی کی نظر میں جگہ بنا سکتے تھے؟

ممی کا خیال تھا۔ وہ چاچو کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے اتنا بگڑ چکا ہے کہ اسے کسی بورڈنگ کی سختیاں ہی

سدھار سکتی تھیں۔ سو اس کے پیروں میں ممی نے بیڑی ڈالنے کے لیے سیونتھ اسٹینڈرڈ کے بعد ـــ یہ ظالمانہ حل سوچا تھا۔ اس کے امریکہ میں مقیم ڈیڈی سے باہمی مشاورت کے بعد اسے فیصل آباد خالہ کے گھر بھیجا گیا تھا۔ خالہ کے گھر بھی وہ تنہا نہیں آیا تھا۔ ممی یہاں بھی اس کے ہمراہ آئی تھیں۔ اپنی سلطنت کو وقتی طور پر اپنی پڑھاکو بیٹی اور سکینہ بی کے حوالے کرکے وہ واحد کے ساتھ تین' چار دن کے لیے فیصل آباد آئی تھیں۔ وہ جو خالہ کے گھر آنے پر بہت خوش تھا کہ خالہ صاحبہ کے تینوں لائق بیٹوں کے ساتھ خوب کھیلے کودے گا۔ کرکٹ کا میچ رکھے گا یا فیصل آباد کے بازار روندنے نکل جائے گا۔ سارے نادر و نایاب منصوبے اس وقت دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

جب ممی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے انٹری ٹیسٹ کلیئر نہیں کیا تو اسے حسن ابدال بھیج دیا جائے گا۔ واحد کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس نے ممی کی توقع کے برعکس بہترین نمبروں سے انٹری ٹیسٹ پاس کرلیا۔ انٹرویو کے دوران بقول اس کے گروپ فیلوز جزائر انڈیمان کے صدر یعنی جنرل صاحب کو واحد سلطان نے اپنی حاضر جوابی' برجستگی اور بقول آئمہ کے چالاکی و مکاری کی بدولت متاثر کرلیا تھا۔ وہ تب سے لے کر اب تک یعنی پانچ سال گزرنے تک جنرل صاحب کا بہت پسندیدہ رہا تھا۔

یہ انٹرویو اس کی کم سنی کا سب سے پہلا اور یادگار انٹرویو تھا۔ بورڈ کے ارکان نے واحد سے جتنے بھی سوال پوچھے تھے' سب اس کے فیملی بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ آج تک جنرل صاحب کے ان غیر ضروری سوالات پر حیران ہوتا تھا۔ جنرل صاحب کچھ دیر کھوجتی نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد بڑی مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولتے تھے۔ یہ اس روایتی انٹرویو میں پہلا غیر روایتی سوال تھا۔

"ویری گڈ ڈے ٹو ینگ بوائے! میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" جنرل صاحب نے پیپر ویٹ گھماتے ہوئے بڑی پیاری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ بہت ہی حلیم' شفیق اور عمدہ اخلاق رکھنے والے ایڈمنسٹریٹر تھے۔

"کیا تم پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی اور اچھا آدمی بن کر اپنے ڈیڈ کے پاس امریکا فلائی کر جاؤ گے؟" جنرل صاحب کا سوال عجیب نہیں تھا اور اپنے ڈیڈی کے پاس امریکا جانا اس کا بہت پرانا خواب تھا مگر اس نے کہا۔

"سر! میری پہلی ترجیح تو پاکستان ہی ہے۔" اس نے سنجیدگی کے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا' اس کے جواب نے کہاں تک بورڈ کے ارکان کو متاثر کیا تھا۔ تاہم انٹرویو کے اختتام پر اسے ایک سلپ ضرور مل گئی تھی اور اب تو پانچ سال گزرنے والے تھے۔

اگرچہ اس "پورٹ بلیر" میں قیدیوں جیسی لائف گزارنا کچھ آسان نہیں تھا مگر ممی کے خوف اور چاچو کے غیض سے گھبرا کر وہ یہاں رہنے کا پابند ہوگیا تھا۔ اس کے سارے دوست اونچے پہاڑوں پر موجود اس عظیم درس گاہ کو ہندوستان کا کالا پانی کہا کرتے تھے مگر اپنی زندگی کے یہ لازوال پانچ سال بھولنا دنیا کے کسی بھی کیڈٹ کے بس کا کام نہیں تھا۔

یہاں آتے ہوئے بھی رویا جاتا تھا اور جاتے ہوئے بھی رویا جاتا تھا۔

یہ بہرحال ممی کی قید سے بہتر تھا۔ گھر میں تو اگر کوئی وقت پہ ڈائننگ ٹیبل تک نہیں آپاتا تھا تو اسے دوبارہ کھانا نہیں دیتی تھیں۔ اسی طرح جو گھر میں دیر سے آتا' اسے پوری رات لان میں گزارنا پڑتی۔ ممی نے شروع سے انہیں اپنا اپنا کام کرنے کی عادت ڈالی تھی۔ جوتے پالش سے لے کر کپڑے استری کرنے تک۔ سو یہاں آکر واحد کو کچھ پرابلم نہیں ہوئی تھی۔ تاہم ممی کے حصار سے نکل کر زیادہ نہ سہی کچھ آزادی پاکر وہ تھوڑا مطمئن ضرور تھا' کیونکہ ممی کے علاوہ ان کی اکلوتی بیٹی کی خطرناک کلاسز یہاں کے بھیانک لیکچرار سے بھی زیادہ بری اور صبر کا امتحان تھیں۔

واحد سلطان کی عموماً" خواہش یہی ہوتی تھی کہ اسے گھر نہ جانا پڑے' لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ پرسوں اتوار کا دن تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی دل پر بھاری بھرکم پتھر رکھ کے وہ لاہور جانے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرچکا تھا۔ مگر یہ طلسماتی رات' ستاروں سے سجے آسمان اور بھیگتی چاندنی جیسی حسین رات کا سحر تھا کہ وہ کچھ پل کے لیے سب کچھ بھول گیا تھا۔ حالانکہ وہ پورٹ بلیر یعنی کیڈٹ کالج کلر کہار کے بابر ونگ کی بالکونی میں کھڑا تھا اور یہاں صرف صبح سویرے پی ٹی آئی سر منصور کی بھیانک آواز کانوں کے پردے پھاڑا کرتی تھی۔ کالج کے ہر ونگ میں بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ تمام کیڈٹس کمبل' لحاف' چادریں اٹھا اٹھا کر پھینکتے کپڑے بدلتے' جوگرز کے تسمے کستے طویل گیلریوں سے بھاگم بھاگ کر نکلتے ہوئے گراؤنڈ میں جمع ہوجاتے تھے۔

☼ ☼ ☼

واحد سلطان احمد جناح ونگ کا ونگ کمانڈر تھا۔ جناح ونگ میں نیو کمرز آئے تھے۔ ہر سال 8th اسٹینڈرڈ میں نیو اپائنٹمنٹس ہوا کرتی تھیں' چونکہ واحد سلطان پورے کالج کا سی پی تھا' سوا سے نہ صرف اپائنٹمنٹ ملی تھی' بلکہ اسے جناح ونگ کا کمانڈر بھی بنادیا گیا تھا۔ وہ خود بھی اسی ونگ کے ساتھ منسلک رہنا چاہتا تھا۔

اسے آنے والوں سے خصوصی لگاؤ تھا۔ کبھی وہ خود بھی اس اسٹیج سے گزرا تھا اور نئے نئے یہ کم عمر لڑکے جب شروع شروع میں اپنے گھر والوں کی یاد میں کمبل یا لحافوں میں منہ دیے سسکاریاں بھرتے تھے' تب راؤنڈ پر آئے واحد کو ان پر ٹوٹ کے پیار آتا تھا۔ جبکہ خود واحد اپنے گھر والوں کو قطعاً" یاد نہیں کرتا تھا۔

اس کی زیادہ دوستی موحد سے تھی۔ واحد کی طرح موحد کو بھی ممی کے سخت رویے اور عظیم اصولوں سے چڑ تھی۔ وہ ویک اینڈ پہ اکثر اسے فون کرکے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑا کرتا تھا۔ اس سہ پہر بھی کالج ٹائم کے بعد وہ اپنا یونیفارم بدل رہا تھا۔ موحد کی کال آئی تھی۔

"یار! تو ابھی زندہ ہے؟" اس کی مصنوعی حیرانی نے موحد کو آگ ہی لگادی تھی۔ وہ جو بڑے خوش گوار موڈ میں تھا ایک دم بھنا اٹھا۔

"اگر مرچکا ہوتا تو تم ابھی کیڈٹ کالج کلر کہار کی حسین سرزمین پر ٹہلیں نہ کررہے ہوتے۔ لاہور آکر میرے تجہیز و تکفین کا انتظام کررہے ہوتے۔" واحد کو ہنسی آگئی۔

تب ہی ائرپیس سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی اور اس آواز کو سن کر واحد کا موڈ بھی خوش گوار نہیں رہ سکتا تھا۔

"واحد سے کہنا' ہائی نیک لازمی پہن کر رکھے اور شام سے پہلے کلر کہار کا موسم سخت ابر آلود اور ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں۔ اس کے دو' تین لانگ کوٹ اور کلوک امریکا سے آئے ہیں۔ اس سے پوچھو' کل آئے گا یا نہیں۔ ورنہ سامان ادھر ہی بھجوادیں۔

ممی نے سوہن حلوہ بھی بنوایا ہے۔ اسے یاد سے کہہ دو' رات کو سبز قہوہ لازمی پی کر سویا کرے۔ میں تو کہتی ہوں...."

وہ نان اسٹاپ بولے جارہی تھی۔ آواز اتنی بلند تھی کہ موحد کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ واحد نے من و عن اس کی تمام تقریر خود سن لی تھی۔ وہ افلاطون کی سوتیلی بہن نہ جانے خود کو سمجھتی کیا تھی۔ سو وہ اس بقراط کی وجہ سے بھی گھر نہیں جاتا تھا۔

اسے بس ایک ہی جنون تھا۔ ممی کی طرح نصیحتیں کرنا' بلاوجہ خود کو نہایت عقل مند' بردبار' عقل کل سمجھنا۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ اسے سب کا بہت خیال ہے۔

اسے کوکنگ کا بھی جنونی شوق تھا۔ وہ اپنی ٹف روٹین سے بھی وقت نکال کر اپنے بھائیوں کو ٹھنسانے

کے لیے نہ جانے کیا کیا بکواس ڈشز بناتی رہتی تھی۔
آج کل حلووں کی شامت آئی تھی۔ اسے اپنے پپا اور بھائیوں سے جھوٹی تعریفیں بٹورنے کا چسکہ بھی پڑ چکا تھا۔ اب یہ جھوٹی تعریفیں محض آئمہ کے پپا اور بھائی ہی کر سکتے تھے۔ واحد میں تو ایسا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ الم غلم پکا کر ہر تیسرے ویک اینڈ پر بھجوا دیتی تھی۔ پھر اس کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ واحد تعریف بھی لازمی کرے' جو کہ وہ قیامت تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بار بار پوچھتی۔
"تمہارے دوستوں کو پوری کچوری' کھوئے کی پڈنگ اور گوشت کے قتلے پسند آئے یا نہیں؟"
"نہیں۔" وہ بڑی رکھائی سے جواب دیتا۔ وہ اسے کیوں بتاتا کہ اس کے کمینے دوستوں کے سامنے تو گھر کی کی گھاس بھی رکھ دی جاتی تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتے اس گھاس کو بھی چر جاتے۔ پھر آئمہ تو خاصی چٹ پٹی اور میٹھی' نمکین ڈشز بنا کر بھیجا کرتی تھی۔ مگر اس کی تعریف کر کے واحد' آئمہ کو اترانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ واحد کو پورا یقین تھا کہ آئمہ اور اس کی سہیلی مختلف ڈشز میں تعویذ گھول گھول کر اسے بھیجتی تھیں' تاکہ وہ شان دار نمبروں سے فیل ہو کر ممی کی نظروں میں دو کوڑی کا ہو جائے۔ وہ اس کی ازلی دشمن تھی۔ ایک زمانے میں آئمہ کی جھوٹی شکایتوں کے باعث واحد کو ممی سے بہت مار پڑتی تھی۔ اگرچہ وہ شکایتیں جھوٹی نہیں ہوتی تھیں۔ وہ واحد اور موحد' آئمہ کو ہمدرد جان کر رازدار بنا کر گھر سے فلم دیکھنے اور دوست کے گھر جاتے تھے اور واپس آنے تک آئمہ ان کا کچا چٹھا کھولے خود بھیگی بلی بنے کتاب میں سر دیے بیٹھی ہوتی اور ممی جوتے سمیت ان دونوں کے سر پہ پہنچ جاتی تھیں۔
آئمہ کی غداری پر تو صفحے کالے کیے جاسکتے تھے۔ کتابیں بھری جاسکتی تھیں۔ اس نے ہمیشہ برے وقت میں واحد اور موحد کا ساتھ چھوڑا تھا۔ وہ جتنا مرضی اسے لالچ دے کر غائب ہوتے تھے۔ ان کے واپس آنے تک وہ ممی کے کانوں میں ان کی شرارتیں پھونک چکی ہوتی تھی۔ کئی مرتبہ آئمہ کی فضول شکایتوں پر اسکول ٹیچر نے پورے مجمع کے سامنے واحد کی کلاس لی تھی۔ ایک مرتبہ آئمہ کی سنگین غداری پر پرنسپل نے واحد کو تھپڑ بھی مارا تھا۔ دراصل ایک بہت اہم ٹیسٹ کے دن واحد نے جان بوجھ کر چھٹی کرلی تھی اور بہانہ بنایا تھا' وہ ممی کے ساتھ کسی فوتگی میں چلا گیا تھا۔ دوسرے دن پرنسپل نے آئمہ کو بلالیا اور اس سچ کی علمبردار نے پورے اسٹاف کے سامنے واحد کا پول کھول دیا تھا۔ جواباً" پرنسپل نے اس کے منہ پر بڑا سخت تھپڑ مارا تھا۔ شاید وہ آخری مرتبہ تب آئمہ سے بدگمان ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے آئمہ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ یہ سب بچپن کے قصے تھے۔ مگر واحد سلطان کے ساتھ ایک بڑا اذیت ناک مسئلہ تھا۔ وہ گزری باتیں کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ تو پھر آئمہ کی غداری کیسے بھول جاتا۔
اگرچہ بیتے وقت کے ساتھ کچھ بھی ویسا نہیں رہا تھا۔ نہ وہ بچپن والا شرارتی سا واحد سلطان تھا نہ ہی وہ شکایتی ٹوسی چالاک ٹائپ آئمہ عماز ویسی رہی تھی مگر جو گرہ واحد سلطان کے ذہن میں پڑچکی تھی' وہ بھی کھل نہیں سکتی تھی۔ وہ اب بھی موقع دیکھ کر ممی کو اس کے خلاف بھڑکانے سے باز نہیں آتی تھی۔
پچھلے ماہ آئمہ اور اس کی دوست نرجس عرف کملو کی وجہ سے چاچو اور ممی نے اسے بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔
ہوا کچھ اس طرح سے تھا کہ آئمہ محترمہ کی سال میں کوئی پانچویں سالگرہ منائی جارہی تھی۔ آئمہ نے اسے کہا تھا' وہ نرجس کو اس کے گھر سے لے آئے۔ ممی کے سامنے اس نے ہامی تو بھرلی تھی' پھر نرجس کو لینے کے بہانے نکل بھی گیا تھا مگر پھر جان بوجھ کر رات دس بجے قریب گھر آیا۔ گھر کے سب ہی افراد منہ پھلائے بیٹھے تھے۔
واحد پر ان کے پھولے منہ کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اطمینان سے ان کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ پھر ڈھٹائی

کے ساتھ اس نے بڑا سا آئس کریم کیک کا پیس اٹھا کر منہ میں رکھا۔ فروٹ چاٹ اور کوک سے لطف اندوز ہوا۔ کیچپ کے ساتھ کباب بھی چکھ لیے تب اسے خیال آیا کہ وہ اکیلا ہی کھائے جارہا ہے۔ اس نے گلا کھنکھار کر سب کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا مگر وہ تو سارے ہی گھور گھور کر اسے دیکھے جارہے تھے۔ تب واحد کو خیال گزرا کہ کیک پہ چھری بھی نہیں پھیری گئی تھی۔ سو وہ ذرا چونکا ہوا۔

"تم کملو کو لینے گئے تھے نا ایک ہی آئمہ کی دوست ہے اس کی ہر خوشی میں شریک ہوتی ہے وہ۔" واحد نے چبا چبا کر غصے کا اظہار کیا تھا۔ ودید بھی اسے ہی گھورے جارہا تھا۔

"او۔۔۔ نو۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا۔ آئمہ نے مجھے کملو کو لینے کے لیے بھیجا تھا۔" واحد بڑی یتیم سی صورت بنا کر اپنے بھلکڑپن کو ملامت کررہا تھا۔

"بہت جھوٹا ہے یہ کمینہ۔۔۔ اٹھارہ ٹیکسٹ کیے تھے کملو کو لے آؤ۔ مگر یہ جان بوجھ کر اتنی دیر سے آیا ہے۔ کملو بے چاری اتنا مہنگا سوٹ اتنی قیمتی جیولری پہنے انتظار کرتی رہ گئی۔ اس نے اتنا پیارا میک اپ کروا رکھا تھا۔ آج تو میں نے کملو کا آئی میک اپ دیکھ کر خود بھی سیکھنا تھا۔" اپنے نقصان یاد کرکے آئمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

اسے ممی سمیت سب کی بے بھاؤ کی اس سننی پڑی تھی۔ پچھلے مہینے کی اس بدمزگی کو سوچتے ہوئے اس وقت بھی واحد کا حلق تک کڑوا ہوگیا تھا۔ سو وہ انتہائی برے موڈ کے ساتھ فون بند کرنا ہی چاہتا تھا جب موحد کی آواز کے پیچھے ایک مرتبہ پھر آئمہ کی متفکر آواز سنائی دی تھی۔

"موحد! اس سے پوچھو تو سہی کل وہ آئے گا یا نہیں۔ میں اس کے لیے سنگاپوری رائس اور سلطانی دال کی کملو سے ترکیب پوچھ کر کچھ تو تیاری کرلوں۔"

وہ بڑی پریشانی کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ واحد ان سے ناراض ہوگیا ہے۔ وہ اس کے لیے چٹ پٹے کھانے بنا کر اسے منالینے کی ترکیبیں بھی سوچ چکی تھی۔ مگر واحد نے بہت کٹھورپن سے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ کہ وہ کل ہرگز بھی نہیں آئے گا۔ اس کا انتظار نہ کیا جائے۔ آئمہ تک واحد کا جواب خود بخود پہنچ گیا تھا اور نہ جانے کہاں سے کوئی اڑتی ہوئی گرد اس کی آنکھوں میں چبھن دینے لگی۔ وہ اپنے بھائیوں سے نظر چرا کر کچن میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼

واحد سلطان، عتیق سلطان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ عتیق سلطان عرصہ دراز سے امریکا میں مقیم تھے۔ ان کا اپنا مختصر سا بزنس تھا۔ واحد کی امی کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی پاکستان میں ہی کی تھی۔ بعدازاں اپنی فیملی کو بھی امریکا بلالیا تھا۔ تاہم واحد کو وہ اپنی ہٹلر ٹائپ بھاوج کے سپرد کرگئے تھے۔ دراصل ان کا خیال تھا واحد کی اچھی تربیت اور پرورش امریکا جیسے ملک میں بہترین طریقے سے نہیں ہوسکتی۔ کچھ وہ فطرتاً "لاپروا" تھوڑا آزاد خیال تھا اور پابندیوں سے سخت گھبراتا تھا۔ انہیں اپنی بھاوج اور بھائی پر بڑا بھروسا تھا، مگر وہ کبھی بھی اپنے بیٹے کی تعلیم اور اس کی ضرورتوں سے غافل نہیں رہے تھے۔ اسے ہمیشہ مہنگے ترین اسکول اور پھر انتہائی اعلا ساکھ رکھنے والے کالج میں داخل کروایا تھا۔ اس کے باوجود واحد کے شکوے کبھی ختم نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنے باپ سے بھی ناراض تھا کہ وہ اسے امریکا نہیں بلواتے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ اسے بلاوجہ کی روک ٹوک اور پابندیوں کے حوالے کرکے اس کے باپ نے اچھا نہیں کیا۔ تاہم وہ جانتا نہیں تھا۔ عتیق سمیت سمیعہ اور عماز بھی اس کی بھلائی کے لیے کہاں کہاں اپنے دل کو مارتے رہتے تھے۔ یہ اس کی اچھائی اور بھلائی کی سب سے بڑی مثال ہی تو تھی۔ سمیعہ نے اسے بورڈنگ بھجوادیا تھا۔ ورنہ واحد کو آنکھوں سے اوجھل

کرنا کہاں ممکن تھا مگر واحد ان چیزوں کو سمجھتا ہی نہیں تھا۔ وہ ان سے تب بدگمان ہوا تھا۔ جب اسے ہاسٹل بھجوادیا گیا تھا۔ وہ 8th اسٹینڈرڈ میں یہاں آیا تھا اور اب اس کالج میں اس کا آخری سال تھا۔ اس کے بعد اس نے کہاں جانا تھا؟ یہ سب وہ بہت پہلے ہی پلان کرچکا تھا۔

مگر فی الحال اسے کچھ بھی واضح نہیں کرنا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بہت آگے تک کا سوچ چکا تھا مگر تقدیر کے پھیر نے اس کی تمام پلاننگ لبریز کردی تھی۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا اس کے برعکس نہ جانے کیسے ہوگیا تھا۔

ہوا کچھ اس طرح سے تھا کہ اس اتوار کو واحد نے سابقہ غصے کے تحت گھر جانے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ سو اتوار والے دن اس کی مصروفیت بھی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اسے جناح ونگ کے بچوں کو ان کے گھروں میں بھجوانے، ان کے سامان چیک کرنے اور والدین کے حوالے کرنے کے متعلق اپنے اسسٹنٹ کو ہدایات دینی تھیں۔

اتوار کو دو بجے سے پہلے سلور سوک میں ٹھونس ٹھانس کر اس کا پورا قبیلہ ملنے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ ممی کی طبیعت خراب تھی۔ وہ آنہیں سکی تھیں مگر ودید، موحد، واحد کے ساتھ آئمہ اور آئمہ کی اکلوتی فرینڈ کملو بھی جلوہ افروز تھی۔ اگرچہ کملو بھی آئمہ کی طرح واحد سے ڈیڑھ دو سال بڑی تھی تاہم وہ واحد کو نام سے نہیں پکارتی تھی بلکہ بھائی کا صیغہ لگالیتی تھی۔ وہ بھی جان بوجھ کر جس کو "کملو آپی" کہا کرتا تھا۔

وہ ہونق پن سے ان سب کو ڈگی میں سے بڑے بڑے باٹ پاٹ نکالتے دیکھ رہا تھا۔ وہ کیسے خوش باش نظر آرہے تھے۔ گویا اسے اطلاع دے کر آنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ وہ جلتا کلستا ان کی کارروائیاں دیکھتا رہا۔

لڑکیاں سامان رکھ کر اب اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں جبکہ ودید اس کی خاموشی محسوس کرکے قدرے خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"اسے دو چار جھانپڑ لگاؤ۔ کیسے ہونقوں کی طرح دیکھے جارہا ہے جیسے ہمارے سروں پر سینگ اگ آئے ہیں۔"

ودید کے ٹوکنے پر بالآخر اسے سنبھلنا پڑا۔ اپنے ہونق تاثرات کو چھپانے کے لیے اس نے گھور گھور کر آئمہ کو دیکھنا شروع کردیا۔ وہ دونوں بچوں کی طرح ایڑھیاں اچک اچک کر اور دوربین لگا کر نجانے کیا تلاش کررہی تھیں۔

"یہ تم دونوں کیا احمقوں کی طرح تلاش کررہی ہو؟" اس نے آئمہ اور کملو دونوں کو بیک وقت مخاطب کیا تھا۔

واحد کے مخاطب کرنے پر آئمہ گویا نہال ہوگئی تھی۔

وہ بے ساختہ کھلکھلا کر کملو کو ٹہوکا دیتی اس کی طرف مڑی۔

"واحد بھائی! ہم دونوں تو جھیل کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ یہاں سے نظر کیوں نہیں آرہی۔" کملو نے اپنے سوجھ بوجھ کے مطابق کملا سا ہی جواب دیا۔ اس کی بات کو سن کر ودید نے بے ساختہ لاحول پڑھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی واحد اور موحد کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ تو گویا یہ دونوں عالم فاضل مستقبل کی "ڈاکٹرنیاں" کلر کہار کی مشہور معروف جھیل دریافت کررہی تھیں۔ ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر کملو کا منہ اتر گیا تھا جبکہ آئمہ نے بہت سنجیدگی کے ساتھ ان دونوں کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"دانت کیوں دکھا رہے ہو مجھے۔۔۔ جانتی ہوں تمہارے پورے بتیس دانت موجود ہیں۔" وہ اسے مزید بولنے پر اکسا رہی تھی۔ واحد کی مسلسل خاموشی اور سنجیدگی نے اندر سے اسے خائف کررکھا تھا۔ واحد نے اسے نظرانداز کرکے کملو کو مخاطب کیا تھا۔

"کملو آپی! یہاں سے جھیل نہیں نظر آئے گی، صرف پہاڑ اور موٹروے نظر آئے گا سو آپ اپنی ننھی منی آنکھوں کو مت تھکائیں۔"

موحد کو ہنسی آگئی تھی جبکہ کملو نے بھی بلاوجہ ہنسنا شروع کردیا تھا۔ دراصل نرجس میں ایک بڑی خوبی یہ بھی پائی جاتی تھی کہ وہ کسی بھی بات کا برا نہیں مانتی تھی۔

"جھیل تو نظر نہیں آرہی، اب کیا ہوگا؟" کملو کی افسردگی ملاحظہ کرکے ودید نے ایک مرتبہ پھر لاحول پڑھی۔

"کملو آپی! پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ جاتے ہوئے جھیل کی سیر بھی کرتی جائیے گا۔" واحد کے مشورے پر ودید تلملا کر رہ گیا کیونکہ وہ صرف واحد سے ملنے اور اسے کھانے پینے کا سامان دینے آئے تھے۔ جھیل پر جانے سے ٹائم ضائع ہونے کا خدشہ تھا۔

"جلدی سے لنچ وغیرہ سے فارغ ہوجاؤ، ہم بس آدھے گھنٹے تک واپس جارہے ہیں۔" ودید کے حکم نامے کو سن کر آئمہ اور نرجس نے جھٹ پٹ ہاٹ پاٹ کے ڈھکن کھول دیے تھے۔ سو گھر کے کھانوں کے ترسے واحد کے سارے دوست کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ پھر بریانی اور فرنی کھاکر باجماعت آئمہ کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔

ان سب کی تعریف سن کر آئمہ خوشی سے پھول پھول کر کپا ہوئی جارہی تھی۔ اس کی تعریفیں واحد کا سو فیصد دل جلا کر رکھ دیتی تھیں۔ جبکہ اس نے خود اس کی تعریف نہیں کی تھی۔

"ہم کالج کا وزٹ کرکے جائیں گے۔" آئمہ کی ضد پر اس کے تینوں بھائی ہمیشہ کی طرح نرم پڑگئے تھے۔

"واحد! تم کملو اور آئمہ کو اپنا کالج دکھالاؤ۔ پکنک منانے کے لیے تمہارے کالج سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔" ودید کی "بکواس" پر واحد بھنا اٹھا تھا۔ پچھلے کئی سالوں میں کئی مرتبہ آئمہ نے اس کالج کا چپہ چپہ دیکھا تھا مگر۔۔۔ اوپر سے پینڈوؤں کی طرح ہر بلڈنگ کی فوٹو بنانے کا بھی جنون تھا۔

"یہ کون سی بلڈنگ ہے۔ کم از کم منہ سے تو کچھ پھوٹ دو۔" جب آئمہ نے تیسری مرتبہ اپنی بات دہرائی تو واحد نے شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا تھا تاہم بولا کچھ بھی نہیں۔ مگر وہ آئمہ ہی کیا جو چپ رہ جاتی۔

"ہمیں کیا خبر، تمہارے کالج میں کیا کچھ ہے۔ پاگلوں کی طرح بس دوڑائے جارہے ہو۔" واحد نے یوں ظاہر کیا گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

دو تین لمبے لمبے راؤنڈ لگوا کر جب وہ انہیں واپس لے کر آرہا تھا تب ہانپتی ہوئی نرجس اکیڈمک بلاک کے بینچ پر گر گئی۔ وہ بھی جان بوجھ کر انہیں طویل چکر کاٹ کر گیٹ تک لایا تھا۔

"صرف گراؤنڈ کا چکر لگا کر یہ حالت ہوگئی ہے تمہاری۔ ابھی تو تم نے اکیس کلاس روم دیکھنے ہیں۔ کمپیوٹر لیب اور انگلش لینگویج لیب دیکھنی ہے۔ لائبریری کا بھی وزٹ کرنا ہے۔ دو ایگزامز ہال بھی ہیں۔ چار کیڈٹ ہاسٹلز ہیں۔ چار ری کری ایشن رومز ہیں۔ دو عدد کیڈٹ میس بھی ہیں۔ ٹیچر ہاسٹل الگ ہے۔ ایک عدد کالج کیفے ہے۔ ایک عدد مسجد بھی ہے۔ آفس بلاک بھی الگ ہے۔ اور یاد آیا، باربر شاپ بھی ہے۔ جنریٹر روم، پانچ واٹر ٹینکس، دو ویلز، دو واٹر ڈیم بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ اتنا کچھ دیکھے بغیر چلی جاؤگی۔۔۔ پھر ممی اور ودید سے شکایت کروگی، میں نے تمہیں جان بوجھ کر اپنا کالج نہیں دکھایا۔ تھوڑی ہمت پکڑو اور میرے ساتھ آؤ۔ تم نے تو ابھی اپنا مشہور زمانہ تصویریں کھینچنے والا شوق بھی تو پورا کرنا ہے۔"

اس کے پچکارنے والے انداز نے نرجس اور آئمہ دونوں کو آگ ہی لگادی تھی۔ وہ اس کی چالاکی اور مکاری پر سخت تاؤ کھارہی تھیں۔ مگر آئمہ کوئی پھڑکتا جواب دے کر پہلے سے تپے واحد کو اور تپانا نہیں چاہتی تھی۔ ورنہ اگلے مہینے بھی وہ گھر نہیں آتا سو اس کے تمام تر طنز کو بہت صبر کے ساتھ حلق سے اتار کر آئمہ نے بڑے پیار بھرے نرم لہجے میں پوچھا تھا۔

"تم گھر کب آؤگے واحد! ممی بہت اداس ہیں تمہارے لیے۔"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ نیکسٹ ویک سے اسپورٹس گالا اسٹارٹ ہورہے ہیں۔ شاید میں چکر نہ لگاؤں۔" اس کا جواب سن کر آئمہ کچھ بجھ گئی تھی تاہم اس نے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔ واحد نے کندھے اچکا کر اس کے چہرے پر سے نظر ہٹالی تھی۔ یقیناً" وہ واحد کی بے عزتی کا موقع ضائع ہوجانے پر افسردہ تھی۔

اس کی وجہ سے ممی کے ہاتھوں بچپن کی ماریں اسے ابھی تک بھولی نہیں تھیں۔ ویسے بھی ممی کی گدی پر اب ان کی بیٹی جلوہ افروز تھی اور وہ بغیر کسی لحاظ کے ابھی تک موحد اور واحد کی دھنائی کرڈالتی تھی۔ مجال تھی جو اب بھی اس کے تینوں بھائی بغیر اطلاع کے رات گئے تک باہر رہتے۔ وہ تینوں شدت سے دعا گو تھے کہ جلد از جلد آئمہ کی شادی ہوجائے مگر آئمہ کی شادی کہاں ہوسکتی تھی۔ ابھی تو اس نے نجانے کس کس جہاں کا علم گھول گھول کر پینا تھا اور جانے وہ کون بدنصیب تھا جس کے مقدر آئمہ کے ساتھ پھوٹنے تھے۔ خیر، وہ جو بھی تھا۔ واحد کی بلا سے۔

☆ ☆ ☆

یہ اس کا کالج میں آخری سال تھا اور کالج میں ان دنوں اسپورٹس گالا سیزن اسٹارٹ ہورہا تھا۔ ہر پانچ سال بعد کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ وہ باسکٹ بال کا بہترین کھلاڑی تھا۔

ممی کی خواہش تھی وہ صرف نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرے۔ غیر نصابی کوئی بھی کامیابی ممی کی نگاہ میں مقام نہیں رکھتی تھی۔ ممی کے بعد ان کی اکلوتی بیٹی اس کی رہنما، پیشوا بننے کی انتھک کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

اسپورٹس گالا کے اسٹارٹ ہوتے ہی ممی کو ہول اٹھنے لگے تھے سو انہوں نے فورا" اپنی اسسٹنٹ کو خوب سکھا پڑھا کر اسے فون کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ ممی کا خیال تھا اس کے فائنل ایگزامز سر پہ تھے اور اب وہ گیم کی طرف متوجہ ہوگیا تو اچھا رزلٹ نہیں لائے گا مگر وہ واحد ہی کیا جو ممی اور آئمہ کی کسی بات کو خاطر میں لاتا۔ پانچ سال سے وہ اسپورٹس گالا کا منتظر تھا۔ آخر پچھلے پانچ سال کی محنت، پریکٹس اور گیم سے جنون کی حد تک محبت سامنے آنا تھی۔ پھر وہ کیسے اتنا اہم موقع گنوا سکتا تھا۔

ممی چاہتی تھیں وہ یہاں سے پاس آؤٹ کرکے کاکول اکیڈمی چلا جائے۔ وہ اسے فوج کا اعلا آفیسر دیکھنا چاہتی تھیں۔ جبکہ آئمہ کی خواہش تھی وہ میڈیسن میں نام بنائے۔

اپنے تئیں ان دونوں ماں بیٹی نے واحد کے حوالے سے اونچے اونچے خواب دیکھ رکھے تھے۔ ممی چاہتی تھیں اس کے شانوں پر اسٹار سجیں اور ان کی بیٹی چاہتی تھی واحد سفید اوور آل میں آنکھوں پر چشمہ لگائے نظر آئے اور واحد کیا چاہتا تھا؟ اس بارے میں کسی نے کچھ نہیں سوچا تھا اس کی خواہش، تمنا اور خواب کیا تھے؟ انہیں جاننے کی کسی نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ سب اپنے اپنے خواب اس کی آنکھوں میں ٹھونس دینا چاہتے تھے۔

آئمہ کی کال سے پہلے احد کا فون بھی آیا تھا اور کم و بیش اس کی باتیں بھی واحد کے مستقبل کے گرد گھوم رہی تھیں۔ اس نے احد کو تو ٹال دیا تھا تاہم آئمہ کے چودہ طبق ضرور روشن کیے تھے۔

"تمہیں میرے فیوچر کے لیے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس بالزاک کی "بوڑھا گوریو" پڑھو اور اچھے اچھے مصنفین کی روحوں کو خراج تحسین پیش کرو۔ جو تم جیسوں کے لیے عظیم خزانہ چھوڑ گئے ہیں۔"

اس کی بکواس سن کر آئمہ بھی یقیناً" تپ اٹھی تھی۔

"ہمیں فکر نہیں ہوگی تو اور کسے ہوگی؟ تمہارا یہ سال بہت قیمتی ہے۔ مگر تمہیں کب اپنے فیوچر کی پروا ہوئی ہے۔ ہم لوگ ہی مرے جاتے ہیں تمہاری فکر میں۔" ادھار رکھنے کی تو وہ بھی قائل نہیں تھی۔ واحد

سر سے لے کر پیروں تک بھنا اٹھا تھا۔

"تو میں تمہارے پیروں میں گرا ہوا ہوں۔ تمہیں خود ہی مدر ٹریسا بننے کا شوق ہے۔ جب کوئی بندہ رعب جمانے کے لیے نہیں ملتا تو میرا دماغ چاٹنے لگتی ہو۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں' میری رہنمائی کرنا چھوڑ کر خود کو اپنے بھائیوں اور اس مسکین اکلوتی سہیلی تک محدود رکھو۔"

آئمہ نے فوراً "موضوع تبدیل کردیا۔

"ارے واحد! یاد آیا۔ تم نے میرے ہاتھ کے بنے موتی چور کے لڈو اور امرتی کھائی یقیناً" اسی طرح بند رکھے ہوں گے جیسے ہم چھوڑ کر آئے تھے۔ تم نے خود تو کھانے نہیں' اس معصوم پردیسی اسامہ کو دے دیتا غریب گھر کی مٹھائیوں کا ترسا ہوا ہے۔ دعائیں دے گا مجھے ان دنوں مجھے سخت دعاؤں کی ضرورت ہے۔ میڈیکل کی ٹف اسٹڈیز نے میری مت مار کے رکھ دی ہے۔" آئمہ کی مزید "بکواس" بڑھتی دیکھ کر وہ فون بند کردینا چاہتا تھا جب وہ اس کا ارادہ بھانپ کر فوراً" بول پڑی۔

"فضول بک بک میں کام کی باتیں بھلا دیتے ہو مجھے۔۔۔"

آئمہ کے اس نئے الزام پر وہ پھر سے پھڑک کر رہ گیا تھا۔

"اب پھوٹ بھی چکو' مجھے ابھی نیچے جانا ہے۔"

"وہ میں نے تم سے پوچھنا تھا۔ گھر کب آؤ گے؟ دو مہینے ہو چکے ہیں' تم نے اپنے درشن نہیں کروائے۔ ممی تمہیں یاد۔۔۔"

واحد نے اس کی پوری بات سنے بغیر فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

پورے ایک ہفتے کی محنت' بلکہ انتھک محنت' جنون' جوش اور جذبے کی بدولت واحد کی ٹیم باسکٹ بال کا مقابلہ جیت گئی تھی۔ اسے اپنی جیت کا پورا یقین تھا۔ مگر یہ سوچ کر واحد کے اندر کی خوشی کچھ ماند پڑ گئی تھی کہ ان کا یہاں سے کوچ کا وقت بھی قریب آگیا ہے۔

اس دفعہ فروری میں برف پڑی تھی اور یہ برف جیسے تمام پاس آؤٹ کر جانے والے کیڈٹس کی آنکھوں میں جمتی جارہی تھی۔ وہ اپنی مدت پوری کرکے بہترین یادوں کو ہمراہ لیے جانے والے تھے۔

انہیں بھیجنے والوں کے دل بھی بوجھل اور اداس تھے۔ اس عظیم درس گاہ سے جڑی یادیں بھلائی نہیں جاسکتی تھیں۔

واحد کا اپنا دل بھی بہت بوجھل تھا۔ ان کے کیریر کا صحیح معنوں میں آغاز ہو رہا تھا۔

وہ سب الگ ہونے والے تھے۔ ان میں سے کسی کی منزل ایک نہیں تھی۔ کسی نے ڈاکٹر بننا تھا' کسی نے انجینئر بننا تھا۔ کوئی پاک فوج کو جوائن کررہا تھا۔ کوئی مزید اعلا تعلیم کے لیے باہر کا رخ کرنے والا تھا۔

اس رات وہ سارے دوست مل کر اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے تھے۔ اپنے اپنے خواب شیئر کررہے تھے۔

اینول ڈنر اور اینول فنکشن میں سب کے والدین بھی آئے تھے۔ ان کے خوشی سے چمکتے چہروں پر خوابوں کے ستارے لشک رہے تھے۔ واحد کو پہلی مرتبہ ممی اور عماز چاچو کے چہرے پر اپنے لیے فخر نظر آیا تھا۔ وہ اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ واحد کو ہمیشہ بہت آگے سب سے آگے دیکھنا چاہتے تھے۔ اینول ڈنر کی رات واحد کے تمام دوست پچھلی بے شمار یادوں کو تازہ کررہے تھے۔ تب اسامہ نے ان سب سے ایک سوال کیا تھا۔

"ان پانچ سالوں میں تم نے سب سے زیادہ کسے یاد کیا؟"

علی کہہ رہا تھا اس نے اپنی مما کو بہت یاد کیا۔ فرقان اپنے ابو کے قریب تھا۔ قاسم اپنی بڑی باجی کو زیادہ یاد کرتا رہا تھا۔ اسامہ اپنی دادی کے لیے بہت اداس رہتا تھا۔ ندیم کی اپنی ہم عمر پھوپھو سے خوب دوستی تھی' کاشر اور تقی اپنی ممی کے لیے کمبل میں منہ دے کر روتے تھے۔ عباس اور فہد بھی اپنی ماما کو یاد کرتے تھے۔ جب واحد کی باری آئی اور اس سے سوال کیا گیا تو وہ ایک دم ہونق ہوگیا۔

وہ بھلا پچھلے پانچ سالوں میں سب سے زیادہ کسے یاد کرتا رہا تھا؟ کیا اپنے ڈیڈی کو؟ مری ہوئی ماں کو؟ ممی یا عماز چاچو کو؟ احد' وحید' موحد واعد کو؟ مگر وہ تو ان میں سے کسی کو بھی اتنی شدت سے یاد نہیں کرتا رہا تھا۔ ہاں اگر اس نے یاد کیا بھی تھا تو صرف اور صرف اپنے چاچو کی اس چالاک' مکار' عیار بیٹی کو۔ حقیقت تو یہ تھی چاہے اس نے برے الفاظ میں سہی مگر آئمہ کو ہی یاد کیا تھا۔ مگر وہ ہی سب سے زیادہ اس کی سوچوں پر قابض رہی تھی۔

اکثر کلاس روم میں لیکچر کے وقت اسے آئمہ کی کوئی چالاکی یاد آجاتی تھی۔ میس میں لنچ کرتے ہوئے اور بریانی روسٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے آئمہ کے ہاتھ کا مچھلی پلاؤ یاد آجاتا تھا' دراصل آئمہ نے اپنی "بکواس" کا حصار کچھ اس طرح سے واحد کے اردگرد کھینچ رکھا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اس حصار کی زد سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ ان دنوں کی ہی تو بات تھی' جب اس نے ایف ایس سی میں ٹاپ کیا تھا۔ تب ممی اور عماز چاچو نے اس کے اعزاز میں بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں اس کے پرانے ٹیچرز اور کلاس فیلوز کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ اسی پارٹی کے اختتام پر واحد کے سب دوستوں نے اپنے اپنے ارادوں کے متعلق آگاہ کیا تھا۔ معاً" شیفون کی زنک کلر کی ساڑھی کا پلو لہراتی ممی سج سج کر قدم اٹھاتی نہ جانے کہاں سے آگئی تھیں۔ اور آتے ہی کس مان اور دھونس بھرے لہجے میں اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔

"میرا واحد تو ان شاء اللہ فوج میں کمیشن لے گا۔ میرا بڑا پرانا خواب ہے یہ۔ میں واحد کو یونیفارم میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اس نے بھری محفل کے سامنے اپنے بی بی اے کے ایڈمیشن کا بتادیا۔ وہ اپنے باپ کے پاس امریکہ جانا چاہتا تھا اور بزنس ایڈمنسٹریشن کے حوالے سے اعلا ڈگریز لینا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس کی خواہش' خواب یا تمنا کوئی انوکھی نہیں تھی۔ تاہم اس کا لہجہ' انداز اور الفاظ اتنے تلخ تھے' جو ممی سمیت کئی لوگوں کو چپ کر چکے تھے۔ اسے نہ فوج میں جانا تھا' نہ آئمہ کی طرح ڈاکٹر بننا تھا۔ اسے بزنس کرنا تھا۔ وہ جانتا تھا بڑا سا کریچ کیک لاتی آئمہ نے بھی اس کے الفاظ سن لیے تھے۔ اس کی رنگت کیسی موم کی طرح سفید پڑ گئی تھی۔ واحد نے غور نہیں کیا تھا۔ اس کے تو قدم بھی ڈگمگا گئے تھے۔ تاہم یہ سب کیفیات لمحاتی تھیں۔ ممی بھی سنبھل چکی تھیں۔ آئمہ نے بھی اپنے تاثرات پر قابو پالیا تھا۔ تب ہی وہ سب کے درمیان کیک رکھتی بڑے ٹھوس اور مستحکم لہجے میں بولی تھی۔

"وش یو گڈ لک واحد!" اس نے بڑی خوب صورت مسکان لبوں پر سجا کے واحد کو مخاطب کیا۔

"مجھے واحد کی سوچ پر بہت خوشی ہوئی۔ میرا بیٹا آگے بڑھنے کے لیے ایک مقصد رکھتا ہے اور مجھے امید ہے یہ اپنی فیلڈ میں بہت کامیاب ہوگا۔"

ممی کی اعلا ظرفی نے اگرچہ واحد کو کچھ خفت زدہ کردیا۔ تاہم بڑی ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ البتہ اسامہ نے اسے خوب سخت سست سنائی تھیں۔

کچھ دن مزید گزرے تو واحد پھر سے گھر میں بھونچال لے آیا تھا۔ اس نے اعلان کردیا کہ وہ مزید تعلیم پاکستان میں جاری نہیں رکھے گا۔ اسے ہر صورت امریکا بھجوا دیا جائے۔

مگر ایک مرتبہ پھر واحد کی خواہشات کو پیروں تلے روند دیا گیا تھا۔ اس کے ضد کرنے' غصہ کرنے' لڑنے جھگڑنے کے باوجود نہ ممی اسے باہر بھیجنا چاہتی تھیں اور نہ ہی ڈیڈی اس کے لیے ویزا بھجوا رہے تھے۔ اس دفعہ ممی کی حمایت میں پورا گھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ نہ

صرف آئمہ بلکہ اس کے چاروں بھائی بھی واحد کے راستے کی رکاوٹ بن گئے تھے۔ اسے ممی سمیت گھر کے ایک ایک فرد سے چڑ ہو گئی تھی۔

اس کی تمام تر ضد، غصہ، بھوک ہڑتال بے کار ہو گئی۔ عماز چاچو اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا آئے گویا کسی بھی فرد کو واحد کی پروا نہیں تھی۔

وہ احتجاجاً "بھوکا پیاسا یونیورسٹی چلا جاتا تھا اور ممی کی چھچی اطمینان سے اپنے بھائیوں کو پراٹھے ٹھنسواتی رہتی۔ ان دنوں وہ بہت ہی مطمئن نظر آتی تھی۔

واحد کے دل سے ان لوگوں کے لیے نرمی، پیار، سکون، اطمینان سب ختم ہو گیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ان لوگوں کو زچ کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا تھا۔ ممی کے صدیوں سے بنائے قوانین، اصول اور قواعد اس نے ٹھوکروں سے اڑا دیے تھے اور وہ ہر وہ کام کرتا جس سے ممی اور خصوصاً" آئمہ کو تکلیف ہوتی۔ گھر لیٹ آتا، اکثر کھانا بھی باہر سے کھاتا، زیادہ وقت سیر سپاٹوں میں گزارتا۔ تاہم پڑھائی سے اتنا لاپروا ہرگز نہیں تھا۔ مگر ظاہر یہی کرتا۔

تھوڑا وقت آگے گزرا تو واحد نے گھر سے کھانا اور گھر میں ہی سونا شروع کر دیا تھا۔ تاہم گھر والوں سے اس کے تعلقات بحال نہیں ہو سکتے تھے اور گھر والے بھی محض اسی بات پر خوش تھے کہ کم از کم واحد آنکھوں کے سامنے تو ہے، یہ ان کی محبت اور پیار کی انتہا تھی۔ وہ اس کی غلطیوں کو، کم فہمیوں کو درگزر کر دیتے تھے۔

اگرچہ ممی نے ہاتھ ہولا رکھا تھا مگر آئمہ کو پورے اختیارات دے رکھے تھے۔

میڈیکل کی ٹف پڑھائی سے وقت نکال کر وہ اور اس کی سہیلی خصوصی طور پر واحد کی جاسوسی کیا کرتی تھیں۔ وہ کملو کو تو کچھ نہیں کہتا تھا اور اس کے ڈیڑھ سال بڑے پن کا لحاظ کر جاتا تھا۔

یہ بھی ان ہی دنوں کا قصہ ہے جب وہ روپیٹ کر اپنے سمسٹرز مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

آئمہ اور اس کی تکرار معمول کا حصہ تھی۔ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی اس کی بے ہودہ شرارتوں میں کملو آپی بھی حصہ ڈالنے پہنچ جاتی تھیں۔

اس صبح واحد اپنی نیند پوری کر کے نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد نیچے آیا تو ڈائننگ ہال گھر والوں سے بھر چکا تھا۔

واحد کو دیکھ کر سب ہی کے چہروں پر مسکراہٹ چمک اٹھی تھی۔ آج وہ بہت دن بعد سب کے ساتھ ناشتا کرنے آیا تھا۔ سو ممی اور عماز چاچو بہت ہی خوش تھے۔ ایک سنہری طشتری میں گرما گرم جلیبیاں تل کر آئمہ کچن سے باہر نکل آئی۔

"میں یہ کھاؤں گا؟" واحد سے زیادہ دیر تک صبر نہیں ہو سکا تھا۔

"کیوں۔ تمہارے لیے یہ حرام ہیں؟" ایسا کرارا جواب آئمہ کی طرف سے ہی مل سکتا تھا۔ اس کے چاروں بھائی کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔

وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھنے لگا تھا۔ جب احد نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ بیٹھو، یہاں ابھی تمہارا من پسند ناشتا آ جاتا ہے۔"

"مجھے نہیں کرنا۔" واحد جیسے اینٹھ گیا تھا۔

"چل یار! محبوبہ جیسے نخرے نہ دکھا۔" احد نے زبردستی اس کے گلے میں بانہیں ڈال لیں۔

تب ہی بڑا سا تھال رومال سے ڈھکے کملو آپی آتی دکھائی دی تھی۔ اس کے خوان کو دیکھ کر واحد کی جان میں جان آئی تھی۔ یقیناً" کملو اپنے گھر سے ان کے لیے کچھ بنا کر لائی تھی۔ اس نے مسکرا کر اٹھلا کر اور قدرے شرما کر تھال موحد اور وديد کے سامنے رکھ دیا تھا۔ واحد کچھ ہونق ہو گیا تھا مگر اس کے گلابی چہرے پر پھیلی سرخی نے اس کے اندازوں پر مہر لگا دی تھی۔ یقیناً" ممی کا کوئی ایک بیٹا کملو کے کملے پن پر فدا ہو گیا تھا۔ اس نے موحد اور وديد کو غور سے دیکھا تھا جو کملو کے بیر بہوٹی بننے پر قطعاً" متوجہ نہیں تھے، اور واحد بھی

بڑے اطمینان سے جلیبیاں ٹھونس کر اخبار پڑھ رہا تھا' پھر جانے کملو نے یہ ناز بھری ادا کسے دکھائی تھی؟"کیا مجھے؟" اپنی اس سوچ پر وہ سرتاپا ہل کر رہ گیا تھا۔ خوف کے مارے اس سے کچھ سوچا نہیں گیا تھا۔

پھر قیمے والے پراٹھے' بھنی ہوئی کلیجی اور اچاری ہانڈی دیکھ کر کوئی سوچ ذہن میں آ نہیں سکتی تھی۔ سو وہ آئمہ کو چڑا چڑا کر اور جلا جلا کر سنہری تھال پر جھپٹ پڑا تھا۔

"یہ سب کچھ لے کر آنا ضروری تھا؟" آئمہ سے برداشت نہ ہو سکا تو پھٹ پڑی۔ اس کی بنائی جلیبیاں ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ جبکہ کملو شان بے نیازی سے فرما رہی تھی۔

"تو کیا خالی ہاتھ آجاتی۔ ایک تو اتنا اچھا ناشتا لائی ہوں' اوپر سے محترمہ کے مزاج نہیں مل رہے۔"

"کون سا میرے لیے لائی ہو۔" وہ واحد کو پراٹھے کھاتے دیکھ کر اور بھی غضب ناک ہو رہی تھی۔ وہ اس کی سنہری شیرے سے بھری جلیبیوں پر کملو کے پراٹھوں کو ترجیح دے رہا تھا۔ آج تک اس کے ہاتھ سے بنی کسی چیز کی اس نے تعریف نہیں کی تھی اور اب کملو کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔

"کملو آپی! آپ کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے۔" واحد نے اسے مزید سلگایا۔

"اگرچہ نرجس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے' پر آئمہ جیسی کوکنگ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔" احد نے بروقت مداخلت کی تھی۔ اسے اپنے بھائیوں پر ایسے ہی مان نہیں تھا۔ اپنی بہن کی سبکی نہیں ہونے دیتے تھے۔

"ایسی سیاسی تعریف؟ کتنے چالاک ہیں آپ۔" وہ ٹھنکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ادھر احد کے ہونٹوں پر بڑا شگفتہ تبسم نمودار ہو گیا تھا' پھر وڈید اور موحد بھی دانت نکوسنے لگے تھے۔ واحد ہونقوں کی طرح ان لوگوں کو ہنستا دیکھ رہا تھا اور ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ آپس میں معمولی سی نوک جھونک میں مصروف ہو چکے تھے۔

"دراصل احد پریکٹس کر رہا ہے۔ فیوچر میں آئمہ اور کملو نے اسی گھر میں جو رہنا ہے۔ دونوں ہی کوکنگ کی شیدائی ہیں' سو فیوچر میں یہ گھر مچھلی بازار بن جائے گا۔ یہاں کوکنگ شوز ہوں گے' کھانوں کے مقابلے ہوں گے اور سب سے پتلی حالت ان کے شوہروں کی ہو گی۔ کملو پر ترس آرہا ہے۔ مستقبل میں بھی آئمہ نہ اپنے شوہر سے اس کی تعریف ہونے دے گی' نہ اپنے بھائی سے' تو پھر میری ساری ہمدردیاں اپنی "کملو بھابھی" سے ہیں۔"

وڈید کے مزاحیہ انداز نے آئمہ سمیت سب ہی کو کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ فوراً" ہی کرسی گھسیٹ کر ٹشو اٹھاتا بھاگ نکلا۔ باہر آکر بھی پیشانی پر امڈتا پسینہ صاف کرتے ہوئے اسے وڈید کی بات سوچ کر جھرجھری آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان ہی دنوں کملو اور آئمہ نے ایم بی بی ایس میں شان دار کامیابی حاصل کرلی تھی۔ ان دونوں کا ہاؤس جاب اسٹارٹ تھی اور پورا پورا دن آئمہ گھر میں نظر نہیں آتی تھی۔ مگر جب گھر میں ۔۔۔ ہوتی تو پرانے ہتھیاروں سے لیس میدان میں اتر آتی تھی۔

اس دن بھی واحد پروین سے کپڑے استری کروا رہا تھا' جب آئمہ عجلت میں اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

"پروین! کیا کر رہی ہو تم' نیچے جاؤ۔ ممی بلا رہی ہیں تمہیں۔" اس نے پروین کو نیا حکم نامہ سنایا اور آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے استری پکڑلی تھی۔

جب واحد واش روم سے نہا کر باہر نکلا۔ پروین کی جگہ آئمہ کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ اس نے تولیہ بیڈ پر پھینک دیا۔

"پروین کہاں ہے؟ تم نے میرے کپڑوں کو ہاتھ کیوں لگایا؟" اس نے آئمہ کے ہاتھ سے شرٹ کھینچ لی۔

"ایک تو تمہارے کام کرتی ہوں' مفت میں ہر چیز کہنے سے پہلے حاضر کر دیتی ہوں' اوپر سے صاحب بہادر کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" آئمہ نے اس کے ہاتھ سے شرٹ دوبارہ کھینچ لی۔

واحد نے اس کی استری کی ہوئی شرٹ کو دوبارہ گول مول کر کے اچھال دیا۔ اور ایک دوسری شرٹ بغیر پریس کیے پہن لی۔ آئمہ حق دق سی کھڑی دیکھتی رہ گئی تھی۔

"تم اس قابل ہو ہی نہیں۔۔۔ یہ تو بس میں ہی۔۔۔" جانے غصے سے بولتے ہوئے اس کی آواز اتنی بھرا کیوں گئی تھی یا پھر واحد کو ہی شک گزرا تھا' مگر اس نے آئمہ کی آنکھوں میں چمکیلا پانی بھی امڈتا دیکھا تھا۔ اندر کہیں اسے کمینی سی خوشی سرشار کرنے لگی تھی۔ آخر اس نے بھی اس منہ پھٹ چڑیل کا منہ بند کر ہی دیا تھا۔ پھر تو گویا واحد کے ہاتھ آئمہ کی کمزوری آگئی تھی۔ وہ اسے اکثر ہرٹ کرنے لگا۔

یہ شغل نہ جانے کب تک جاری رہتا' جب ایک روز اچانک ڈیڈی نے پاکستان آنے کی اطلاع دی تھی۔

☼ ☼ ☼

واحد بھی چونکہ فائنل سمسٹر سے فراغت پا چکا تھا۔ اس کا ایم بی اے مکمل ہو گیا تھا۔ سو وہ بھی ان دنوں سارا وقت گھر میں گزار رہا تھا لیکن اسے حیرت ہو رہی تھی۔ ممی آئمہ کو ساتھ لیے دھڑا دھڑ شاپنگ کر رہی تھیں۔ ان کا زیادہ وقت بازار میں گزرتا تھا۔

اس دن آئمہ کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔ جب ٹی وی پر کوئی میچ دیکھتا واحد موقع پا کر اس کے پیچھے کچن میں چلا آیا تھا۔

"کچھ چاہیے؟" اس کی آواز خاصی نرم تھی۔

"نہیں۔۔۔" واحد نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"تم سے کچھ پوچھنا تھا؟"

"زہے نصیب۔" آئمہ اس کے الفاظ پر نہال ہوتی گویا پوری کی پوری واحد کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئی تھی۔

"یہ گھر میں آج کل کیا ہو رہا ہے؟" واحد نے کچھ دیر بعد بڑی حیرت سے کہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟ تمہیں نہیں پتا' ڈیڈی آرہے ہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی خفگی نمایاں تھی۔

"ڈیڈی تو آرہے ہیں۔ یہ ممی کیا کرتی پھر رہی ہیں۔ کیا ڈیڈی کے لیے زرق برق ملبوسات خریدے جارہے ہیں؟" اس کے طنزیہ لب و لہجے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" واحد دانت کچکچا کر پلٹنے ہی والا تھا جب آئمہ ایک دم اس کے سامنے آگئی۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ کہاں جارہے ہو' سنو تو۔" آئمہ نے واحد کا بازو دبوچ لیا۔ وہ اسے منہ لگا کر ہی پچھتا رہا تھا۔

"زرق برق ملبوسات خریدنے کی وجہ پوچھے بغیر ۔۔۔ جارہے ہو۔"

"بتاؤ۔۔۔" اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

"احد اور کملو کی منگنی ہونے والی ہے۔" واحد کا منہ تو مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"احد اور کملو؟ مگر کیسے؟ احد کیسے مان گیا؟" وہ کملو جس کے کملے پن پر آئمہ کے سارے بھائی ایسے ایسے نادر و نایاب جملے کسا کرتے تھے۔ اب اسی کملو سے احد کی منگنی ہو رہی تھی' جو بہت ہی ذمہ دار اور قابل ترین سرجن تھا۔ اگرچہ کملو خوب صورت تھی' تعلیم یافتہ تھی' مگر کچھ بدھو بھی تھی۔ ان سب کے ہاتھوں مذاق کا نشانہ بننے والی کملو' احد کے دل کی مالکن بننے جارہی تھی۔

"احد صاحب کی رضا کے عین مطابق تو ہو رہا ہے۔" اب وہ مسکرا رہی تھی۔

"احد کا دماغ تو نہیں چل گیا۔" واحد نے انتہائی تاسف سے کہا تھا۔

"دماغ ہی چلتا ہے تو محبت ہوتی ہے۔"

واحد ہونقوں کی طرح آئمہ کو برتن دھوتے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر بہت سارے دن دبے پاؤں گزر گئے تھے۔ واحد کو ڈیڈی کے اچانک واپس آنے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ پھر اس نے یہی خیال کیا تھا کہ وہ احد کی منگنی کے لیے آرہے ہیں۔ مگر ڈیڈی نے یہاں آکر دھماکا کیا تھا کہ وہ تو مستقل واپس آچکے ہیں۔ واحد کے لیے ڈیڈی کا یہ انکشاف انتہائی تکلیف دہ تھا۔ وہ جو یہاں ایک ایک دن گزار رہا تھا کہ ڈیڈی ویزا بھیجیں گے اور وہ امریکہ چلا جائے گا۔ ڈیڈی کی پلاننگ سن کر حواس باختہ رہ گیا۔

ممی کی فیملی اور ڈیڈی نے ہمیشہ اس کے ارمانوں کا خون کیا تھا۔ پہلے ممی نے اسے باہر نہ جانے دیا کہ ایم بی اے کے بعد ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر چلے جانا اور اب ڈیڈی اسے خون کے آنسو رلانے پہنچ چکے تھے۔ گویا باہر جانے کا اس کا اکلوتا خواب کانچ کی مانند بکھرنے والا تھا۔

ڈیڈی کی فیملی سے اس کے گھر والے فوراً گھل مل گئے تھے۔ ممی کی دوسری امی سے خاصی دوستی تھی۔ آج کل دونوں ہی دھڑا دھڑ شاپنگ کررہی تھیں۔ اپنی نئی امی سے تو اس نے زیادہ بات نہیں کی۔ مگر اپنی چھوٹی بہن سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکا تھا۔ کچھ وہ تھی بھی بہت پیاری معصوم اور بے حد محبت کرنے والی۔

"میری کتنی بڑی خواہش پوری ہوگئی ہے بھائی! ہم سب اب ایک ساتھ ہی رہیں گے۔" مائلہ ایک ہزار مرتبہ یہ الفاظ دن میں دہرایا کرتی تھی۔ اگرچہ اس کی خواہش پوری ہوگئی تھی۔ مگر واحد کے خواب' شوق اور خیال کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گئے تھے۔

ڈیڈی اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ موحد اور اس کا پیارا دوست اسامہ کاکول سے چند سال پہلے پاس آؤٹ کرکے مختلف شہروں میں تعینات ہوچکے تھے۔ دونوں کے شانوں پر کچھ نئے اسٹارز کا اضافہ ہوچکا تھا اور ایک مرتبہ پھر واحد کی خواہش اور ضد کے سامنے ڈیڈی کی شرط دیوار چین بن گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے امریکا جانے کے تمام انتظامات کروا دیتا ہوں۔ تاہم میری ایک شرط ہے۔ تمہیں یہاں نکاح یا شادی کرکے جانا ہوگا۔" ڈیڈی نے فیصلہ کن لہجے میں اپنی بات اسے سمجھادی تھی اور امریکا جانے کے لیے تو وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ پھر ڈیڈی کی شرط اتنی بڑی نہیں تھی۔

ڈیڈی نے اسے ریڈنگ روم میں بلوایا تھا اور بہت سالوں سے جمع شدہ ایک ایک بات اس کے کانوں میں انڈیلی تھی۔ ڈیڈی نے اسے بتایا کہ کیسے انہوں نے انتھک محنت کی۔ امریکا میں کتنے دھکے کھائے تھے۔ کتنا ذلیل و خوار ہوتے رہے تھے اور کتنے بے شمار سال بے روزگار بھی رہے تھے۔ وہ اپنی ناتجربہ کاری کے باعث ایک ایکسیڈنٹ کے جرم میں کافی سال جیل بھی رہے تھے۔ تب اس کی دوسری امی نہ جانے کیسے محنت مشقت کرکے وکیل کو دینے کے لیے رقم جمع کرتی تھیں۔ دراصل ممی اور عماز چاچو نے اسے کبھی کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے ہمیشہ "سب ٹھیک ہے" کی خبر دیتے تھے۔ ڈیڈی اس کے لیے بہت بھاری رقم اور تحائف بھیجا کرتے تھے۔ وہ ایسی ہی باتیں بچپن سے سنتا آیا تھا' جبکہ ڈیڈی اب اسے کوئی اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔

ڈیڈی اتنے سال جیل میں رہنے کی وجہ سے پاکستان اس کے نام پھوٹی کوڑی نہیں بھیج پائے تھے۔ وہ اس کی یاد میں تڑپتے رہتے تھے' مگر واپس آنہیں سکتے تھے۔ اس کی تمام تعلیم و تربیت کا سہرا ممی اور عماز چاچو کے سر جاتا تھا۔ جب وہ شرمندہ ہوکر اپنے بھائی کو فون کرتے تو چاچو الٹا ان سے خفا ہوجاتے۔ واحد انہیں اپنے بچوں سے بڑھ کر عزیز تھا اور اس پر خرچ کرتے ہوئے انہیں قطعاً" پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

ڈیڈی نے اسے بتایا تھا۔ اول روز سے لے کر آج تک اس کے بورڈنگ کے اخراجات سے لے کر یونیورسٹی لیول تک کی تعلیم میں انہوں نے ایک روپیہ عماز چاچو کو نہیں دیا تھا۔ ڈیڈی اپنے بھائی کی محبتوں' پیار' احسان' ایثار کو خراج تحسین پیش کررہے تھے۔ وہ اپنے بھائی کے قرض دار تھے۔ وہ ان کی محبتوں کا بدلہ اتار ہی نہیں سکتے تھے۔ بعد میں ان کے حالات بہتر

ہوجانے کے باوجود بھی عماز چاچو نے ان سے واحد پر خرچ کرنے کے لیے کبھی ایک روپیہ نہیں لیا تھا۔

ڈیڈی کی نم آنکھوں میں عماز چاچو کے لیے محبتوں کا جہان آباد تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا؟ مگر اس سے آگے؟ واحد دھیرے دھیرے کھٹک ضرور رہا تھا۔ کہیں دور اسے خطرے کے الارم بھی محسوس ہورہے تھے۔

پھر کچھ دن بعد اس کے تمام وسوسے اور خدشے ناگ کی طرح پھنکارتے اس کے سامنے آگئے تھے۔

احد اور کملو کے ولیمہ کے فنکشن میں ڈیڈی نے باقاعدہ واحد اور آئمہ کی منگنی کا اعلان کردیا تھا۔ کوئی شاکڈ ہوا تھا یا نہیں۔ تاہم واحد کی آنکھوں کے سامنے تو زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔

اس کی دوسری امی نے آئمہ کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ تب وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔ مگر فنکشن کے بعد تو گویا سلطان ہاؤس میں بھونچال آگیا تھا۔

واحد نے ببانگ دہل اعلان کردیا تھا۔ اسے یہ زبردستی کا رشتہ قطعاً" گوارہ نہیں تھا اور وہ اس جبرا" منگنی کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا تھا۔ مگر ڈیڈی کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔

ڈیڈی کے دل میں تو وہ مدتوں سے تھی۔ اس کی دوسری امی اور مائلہ کو بھی آئمہ نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے گھائل کرلیا تھا۔

واحد کی ناگواری' غصہ' ضد' نفرت اور مسترد کرنے کی خبریں سن سن کر بھی بڑی مطمئن تھی۔ یقیناً" اس میں عزت نفس اور انا نام کی کوئی چیز نہیں ——— تھی۔ ورنہ جتنی دفعہ وہ اسے مسترد کرچکا تھا' اپنی ناپسندیدگی اور غصے کا اظہار کرچکا تھا۔ اب تک تو آئمہ کو چاہیے تھا ہزار مرتبہ اس پر لعنت بھیج دیتی۔ منگنی کی انگوٹھی اس کے منہ پر دے مارتی یا پھر خود ہی انکار کردیتی۔

واحد نہیں جانتا تھا کہ بچپن سے ایک ہی شبیہہ کو دل میں سجانے والی بھلا کیسے ایک ہی جھٹکے سے اس شبیہہ کو نوچ پھینک دیتی۔ جبکہ اس کی ماں نے بہت اوائل عمر میں ہی واحد کے حوالے سے کچھ خواب آنکھوں میں سجا لیے تھے۔ کچی عمر کے بڑے پکے خواب تھے۔ بھلا ان کے رنگ کیسے اتر جاتے؟

آئمہ کو پورا یقین تھا۔ وہ صرف امریکا جانے کے لالچ میں اس بے نام نہاد رشتے کا ہار گلے میں لٹکائے ہوئے ہے۔ امریکا جاتے ہی منگنی توڑنے کا سندیسہ سنا دے گا اور اس کے سارے خدشات اور اندازے تب ثابت ہوگئے تھے جب وہ ایمبیسی کے چکر لگا تا بڑا مسرور تھا اور آتے جاتے آئمہ کو جتلانے سے باز نہیں آتا تھا۔

"جاتے ہی "میم" پھڑکاؤں گا۔ میرے انتظار میں نہ بیٹھی رہنا۔ میرے نزدیک اس منگنی کی کوئی اہمیت نہیں۔" واحد کے یہ الفاظ اس کی انا پر کاری ضرب تھے۔

آئمہ کو وہ بار بار مسترد کرتا تھا۔ آخر کس بنیاد پر؟ کیا وہ ان پڑھ تھی؟ بدصورت تھی؟ بدکردار تھی؟

جس کو قرنوں سے اپنی سوچوں' خیالوں اور خوابوں کی ڈوریں تھما رکھی تھیں۔ آج وہی اسے خاک دھول کررکھا تھا۔

اس دن بھی صبح صبح وہ اس کے اعصاب پر سوار ہوچکا تھا۔

"جاتے کے ساتھ ہی منگنی توڑ دوں گا' تم یہ انگوٹھی اتار کر مائلہ کو دے دینا۔" وہ فریج میں سے جوس نکالتا' ناشتا بناتی آئمہ کے سر پہ ہتھوڑا مار رہا تھا۔ آئمہ کے تاثرات لے مزا دے گئے تھے۔ اس کی پھیکی پڑتی سفید رنگت اور لرزتی پلکیں' کتنی خوب صورت ساعت واحد کے نصیب میں آئی تھی۔

"کل کے توڑتے آج ہی منگنی توڑ دو۔ میں تو شکرانے پڑھوں گی' تم جیسے فضول' بے ہودہ انسان کے ساتھ زندگی ضائع کرنے سے بہتر ہے بندہ کنوارا ہی مر جائے۔" وہ اتنی غصے میں تھی کہ بغیر سوچے سمجھے بولے جارہی تھی۔ "منگنی تو میں ضرور توڑوں گا' پر ایک مرتبہ امریکہ چلا جاؤں۔" وہ اسے جلا رہا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ امریکا چلا جاؤں۔" وہ اس کے لہجے کی نقل اتار رہی تھی۔ "میرے ساتھ منہ ماری کروگے تو ڈیڈی سے کہہ کر تمہارا ویزا کینسل کروادوں گی اور تم

جانتے ہو میں ایسا کرسکتی ہوں۔" اور اس کی دھمکی نے صحیح معنوں میں واحد کا سانس تک الجھا دیا تھا۔ اس کی دھمکی چونکہ محض دھمکی نہیں ہوتی تھی اور وہ عمل کرکے بھی دکھا دیتی تھی۔

"امریکا نہیں جاؤں گا تو مر جاؤں گی مگر ——— یہ فضول سا رشتہ تو ہر صورت توڑ ڈالوں گا۔" وہ ایک مرتبہ پھر آئمہ کا رنگ بدلتے دیکھ رہا تھا۔

"کہا نا جو مرضی کرو، مگر میری جان چھوڑ دو۔" وہ دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑتی یک لخت کچن سے باہر نکل گئی تھی۔ واحد کو اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں نے ٹھٹکا دیا تھا۔

تو کیا آئمہ کو یہ رشتہ اتنا عزیز تھا یا پھر محض اپنے دھتکارے جانے پر آزردہ تھی؟ یہ سوچ بڑی دیر بعد اس کے ذہن میں آئی تھی۔

مگر وہ ایک مرتبہ پھر تقدیر کے شکنجے میں جکڑا گیا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ ہٹے کٹے ایک دم فٹ اور چاق و چوبند ڈیڈی ہارٹ اٹیک کی زد میں آگئے تھے۔ اگرچہ اٹیک شدید نہیں تھا۔ مگر دوسری امی اور مائلہ سخت ہراساں ہوگئی تھیں۔ اس کے امریکا جانے میں مختصر سے دن رہ گئے تھے۔ مگر مائلہ اسے جانے نہیں دے رہی تھی۔

"ڈیڈی کو آپ کے پیچھے کچھ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے بھائی! آپ ہمیں تنہا چھوڑ کر مت جائیں۔" فی الحال اس نے امریکا جانا ملتوی کردیا تھا۔ یہ خبر گھر بھر کو بہت مسرور اور شاد کرچکی تھی۔ گویا سب چاہتے ہی یہی تھے۔

ڈیڈی نہ صرف بیمار ہوئے، بلکہ انہوں نے نوے فیصد اباؤں کی طرح "میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، مائلہ کو اور تمہیں گھر بار والا دیکھنا چاہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔" رٹ لگا کر اسے عاجز کردیا تھا۔

ڈیڈی کی یہ رٹ عماز چاچو اور احد کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ سو وہ ڈیڈی کی خوشی اور خواہش پوری کرنے کے لیے پورے دل سے تیار ہوچکے تھے۔ عماز چاچو نے اپنے خلوص کے آخری ڈونگرے برسا کر ڈیڈی کی اس پریشانی کا بھی گویا خاتمہ کردیا تھا اور مائلہ کو موحد کے لیے مانگ لیا۔ جانے چاچو کے بیٹے اتنے فرماں بردار کیسے تھے؟ چاچو نے ایک فون کیا اور موحد کھاریاں سے اڑتا ہوا لاہور پہنچ گیا تھا۔

ڈیڈی کو گویا دو جہان کی خوشیاں مل گئی تھیں۔ ان کی خواہش پر موحد اور مائلہ کا نکاح کردیا گیا تھا۔ تاہم جب واحد کی باری آئی تو وہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ گیا۔ اس نے آئمہ سے نکاح کرنے پر طوفان کھڑا کردیا تھا۔ وہ منگنی توڑ بھی سکتا تھا۔ مگر نکاح توڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

"موم کا گڈا ہوں میں، جس کا جو دل چاہے گا میرے بارے میں فیصلہ کرتا رہے گا۔ بچپن سے لے کر اب تک آپ سب کے ناجائز فیصلوں کی بھینٹ چڑھایا گیا ہوں۔ ناک پونچھنے کی عمر میں کالے پانی کی سزا دے دی۔ پر کسی سے کیا شکوہ کروں؟ جب آپ کو ہی میرا احساس نہیں تھا۔"

واحد نے اپنے اندر کے اس زہر کو اگل ہی دیا تھا جو اسے ممی اور عماز چاچو سے متنفر کرنے کا سبب بنا تھا۔ اس کا ننھا ذہن بورڈنگ کی سختیوں کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے اندر آشیانے سے دور رہنے کی اذیت پلتی رہی تھی، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناسور کی شکل اختیار کرگئی تھی۔ ڈیڈی کے ہزار دلائل ان کی پر اذیت مشقت سے بھری زندگی کے بارے میں سن سن کر بھی اس کا دل نہیں پسیجا تھا۔ ڈیڈی نے تنگ آکر ساری نرمی، پیار اور حلاوت ایک طرف لپیٹ کر رکھ دی تھی۔ انہوں نے غصے میں غضب ناک ہو کر کہا تھا۔

"میں دیکھتا ہوں امریکا میں بغیر سپورٹ اور پیسے کے تم کیسے رہتے ہو۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ جانوروں کی طرح کام کرکے بھی دو وقت کی روٹی کما نہیں پاؤ گے۔ تم من مانیاں کرکے ضرور پچھتانے والے ہو اور میں تمہیں پچھتاتا نہیں دیکھ سکتا۔"

ڈیڈی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر واحد کا دل بری طرح سے لرز گیا تھا۔ وہ اپنے بیمار باپ کو کتنا پریشان کررہا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا بھی تھا۔ اس کا باپ پردیس کی مشقت کاٹ کر آیا ہے۔

وہ شرمندہ اور پشیمان ضرور تھا۔ مگر اس پشیمانی اور جذباتی گفتگو کے دوران بھی اس نے دماغ کو حاضر رکھا تھا۔ وہ پھر بھی آئمہ کے ساتھ نکاح کا رسک لینے والا نہیں تھا۔ وہ بہت چالاک، مکار اور چھپا چھپا گھنی ٹائپ کی لڑکی تھی۔ اسے نرجس جیسی معصوم، ذرا دبو، تھوڑی کملی اور سیدھی سادی لڑکیاں پسند تھیں۔ اتنے عرصے بعد اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ احد نے کملو کی کس خوبی سے متاثر ہوکر اس سے شادی کی تھی۔ دراصل مرد کو کبھی بھی زبان دراز عورت پسند نہیں آتی۔ منہ پھٹ اور اپنے تئیں حاضر جواب بنتی عورتیں محفل لوٹ سکتی تھیں۔ مگر کسی کا دل نہیں اور آئمہ کی زبان کے جوہر کا وہ خود ہی گواہ تھا۔

وہ اسے لاجواب کرکے جو غرور سے گردن تان لیتی تھی۔ تب واحد کا دل چاہتا تھا اس کی گردن دبوچ کر مروڑ دے۔ وہ اداؤں سے اسے چونکاتی یا متوجہ نہیں کرتی تھی۔ محض طنز کے تیر چلا کر اسے آگ بگولا کرتی تھی۔

وہ اپنی خواہش، آرام سے بیان کرتا اور نکاح سے انکار کرتا، تب بات اتنی نہ بڑھتی۔ مگر اس کے انکار نے جہاں ممی اور چاچو کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی وہیں آئمہ بھی بجھ کر رہ گئی تھی اور ڈیڈی نے گویا اسے ہر طرف سے آزادی دے کر اپنے پچھلے رویوں کی تلافی کرلی تھی۔ وہ اسے اپنی طرف سے ہر فیصلے سے آزاد کرچکے تھے۔

پھر وہ مبارک دن بھی آگیا جب اسے اس حبس زدہ زندگی سے رہائی ملنے والی تھی۔ اسے ممی اور عماز چاچو نے آنسوؤں کے سائے تلے رخصت کیا تھا۔ احد اور واحد نے البتہ خوب ناراضی کا اظہار کیا تھا، جبکہ نرجس عرف کملو نے تمام کملے پن کو بھاڑ میں جھونک کر اس کے خوب لتے لیے۔ گھر والوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ ہر بندے نے حسب توفیق منہ سجا رکھا تھا۔ البتہ آئمہ ایسے غائب ہوچکی تھی گویا دنیا سے اس کا نشان ہی مٹ گیا تھا۔

وہ روشنیوں اور چمکیلے شیشوں کے شہر نیویارک پہنچ گیا تھا۔ گویا وہ خوابوں کی طلسماتی نگری میں اتر آیا تھا۔ وہ ایک نئی، انوکھی اور الگ سی جگمگاتی دنیا کو دریافت کرنے آیا تھا مگر یہ دریافت اتنی جلدی پچھتاوے میں بدلے گی یہ واحد سلطان احمد کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

شروع کے دو چار مہینے تو بڑے مزے میں گزر گئے تھے۔ ڈیڈی نے اسے خوب رقم دے کر بھیجا تھا۔ اکاؤنٹ بھی ڈالرز سے فی الحال بھرا بھرا تھا، سو تین، چار مہینے موج مستی میں گزر گئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اگلے پچھلے یاد آنے لگے۔ وہ دل بڑا کرکے خود کو خوب دلیر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ سو گھر فون کرنے سے پرہیز ہی کرتا رہا۔ ویسے بھی گھر میں اس کا فون سوائے مائلہ، دوسری امی اور ڈیڈی کے کوئی اور سنتا ہی نہیں تھا۔ ممی تھیں جو کبھی کبھار دل کے مجبور کرنے پر اس سے بات کرلیا کرتی تھیں۔ تاہم چاچو سمیت احد، ودید، موحد واعد میں سے اگر کوئی فون اٹھاتا بھی تو سلام دعا سے پہلے ہی مائلہ کو آواز دے کر بلا لیا جاتا تھا۔ تب شاید پہلی مرتبہ واحد کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ وہ ان کی بہن کو ہزار مرتبہ ٹھکرا کر آیا تھا۔ ایک سو ایک مرتبہ رد کرچکا تھا، پھر واحد ان لوگوں سے کیسی نرمی کی امید رکھتا تھا؟

تین چار مہینوں میں اسے اچھی طرح سمجھ آگئی تھی کہ گھر والوں کی محبتوں کے بغیر پردیس میں کیسے رہا جاتا ہے۔ اگر ممی نے اسے بورڈنگ بھیجا بھی تھا تو ہر دو ہفتے بعد اس سے ملنے پورا "کنبہ" پہنچ جاتا تھا۔ اگرچہ بظاہر برے دل کے ساتھ کرتا تھا مگر لاشعوری طور پر "اپنوں" کی آواز سن کر وہ اندر تک پرسکون اور سرشار ہوجاتا تھا۔

کبھی اس کا دعوا تھا وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے والوں میں سے نہیں۔ اب جانے کیوں مڑ مڑ کر کس آس پر دیکھا کرتا تھا۔ کبھی ماضی کی کھڑکی کھول لیتا۔ تب اسے کیڈٹ کالج کھاریاں کے ہر بلاک کے ہر در دریچے میں

کھڑا ایک خفا خفا لڑکا دکھائی دینے لگتا تھا اور اس ویران پریشان اپنے گھر سے دور اپنوں کی یاد میں اداس اور غم زدہ وہ ممی کو اور اپنے گھر کو کہیں دور اندر خاموشیوں میں، رات کی تاریکیوں میں خود سے بھی چھپ کر یاد کیا کرتا تھا۔

پھر اسی کالج میں اس نے سب سے زیادہ آئمہ کو یاد کیا تھا چاہے برے الفاظ میں ہی سہی۔ وہ کسی بھی اتوار اسے فون کرنا نہیں بھولتی تھی مگر وہ اسے فون کرنا کیوں نہیں بھولتی تھی؟ یہ تب وہ نہیں سمجھتا تھا۔ یہ سب اب لاکھوں میل دور بیٹھ کر سوچ رہا تھا۔

اس کا دل یہاں آکر من پسند خواہش، خواب کی تعبیر پاکر بھی ناخوش تھا۔ لگی بندھی سی ایک روٹین تھی، یونیورسٹی سے اپنے فلیٹ تک۔ اسے یہاں کام نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ ڈیڈی اکاؤنٹ ہر مہینے بھر دیتے تھے مگر وہ آسائشات پاکر بھی خوش نہیں تھا، اسے لگتا تھا اس کی ذات کا ایک بڑا حصہ کہیں گم ہو گیا ہے کہاں گم ہوا تھا۔ یہ چیز وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کی ہر سوچ لہراتی، بل کھاتی، اٹھلاتی ہوئی اس منہ پھٹ بدلحاظ لڑکی کے ارد گرد گھومنے لگتی تھی۔ وہ کتنا احمق، کم فہم اور بدنصیب تھا جو محبتوں سے دور بھاگتا تھا۔

جب اس کا زیادہ دل گھبرانے لگتا تب وہ اسامہ کو کال کرلیتا تھا اور وہ اسے تنگ کرنے کے لیے، چھیڑنے کے لیے اور بہت کچھ جتلانے کے لیے طعنوں سے لپٹے گیت سناتا تھا۔

تیرا گھر بار یہاں
تیرے سب یار یہاں
تیری راہوں میں کھڑا
تیرا پیار یہاں
سب کچھ ہے تیرے دیس میں
تو ڈھونڈے کیا پردیس میں۔

فلیٹ کی تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ یہاں اس کی دلچسپیوں کے کئی لوازمات تھے مگر وہ دلچسپی لیتا تو تب نا۔

ممی بغیر کسی صلے کے، اس پر اپنی بے لوث محبتیں نچھاور کرتی رہی تھیں اور پھر ڈیڈی سے رقم لیے بغیر اتنے مہنگے ترین کالج میں محض اس کی شخصیت بنانے کے لیے داخل کروانا کیا کم تھا؟

اسے آئمہ بھی کبھی بھولی نہیں تھی۔ خصوصاً گھر کی صفائی کرتے ہوئے، لانڈرنگ کرتے ہوئے، کپڑے پریس کرتے ہوئے، جوتے پالش کرتے ہوئے اور برتن دھوتے ہوئے۔ وہ کھانا بناتے ہوئے اکثر رو پڑتا تھا۔

ڈیڈی صحیح کہتے تھے، زندگی یہاں بہت مشکل تھی۔ وہ اکثر ڈیڈی سے بات کرتے ہوئے بھرا جاتا۔ دوسری ای بھی اسے واپس آنے کو کہتیں۔ ممی نے کبھی آنے کے لیے اصرار نہیں کیا تھا تاہم وہ ان کے بن کہے بھی جانتا تھا کہ ممی کا رواں رواں اس کی واپسی کا منتظر ہے۔

اس کی حقیقی ماں تو وہ ہی تھیں۔ اسے راتوں کو جاگ جاگ کر لوری سنانے والی اور واحد کتنا ذلیل تھا جو ممی کے منہ پر کہہ آیا تھا۔

"آپ پالنے پوسنے کا خراج مانگتی ہیں۔ آپ کی پائی پائی لوٹا دوں گا مگر اپنا آپ عمر بھر کے لیے گروی نہیں رکھ سکتا۔"

اس کے یہ لفاظ ممی کو پتھر کر گئے تھے پھر آئمہ اور ممی کی طرف سے کوئی اصرار نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں گویا اندر سے بجھ گئی تھیں۔ انہیں ایسی سفاکی کی اور ایسی بے رحمی کی امید ہرگز نہیں تھی۔

اسامہ اسے سمجھاتا بھی تھا کہ وہ وقت ضائع کرنے سے پہلے دیر ہونے سے پہلے اپنے گھر لوٹ آئے مگر واحد بھلا کس منہ سے واپس جاتا؟ اتنے لوگوں کے دلوں کو روند کر، دل دکھا کر آیا تھا پھر کیسے پلٹ جاتا۔ اذیت سی اذیت تھی۔ اور اس اذیت کا خاتمہ ہونے کے بجائے درد کا ایک اور نیا طوفان امڈ آیا تھا۔ جب اسے مائلہ کے توسط سے اطلاع ملی تھی۔

"آئمہ کے کئی پرپوزل آئے ہیں اور ممی ان دنوں اس کے لیے کسی پرپوزل کو فائنل کرنے والی ہیں، وہ آپ کی خاطر آئمہ کو کب تک بٹھا سکتی ہیں۔" واحد تو گویا اس انکشاف پر سرتاپا ہل گیا تھا۔ تو گویا کیڈٹ کالج کلر کہار سے لے کر امریکا تک اس کی یادوں میں بسنے والی آئمہ کسی اور کی ہونے والی تھی۔

وہ اس کی منگیتر تھی۔ احد کے ولیمہ پر آئے ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں اس کے نام کی انگوٹھی آئمہ کو پہنائی گئی تھی۔ تو پھر ممی کسی اور جگہ آئمہ کا رشتہ کیسے کر سکتی تھیں؟

اس پل وہ اپنی سابقہ بکواس یکسر بھلا چکا تھا۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ آئمہ پرائی ہونے جارہی تھی۔ اس کی زندگی سے نکلنے والی تھی۔ مگر آئمہ اس سے دور کیسے جاسکتی تھی؟ وہ تو واحد سے محبت کرتی تھی۔

"محبت۔" واحد۔ ٹھٹک گیا تھا۔ بھلا محبت یہاں کہاں تھی؟ یہاں تو صرف جھگڑے تھے، تکرار تھی، لڑائیاں تھیں، غصہ تھا۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سازشیں تھیں۔ محبت بھلا کہاں تھی؟

پھر کوئی واحد کے اندر سے پکار پکار کر چیخ اٹھا، ان لڑائیوں میں، ان جھگڑوں میں، اس تکرار میں، اس خیال کرنے کے انداز میں، ان فون کالز میں، تازہ بنائے ان پکوانوں میں۔ محبت ہی تو تھی۔

وہ ہر دوسرے اتوار اس کے کالج میں بھائیوں کے ہمراہ پہنچ جاتی تھی۔ یہ سب محبت کے اسلوب ہی تو تھے۔

اس نے کئی مرتبہ اسے جتلایا تھا تم عزیز ہی بہت ہو، پیارے ہی بہت ہو۔ بھلا ان لفظوں کا مفہوم کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کچے دھاگے سے بندھے سرکار چلے آئے ہیں یا نہیں۔"

نرجس عرف کملوا نے سابقہ تمام کملے پن بھول کر بڑے فخر سے کچن میں کھڑی اپنی ذہانت کو داد دے رہی تھی۔

"دیکھ لو، میرا اندازہ کچھ غلط نہیں تھا۔" وہ ابھی تک اترا رہی تھی۔

"میں نہ کہتی تھی، تمہارے پرپوزل کی خبر اس کے ہوش اڑا دے گی۔ ایسے بے نیاز لوگوں کو اسی طرح آزماتے ہیں۔"

اس کا سابقہ جوش بھرا انداز قائم دائم تھا۔ یہ کملوا اور مائلہ کی ہی کارستانی تھی کہ واحد اپنا سمسٹر چولہے میں جھونک آیا۔

"یہ خبر میں رات سے سن رہی ہوں مگر اس کے باوجود ہر کوئی مجھے خصوصی طور پر بتانے ضرور آتا ہے خیر ہے؟"

وہ تنک کر کہتی کچن سے نکل گئی۔

اور وہ... وہ رات بھر اپنے ڈیڈی اور ممی کے پیر پکڑے ایسی ایسی منتیں کررہا تھا کہ کلیجے تھام رہے تھے۔ وہ کتنا اکھڑ اور بدلحاظ تھا۔ وہ جان سے بڑھ کر پیار کرنے والی ممی سے بھی بدظن تھا۔ چچا زاد بھائیوں

سے بھی دور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کو بھی چھوڑ گیا تھا۔ اسے اپنے ہر ہر عمل پر شرمندگی تھی۔

"پیاری ممی! مجھے معاف کردیں حالانکہ معافی لفظ چھوٹا ہے۔ میری بے ہودگیاں اور بد تمیزیاں بہت بڑی اور بھاری ہیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ ہمیشہ آپ کے لیے غلط اور الٹا سوچا۔ آپ نہیں جانتیں ممی! ان آٹھ مہینوں میں کس کس یاد نے مجھے رلایا ہے۔

ممی! میں اپنا احتساب کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتا تھا اور پھر خود کو ہر کدورت سے پاک کرکے آپ کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔

میں جتنا بھی غور کرلوں، سوچ لوں تب بھی اپنی بدگمانی کی ایک بھی ٹھوس وجہ سمجھ نہیں آتی سوائے اس کے کہ پہاڑوں میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ تو بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور میں خواہ مخواہ اتنے سال آپ سے بدگمان رہا۔ آئمہ کی محبت کو نہ سمجھ پایا۔ وہ تو جانے کب سے مجھے چاہتی تھی۔ بس میں ہی الو، احمق، بے وقوف اور بدھو سمجھ نہیں پایا۔۔۔ ممی! یہ آئمہ کی محبت ہی تو تھی جو وہ مجھے اس طرح۔۔۔"

بہت بھرائی آواز میں اتنی طویل گفتگو کرتے واحد کے بازو میں کسی نے بہت زور سے چٹکی کاٹی تھی مگر وہ پھر بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ تب کسی نے اس کے پیر پر اپنا پیر بہت زور سے مارا تھا۔ تب واحد بات ادھوری چھوڑ کر سر اٹھائے اپنے برابر کھڑے احد، وعید اور موحد کو دیکھ رہا تھا جو آنکھوں ہی آنکھوں میں جانے کب سے اسے سرزنش کررہے تھے مگر جب واحد نے دھیان نہیں دیا تب احد نے اس کے بازو میں چٹکی کاٹ کر اور وعید نے پیر مار کر احساس دلانا چاہا تھا۔

"بدھو، احمق گدھے! ایسی باتیں پیرنٹس کے سامنے نہیں کرتے۔ آئمہ کی محبت لاحول۔۔۔"

موحد گویا اپنا ماتھا پیٹ رہا تھا۔ اسے احمق، عقل سے پیدل اور جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ تب وہ ممی، چاچو، ڈیڈی اور دوسری امی کی ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز سن کر سخت جھینپ گیا تھا۔ روانی میں وہ کیا کچھ بول چکا تھا۔

اسے سخت شرم اور خفت محسوس ہوئی تھی، سو وہ فوراً ہی اٹھ کر اندر کی طرف بھاگا۔

جہاں نرجس بھابھی عرف کملو کھڑی پتھر کے مجسمے میں ڈھلی بس گرنے کے قریب تھی۔ دراصل آئمہ کے ان الفاظ کو سن کر۔

"بھاڑ میں جائیں سارے اقوال۔ ذرا اپنے اور میرے دشمن کو بتا آؤ۔ میں دس ماہ پہلے جوڑے گئے اس رشتے کو خود توڑ رہی ہوں۔"

کملو نے پتھر کی مورتی میں ہی ڈھلنا تھا۔

"تم معافی کس چیز کی معافی مانگ رہے ہو؟ آخر تم نے غلطی کون سی کی ہے؟ صرف مجھے مسترد کیا ہے؟ دھتکارا ہے اور یہ کوئی بڑی غلطی نہیں جس کی معافی مانگ رہے ہو۔ تم نے اپنا حق استعمال کیا ہے۔"

"میں اسی "بکواس" کی معافی مانگ رہا ہوں۔" وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "قسم سے! تمہیں دل سے مسترد نہیں کیا بس میں نے تب تمہارے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ مشرقی لڑکا تھا نا۔ ممی کے اصول، قاعدوں اور قوانین میں تربیت پاکر بڑا ہونے والا، پھر کیسے بے حیائی کا مرتکب ہو جاتا۔ کسی کی بیٹی کو تاڑتا پھرتا۔ منگنی سے پہلے اور منگنی کے بعد بھی فطری سی شرم مجھے اعتراف کے مرحلوں تک لے جانے سے گھبراتی تھی حالانکہ تم سے محبت تو میری گھٹی میں پڑی ہے۔ تمہارے سر کی قسم! ایسے گھور گھور کے تو نہ دیکھو۔"

واحد نے اداکاری کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔

"میرے ساتھ چال چلنے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہاری نیت کے کھوٹ سے واقف ہوں۔ اور یہ ڈرامے کرنے کی بھی ضرورت نہیں، ممی اور سب لوگ تمہاری غلطیوں کو درگزر کرچکے ہیں۔ تمہارا سابقہ مقام بحال ہو گیا ہے۔۔۔ تم اطمینان رکھو، میں منگنی کی انگوٹھی ڈیڈی کو واپس کرنے والی ہوں۔"

واحد کے خاموش ہوتے ہی آئمہ نے اپنے اگلے خطرناک ارادوں سے بھی اسے باخبر کردیا تھا۔

تو گویا وہ اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھی۔ واحد کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"کل تم مجھے مسترد کرتے تھے۔ آج میں تمہیں مسترد کرتی ہوں۔"

واحد کے چہرے پر پھیلا دھواں دیکھ کر دل کو کتنی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ آئمہ لمحوں میں ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ مگر یہاں تو کایا پلٹ چکی تھی۔

"تو تم مجھے مسترد کرتی ہو، محض اس لیے کہ میں نے تمہیں اپنی کم فہمی میں بہت بے ہودہ الفاظ سے نوازا ہے۔ میں نے تمہاری ذات کو تو کبھی بھی رد نہیں کیا۔ میں تو صرف تمہاری سوچ اور تخریبی ذہن سے خار کھاتا تھا۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے اور کس طرح آئمہ کے دل کی ساری بدگمانی دھو ڈالے۔

"اپنا اور میرا وقت فضول تکرار میں ضائع مت کرو۔ ویسے بھی تم نے تو امریکا جاکر "میم" پھڑکانی تھی۔ اور پھر اس نام نہاد منگنی کو بھی توڑنا تھا۔ میں تو تمہارے اس فون کا انتظار کررہی تھی مگر تم خود شرمندگی کی بوری اٹھائے بھاگ آئے۔"

آئمہ نے بہت واضح طور پر واحد کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے دیکھے۔

"میں تو شروع سے تمہارے حصار میں ہوں۔ وہ برا حصار تھا یا اچھا۔۔۔ مگر کالج کا چپہ چپہ گواہ ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہیں یاد کیا۔ تمہاری لگائی بجھائی کو، شرارتوں کو، شاطرانہ چالوں اور منصوبوں کو، تم کیسے اور کس طرح ممی سے میری چھترول کروایا کرتی تھیں، پھر تمہاری ڈرامے بازیاں، جو دراصل تمہاری محبتیں تھیں جسے میں عموماً چالاکی، مکاری ہی سمجھتا تھا۔ میں کتنا کم فہم تھا۔ کتنا بے عقل تھا۔"

واحد کی آواز زیادہ بھرآئی تو وہ چپ ہو گیا تھا۔ کیونکہ اب آئمہ کے بولنے کی باری تھی۔ اور اس کا لہجہ پہلے سے کچھ مختلف ہو گیا تھا۔ ذرا نرم اور ہلکا پھلکا۔

"اچھا، اب زیادہ جذباتیت کا مظاہرہ نہ کرو۔ میں کتنا کم فہم تھا، کتنا بے عقل تھا۔" وہ اس کے لہجے کی نقل اتار رہی تھی۔ "تم اب بھی کم فہم اور بے عقل ہو۔"

اسے شدید غصہ آتے آتے رہ گیا تھا۔ وہ مزید اس پر غصہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔

"جو مرضی کہہ دو، پر معاف ضرور کردو۔۔۔ کیونکہ میں تم سے شادی کرنے کے بعد بہت اچھا فرماں بردار قسم کا شوہر بننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

آئمہ کے چہرے پر یکایک پھیلی نرمی کو محسوس کرکے واحد کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ تو گویا وہ اپنا مقدمہ جیتنے کے قریب قریب پہنچ گیا تھا۔ ویسے بھی یہ "مقدمہ دل" تھا، ہار جاتا تو پھر کہاں جاتا؟

"تم بے شک ایسے ہی منہ پھٹ، بدلحاظ اور بدتمیز ہی رہنا مگر۔۔۔ مگر یہ رشتہ نہ توڑنا۔"

حالانکہ وہ مسکرانا نہیں چاہتی تھی مگر ہونٹ تھے کہ کھلے ہی جارہے تھے اور ناراضی تھی کہ ختم ہی ہوتی جارہی تھی۔

"سو دفعہ پش اپ، کروتب ہی مانوں گی۔ اتنی آسانی سے تمہاری "بکواس" بھلانا ممکن نہیں۔"

"سو دفعہ نہیں، ایک سو دو دفعہ کروں گا۔ مگر مجھے ذرا اس خوش خبری کا اعلان کرلینے دو۔"

باچھیں چیر کر بولتا ہوا وہ دوسرے ہی لمحے کچن سے نکلا اونچی آواز میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اکلوتے دوست اسامہ کو فون کھڑکانے جارہا تھا کہ اس نے دل کا ہارا ہوا مقدمہ جیت لیا تھا۔

ادھر آئمہ سوچ رہی تھی۔ وہ محبت ہی کیا جو دلوں کو تنگ کرے اور انا کی فصیلیں کھڑی کرے۔ رشتوں کو جوڑنے کے بجائے توڑے۔

اس نے اپنے دل کو وسیع کرکے واحد کی پچھلی غلطیوں کو معاف کردیا تھا۔ اور وہ واحد کی آئندہ زندگی میں سرزد ہونے والی غلطیوں کو بھی درگزر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ انسانی فطرت کبھی بدل نہیں سکتی واحد اچھا خاصا جھگڑالو، بدلحاظ اور منہ پھٹ تھا اور ایسی خوبیوں سے آئمہ بھی مبرا کہاں تھی؟ مگر فطرتاً" وہ دونوں ہی خیال کرنے والے اور محبت کرنے والے تھے۔

☼

صباحت یاسمین ملک

حاصلِ کلام

"سیرت پلیز!"

وہ اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اتنا ہانپ چکا تھا کہ دو لفظ بھی ٹھیک سے نہ بول سکا۔

"صفی! بس کرو خدا کے لیے اب مزید نہیں۔" شولڈر بیگ کاندھے پہ لٹکائے فائل سینے سے لگائے وہ لڑکی رکی اور روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔

"تم سوچو تو سہی' خود کو منانے کی کوشش تو کرو یار۔۔۔!"

"ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں عقل اور فہم رکھتی ہوں۔ مجھے اپنی زندگی خراب نہیں کرنی۔"

وہ اب ہولے ہولے صفی کے برابر قدم اٹھا رہی تھی۔

"فار گاڈ سیک یار! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ بری طرح زچ ہوا۔

"ہاں جیسے پہلے بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔" طنز ہی طنز بھرا لہجہ تھا۔

"لک سیرت! ہم اچھے گمان کے ساتھ بہت ہی اچھی امیدیں لے کر کوئی کام کریں تو وہ ایسا غلط نہیں ہو سکتا' جیسا تم سوچ رہی ہو۔"

"تمہارے والدین کی دفعہ ان کے بڑوں نے بھی نیک گمان اور نیک خواہشات کے ساتھ ہی سب کیا تھا' مگر نتیجہ کیا ہوا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

وہ صفی کے رسانیت بھرے لہجے پر ٹھنڈی تو ہوئی مگر قائل ذرا نہ ہوئی۔

"تھوڑا پوزیٹو سوچنے کی کوشش کرو یار!"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ حقائق سے نظریں چرا لو بی بی!"

"تمہاری اس ہٹ دھری کی وجہ کچھ اور تو نہیں؟" وہ مشکوک انداز میں بولا۔

"تمہارے ایک بھائی اور میرے دو بھائیوں سے بڑی وجہ کوئی نہیں ہو سکتی صفی الرحمٰن!"

اندر کی تکلیف کو دباتے وہ بمشکل بولی اور تیز تیز ڈگ بھرتی کیفے ٹیریا کی جانب چلی گئی۔ صفی نے زیریں لب دانتوں تلے دبا لیا۔

"کیا کروں میں؟" اس نے بے بسی سے خود کلامی کی۔

جانے کتنی دیر وہ وہیں کھڑا سوچتا رہتا کہ اچانک اس کی کلائی پہ بندھی رسٹ واچ کی ہلکی سی بیپ سنائی دی۔ وہ سوچوں کے بھنور سے نکلتے ہوئے اپنے ڈپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ آج اس کا کوئز تھا' مگر اس کا مکمل دھیان سیرت والے سوال کو حل کرنے میں تھا۔ یہ کوشش وہ پچھلے کئی ماہ سے کر رہا تھا۔ سیرت نے گھر میں بات چیت مکمل بند کر دی تو وہ یونیورسٹی میں اس کے پیچھے پھرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کی چچا زاد تھی۔ چچا کی اولادوں میں واحد مکمل طور پر صحت مند۔ اس کا بڑا بھائی نابینا تھا اور چھوٹا ذہنی معذور اور وجہ تھی کزن میرج!

صفی الرحمٰن کا اپنا چھوٹا بھائی بھی ذہنی معذور تھا۔ ان کے خاندان میں پشتوں سے کزن میرج چلی آرہی تھی۔ وجہ تسمیہ خاندان میں ایکا رکھنا اور ایک دوسرے کی ذمہ داریاں بانٹنا بتائی جاتی۔ ایسا نہیں تھا کہ فیملی میں بیمار بچوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی' مگر ہر نسل میں کسی نہ کسی جوڑے کو اولاد کا ایسا دکھ اٹھانے کو ملتا ہی رہا۔ صفی اور سیرت کی تینوں پھوپھیوں کی تمام اولادیں بفضل خدا مکمل طور پہ صحت مند تھیں مگر ان دونوں کے والدین کے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کا امتحان لکھا تھا۔

ستم ظریفی کہ اچانک صفی الرحمٰن دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ مگر سیرت۔۔۔ انکاری ہو گئی اور پھر اپنے انکار پہ ڈٹ بھی گئی۔ صفی زچ ہوتا' غصے میں پیچ و تاب کھاتا' مگر ہمت نہ ہارتا اور پھر کوشش شروع کر دیتا' لیکن سیرت کی ڈھٹائی کم نہ ہو رہی تھی' صفی نے گھر کے بڑوں کی مدد لی اور پھر وہی ہوا جس کا سیرت کو ہمیشہ ڈر رہا تھا۔ وہ سب جو ہمیشہ سے خاندان میں ایکا رکھنے کے لیے کزن میرج کو اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھتے تھے۔ وہ سیرت کے سر ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے نہیں کھانا کچھ بھی۔"

جونہی اس کی ماں کھانے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس نے جھٹ سے کہا اور ہاتھوں کے کٹورے میں رکھا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

"میری چندا! کیوں ناراض ہوئی ہے؟" نجمہ ٹرے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر اس کے پاس آبیٹھیں۔

"پوچھ تو آپ ایسے رہی ہیں جیسے آپ جانتی نہیں ہیں کچھ۔" بے حد رکھائی سے کہتے ہوئے وہ اپنے لہجے کی نمی چھپانے میں ناکام رہی۔

"بیٹا! ہم تیرے دشمن تو نہیں۔۔۔"

اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے اسے پچکارا۔

"جی ہاں مگر آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کے تو شوقین ہیں آپ سب!"

"ایسے تو نہ کہو۔۔۔" نجمہ کو واضح برا لگا۔

"کیوں برا لگا۔ مگر امی آپ جتنی بھی شوگر کوٹنگ کر لیں۔ یہ حقیقت تلخ ہی رہے گی۔"

اس نے گفتگو کے دوران پہلی بار گھٹنوں میں چھپا چہرہ اٹھایا۔ نجمہ کو اس پہ بے طرح پیار آیا۔ بھوک ہڑتال کی وجہ سے اس کا چھوٹا سا منہ نکل آیا تھا۔ روئی روئی آنکھیں' سرخ ہوتی ناک اور ناک پہ دھری بے تحاشا ناراضی۔۔۔ نجمہ کا جی چاہا فوراً اسے خود میں بھینچ لیں۔

"میری بٹی! اچھی طرح جانتی ہے ہم اس کے لیے کتنی دعائیں کریں گے' سب کو بھرپور امید ہے کہ تمہیں اتنی خوشیاں ملیں گی کہ تم سے سنبھالی نہ جائیں گی۔"

وہ اسے خود سے لپٹانے کی کوشش کرتے ہوئے



بولیں۔

"تم دونوں صحت مند ہو بیٹا! اور پھر اپنی پھوپھیوں کی طرف دیکھو ان کی بھی تو خاندان میں ہی شادیاں ہوئیں مگر اللہ کا کرم رہا۔ سارے بچے صحت مند ہیں ان کے۔"

"امی پلیز۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ضروری نہیں کہ پھوپھیوں پہ آزمائش نہیں آئی تو مجھ پہ بھی نہ آئے۔" وہ پھر روہانسی ہو گئی۔

"ضروری تو یہ بھی نہیں کہ اگر ہم پہ امتحان آیا ہے تو تم پہ بھی آئے!"

"امی! دنیا بھر کے ڈاکٹرز بتا بتا کے تھک چکے ہیں اور آپ میں سے کوئی ایک شخص بھی سمجھنے کو تیار نہیں۔"

"اچھا؟" نجمہ یوں بولیں جیسے اس کی بات سے انہیں اچنبھا ہوا ہو۔

"دنیا بھر کے تمام ڈاکٹرز اور ماہرین کا کہا ہم سے زیادہ اہم ہو سکتا ہے تمہارے لیے؟"

ان کی اس جذباتی کوشش پر سیرت نے تھکن سے بھرپور ٹھنڈی سانس خارج کی۔

"رائٹ۔۔۔ تو آپ لوگ نہیں مانیں گے؟" اچانک ہی اس کا دل چاہا تھا کہ ان سے فیصلہ کن بات سن لے۔

"ہاں اور تمہیں ماننا ہی ہوگا۔" نجمہ کا لہجہ قطعی تھا' گو کہ ایسا قطعی جواب وہ ابا' چچا' دادا' دادی اور پھوپھیوں کا بھی سن چکی تھی مگر ماں سے سن کر تو جیسے وہ تڑپ ہی اٹھی۔

"امی! آپ لوگوں کو مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں؟"

"بیٹا! ہمارے پیار پہ تو شک نہ کر۔"

سیرت نے دیکھا کہ یہ کہتے ہوئے اس کی ماں کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں اور یہیں وہ ہار گئی۔

☼ ☼ ☼

"اف ہم لڑکیاں بھی نا!"

جونہی اسے احساس ہوا دروازہ کھولا جا رہا ہے' اس نے اپنی دھڑکنوں کو بری طرح اتھل پتھل ہوتے پایا۔ اسے خود پہ بہت غصہ آیا تھا۔ وہ دروازہ لاک کر کے بیڈ کی طرف آنے لگا۔

سیرت نے خود کو یہ محسوس کرنے سے روکنا چاہا کہ وہ نروس ہے۔ وہ بیڈ پہ اس کے قریب آبیٹھا۔

"السلام علیکم!"

اس کا سلام سن کر سیرت کو بے پناہ حیرت ہوئی کہ آج تک چاہے اس نے صفی کو بھوک بھوک کا شور مچاتے سنا' گرمیوں کی لوڈ شیڈنگ میں با آواز بلند گنگناتے سنا۔ ہمیشہ اس کی آواز پھٹے ڈھول سی لگی مگر آج جانے کیوں اسے یہ لہجہ' آواز' انداز سب بہت رومانٹک لگا حالانکہ وہ تو حسب معمول ہی بولا تھا۔

"اللہ کرے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مبارک ثابت ہوں۔" اس کا لہجہ دعائیہ تھا۔ سیرت خاموش رہی۔

"آمین بھی نہیں کہو گی کیا؟"

"آمین ثم آمین!" سیرت نے ہولے سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"میں نے۔۔۔ امی سے ایک۔۔۔ بات کہی تھی۔۔۔!"

وہ رک رک کر بات مکمل کر پائی تو صفی کو یک لخت احساس ہوا کہ وہ نروس ہے۔

"وہ بات میں نے بھی سوچ رکھی تھی۔۔۔ شاید تم سے پہلے ہی سوچی ہو اور تم پلیز یہ گھونگھٹ ہٹا کر سر اونچا کر کے ریلیکس ہو کر بیٹھ جاؤ بلکہ ٹیک لگا لو۔۔۔"

کہنے کے ساتھ ہی اس نے اٹھ کر بیڈ کے دونوں تکیے اوپر تلے رکھ کر اس کے قریب کر دیے۔

"میں کوئی بزرگ تو نہیں ہوں۔" اس نے نروٹھے پن سے تکیوں کو دھکیلا۔ صفی کو فوراً" احساس ہوا کہ ناراضی کس بات کی ہے۔ وہ مسکرایا پھر بڑے مجاز سے اس کے برابر آن بیٹھا اور گھونگھٹ اٹھایا۔

"میرے لیے محترم تو ہو نا!" وہ بری طرح جھینپی۔

"ویل! اس سارے میک اوور اور جیولری میں تم مجھے بہت کم نظر آ رہی ہو۔ اگر تم چاہو تو ابھی فریش ہو سکتی ہو۔"

سلور گولڈن تاروں سے بھرا جالی والا گلابی گھونگھٹ اس نے سائیڈ پہ رکھ دیا۔

"تھینکس صفی!"

"یو آر موور دین ویلکم مسز صفی۔۔۔ بائے دا وے ویلکم ان مائی روم' ان مائی لائف۔۔۔ اور یقین رکھنا میرا تمہارا ساتھ ہمارے لیے بہت سہل رہے گا۔"

اس کی بات پہ سیرت نے صدق دل سے ان شاء اللہ کہا اور تبدیل کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"بس بس میرا بیٹا۔۔۔ آ گئی ماما۔۔۔"

سیرت نے تھرماس سے نیم گرم پانی فیڈر میں ڈالتے ہوئے دور سے ہی اپنی بیٹی کو بہلایا۔ صفی اخبار لیے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ سامنے ہی اس کا کمرا تھا جس کے وسط میں ان کا بیڈ ایک طرف صوفہ اور ایک طرف ساتھ ساتھ لگے دو بے بی کاٹ تھے سونیا سو رہی تھی اور رانیہ بھوک کی وجہ سے بلک رہی تھی' صفی نے اخبار سائیڈ پہ رکھا اور آکر رانیہ کو اٹھا لیا۔ سیرت جب تک فیڈر تیار کر کے لائی' وہ اسے کندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے چپ کرا چکا تھا۔

"تم اسے ہاتھوں میں لو' اسے لمس کا احساس ہو تو وہ چپ ہو گی نا' دور سے بولتی رہتی ہو۔" رانیہ کو سیرت کی گود میں دیتے ہوئے صفی بولا۔

"بچے ماں کی لوریوں کو محسوس کرتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں ان پہ چاہے ماں دور ہی کیوں نہ ہو!"

وہ بیڈ پہ بیٹھ کر اسے فیڈر پلانے لگی۔ اس کی بات پہ صفی نے زیر لب دانتوں تلے دبا لیا اور پر سوچ انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بیڈ کی اس سائیڈ پہ جا بیٹھا' جہاں سیرت کی پشت تھی۔

"کب تک اور کیسے چھپا سکتے ہو صفی؟ آج نہیں تو کل' وہ جان جائے گی۔" کوئی اس کے اندر سے بولا تو بے ساختہ ہی پہلے اس کی نگاہ سونیا اور پھر رانیہ پہ گئی۔ بچیاں ابھی چند روز کی تھیں اور چونکہ یہ زچگی کے شروع کے دن تھے لہٰذا سیرت سے زیادہ باقی گھر والوں نے بچیوں کو سنبھال رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے محسوس نہ ہو سکا کہ۔۔۔

بنا چاہے ہی اسے یاد آ گیا کہ سیرت نے شادی کے لیے کیا شرط رکھی تھی۔

گو سیرت سے شادی کا فیصلہ کرتے وقت اس نے بھی یہی سوچا تھا کہ اگر خدانخواستہ انہیں اولاد کی معذوری کا امتحان سہنا پڑا تو وہ اپنی زندگی اس معذور بچے کے لیے وقف کر دیں گے۔ صحت مند اولاد کی خواہش میں فیملی بڑھاتے نہیں جائیں گے۔

"الحمد للہ"

سیرت کی آواز نے اسے مزید کچھ سوچنے سے روکا۔ رانیہ فیڈر ختم کر چکی تھی۔ جب ہی سیرت نے الحمد للہ کہتے ہوئے اسے ڈکار دلوانے کے لیے بے حد احتیاط کے ساتھ کندھے سے لگایا۔ پھر وہ اسے اس کے کاٹ میں لٹا آئی۔ پیٹ بھرا تو وہ گہری نیند میں چلی گئی۔

"سیرت! بات سنو۔" وہ کمرے کا دروازہ عبور کر رہی تھی کہ صفی بولا۔

"جی!" وہ مستعدی سے کہتے ہوئے اس کے سامنے آبیٹھی۔

"دو بچے کافی ہوتے ہیں نا؟" ہلکے پھلکے سے انداز میں اس نے پوچھا۔

"جی۔۔۔ مگر تین بھی زیادہ نہیں ہوتے میرے خیال سے۔" سیرت شرارت سے بولی تو بے ساختہ اس کے لبوں سے ٹھنڈی سانس برآمد ہوئی۔

"سیرت۔۔۔ ہم اپنی فیملی نہیں بڑھائیں گے۔" صفی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"ان فیکٹ وعدہ کے مطابق۔۔۔ ہم بڑھا ہی نہیں سکتے۔"

سیرت کو لگا کہ اس نے کچھ غلط سنا ہے۔ جب ہی وہ وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی' صفی نے نظریں چرا لیں۔ وہ بری طرح الجھن کا شکار ہوئی۔ اس کی دونوں بچیوں کے اعضا پورے' بجسم تندرست تھے

۔وہ کالی کالی آنکھیں گھما کر بغور دیواروں کو تکتی تھیں اور اسے یاد تھا کہ اس نے ڈاکٹر سے ان کی ذہنی حالت کے متعلق بھی پوچھا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق وہ بالکل نارمل بچوں کی طرح تھیں' پھر یہ صفی کیا کہہ رہا تھا بھلا؟

"ہماری بیٹیاں سن نہیں سکتیں۔" کہتے ہوئے صفی کی آواز لرزی' سن کر سیرت کا دل ڈوب کر ابھرا اور آنکھیں پھٹنے کے قریب ہوئیں۔

"وہ کبھی بول نہیں پائیں گی۔" بدقت صفی نے مزید بتایا تھا۔ سیرت نے اپنی چیخ کا گلا گھونٹنے کے لیے منہ پہ سختی سے ہاتھ رکھ لیا۔ صفی نے اسے اپنی پناہوں میں لے لیا۔ دونوں کا دکھ سانجھا تھا۔ ازراہ ہمدردی دونوں نے فورا" ایک دوسرے کو رونے کے لیے اپنا کندھا فراہم کیا۔

☼ ☼ ☼

"یادیں جکڑ لیتی ہیں۔" صفی نے تھکن سے بھرپور انداز میں کہا اور چشمہ اتار کر اسٹڈی ٹیبل پہ رکھا۔

"میں چائے بناتا ہوں بابا!" اس کے بالکل سامنے رکھے کاؤچ پہ بیٹھا نوجوان فورا" اٹھا اور برقی کیتلی کی طرف بڑھا۔

"جس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے سیرت سے شادی کی۔ وہ ایک بیٹے کی اپنے والدین سے محبت تھی۔۔۔ ایک بھتیجے کی چچا چچی سے ایک پوتے کی دادا سے اور سب سے بڑھ کر ایک بھائی کی اپنے معذور بھائیوں سے۔"

صفی الرحمٰن نے اب اپنی کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا تھا۔ خلیل الرحمٰن گو کہ چائے بنا رہا تھا مگر اس کا دھیان ان کی گفتگو میں تھا۔

"سیرت کے لیے رشتہ ملنا مشکل سے مشکل تر ہو رہا تھا۔ ہمارے ہاں کزن میرج کے بعد ترجیحات میں سب سے اہم یہ بات تھی کہ شادی کم از کم برادری میں تو ضرور ہی ہو۔۔۔ اور برادری کے لوگ اس بات پہ پکے ہو چکے تھے کہ اس فیملی کی لڑکی کو بہو بنایا تو اولاد صحت مند نہ ہوگی۔ میں گو کہ لڑکا تھا۔ میرا روشن مستقبل سب کو متاثر کر رہا تھا۔ میرے لیے اتنی دقت نہ تھی مگر میری ماں کی فکریں ختم نہ ہوتی تھیں۔"

وہ آنکھیں موندے بولتے جا رہے تھے مگر جونہی خلیل چائے لے کر آیا انہوں نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور شکریہ کے ساتھ چائے کا کپ تھام لیا۔ اپنا کپ لیے کاؤچ پہ واپس جا بیٹھا۔

"ان کا سارا دن روتے میں نوافل ادا کرنے میں' دعائیں مانگنے میں گزر جاتا۔۔۔ انہیں میرے بھائی کی بہت فکر تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ اس غم میں نڈھال سے نڈھال تر ہوتی جا رہی تھیں کہ کل کو میری دلہن آکر میرے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔۔۔ اور اگر وہ نک چڑھی' بد مزاج ہوئی۔ میری تنخواہ پر مکمل طور پر قابض ہو گئی تو بھائی کی دوائیاں اور دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔۔۔ ادھر سیرت کے والدین ہلکان ہو رہے تھے۔۔۔ وہی روایتی سوچ کہ والدین تو آج ہیں کل نہ ہوں گے۔ بھائی بیمار ہیں۔ اس کا میکہ تو سمجھو ہوگا ہی نہیں۔ سسرال والے کیا سلوک رکھیں گے اور پھر جب کچھ لوگوں نے انتہائی نامناسب اور بے جوڑ رشتوں کا بتایا تو انہوں نے مجبورا" میرے ابا سے بات کی۔ اماں فورا" راضی ہو گئیں اور دادا کو اس سے اچھی بات کوئی نہ لگی۔ ان سب نے مجھ پہ دباؤ ڈالا اور میں مجبور ہو گیا کیونکہ مجھے ان سب سے بے حد محبت تھی۔۔۔ میں محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کہ اس کے سر ہو گیا۔ وہ چڑتی رہی۔ ناراضی اور غصہ دکھائی رہی مگر آخر کار سب نے اسے منا کر ہی چھوڑا۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکے تھے۔ چائے ان کی کپ کی ختم ہو چکی تھی مگر پھر بھی کپ ان کے ہاتھ میں تھا۔ خلیل الرحمٰن نے اٹھ کر ان سے خالی کپ لیا اور اپنا اور ان کا کپ دھونے چلا گیا۔

وہ واپس آیا تو انہیں سوٹ کیس کے ساتھ کمرے سے نکلتے پایا۔ آج ان کی فلائٹ تھی۔

وہ خلیل الرحمٰن کو لے کر پہلی بار گھر جا رہے تھے۔ خلیل اسٹڈی ٹیبل تک گیا اور ان کا چشمہ اٹھا لایا۔ حسب عادت وہ بھول آئے تھے۔ حسب معمول اسے یاد رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم!" حسب معمول سیرت نے گیٹ کھولا۔ اسے دیکھتے ہی خوش دلی سے مسکرائی' سلام کیا اور راستہ چھوڑا۔

"وعلیکم السلام" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"آؤ۔ آؤ بیٹا۔" وہ مزید کسی سے کہہ رہا تھا۔ سیرت نے حیرت سے آنے والے کو دیکھا۔ بڑا سا سوٹ کیس اور چہرے پر واضح گھبراہٹ۔۔۔ یہ دو چیزیں بناکوشش کے دکھائی دے رہی تھیں۔

"سیرت یہ۔۔۔ میرا بیٹا ہے بلکہ ہمارا بیٹا۔۔۔ رانیہ اور سونیا کا بھائی!"

اس نے اطلاع دی تھی یا بم پھوڑا تھا۔

"کیا؟؟؟؟" سیرت کے لبوں میں لفظ اور حلق میں سانس اٹک گئی۔

وہ ذرا سا آگے بڑھا اور سیرت کے شانوں پہ اپنے ہاتھوں سے دباؤ ڈال کر اس کی گویا ڈھارس بندھائی۔

"آئی ایم سوری۔"

سیرت نے دیکھا کہ صفی الرحمٰن کا سر جھکا ہوا ہے۔

"میں نے تمہیں لیٹ بتایا۔" وہ وضاحت دے رہا تھا یعنی اسے احساس تھا کہ اس نے غلط کیا ہے۔ "بہت ہی زیادہ لیٹ بتایا۔"

"تم۔۔۔" کہتے ہوئے سیرت کی آنکھیں نم ہوئیں۔ ہونٹ لرزے۔ "تم مردوں کی فطرت نہیں بدلتی۔" غصہ' ہار اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات لیے وہ غضب ناک ہونے کو تھی۔

"ساری عمر تم محبتیں بدلتے رہتے ہو مگر کوئی محبت تمہارا اندر نہیں بدل سکتی۔" اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

"پاگل ہیں ہم عورتیں' بہت پاگل کہ عمر بھر محبت کے لیے مرتی ہیں۔ مر کر بھی محبت کرتی رہتی ہیں' نبھاتی رہتی ہیں۔۔۔ ان سے جو وعدے تک نہیں نبھا سکتے!"

بے پناہ ناراضی کے ساتھ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ خلیل الرحمٰن گو کہ اس ساری صورت حال کے لیے خود کو تیار کر کے آیا تھا مگر پھر بھی اس کی حالت متزلزل ہو گئی اور بابا۔۔۔ اس کے پیارے بابا۔ ان کے چہرے پہ بھی ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

صفی الرحمٰن نے ایک نظر ناشتے کے لوازمات کو دیکھا۔ سلائس سینکے نہیں گئے تھے۔ دودھ ٹھنڈا اور فرائیڈ ایگ ندارد!

"خلیل الرحمٰن جلدی آئیں بیٹا!" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

چند ثانیوں بعد خلیل الرحمٰن ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔

"بھئی آپ کی امی نے ناشتے کے برتن سمیٹ کر اور بھی کام کرنے ہوتے ہیں۔"

"سوری امی جان!" وہ اتنی اونچی آواز میں بولا کہ کچن میں موجود سیرت بآسانی سن لے۔ "آج نماز کے بعد لیٹ سویا تھا تو اٹھنے میں دقت ہوئی۔"

"اٹس او کے ناشتا شروع کرو اب۔" سیرت کا جواب تو آنا نہ تھا۔ صفی ہی بولا۔

"بابا! وہ ناراض ہیں نا۔"

"ہوں۔۔۔ بہت۔"

"راضی ہو تو جائیں گی نا؟"

"ہاں۔۔۔ شی از اے لوونگ لیڈی۔ ڈونٹ یو وری۔"

بابا نے تسلی کرائی تو وہ مطمئن ہو گیا' وہ لمحوں اور منٹوں میں اسے جان سے بڑھ کر عزیز ہو گئی تھیں' جب ہی تو اسے ان کی اتنی پروا تھی۔

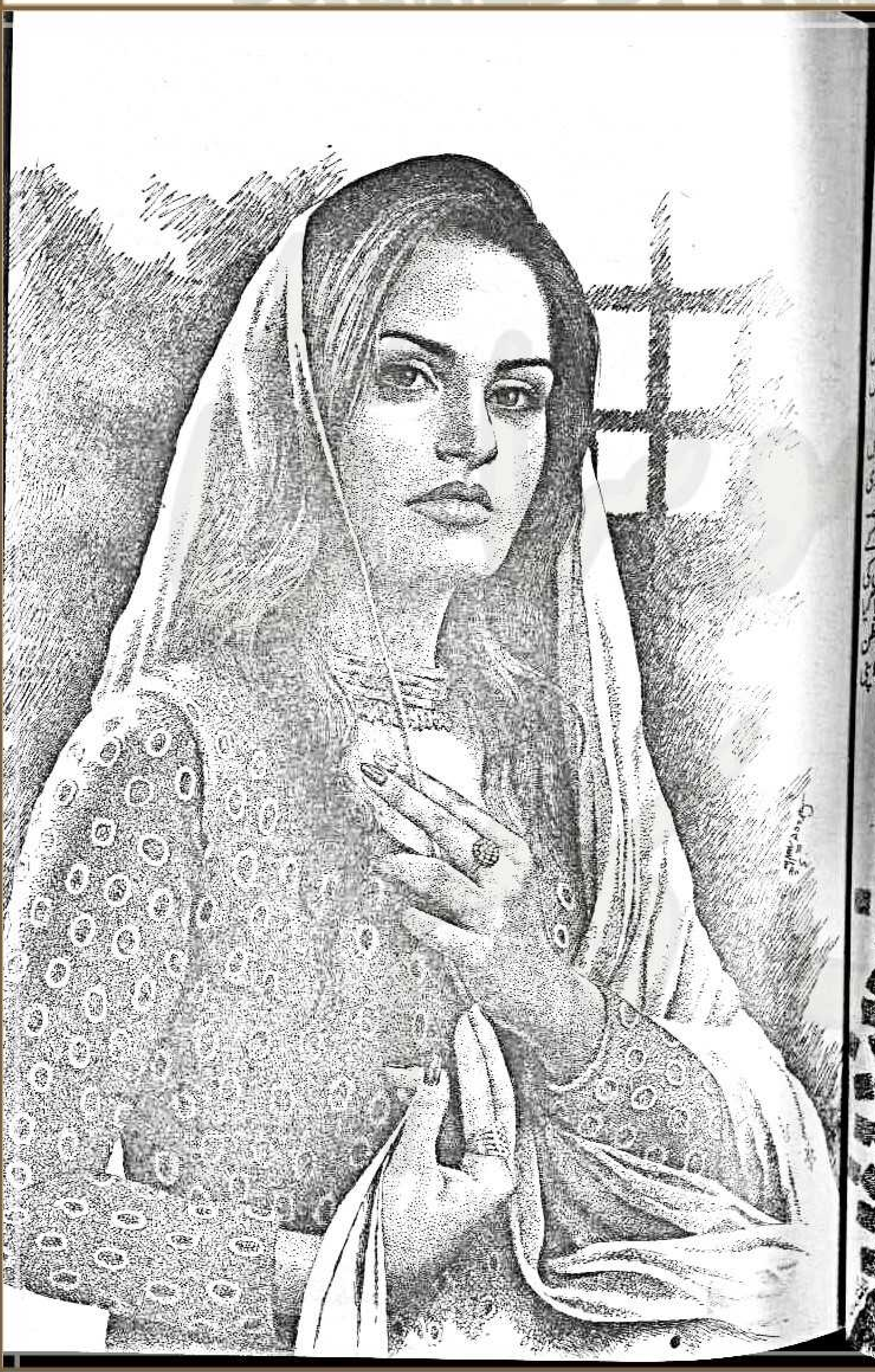
☼ ☼ ☼

اسے نیند میں امی کے رونے کی آواز آئی تو وہ بری طرح بے چین ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔

"کیا ہوا امی جان؟" وہ بے تابانہ ان کی طرف بڑھا۔
"کچھ نیا نہیں۔۔۔ وہی پرانے قصے جیسا ایک اور قصہ!" انہوں نے سسکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے جواب دیا۔
"کیسا قصہ امی! ٹھیک سے بتائیں نا؟" اس نے کہنے کے ساتھ ہی انہیں اٹھایا اور پنکھے کے عین نیچے والے صوفے پہ بٹھا دیا۔
"میں پانی لے کر آتا ہوں۔" کچن سے پانی لے کر آیا۔ "اب بتائیں کس کا فون تھا؟"
پانی پی کر وہ کچھ بہتر ہوئیں تو خلیل الرحمٰن نے پوچھا۔
"تمہارے ماموں کا۔ شزا کے ساتھ پھر کسی نے شرارت کی۔"
بتاتے ہی وہ پھر پھوٹ کر رو دیں۔
"مائی گاڈ۔۔۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔
ماموں کی بیٹی بھی انہی کی طرح نابینا تھی۔ بہت لوگ احترام کرتے' عزت دیتے مگر زیادہ لوگ تنگ کرتے' مذاق بناتے' چھیڑتے۔ ستم ظریفی کہ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ گلی کے شوخ لڑکے موقع ملتے ہی اسے بے حد ستاتے۔
"امی جان! کتنی بار ہی کہہ چکا ہوں کہ شزا اور ماموں کو یہاں لے آئیں۔ وہاں ضرورت کے کاموں سے بھی اسے چھت پہ جانا پڑتا ہے اور کبھی صحن میں نکلنا پڑتا ہے۔ یہاں سب کام ملازم دیکھ لیں گے۔"
"کیسے لے آئیں انہیں یہاں' کیا کہیں گے دنیا والے؟"
"فار گاڈ سیک امی جان! آپ کے بھائی کی فکریں ختم ہوں گی۔ آپ کی بھتیجی آرام سے رہے گی۔۔۔ یہ سب آپ نہیں سوچیں اور دنیا والوں کا سوچتی ہیں۔"
وہ بے طرح ناراضی سے بولا۔
"جوان بیٹی کے باپ کی فکریں یوں ختم نہیں ہوتیں بیٹا! پھر کل کو تمہاری بیوی آ گئی تو پھر۔۔۔ پھر کیا ہوگا؟"
"دس بیویاں اکٹھی بھی مل جائیں تو بھی میرے لیے آپ سب سے زیادہ اہم رہیں گی امی! آپ کے کام' آپ کے حکم میری ترجیحات میں سرفہرست ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔
سیرت نے جواباً" براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مضبوطی اور قطعیت۔۔۔ صرف یہی دو چیزیں سب سے واضح تھیں۔
"خلیل الرحمٰن!" سیرت نے محبت سے اسے پکارا۔
"جی امی!"
"شزا سے شادی کرو گے؟"
اس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے سیرت نے پوچھا۔ اس نے شاکڈ ہو کر چیخ نہ ماری' گھبرا کر اپنی جگہ سے نہ اٹھا البتہ ہلکی سی حیرانی اسے ضرور ہوئی۔ سیرت نے اسی لمحے اس کے دل میں اپنا مقام پہچانا۔
"شزا سے شادی کر لو بیٹا!"
وہ یوں بولیں جیسے کہا ہو کہ "بیٹا چائے پی لو۔"
"اوکے امی ڈیر!" بیٹا بھی یوں بولا جیسے کہتا ہو۔ "ابھی پیتا ہوں امی۔"

"حیران تو میں ہوا تھا' ضرور ہوا تھا۔ اصل میں مجھے یہ امید نہ تھی کہ امی شادی کا کہہ دیں گی' مگر پھر مجھے فوراً" ہی محسوس ہوا کہ انہیں مجھ سے بات مان لینے کی امید تھی' جب ہی میں فوراً" سے بیشتر بولا "جی ٹھیک امی"
جانے اس لمحے میں کیا تھا کہ اس ٹھیک کے بعد میری زندگی میں سب ٹھیک ہی رہا۔ حالانکہ وہ صرف خواندگی کی حد تک تعلیم یافتہ تھی اور میں نے ایم بی بی ایس کے بعد اسپیشلائزیشن بھی کر رکھی تھی۔"
میں اپنے بیڈ کے بیچوں بیچ اوندھا لیٹا تخیل میں بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ یہی میری عادت تھی کہ پہلے بھی میں بورڈنگ اسکول سے چھٹی پر آتا تو بیڈ پر اوندھے لیٹ کر ان سے باتیں کرتا۔ وہ اسپورٹس چینل دیکھتے ہوئے ہوں ہاں کرتے جاتے۔
"وہ ایک بہترین شریک حیات ثابت ہوئی اور میں نے امی کا دل اتنا خوش کر دیا کہ ان کے بعد بھی ان کی دعاؤں کے حصار میں ہوں!" میں رک گیا۔
"آپ اپنی ماں کے آگے مجبور ہو گئے تھے اور میں نے اپنی سعادت مندی سے اپنی ماں کو مجبور کر ہی لیا کہ وہ مجھ سے محبت کریں۔ مجھ پہ ممتا نچھاور کریں۔ رسمی اور لفظی تعلق کے بجائے میری حقیقی ماں بنیں۔ میری پیاس بجھا دیں۔ میری حسرت ختم کر دیں اور میں نے ان کی سوچ بھی بدل دی بابا۔۔۔ ان سے بہت پیار کرنے کے باوجود میری بڑی شدید خواہش تھی کہ میں ان کی نظروں میں ان کی وہ بات غلط ثابت کروں جو انہوں نے مجھے پہلی دفعہ دیکھ کر کہی تھی۔
انہوں نے آپ کے خلوص اور محبت پر شک کیا تھا نا؟ کہ آپ بھی باقی مردوں کی طرح ہیں۔۔۔ پتا ہے بابا! بعد میں جب جب وہ مجھ سے خوش ہوئیں۔ انہیں مجھ پہ پیار آیا۔ میں نے شرارت میں ہی سہی یاد ضرور دلایا۔۔۔ "کہ بیٹا کس کا ہوں؟"
سونیا اور رانیہ کے لیے آپ نے بہت محنت کی۔ معذوری کے باوجود انہیں اعلا تعلیم دلوائی۔ ان کی جابز تک کا انتظام کیا مگر آج جو وہ خوشحال ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں' اس میں میرا بھی ہاتھ ہے۔
سب جانتے ہیں کہ وہ ایک معروف سرجن کی عزیز از جان بہنیں ہیں۔ جن پہ وہ جان چھڑکتا ہے' جب ہی کوئی بھی انہیں ستانے سے پہلے' ان کے لیے پریشانیاں کھڑی کرنے سے پہلے سو بار ضرور سوچتا ہے۔
امی جان بہت خوش رہیں اور اب ان کی روح خوش ہوتی ہوگی کہ میں نے حقیقی بھائی والا رشتہ بھی نبھایا اور پیار بھی۔۔۔ اور بابا سوری۔۔۔ میں نے عمر بھر جو آپ سے پیار کیا' اس کو نبھاتے وقت وہ کام کر دیا' جو آپ نے زندگی بھر نہ کیا تھا۔۔۔
سو سوری بابا۔۔۔ میں نے آپ کی محبت میں مجبور ہو کر انہیں بتا دیا تھا کہ کس محبت کے ہاتھوں بے بس ہو کر آپ نے ان سے شادی کی تھی۔۔۔
اور یہ بھی بتایا کہ دوسری شادی کے وقت' مجھے جنم دینے والی ماں سے شادی کے وقت بھی آپ اپنی ماں کی دھمکیوں' باپ کے ڈر سے ہی مجبور ہوئے تھے۔
اور پھر آپ اپنی بیوی کی محبت سے بھی مجبور تھے کہ بس کی وجہ سے آپ اسے بچانے کی ... نہ کر سکے۔ ارے ہاں۔۔۔ بابا جان! ساتھ ہی میں نے یہ بھی بتایا کہ آپ نے نفس کی غلامی تب بھی نہ کی۔ آپ نے صرف اس سوچ کے تحت کسی کی معذور بیٹی کو سہارا دیا تھا' عزت دی' محبت دی تاکہ کل کو آپ کی معذور بیٹیوں کو اچھا وقت دیکھنے کو ملے۔۔۔
سوری نا بابا پلیز سوری! جو محبتیں آپ نے کیں اور نبھائیں' انہیں کیش کرانا اچھی بات نہیں' مگر امی جان کا دل بھی تو صاف کرنا تھا۔
وہ کہتی تھیں کہ آپ کا دل اس لیے نرم تھا کہ آپ نے گھر میں اپنے بھائی اور چچازاد بھائیوں کی معذوری اور بے بسی دیکھ رکھی تھی۔ میں نے کہا وجہ جو بھی ہو امی جان! حاصل کلام تو یہی ہے کہ میرے بابا نے محبتیں نبھائیں۔
مزے کی بات سنیں گے بابا۔۔۔! ایک روز جب امی جان کو مجھ پہ بہت لاڈ آیا ہوا تھا تو انہوں نے کہا کہ یہ کوالٹی تمہیں باپ سے وراثت میں ملی ہے۔
میں خوش ہوا تھا بے حد خوش۔۔۔ مگر اتنا نہیں جتنا آج ہوں۔ آج تو میں خوشی سے پاگل ہونے کو ہوں۔ آج میں نے یہ سنا کہ میرا بیٹا بھی محبت نبھانا جانتا ہے۔ دل شاد شاد ہو گیا تھا سن کر۔۔۔ بھئی مرد کا بچہ ہے اور محبت کرنے والوں کی' محبت نبھانے والوں کی اولاد ہے۔۔۔"
میں جو بہت دیر سے نیم غنودگی کی حالت میں بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ اب مکمل طور پر نیند کی آغوش میں جانے کو تھا۔ ایسی مطمئن نیند کبھی کبھار ہی آتی تھی جو آج آئی ہے' مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں صرف خود کو اور اپنے گھر والوں کو فرشتہ صفت ثابت کرنے پہ تلا ہوں۔
"حاصل کلام صرف یہ کہ مرد بھی محبت کر سکتا ہے اور نبھا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جیسے ہر عورت ہر سچویشن میں محبت نہیں نبھا سکتی' اسی طرح ہر مرد کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوتا۔۔۔"

☼



نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف فارس غازی کا بھانجا ہے جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کرکے بچوں کی پرورش کی ہے' حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مرجاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی' سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ واپس

مکمل ناول



پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں' جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ فارس غازی کے جیل جانے کے بعد اس کا پورشن مقفل ہے۔

سعدی یوسف کے لیے وہ دن خوشیوں سے بھرپور تھا جب اسے فارس غازی کے رہا ہونے کی خبر ملتی ہے۔

ہاشم نے یہ خبر سن کر عہد کیا کہ اگر اس میں سعدی کا ہاتھ ہے تو اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔ فارس غازی جیل سے نکلتا ہے تو سعدی یوسف ان کا منتظر ہوتا ہے۔ فارس اس سے قبرستان چلنے کو کہتا ہے۔ قبرستان جا کر فارس دو قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہے۔ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے سعدی کا موبائل لے لیتا ہے۔ قبرستان میں وہ کسی کو فون کر کے کوئی ہتھیار منگواتا ہے۔

ہاشم کاردار' زمر کو اپنی بیٹی سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دینے کے ساتھ سعدی کا کارڈ بھی زمر کو دے دیتا ہے۔

زمر کے والد کو اپنے پوتے سعدی یوسف سے بہت محبت ہے۔ وہ زمر سے کہتے ہیں' سعدی کی سالگرہ پر وش کرنے ان کے گھر جائے۔ وہ پھول لے کر کارڈ دینے سعدی کے گھر جاتی ہے۔ زمر کو دیکھ کر سعدی کے ساتھ تمام گھر والے حیران ہو جاتے ہیں۔ زمر' سعدی کو سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دیتی ہے۔

زمر کے جانے کے بعد سعدی نے ہاتھ میں پکڑے سیاہ اور سنہرے کارڈ کو دیکھا۔ اسی وقت ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔ اس نے ہوٹل میں ہاشم کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگایا تھا۔ وہ اس کے لیپ ٹاپ سے ڈیٹا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سعدی نے جب بیگ سے ٹیبلٹ نکالا تو اسے پریس کرنے کے بعد اسکرین پہ پیغام آیا کہ آپ کی ڈیوائس کو ایک ہارڈ ڈرائیو ملی ہے' کیا آپ سارا ڈیٹا کاپی کرنا چاہیں گے؟ سعدی نے مسکراتے ہوئے "یس" دبایا۔ اسکرین پہ دوسرا پیغام دیکھ کر سعدی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

اسکرین پہ پیغام جل بجھ رہا تھا کہ "پاس ورڈ داخل کریں" سعدی کے پاس' پاس ورڈ نہیں تھا۔

سعدی یوسف' ہاشم کاردار کی سابقہ بیوی شہرین سے ایک شاپنگ مال میں مل کر کہتا ہے۔ مجھے آپ سے ہاشم بھائی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ چاہیے۔ شہرین' سعدی سے کہتی ہے کہ "تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" سعدی زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے کہ "ہاشم بھائی نے جو ہم سے چرایا تھا' میں وہ واپس چرانے جا رہا ہوں۔"

(اب آگے پڑھیں)

۲

دوسری قسط

فریب کار

اور ابلیس کا ساتھی ہامون بھی تھا۔
جنت سے نکالی جانے والی ایک کم تر روح
کہ وہاں بھی اس کی نگاہ اور سوچ نیچے جھکی رہتی
اور زیادہ سراہتی سونے کی بنی جنت کی روش کو۔
یہ منظر اسے کسی بھی دوسرے سے زیادہ مزا
دیتا ہے۔
اسی نے سکھایا بنی نوع انسان کو
اپنے ناپاک ہاتھوں سے دھرتی ماں کے بطن کو کھود
کر لوٹنا
ان خزانوں کو جو چھپے بہتر تھے
جلد ہی اس کی فوج نے جہنم کی پہاڑی میں ڈالا ایک
وسیع چھید۔
اور کھود ڈالیں سونے کی پسلیاں

نہ ہو کوئی حیران اس بات پہ کہ سونا اگتا ہے اندھیر
جہنم میں
کہ شاید مٹی ہی قابل ہے۔ اس قیمتی بلا کے۔۔۔۔
(ماخوذ از : ملٹن۔ جنت گمشدہ)

حسن و عشق کا سوز تعلق سمتوں کا پابند نہیں
اکثر تو خود شمع کا شعلہ بڑھ کے گیا پروانے تک

ہاشم کاردار کی بیٹی سونیا کی سیاہ' سنہری سالگرہ آج یعنی ہفتے کی شام کو تھی' شاید اسی لیے ہفتے کی صبح بھی چمکیلی سنہری طلوع ہوئی تھی۔ ذوالفقار یوسف کے گھر میں ناشتے کا دھواں' ندرت کی ڈانٹ بھری تاکیدیں' حنین کی بھاگم بھاگ تیاری' سب ایک ساتھ چل رہا تھا۔ سعدی آج بھی صبح سویرے ریسٹورنٹ چلا گیا تھا۔

سیم اب یونیفارم میں تیار گول میز کے گرد بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ حنین اپنے سیاہ کوٹ شوز پالش کر کے جب آئی تو توس کی پلیٹ کو دیکھ کر منہ بن گیا۔

"امی ۔۔۔ میں نے نہیں کھانا ڈھکن توسٹ۔ یہ موٹا آلو میرے لیے بریڈ کا پہلا اور آخری توس ہی بچاتا ہے ہمیشہ!" وہ ماتھے کے کٹے بالوں پہ برش پھیرتی' وہیں سے چلائی۔ کچن سے ندرت کا ڈپٹا ہوا جواب فوراً آیا۔

"ہزار دفعہ کہا ہے کھانے کی چیزوں کے نام مت رکھا کرو۔"

اس نے منہ میں بڑبڑاتے آگے ہو کر سیم کا آدھا پراٹھا توڑ لیا۔ خلاف معمول سیم نے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ چپ چاپ کھاتا رہا۔

وہ ناشتہ کر کے اٹھی تھی کہ سیم نے پکارا "حنہ!"

"حن ۔۔۔۔ نا؟" اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تاریخ گواہ ہے کہ تم نے مجھے بغیر کام کے حنہ نہیں کہا۔"

"آج کا لنچ میری طرف سے ہے!" ہاتھ جھاڑتے اس نے مزید سنجیدگی سے اطلاع دی۔

حنین نے بیگ کندھے پہ ڈالا' فائل اٹھائی اور استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔

"مجھے گیس کرنے دو کہ کیا منگوایا ہو گا تم نے' ہاں ہوں گے سموسے' ساتھ میں چرغہ اور آلو کے چپس۔" اور جیسے ان سب اشیا پہ لعنت بھیج کر وہ دروازے کی طرف بڑھی جہاں باہر وین والا ہارن دیے جا رہا تھا۔

"اسپرنگ رولز' بہاری کباب اور پھکڈ ہوئے آلو۔" سیم نے عقب میں بڑے سکون سے کہا۔ حنین کے قدم زنجیر ہوئے' آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ یکدم مڑی' کہنی سے دبوچ کر اسے سامنے کھڑا کیا۔

"پھر ساتھ میں ہو گی پودینے کی چٹنی؟" اور مشکوک نظروں سے گھورا۔

"اونہوں۔ تمہاری فیورٹ' مایونیز والی ساس!"

حنین کے لب بھرپور مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ آنکھوں میں شرارت چمکی۔ بازو چھوڑا اور چلنے کا اشارہ کیا۔

"اب کام بتاؤ!"

"رات ہاشم بھائی کی بیٹی کی سالگرہ میں' میں نے بھی جانا ہے۔" وہ دونوں ساتھ چلتے باہر آئے تو باغیچہ کراس کرتے ہوئے سیم نے کہا۔

"سعدی بھائی نے کہا تھا کہ امی نہیں جا رہیں تو میں گھر میں رہوں۔"

"ہوں۔ تمہارے پاس بلیک سوٹ ہے؟"

تصحیح

ناول کی تمام اقساط کو مصنفہ نے عنوان دیے ہیں۔ پہلی قسط کا عنوان "تمہارا سعدی" گزشتہ ماہ شائع ہونے سے سہواً رہ گیا تھا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ یہ ناول کی دوسری قسط "فریب کار" ہے۔

"ہاں' وہی جو بھائی نے برتھ ڈے پہ دیا تھا۔"

"تو پھر اس کو دھوپ لگوالو' ہوا لگوالو اور استری کروالو۔" وہ گیٹ بند کر کے وین کی طرف بڑھتے ہوئے بڑے سکون سے بولی۔ سیم نے خوشگوار بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"مگر تم بھائی کو کیسے مناؤ گی کٹو۔۔۔ سوری۔۔۔ حنہ!"

"سیم یوسف' یہ جو آج تم مجھ پہ اپنی پاکٹ منی جھونک رہے ہونا' یہ اس لیے ہے کہ تمہیں پتا ہے' اس کام کے لیے صحیح بندی میں ہی ہوں' اس لیے اپنے سوٹ کی فکر کرو بس!" کہہ کر وہ وین میں چڑھ گئی۔

اندر رافعہ اور خدیجہ بری طرح دہرائی کرنے میں مگن تھیں۔ جبکہ ناعمہ کتاب کھولے کچھ لکھ رہی تھی۔ آج ان کا آخری پیپر تھا۔

"کیسی تیاری ہے؟" اس نے امتحان کی صبح کا مخصوص سوال دہرایا۔

"یار! کچھ نہیں آتا' سمجھو سب مکس اپ ہو گیا۔" رافعہ نے ہراساں نفی میں سرہلاتے ہوئے مخصوص جواب دہرایا۔

حنین نے اپنی فائل کھول لی اور سرسری سی نگاہ دوڑانے لگی۔ پھر کسی احساس کے تحت ناعمہ کو دیکھا ۔۔۔ وہ ٹشو پیپر پہ کچی پنسل سے لکھے جا رہی تھی۔ نقل کے یہ طریقے ان کو جانے سوجھتے کہاں سے تھے۔

"اگر پکڑی گئیں تو؟" حنین نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تو گرمی گرمی کرتے اس سے پسینہ پونچھ لوں گی۔ سارے ثبوت ختم!" اس نے شانے اچکا دیے تو حنین سر جھٹک کر اپنا پڑھنے لگی۔

سیم کھڑکی سے باہر دیکھتا اپنے سوٹ اور ان دوستوں کے بارے میں سوچ رہا تھا' جن کو اس نے سوموار کی پارٹی کی تفصیلات دینا تھیں۔ ذہن میں وہ فقرے ترتیب دے رہا تھا۔

"پتا ہے ہمارے ایک انکل ہیں ۔۔۔ ان کے بیٹے ۔۔۔ کزن ہیں ہاشم بھائی' ان کا گھر ۔۔۔"

☼ ☼ ☼

تو نے کیا کیا اے زندگی دشت و در میں پھرایا مجھے
اب تو اپنے در و بام بھی جانتے ہیں پرایا مجھے

کاردار خاندان کے قصر کے سبزہ زار میں ملازموں کا عملہ اور فاضل ویٹرز پارٹی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اندر لاؤنج میں بھی صفائی ستھرائی کا عمل جاری تھا۔ شہرین متوازن قدموں سے زینے چڑھتی اوپر جا رہی تھی۔

ہاشم کا کمرا سنسان پڑا تھا۔ وہ آگے بڑھی۔ نوشیرواں کے کمرے کا داخلی دروازہ کھلا تھا اور آگے بالکونی کا بھی۔ وہ بالکونی میں بیٹھا تھا۔ لیپ ٹاپ گود میں کانوں میں ایئرفونز۔ شہرین وہیں کھڑی رہی' یہاں تک کہ نوشیرواں نے چونک کر اس طرف دیکھا تو وہ سر جھٹک کر جانے لگی۔

"آپ کب آئیں؟ آئیے۔" شیرو جلدی سے ایئرفونز نکالتے ہوئے اٹھا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس روز کی نسبت آج درست حلیے میں تھا۔ وہ اسے پسند کرتا ہے' کوئی اندھا بھی بتا سکتا تھا اور شہرین اندھی نہیں تھی' البتہ اسے معلوم تھا کہ وہ کہنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ شہرین نے پریشانی سے نفی میں سرہلایا۔ "نہیں تم بیٹھو۔۔۔" پھر رکی۔

"ہاشم ۔۔۔ ہے یا؟" اس نے نوشیرواں کے بھائی کا نام لیا' وہی بھائی جس کے ڈر کے باعث شیرو کبھی نہیں کہہ سکے گا۔

"بھائی کا آف تھا مگر وہ شاید شہلا آنٹی کے کیس کے لیے کہیں گئے ہیں' ان کے ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کر دیا تھا کسی کا۔" وہ ابھی تک منتظر کھڑا تھا۔ شہرین کی آنکھوں میں مایوسی ابھری۔

"خیر وہ ہوتا بھی تو میرا کام نہیں ہونا تھا۔ اٹس اوکے جانے دو۔" وہ کہہ کر پلٹنے لگی۔

"کیا کام؟ مجھے بتائیں۔" وہ قدم قدم اٹھاتا اس تک آیا۔

"چھوڑو' تم سے نہیں ہو گا۔"

"ویل اگر آپ نے اپنے کام کا ذکر مجھ سے کیا ہے تو یقیناً" آپ کو لگتا ہو گا کہ میں کر سکتا ہوں تو بتائیں۔" وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا۔ شہرین تھکے انداز سے مسکرائی۔

"سونیا ۔۔۔ وہی ہے اصل مسئلہ ۔۔۔ اس کو میری اور ہاشم کی پکچرز چاہئیں۔ ہنی مون کی۔"

"تو آپ کے پاس نہیں ہیں؟" نوشیرواں کو اندر سے شاید خوشی ہوئی۔

"میں تکلیف دہ یادوں کو سنبھال کر نہیں رکھتی۔" اس نے سنہرے بالوں میں ہاتھ پھیر کر ان کو پیچھے کرتے کہا۔ وہ دونوں ہنوز چوکھٹ پہ کھڑے تھے۔

"شادی کی تو میرے پاس بھی ہوں گی۔"

"مگر ہنی مون والی ہاشم کے لیپ ٹاپ میں ہوں گی اور میں تمہارے بھائی کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔" اس نے بہت ہی لاپروائی سے لیپ ٹاپ کا ذکر کیا۔

"نو پرابلم میں کاپی کر دیتا ہوں۔ بھائی آفس نہیں گئے تو لیپ ٹاپ گھر پہ رکھ کر گئے ہوں گے۔" وہ چلتا ہوا ساتھ والے کمرے میں آیا' بتی آن کی۔

"جلدی کرنا' میں اس کمرے میں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتی۔" اس نے فلیش ڈرائیو بڑھاتے ہوئے کہا۔ نوشیرواں نے ڈرائیو پکڑتے ہوئے نظر بھر کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" وہ جواباً" زخمی سا مسکرائی۔

نوشیرواں نے ہاشم کی اسٹڈی ٹیبل سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور آن کیا۔ وہ اس کے ساتھ کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ ساتھ ہی وہ لب بھی کاٹ رہی تھی اور انگلیاں بھی مروڑ رہی تھی۔

"اوہ ..... پاس ورڈ؟ اب یہ کیا ہے؟" سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے جب پاس ورڈ مانگا گیا تو نوشیرواں کراہ کر رہ گیا۔ شہرین کے ماتھے پر بل پڑے۔

"میں نے کہا تھا نا' تم سے نہیں ہو گا۔ جانے دو۔" وہ مڑنے لگی۔

"ایک منٹ ۔۔۔ ٹھہریں تو!" اس نے موبائل نکال کر ہاشم کو کال ملائی۔

"میرا نام لے لینا تاکہ وہ بالکل بھی اپنا پاس ورڈ نہ دے۔" وہ تلخی سے بولی۔ نوشیرواں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بہت نرم اور سمجھ دار نظر آنے کی سعی کر رہا تھا۔

"ہاں شیرو بولو۔" وہ مصروف تھا۔

"بھائی یار! آپ کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ کیا ہے؟"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" اپنی تمام تر مصروفیت کے باوجود وہ چونکا تھا۔

"کچھ پکچرز چاہئیں تھیں' سونیا کے لیے۔"

"کون سی پکچرز؟" وہ ہاشم تھا' کھٹک گیا۔

"بھائی دے رہے ہو یا میں کچھ اور کروں؟" اس کا موڈ بگڑنے لگا۔ "پھر ہوں ۔۔۔ اچھا۔" کہہ کر سرہلا کر فون بند کیا اور مسکراتے ہوئے کی بورڈ کے بٹن دبائے۔ اس کے کندھے سے جھانکتی شہرین نے ان کو حفظ کیا (گو کہ اس کی ضرورت نہ تھی) اور پھر لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ (یہ لفظ تو اس کو ازبر تھا۔ آنکھیں بند کر کے بھی ٹائپ کر سکتی تھی)

"آپ بتاتی جائیں' کون کون سی چاہیے۔"

ان کی ہنی مون' شادی اور دیگر مواقع کی تصاویر کھلتی جا رہی تھیں۔ مقصد پورا ہونے کے بعد شہرین کو جانے کی جلدی تھی اور وہ سب دیکھ کر سینے میں کچھ چبھنے لگا تھا۔ احساس زیاں' تہی دامنی۔

"یہ والی ۔۔۔ اور یہ تینوں ۔۔۔" وہ انگلی سے اسکرین پہ اشارہ کرتی بتانے لگی۔ نوشیرواں نے کاپی کرتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھا' وہ ضبط کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی اس نے افسوس' ہمدردی' ترحم' سب محسوس کیا تھا۔

سوائے فریب کی بُو کے۔

☼ ☼ ☼

میں تو لب کھول کے پابند سلاسل ٹھہرا
تیری اور بات ہے تو صاحب محفل ٹھہرا

کمرا امتحان میں معمول کا سناٹا چھایا تھا۔ دو ممتحن خواتین کرسیوں کی قطاروں کے بیچ ٹہل رہی تھیں۔ لڑکیاں سر جھکائے' دھڑادھڑ لکھے جا رہی تھیں۔ حنین نے دفعتاً" درد کرتی انگلیوں کو سہلاتے ہوئے سر اٹھایا اور پھر گردن کو ریلیکس کرتے ہوئے دائیں طرف دیکھا۔ کمرے کی ایک دیوار کھڑکی سے ڈھکی تھی' اور سامنے سڑک اور بنگلوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ جس لاء کالج کو ان کا امتحانی مرکز بنایا گیا تھا' وہ دراصل ایک بڑا سا بنگلہ تھا اور یہ کمرا یقیناً "ڈرائنگ ڈائننگ کے طور پہ استعمال کے لیے بنایا گیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔

نیچے لان تھا اور وہاں سے ان ادھیڑ عمر وکیل صاحب کی کار نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ جو ہائی کورٹ کے وکیل تھے' اس لاء کالج کے مالک تھے اور ہر پیپر میں بار بار امتحانی کمروں کا چکر لگا کر اپنی خراب انگریزی میں لڑکیوں کو نقل کرنے کے نتائج سے ڈرانے کی کوشش کرتے تھے۔ شکر کہ اب وہ کہیں جا رہے تھے اور اگلے ڈیڑھ گھنٹے سر پہ سوار نہیں ہوں گے۔ اس نے مسکراہٹ دبا کر سوچا اور دوبارہ پرچے پہ جھک گئی۔

"شش!" ناعمہ نے پیچھے سے اسے ٹہوکا دیا۔ اس نے جھنجلا کر ممتحن کو دیکھا' جس کی ان کی طرف پشت تھی اور پھر پیچھے مڑی۔

"کیا ہے؟"

"رافعہ کو دو!" اس نے ٹشو آگے کیا۔ حنین نے جلدی سے ٹشو پکڑا جیسے کوئی جلتا ہوا انگارہ ہو اور رافعہ کی کمر پہ پین چبھا کر اسے متوجہ کیا۔ ممتحن اب چلتی ہوئے آگے جا رہی تھی۔ قطار ختم کر کے ہی وہ مڑتیں اور اس سے پہلے ہی اس نے رافعہ کو وہ دے دینا تھا۔

مگر رافعہ یا تو ڈر گئی تھی یا اس سے سمجھنے میں غلطی ہوئی یا ممتحن غلط وقت پہ مڑیں' اسے ٹہوکا دے کر ٹشو پکڑاتی حنین کے ہاتھ سے ٹشو گرا' وہ فوراً" پیپر پہ جھکی۔ اس کی گھبراہٹ نے سب واضح کر دیا۔ ممتحن خاتون تیز تیز اس طرف آئیں۔ جھک کر ٹشو اٹھایا۔ اسے کھولا۔ حنین نے سر جھکائے اگلا لفظ لکھنے کی کوشش کی' مگر ہاتھ نم ہو گئے' پرچہ نم ہو گیا' سیاہی پھیلنے لگی۔

"آپ نقل استعمال کر رہی تھیں؟ کہاں سے آیا یہ آپ کے پاس؟ چھوڑیں پیپر!" دو ہاتھوں نے اس کا پرچہ کھینچا۔ دو ٹیچرز مزید اس طرف آئیں۔ وہ ہکا بکا سی بیٹھی رہ گئی۔

"یہ میرا نہیں ہے میم' مجھے نہیں پتا اس میں کیا ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ میں نے خود تمہیں اسے پکڑے دیکھا ہے۔"

"یہ ناعمہ نے دیا تھا' رافعہ کو دینے۔" اس نے پچھلی اور اگلی دونوں کو گھسیٹا' کہ وہ کوئی اس کی اچھی دوستیں نہ تھیں جن کو وہ بچاتی۔

"میرا نام کیوں لے رہی ہو؟"

"مجھے نہیں پتا' یہ کیا کہہ رہی ہے۔" دونوں لاتعلق ہو گئیں۔ کمرے میں تماشا لگ گیا۔ سب سر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ٹیچرز اسے اٹھا رہی تھیں کہ وہ اپنی چیزیں لے کر آفس میں آ جائے' اس کا پرچہ ختم۔

"آپ پر کیس بنے گا اور تھانے میں درج ہو گا۔ تین سال تک آپ پیپرز نہیں دے سکتیں۔" ان کے الفاظ حنین یوسف کی روح قبض کر رہے تھے۔

زمین آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ آج تو ویسے بھی آخری پرچہ تھا۔ یہ ایک دم سے سب کیسے غلط ہونے لگ گیا تھا؟

کچھ لڑکیاں واپس لکھنے میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ اسے چیزیں سمیٹتے دیکھ رہی تھیں۔

"میم! یہ میرا نہیں ہے' مجھے نہیں پتا تھا اس میں کیا لکھا ہے۔" وہ ساتھ ساتھ خشک حلق کے کہہ رہی تھی۔

کسی نے اسے ٹشو "پاس" کرتے نہیں دیکھا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے ٹشو اس کے "پاس" دیکھا تھا اور اگلی پچھلی انہیں دم کٹی لومڑی کا شکار لگی تھیں۔ صرف اسے اٹھایا گیا' وہ منت کرتی رہی۔ کبھی غصے سے زور سے بھی بولتی مگر کوئی اثر نہیں ـــــ میڈم اسے دو کمروں سے گزار کر ایک آفس نما کمرے میں لے آئیں۔

اسے کرسی پہ بٹھا دیا۔ پرچہ پیپر ویٹ تلے رکھ دیا۔ اور ایک دوسری ٹیچر کو یونیورسٹی کی انسپکشن ٹیم کو کال کرنے کا کہا۔ مقدمے کا پرچہ انہوں نے ہی آ کر بنوانا تھا۔ ٹیم شہر کے کسی دوسرے امتحانی مرکز کے دورے پہ تھی' ان کو آنے میں کچھ وقت لگنا تھا۔ گھڑی کی ٹک ٹک حنین کے اعصاب پہ ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ وہ سفید چہرہ لیے' حواس باختہ پریشان سی بیٹھی تھی۔ مگر خاموش نہیں تھی۔ وہ بار بار احتجاج کر رہی تھی۔

"میم! میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ پچھلی لڑکی کا تھا ـــــ"

"اگر آپ نے ایک لفظ مزید بولا تو میں اس پہ ابھی سرخ کاٹا پھیر دوں گی۔" انہوں نے غصے سے جھڑکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سر جھکا دیا۔ مگر وہ ہار نہیں مان سکتی تھی۔ وہ سعدی یوسف کی بہن تھی ـــــ اوہ ـــــ بھائی کو کتنی شرمندگی ہو گی اس پر؟ حنین چیٹنگ کرتے پکڑے گئی؟ تھانے میں مقدمہ؟ وہ لرز کر رہ گئی۔ بھائی کبھی اس پہ دوبارہ اعتبار کر سکے گا کیا؟

سپرنٹنڈنٹ کو ایک ٹیچر نے بلوا لیا۔ ایک دوسرے کمرے میں کچھ لڑکیاں کونسچن پیپر پہ لکھ رہی تھیں۔ ان کی لاپروائی نے ان کو بھی پھنسا دیا۔ ابھی پچھلے پیپر میں اسی جگہ ایک پوری قطار جو کونسچن پیپر پہ پوائنٹس لکھ رہی تھی' اور اس قطار میں سلطی ممتحن' دونوں پہ پرچہ کیا تھا انسپکٹر نے اور ابھی وہی جلاد صفت انسپکٹر پھر آنے والا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ غصے سے باہر نکلیں۔ حنین کمرے میں تنہا رہ گئی۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہر سو گونجنے لگی۔

میز پہ سپرنٹنڈنٹ کے پرس کے ساتھ ان کا موبائل رکھا تھا۔ حنین نے ادھ کھلے دروازے کو دیکھا اور لمحے بھر میں فیصلہ کیا۔ اسے مدد پکارنا تھا۔ مگر کون آئے گا؟

موبائل اچک کر اس نے دھڑکتے دل سے نمبر ملایا۔ پہلے سعدی کا پھر مٹا دیا۔ بھائی کے سامنے شرمندگی؟ نہیں پھر پھپھو کا ـــــ دو ہندسوں کے بعد ہی مٹا دیا۔ کبھی بھی نہیں' ہونہہ اور ماموں کا تو کوئی نمبر ہی نہ تھا۔ پھر کسے کرے؟ وقت کی ریت ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔ وہ تاریک سرنگ میں کھڑی تھی اور ایسے میں اچانک سے سنہری رنگ سے لکھے گیارہ ہندسے جگمگانے لگے۔ بنا سوچے سمجھے اس نے نمبر ڈائل کیا۔ یہ پہلی دفعہ تو نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو فیور زدے رہے تھے۔

"ہیلو؟" ہاشم نے تیسری گھنٹی پہ فون اٹھایا۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھا تھا اور ایکسیڈنٹ میں مرنے والی لڑکی کی فیملی سے مل کر واپس آ رہا تھا۔ گو کہ نمبر انجان تھا مگر ہاشم ہر انجان کال اٹھایا کرتا تھا۔

"ہاشم بھائی؟ ہاشم بھائی' میں حنین بول رہی ہوں۔" منہ پہ ہاتھ رکھ کر وہ دبی دبی سی آواز سے بولی' خوف زدہ نظریں دروازے پہ ٹکی تھیں۔

"آ ـــــ کون ـــــ حنین؟" وہ یاد کرنے لگا تھا۔ حنین کے گرد اندھیرے بڑھنے لگے۔ نقل کرنے پہ ایک پرچہ' امتحانی مرکز میں موبائل کے استعمال پہ دوسرا پرچہ ـــــ

"میں ـــــ ندرت کی بیٹی' فارس کی بھانجی' زمر کی ـــــ"

"سعدی کی بہن؟" ہاشم چونکا تھا۔ "ہاں' حنین' بولو بیٹا' کیا ہوا؟ خیریت؟" اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"ہاشم بھائی! انہوں نے مجھے چیٹنگ کے جرم میں پکڑا ہے' پرچہ ہو گا' پلیز کچھ کریں ہمیں ـــــ"

"تم ـــــ کدھر ہو تم؟ مجھے ایڈریس بتاؤ اور فون کہاں سے کر رہی ہو؟"

اس نے جلدی جلدی ایڈریس بتایا تھا کہ باہر سے بولتی سپرنٹنڈنٹ کی آواز قریب آنے لگی۔

"سپرنٹنڈنٹ آ گئی' کال بیک مت کیجئے گا۔" گھبرا کر اس نے فون رکھا۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر آئیں۔

حنین نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ دونوں ٹیچرز اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں' اسے تو وہ کنارے لگا ہی چکی تھیں۔ اب پوری پانچ لڑکیوں کے کونسچن

پیپر کا معاملہ آگیا تھا' انسپکشن ٹیم آئے گی تو یہ پنڈورا باکس بھی کھلے گا۔ وہ لوگ سخت غصے میں تھیں۔

کسی نے بھی موبائل کی سمت نہ دیکھا کہ ان کو بلا ضرورت خود بھی موبائل استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔

حنین اب بہتر محسوس کر رہی تھی ہاشم سے بات کر کے تسلی ہوئی تھی۔ یہ لاء کالج تھا' ہو سکتا ہے ہاشم ان خراب انگریزی والے پرنسپل وکیل کو جانتا ہو' وہ انہیں فون کر دے اور معاملہ ختم ہو جائے۔ ہاشم تو سب کو جانتا ہے اور یہ تو سب کو پتا تھا کہ کام کے وقت ہاشم کاردار کو ہی پہلی کال کی جاتی ہے۔ اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔

وہ انگلیاں مروڑتی خود کو ریلیکس کر رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ کھڑکی سے نیچے گیٹ کو دیکھنے لگی' یہاں سے گیٹ صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ وکیل پرنسپل کب آئیں گے؟ اف۔

کتنا وقت گزرا سپرنٹنڈنٹ کی کتنی کڑوی کسیلی سنی' کچھ پتا نہیں' پتا بس اس وقت چلا جب اس نے گیٹ کے پار سیاہ چمکتی کار رکتی دیکھی۔ پچھلا دروازہ کھول کر وہ نکلا۔ سیاہ سوٹ' ٹائی' سن گلاسز' ہاتھ میں سرخ کور کی فائل۔ گلاسز اتارتے ہوئے اس نے گیٹ پار کیا۔ حنین کا سانس رک گیا۔

بہت عرصے بعد دیکھا تھا مگر وہ پہچان گئی تھی۔ وہ ہاشم تھا۔ ہاشم خود آیا تھا؟ حنین کے لیے؟ وہ ساکت تھی۔

وہ وکیل لگ رہا تھا' یا اس کی شخصیت ایسی تھی' اسے کسی ملازم نے نہیں روکا۔ وہ کسی سے امتحانی کمرے کا پوچھ کر اوپر آیا' راہداری عبور کی اور سپرنٹنڈنٹ کے آفس کے سامنے رکا۔

حنین بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں امید اور خوف دونوں سمٹے تھے۔

"سپرنٹنڈنٹ آپ ہیں؟" ہاشم نے سنجیدگی سے سپرنٹنڈنٹ کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں خواتین پزل سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

"جی میں ہی ہوں' مگر یہ امتحانی مرکز ہے' یہاں غیر متعلقہ افراد کا داخلہ؟" اس کی شخصیت کے رعب میں وہ ذرا دھیمی سی کہنے لگیں۔

"تو پھر آپ ان کو یہاں سے بھیج دیں کیونکہ مجھے اور آپ کو تنہائی میں بات کرنی ہے۔" ہاشم نے کرسی کھینچی' ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھا اور سنجیدگی سے دوسری ممتحن کی جانب اشارہ کیا۔

سپرنٹنڈنٹ پریشان ہوئیں' مگر دوسری ٹیچر خود ہی جلدی سے باہر نکل گئیں۔

"حنین' بیٹا دروازہ بند کرو۔" اس نے اطمینان سے دوسرا حکم صادر کیا۔ سپرنٹنڈنٹ چونکیں۔ وہ اس بچی کا جاننے والا تھا' مگر۔۔۔؟

حنین نے جلدی سے دروازہ بند کیا۔ پھر واپس آ کر کھڑی رہی۔ ٹانگوں سے جان نکلنے کو تھی مگر بیٹھی نہیں۔ ہاشم نے ابھی تک اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"دیکھیں' آپ اس طرح کیسے اندر آگئے ہیں؟ یہ کوئی طریقہ کار نہیں؟" اب کہ ان کو غصہ چڑھنے لگا تھا۔

"میں ہاشم کاردار ہوں' حنین یوسف کا وکیل اور طریقہ کار میں ابھی آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔"

مگر اس کے نام کا سپرنٹنڈنٹ پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے نہیں جانتی تھیں۔

"اس بچی نے نقل کی ہے' یہ نقل کی بوٹی (ٹشو پیپر لہرایا) ہم نے اس کے پاس سے پکڑی ہے اور ابھی انسپکٹر آکر اس پہ پرچہ کاٹنے لگے ہیں' اس لیے میں یہاں آپ کی کوئی سفارش نہیں سننے والی ہوں۔"

"جی۔۔۔ یہ نقل کی بوٹی اس کے پاس تھی' بالکل تھی!" ہاشم نے اثبات میں سر ہلایا تو حنین نے کرنٹ لگا کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"اور یہ بوٹی اسے آپ نے پہنچائی تھی میڈم سپرنٹنڈنٹ۔"

میڈم کا منہ کھل گیا' آنکھوں میں حیرت اور پھر غصہ ہلکورے لینے لگا۔ مگر اب ہاشم نے اسے بولنے کا

موقع نہیں دیتا تھا۔

"یہ آپ ہی نے پہنچائی ہے' بالکل اسی طرح جیسے پچھلے چند سالوں میں آپ نے اپنی تین رشتہ دار بچیوں اور ایک دوست کی بچی کو نقل پہنچائی تھی۔ ان چاروں لڑکیوں کے بیان حلفی' نقل کے عمل کا طریقہ' ان امتحانی مراکز کی تفصیلات اور شناختی کارڈز کی کاپی سب اس فائل میں موجود ہیں اور جب میں یہ فائل یونیورسٹی انتظامیہ اور کنٹرولر امتحانات کو دکھاؤں گا اور جب وہ ان میں سے ایک بچی کے منہ سے سب سنیں گے کیونکہ وہ بچی بعد میں مدرسے چلی گئی تھی اور اب اسے اپنی نقل سے کمائی گئی ڈگری پہ بے حد ندامت ہے' تو آپ کا کیا بنے گا؟"

سپرنٹنڈنٹ کا تو رنگ سفید پڑا ہی' حنین الگ منہ کھولے ہاشم کو دیکھ رہی تھی جو سرخ فائل لہرا کر سب کہہ رہا تھا۔

"یہ جھوٹ ہے' میں نے کبھی کسی کو نقل نہیں کروائی۔"

"وہ میرا مسئلہ نہیں ہے' یہ بچی میرا مسئلہ ہے۔ آپ اسے پیپر واپس دیں اور اس کا جو ٹائم ۔۔۔ کتنا ٹائم ضائع ہوا ہے؟" رک کر حنین کو دیکھا۔ وہ جو ہکا بکا اسے دیکھے جا رہی تھی' گڑبڑا کر گھڑی دیکھی۔ "چالیس منٹ۔"

"اس کے جو چالیس منٹ ضائع ہوئے ہیں وہ اس کو ایکسٹرا دیں' اس کا پیپر بغیر سرخ نشان کے لیا جائے اور اسے عزت سے جانے دیا جائے' کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو آپ کی یونیورسٹی کے وی سی کا نمبر میرے فون میں "آر" کی لسٹ میں ہے (ساتھ ہی موبائل اسکرین دکھائی) کنٹرولر امتحانات کا "ایس" کی لسٹ میں اور آئی جی کا "ٹی" میں سو میرے آر ایس ٹی دبانے سے پہلے اس بچی کو اس کا پیپر واپس مل جانا چاہیے۔" وہ سپرنٹنڈنٹ کی آنکھوں میں دیکھ کر بہت اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"یہ سب بکواس ہے اور ہم انسپکشن ٹیم کو کال کر چکے ہیں' وہ آتے ہی ہوں گے۔" وہ بے چین' مضطرب' غصے میں تھیں۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ میں یہ فائل ان ہی کو پیش کردوں گا اور مجھے لگتا ہے ابھی تک آپ کو ان لڑکیوں کے بیانات کی نزاکت کی سمجھ نہیں آئی۔ حنین' بیٹا! یہ لو اور پہلا بیان ان کو پڑھ کر سناؤ۔" ہاشم نے سپرنٹنڈنٹ کو ہی دیکھتے ہوئے فائل اس کی طرف بڑھائی۔ حنین کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے فائل کھولی اور پہلا صفحہ سامنے کیا۔

کاردار اینڈ سنز' پریزنٹیشن' ہاشم کاردار کے پوائنٹس وہ اندھوں کی طرح صفحے کو اوپر نیچے دیکھ رہی تھی۔ یہ تو ہاشم کے آفس کی کوئی فائل تھی۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ہاشم کا چہرہ دیکھا۔ (کیا وہ غلط فائل اٹھا لایا تھا؟)

"پڑھو حنین!" اب کے ہاشم نے اسے دیکھ کر کہا' پھر ترچھا ہو کر خود فائل کو دیکھا۔

"ہوں ۔۔۔ پہلا کیس تو آپ کی بہت قریبی عزیز بچی کا ہے اور یہ واقعہ بھی اسی سیکٹر کے ایک کالج میں پیش آیا ۔۔۔" وہ جیسے پڑھتے ہوئے اعتماد سے کہہ رہا تھا۔ وہ غلط فائل نہیں اٹھا کر لایا تھا۔ حنین بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاشم جھوٹ بول رہا تھا۔

"بس!" سپرنٹنڈنٹ کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا' ہاتھ اٹھا کر سختی سے روکا۔ ہاشم نے فائل لے کر بند کر دی۔ پیپر ویٹ ہٹا کر پیپر اٹھایا اور حنین کو دیا۔

"جاؤ' جا کر پیپر کرو۔" حنین نے میڈم کو دیکھا۔ وہ ضبط سے لب کاٹتی اسے دیکھ رہی تھیں۔

اسی پل دروازہ کھول کر پرنسپل وکیل داخل ہوئے۔ ہاشم نے گردن ترچھی کر کے مسکرا کر دیکھا' پھر اٹھ کر ملا۔ وہ خوشگوار حیرت سے اس سے ملے۔

"کاردار صاحب' آپ ادھر کیسے؟" وہ اسے جانتے تھے خیر اب تو سپرنٹنڈنٹ بھی اسے جان گئی تھیں۔

"دراصل یہ میری کزن کی بیٹی ہیں' خاندان میں ایک بزرگ کی ڈیتھ ہو گئی تھی' مجھے ان کو پک کرنا تھا' مگر یہ خبر سن کر پریشان ہو گئیں اور آدھا پونا گھنٹہ ضائع

ہو گیا۔ بمشکل پیپر مکمل کرنے پہ راضی کیا ہے میڈم نے اور ایکسٹرا ٹائم بھی دیں گی۔ ان کی مہربانی!" کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر سپرنٹنڈنٹ کو دیکھا جنہوں نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔

"نہیں' بس تھوڑا سا رہ گیا تھا' میں پندرہ بیس منٹ میں کرلوں گی۔" حنین پیپر دبوچے کھڑی ہو گئی۔

"جی بالکل آپ آرام سے کریں۔" پرنسپل صاحب نے گرم جوشی سے کہا پھر ہاشم کی طرف متوجہ ہوئے۔ "آئیے نیچے آفس میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ بڑا عرصہ ہوا ملاقات نہیں ہوئی تھی آپ سے۔" ہاشم نے مسکرا کر سر کو خم دیا' پھر گھڑی دیکھی۔ اس کا وقت بہت قیمتی تھا۔ مگر پھر بھی اس نے حنین سے کہا۔ "پیپر دے کر آؤ' میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"اوہ میڈم' انسپکشن ٹیم پہنچنے والی ہے' آپ نے ان کو کس سلسلے میں بلایا تھا؟" پرنسپل صاحب نے جاتے جاتے ایک دم پوچھا۔ حنین کی ٹانگوں سے جان نکلنے لگی۔ اس نے ہراساں سی ہو کر ہاشم کو دیکھا جو گہری' سرد نظروں سے سپرنٹنڈنٹ کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ ہال نمبر تھری میں لڑکیاں کونسیجن پیپر پہ لکھ رہی تھیں تو ۔۔۔"

"اوکے اوکے ۔۔۔" وہ سر ہلا کر ہاشم کو باہر لے گئے۔ حنین بھی پیپر کسی متاع عزیز کی طرف پکڑے وہاں سے نکل گئی۔

بیس نہیں' اسے پچیس منٹ لگے۔ جلدی جلدی پیپر ختم کر کے وہ شعلہ بار نظروں سے خود کو گھورتی سپرنٹنڈنٹ سے نگاہ ملائے بغیر نیچے آئی تو ہاشم پرنسپل کے آفس (جو پورچ کے ساتھ تھا کہ وہ کالج بنگلہ ہی تھا) سے نکل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر خوشگوار سا مسکرایا۔

"ہاشم بھائی ۔۔۔۔ تھینک یو سو مچ!" وہ قریب آ کر بولی تو آواز بھرا گئی۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔

"شکریہ کس چیز کا؟ سعدی اور تم نے ہم پہ ایک احسان کیا تھا' اس کو اسی کا بدل سمجھ لو۔ خیر' میں نے پرنسپل سے کہہ دیا ہے' وہ اس امر کو یقینی بنائے گا کہ تمہارا پیپر بغیر سرخ کانٹے کے سیل ہو جائے۔"

"ان کو ۔۔۔ خبر نہیں ہوئی سارے معاملے کی؟"

"ضرور ہو گی مگر تب تک تمہارا پیپر جا چکا ہو گا۔ بے فکر رہو' میں نے سب سنبھال لیا ہے۔" اس نے اعتماد سے کندھے اچکائے۔

"مگر ۔۔۔ وہ فائل اس میں میڈم کی تفصیلات تو نہیں تھیں؟"

ہاشم نے ہنس کر سر جھٹکا۔

"مجھے تو اس عورت کا نام بھی نہیں معلوم!"

"مگر ۔۔۔ وہ سب آپ نے کیسے کہا؟"

"میں نے اندازہ لگایا۔ کم از کم چار دفعہ تو اس نے یہ کام کیا ہو گا۔"

"لیکن اگر وہ ایماندار ٹیچر ہوتیں تو؟"

"بہرحال' وہ ایماندار نہیں تھی۔"

"اور اگر وہ فائل دیکھ لیتیں؟"

"مجھے پتا تھا وہ نہیں دیکھے گی۔ اپنا اعمال نامہ کوئی بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔" اس نے کلائی پہ گھڑی دیکھی۔ "چلو تمہیں ڈراپ کر دوں؟"

اور سعدی یوسف کی بہن بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی "نہیں' وین آ گئی ہو گی اور اگر آپ نے چھوڑا تو سب کو پتا چل جائے گا۔ ہاشم بھائی' پلیز سعدی بھائی کو مت بتائیے گا۔" وہ یکدم خوفزدہ و شرمندہ نظر آنے لگی۔

"کیا یہ کہنے کی بات ہے؟" الٹا وہ حیران ہوا۔ حنین نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

"آج پھر پارٹی پہ آ رہے ہو؟ زمر نے آر ایس وی پیز ٹکٹ کر کے بھیج تو دیے تھے۔"

"جی' پھپھو خود کارڈ دینے آئی تھیں' ہم سب آئیں گے۔"

"اچھا زمر خود گئی تھیں؟ گڈ!" ہاشم مسکرا دیا' پھر دوبارہ گھڑی دیکھی۔ اس کو جانا تھا' سو مہذب انداز میں اجازت چاہی۔

حنین کی نگاہوں نے اس کے کار میں بیٹھنے تک اس کا تعاقب کیا۔ اس کا پرفیوم ہنوز اس کے اردگرد پھیلا تھا۔ وہ جادوگر تھا۔

جادوگر۔۔۔
وہ مڑ گئی۔۔۔ ابھی اسے رافعہ اور ناعمہ کی بھی خبر لینی تھی۔

☼ ☼ ☼

سارے گل بوٹے مصنوعی
رنگ، نمو، خوشبو دھوکا ہے

قصر کے سبزہ زار میں سیاہ شام سنہرے تاروں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تھی۔ بھرپور سجاوٹ، سیاہ اور سنہری اسپرے پینٹ شدہ اصلی گلاب، روشنیاں، قہقہے۔

وہ سب گول میزوں کے گرد کھڑے تھے۔ وہ گول میزیں اتنی اونچی تھیں کہ سینے تک آتیں کرسیاں ندارد ایک میز پہ ٹیگ لگا تھا "Yousufs" اور اس کے گرد وہی چاروں تھے۔ صرف حنین کا فراک سنہری تھا، باقی سعدی اور سیم سیاہ سوٹ میں تھے اور زمر کو تو سیاہ کی عادت تھی۔ وہ بے تاثر چہرہ لیے گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹتی سامنے دیکھ رہی تھی۔ سیاہ لمبی قمیص کندھوں پہ سیاہ ہی دوپٹہ۔ بال کھلے تھے۔ حنین کے بال مگر فرنچ چوٹی میں بندھے تھے اور وہ مسلسل ارد گرد سے گزرتی لڑکیوں کے پیر دیکھ رہی تھی۔ (امیر لڑکیوں کی شکلیں جیسی بھی ہوں' پاؤں بلا کے حسین ہوتے ہیں) وہ چہرہ رگڑ لے بہت ہے' پیروں کا خیال دعوتوں میں ہی آتا۔ اس نے اپنے پاؤں فراک کے گھیر کے اندر سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

سیم کافی پرجوش آیا تھا۔ حنین نے یہ کہہ کر کہ "امی کو بڑے ابا کے پاس چھوڑ دیتے ہیں کیوں پھپھو؟" زمر کی تائید لی تو سعدی انکار نہ کر سکا۔ سیم کو سب سے زیادہ خوشی سوموار کو اپنے دوستوں کو اپنے امیر رشتے داروں کی دعوت کی تفصیل بتانے کی تھی۔ اس لیے رستے میں بار بار وہ دبی آواز میں حنین سے اپنا اور کاردار ز کا رشتہ پوچھتا آیا تھا۔

"ہاشم بھائی ہمارے کیا لگتے ہیں۔"

"دیکھو سیم! ہمارے نانا نے دو شادیاں کی تھیں۔" حنین نے پہلی دفعہ تفصیل سے سمجھایا۔ "پہلی بیوی سے امی اور وارث ماموں تھے' جن کی بیوی سارہ خالہ ہیں' پتا ہے نا ان کا؟" سیم نے اثبات میں سر ہلایا "اور دوسری بیوی سے فارس ماموں تھے۔ اب یہ جو دوسری نانی تھیں نا' ان کے بھائی اورنگ زیب کاردار تھے۔ ہاشم بھائی کے ابو۔"

"یعنی فارس ماموں اور ہاشم بھائی فرسٹ کزن ہوئے؟"

"بالکل۔ مگر ہماری امی کے فرسٹ کزن نہیں ہیں ہاشم بھائی۔ ہمارے وہ کچھ بھی نہیں لگتے ویسے۔"

"تو پھر وہ ہمیں کیسے جانتے ہیں؟"

"اف سیم۔۔۔! خون کا رشتہ نہیں ہے مگر امی کی سوتیلی ماں کے بھتیجے ہوئے تو رشتے دار تو لگے نا۔ اب دوبارہ مت پوچھنا۔"

"مگر پھر وہ زمر پھپھو کو کیسے جانتے ہیں؟"

"ہاشم بھائی اور پھپھو وکیل ہیں ایک ساتھ کام کرتے رہے ہوں گے اسی طرح شاید۔"

"تو ہاشم بھائی نے سارہ خالہ کو کیوں نہیں بلایا؟"

"اف' مجھے کیا پتا۔ سارہ خالہ تو ویسے بھی اب کسی سے زیادہ ملتی جلتی نہیں ہیں اور ہمیں بھی کبھی کبھی ہی بلاتے ہیں۔"

"پہلے کب بلایا تھا' میں تو کبھی نہیں گیا۔" سیم کو تو غم لگ گیا۔

"بس چند ایک بار گئے تھے ہم ان کی طرف۔ بھائی اور میں۔ اب چپ کر کے بیٹھو!" اس نے بات ٹال دی اور۔۔۔ بمشکل سیم کو خاموش کروایا' مگر پارٹی میں آ کر وہ واقعی خاموش ہو گیا تھا۔ یہ اس کی دنیا سے مختلف دنیا تھی اور اسے بالکل بھی مزا نہیں آ رہا تھا۔

"گٹو۔۔۔" اس نے حنین کے قریب سرگوشی کی۔ "یہ ہاشم بھائی۔۔۔ دور کسی سے ہنس کر باتیں کرتے ہاشم کی طرف اشارہ کیا" کتنے آرٹیفشل لگتے ہیں نا۔"

"الو۔ اشارے مت کرو!" اس نے جلدی سے سیم کا ہاتھ دبایا البتہ چہرے کے رنگ بدل گئے۔ وہ ہاشم کو دیکھ بھی نہ پا رہی تھی۔ دل میں خوف الگ۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟

سعدی جوس کے گلاس سے گھونٹ بھرتا گہری نظروں سے بائیں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں شہرین کھڑی کسی سے مل رہی تھی اس نے وہی سنہرا گاؤن پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں کلچ کے ساتھ ٹیب اٹھا رکھا تھا۔ پھر سعدی کو دیکھ کر ان کی طرف آئی۔

"ہیلو ڈی اے!" زمر کو وہ اسی طرح پکارتی تھی۔ ڈی اے یعنی ڈسٹرکٹ اٹارنی۔ پھر سعدی پہ ایک سرسری نظر ڈالی۔

"ہیلو سعدی؟ ٹھیک ہو تم؟" رسمی سا حال احوال پوچھا۔

زمر نے محض سر کے خم سے جواب دیا۔ وہ اسی طرح مڑ گئی' مگر سعدی کے قریب سے اور سعدی نے بے حد مہارت سے ٹیب پکڑ کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ شہرین مڑ کے بنا دور ہوتی گئی۔ سعدی نے گہری سانس لی آدھا کام ہو گیا تھا مگر پاس ورڈ۔۔۔

"زمر نے وعدہ پورا کیا سعدی بالآخر آ گیا۔" ہاشم نے مسکرا کر اس کے کندھے کو تھپکا تو وہ سنبھل کر سیدھا ہوا۔ ہاشم ابھی ادھر آیا تھا۔ حنین اپنے جوتوں کو دیکھنے لگی۔

زمر نے ذرا سے شانے اچکائے۔ اور خاموشی سے اسے سعدی سے بات کرتے دیکھتی رہی۔

"کیا کر رہے ہو آج کل؟" وہ بالکل بڑے بھائیوں کے انداز میں پوچھنے لگا۔ سعدی سادگی سے مسکرایا۔

"آپ کو علم نہ ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں' یہ میں نہیں مان سکتا۔"

ہاشم ہنس دیا مگر اس کی سرد آنکھیں سعدی کے اندر تک اتر رہی تھیں۔

"یہی تو جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"گڑے مردے اکھاڑ رہا ہوں۔"

ہاشم کی برف آنکھوں میں تپش ابھری' مگر مسکراہٹ پھیکی نہ ہوئی۔

"کوئی مدفن ملے تو مجھے بھی خبر کرنا!"

"سب سے پہلے آپ ہی کے پاس آؤں گا' وعدہ رہا!"

سعدی کے لہجے میں عزم تھا۔ ہاشم نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور سعدی کے کالر سے نادیدہ گرد جھاڑی۔

"میں انتظار کروں گا۔" پھر وہ دوسروں کی طرف پلٹا "کیسی ہو حنین؟"

حنین نے چہرہ اٹھایا' پلکیں لرزیں۔ وہ سامنے کھڑا تھا' نرم مسکراہٹ سے اس کو دیکھتا۔ کیمل کلر کے سوٹ میں ملبوس اندر سیاہ شرٹ سب سے مختلف' حنین کا اعتماد بڑھا۔ کسی کو کچھ علم نہیں ہو گا۔ ہاشم کسی کو نہیں بتائے گا۔

"جی۔۔۔ ٹھیک!"

وہ سیم کو دیکھے بنا زمر کی جانب متوجہ ہوا۔ "کیا میں نے آپ کو بتایا کہ مجھے سرکار بنام عبدالغفور میں سیٹل منٹ مل گئی ہے؟"

زمر کی گھنگھریالی لٹ لپیٹتی انگلی ساکت ہوئی۔ آنکھوں میں حیرت' شاک کچھ بھی نہ ظاہر ہوا' بس سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"واقعی؟ پراسیکیوٹر بصیرت کیسے مانے؟"

"جیسا کہ میں کہتا ہوں' پیسہ بولتا ہے۔" وہ محظوظ ہوا تھا۔ "ویسے آپ کو لاعلم دیکھ کر حیرت ہوئی' میرا خیال تھا میری جیت کا آپ کو علم ہو گا!"

"مجھے واقعی علم نہیں تھا کہ آپ جیت گئے ہیں۔" اس نے بے نیازی سے ابرو اچکائے۔ "اینی ویز مبارک ہو' آپ نے ایک قاتل کو ٹرائل سے محفوظ کر لیا۔"

"یہ صرف ایک ایکسیڈنٹ تھا!" ہاشم نے یاد کروایا' پھر انٹرنس کی طرف دیکھا اور "میں آتا ہوں" کہہ کر اپنے دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گیا۔

زمر اسے جاتے دیکھتی رہی' پھر رخ موڑا تو سعدی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"یہ کس جیت کی بات کر رہے تھے؟" اور یہ کارپوریٹ Licitation سے کرمنل کیسز کی طرف کیوں آ جاتے ہیں بار بار؟ ذرا سمرائز کر کے بتائیں۔" اس کی بات پر زمر نے کہنا شروع کیا۔

"ویل۔۔۔ ہاشم کی ماں کی دوست مسز شہلا ارشاد کے ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ میں ٹین ایج لڑکی ماردی اور ہاشم اپنا آفس چھوڑ کر صرف عزیزواقارب کو فیورز دینے ڈی اے کے آفس آتا رہتا ہے 'سو وہ معاملہ سیٹل کرنا چاہتا تھا مگر پراسیکیوٹر بصیرت کے پاس کیس ہونے کی وجہ سے یہ مشکل تھا۔ بہرحال اس نے دیت کی رقم جتنا اماؤنٹ اوپر بھی خفیہ طور پر ورثا کو دے دیا اور معاملہ سیٹل۔"

سعدی نے اثبات میں سرہلایا۔ "صرف بیس منٹ!"

زمر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"ابا پہلی دفعہ جب مجھے آپ کے پاس لے کر گئے تھے تب میری عمر بیس منٹ تھی 'سو سوائے ان بیس منٹ کے باقی کے پچیس سال اور سات دن میں آپ کے قریب رہا ہوں 'اور ان بیس منٹ کی کمی میری آپ کو سمجھنے کی صلاحیت پہ اثر انداز نہیں ہوسکتی 'کیونکہ آپ نے ہاشم سے کہا 'آپ اس کی جیت سے بے خبر تھیں 'اور اس کو ڈی کوڈ کروں تو آپ کو خبر تھی مگر جیت کی نہیں 'کیونکہ وہ شاید جیتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے یہ جو آپ نے ابھی سمرائز کرکے بتایا ہے 'اسے ژمرائز کر کے بتائیں۔"

"ژمرائز کروں؟ اچھا۔۔۔" وہ ہلکا سا ہنسی اور اتنے عرصے بعد یہ پہلی دفعہ ہوا۔ وہ مسکراتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا اور حنین بے دلی سے سن رہی تھی۔ اس کا دھیان باربار بھٹک رہا تھا۔

"قانون اندھا ہوتا ہے مگر پراسیکیوٹر کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ مجھے کیس دیکھ کر پتا چل گیا تھا کہ ایکسیڈنٹ مالکن نے کیا ہے اور وفادار ڈرائیور قربانی کی بھینٹ ہے۔ مگر ثبوت تھا نہ گواہ 'تو میں نے ہاشم کو پراسیکیوٹر بصیرت کا رستہ دکھایا 'کیونکہ ہاشم اپنی انا کے لیے مسز شہلا سے دوہری رقم نکلوا سکتا تھا۔ جب لڑکی کے باپ نے بتایا کہ دہری رقم مل گئی ہے تو میں نے بصیرت صاحب کو ڈیل کے لیے قائل کرلیا۔ بہرحال یہ ایک ایکسیڈنٹ تھا اور میں صرف اس فیملی کی مدد کرنا چاہتی تھی۔"

مسکرا کر بتاتے اس نے دور کسی سے بات کرتے ہاشم کو دیکھا۔ حنین بے دلی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی 'البتہ سعدی نے صحیح انجوائے کیا تھا۔

"آپ نے ہاشم کو کیوں نہیں بتایا کہ وہ نہیں جیتا؟"

زمر نے جواباً "سعدی کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہمارے اسکول میں ایک جادوگر شو کرتا تھا۔ کبھی ٹوپی سے کبوتر نکالتا 'کبھی کان سے سکہ۔ میں نے ایک دن پوچھا 'اس ٹرک کا راز تو بتائیں۔ وہ بولا 'جس دن بتادیا 'وہ میرے شو کا تمہارے اسکول میں آخری دن ہوگا۔"

"صحیح! اور یہ ڈرائیور کو قربان کرنے کا مشورہ بھی ہاشم بھائی کا ہوگا۔"

"کیا پتا انہیں معلوم نہ ہو کہ جرم مالکن نے کیا ہے۔" حنین کو برا لگا تھا۔

"معلوم؟ ہاشم کبھی بھی اپنے کلائنٹ سے نہیں پوچھے گا کہ اس نے جرم کیا ہے یا نہیں۔ اس کا کام دفاع کرنا ہو تو وہ دفاع کرے گا 'پراسیکیوٹ کرنا ہو تو پراسیکیوٹ کرے گا۔"

حنین زمر کو دیکھ کر رہ گئی۔ ہاشم نے اس سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس نے نقل کی تھی یا نہیں۔

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ وکیل کا کام پوچھنا اور موکل پہ اعتبار کرنا نہیں ہوتا۔ اسے خود تفتیش کرکے سچ ڈھونڈنا اور اسے چھپانا یا بڑھانا ہوتا ہے۔"

"ہاشم بھائی کو لازمی پتا ہوگا کہ مالکن نے جرم کیا ہے۔ اپنے جیسے کریمنلز کو وہ اچھے سے جانتے ہیں۔" سعدی نے اضافہ کیا تو زمر نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔

"سعدی! میں ہاشم کو پسند نہیں کرتی اور قابل اعتبار تو قطعاً "نہیں سمجھتی 'مگر کریمنلز کا دفاع کرنے کے باعث ہم اس کو کریمنل نہیں کہہ سکتے۔"

سعدی خاموش ہوگیا۔ بس ایک نظر زمر پہ ڈالی۔ اگر جو پھپھو کو پتا چل جائے کہ وہ ہاشم کو اتنا بھی نہیں جانتیں تو؟

جواہرات جب ادھر آئی تو تنہا نہیں تھی 'ساتھ وہ تین خواتین بھی تھیں۔ تازہ بوٹوکس کا اثر تھا 'وہ سیاہ سنہری دھاریوں والے گاؤن میں دمک رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے سعدی کا کالر نزاکت سے جھاڑا۔

"کیا یہ دوستی ہے تمہاری نظر میں کہ شکل بھی نہیں دکھاتے؟" بڑی نزاکت اور مان سے کہا۔

سعدی نرمی سے مسکرادیا۔

"اب آپ کے پاس خود پہلے جیسا وقت نہیں ہوتا مسز جواہرات۔" جواہرات بس مسکرا کر اپنی فرینڈز سے زمر کا تعارف کروانے لگی۔ ایک تو شاید زمر کو جانتی بھی تھی۔

"اوہ 'آپ زمر ہیں 'مجھے یاد ہے۔ پہلے بھی ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے البتہ زمر کا نام غلط تلفظ سے بولا تھا۔ رے کے اوپر زبر کے ساتھ۔ "اُف"

"اِٹس زمر۔۔۔ زو۔۔۔ مر زے کے اوپر پیش ہے۔" اس نے توڑ توڑ کر بتایا۔ وہ خاتون "اچھا 'اچھا" کہہ کر سر ہلانے لگیں۔ قدرے فاصلے پہ کھڑا نوشیرواں تند نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے ماں کے وعدہ پورا کرنے کا انتظار تھا۔

اب جواہرات نے ساتھی خواتین سے سعدی کا تعارف کروایا۔

"یہ سعدی یوسف ہے 'ہمارا رشتہ دار اور بہت اچھا دوست۔ اپنا مکمل تعارف اور شجرہ نسب بتانا سعدی کو پسند ہے۔ سو بتاؤ نا سعدی!"

سعدی ذرا سا چونکا 'پھر سنبھل کر مسکرایا۔۔۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ (تو نوشیرواں کی بے عزتی کا بدلہ اتارا جارہا تھا) اس نے بس ایک نظر سامنے کھڑے شیرو پہ ڈالی 'جس کے لبوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ سعدی کھنکھارا۔

"مسز جواہرات نے چونکہ شجرہ نسب کا ذکر کیا ہے تو ہم پٹھان ہیں اور ہمارا قبیلہ بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے 'یوسف علیہ السلام کی اولاد سے 'اسی لیے سعدی یوسف خان نام ہے میرا اور چند برس قبل میں نے اپنا ڈی این اے ٹیسٹ بھی کروایا تھا 'اس کے مطابق بھی میرے آبا یہود میں سے تھے۔ یوں 'میں 'میرے مڈل کلاس والدین 'ہم سب بنی اسرائیل سے ہیں۔"

کہہ کر اس نے معصومیت سے جواہرات کو دیکھا جہاں شیرو کا چہرہ سیاہ پڑا۔ وہیں جواہرات بھی بجھ گئی 'وہ یقیناً "یہ سب اس انداز میں نہیں کہلوانا چاہتی تھی اگر جو وہ اس روز نوشیرواں کے سامنے جھاڑی گئی تقریر یہاں دہراتا تو کتنا مزا آتا مگر اب وہ تینوں خواتین ستائشی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ نوشیرواں سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ جواہرات نے ان میں سے ایک کو مخاطب کیا۔ "آسٹریلیا کب جارہی ہو آمنہ؟"

"اسی ہفتے 'حماد اور کرن کے ساتھ۔"

زمر چونکی 'سعدی بھی 'حنین تک نے ان کو دیکھا۔ جواہرات مسکراتے ہوئے نرمی سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے پاس بدلہ لینے کے بہت طریقے تھے۔

"کرن کیسی ہے؟"

"جڑواں بیٹے ہوئے ہیں اس کے 'خوش ہے۔" وہ کرن کی خالہ تھیں اور یہ تو سب کو علم تھا کہ زمر کے منگیتر کا رشتہ جواہرات کے جاننے والوں میں ہی ہوا تھا۔

وہ خواتین وہاں سے ہٹیں تو جواہرات اس طرف مڑی 'ایک معصوم نظر سعدی کے سنجیدہ چہرے پہ ڈالی 'پھر زمر کو دیکھا جو سپاٹ کھڑی تھی 'پھر ایکدم آنکھوں میں ملال ابھرا۔

"اوہ آئی ایم سوری ہنی! مجھے حماد کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا 'میں نے تمہیں ڈسٹرب کردیا نا۔" نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر وہ جیسے بے حد شرمندہ تھی۔

حنین نے لب کاٹتے ہوئے پھپھو کو ہمدردی سے دیکھا۔ اسے اپنے پچھلے رویے پہ شرمندگی ہوئی بے چاری پھپھو۔

"مجھے فرق نہیں پڑتا۔" اسے فرق پڑا تھا 'مگر وہ رخ موڑ گئی اور وہیں انٹرنس سے وہ چلا آرہا تھا۔ سیاہ سنہرے لوگوں میں وہی منفرد تھا۔ نیلی جینز اور سفید شرٹ 'چھوٹے کٹے بال 'کندھے پہ بیگ لٹکائے۔ ویٹر نے کچھ کہا 'اس نے "اونہوں" کرتے بے زاری سے

اسے پرے کیا اور برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ زمر کی آنکھوں میں کرب ابھرا۔ نفرت، غم، غصہ، لب بھنچ گئے۔ جواہرات نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

"وہ رہا ہو گیا ہے، اور یہ اس کے ماموں کا گھر ہے، اس کو رہنے سے روک نہیں سکتی۔ فارس کو کوئی بھی کچھ کرنے سے روک نہیں سکتا۔" جواہرات نے زمر کا ہاتھ دبائے گویا معذرت کی گرہ دی ہوئی ہے۔

"مجھے فرق نہیں پڑتا!"

"آئی ایم سوری! ریئلی!"

"یو شڈ بی!" سعدی نے سرد لہجے میں کہا۔ جواہرات نے نرمی سے اسے دیکھا، اس کی کہنی کو بچے کی طرح تھپکا اور ایکسکیوزمی کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ حنین، نیم، سعدی، تینوں خاموش تھے اور زمر کے رد عمل کے منتظر تھے۔ مگر وہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"کیا آپ نے وہ کتاب پڑھی جو میں نے گفٹ کی تھی؟" سعدی نے کھنکھار کر کہا۔

"کون سی کتاب؟" زمر نے آنکھوں میں اتری نمی کو اندر اتار لیا مگر لہجے میں لرزش تھی۔ "ہاں وہ... تیرہویں صدی کا مسلم اسکالر نان فکشن؟ نہیں، میں نہیں پڑھ سکی۔ میں آتی ہوں ابھی ہوں!" وہ معذرت کر کے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"پھپھو ہرٹ ہوئی ہیں۔" سیم نے کہا۔ وہ دونوں چپ رہے۔

کیک کٹ رہا تھا۔ ہاشم اور شہرین بچی کے اردگرد مسکراتے ہوئے موجود تھے۔ مصنوعی قہقہے، کھوکھلی خوشیاں پھر شہرین نے کیک کے ٹکڑے کرنا شروع کیے۔ وہ فونڈنٹ کا تین منزلہ باربی کیک تھا، جیسے اصلی باربی پھولے فراک کے ساتھ کھڑی ہو۔ چند کیکس اس کے علاوہ بھی مرکزی میز پہ رکھے تھے جن کے اب لینو نا ٹکڑے کر رہی تھی۔ باربی والے کیک پہ باربی نے ایک دل اٹھا رکھا تھا جس پہ Soniya لکھا تھا۔ شہرین نے وہ دل سونیا کی پلیٹ میں ڈالا مگر جب کیک سرو کیے جانے لگا تو اس نے وہ دل ایک اور ڈش میں کیک کے اوپر رکھ کر فینو نا کو دیا۔

"یہ ڈی اے کی ٹیبل پہ لے جاؤ۔"

فینو نا اسے فوراً وہاں لے آئی۔ ڈی اے (زمر) تو نہیں تھی، مگر سعدی نے یہ سب غور سے دیکھا اور پھر شہرین کو۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی مگر اس کو دیکھتے پا کر مہمانوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔ یعنی سعدی خود سمجھ لے تو سمجھ لے، وہ بس کنارے کنارے رہ کر ہی مدد کرے گی۔

زمر اندر آئی تو وہاں بھی مہمان بکھرے تھے۔ امیروں کی دعوتیں، سارا گھر ہی کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

"گیسٹ باتھ روم کس طرف ہے؟" زمر نے گزرتے ویٹر کو روکا وہ کسی کام سے آیا تھا سو باتھ کے بجائے گیسٹ روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ سیدھی ادھر چلی آئی۔ وہ آنسو جو باہر مضبوطی کے خول نے بہنے نہیں دیے تھے، وہ اندر اترنے کے باوجود آنکھوں کو سرخ کر گئے تھے۔ اس نے گیسٹ روم کا دروازہ دھکیلا کہ باتھ روم جا کر منہ دھوئے مگر۔

بیڈ پہ بیگ کھلا پڑا تھا۔ ایک مشین گن، دو پستول، گولیاں اور خود وہ بیڈ کے کنارے پہ جو گر رکھے، پنڈلی کے ساتھ چاقو باندھ رہا تھا۔ آہٹ پہ چونک کر سر اٹھایا پھر وہیں رک گیا۔ سیدھا بھی نہ ہوا۔

چوکھٹ پر کھڑی زمر کا سانس رک گیا تھا۔ اس کی نگاہیں اسلحے سے ہوتی، فارس کے چہرے تک گئیں، پھر ان میں اترا غم، غصے میں بدلا جبڑے کی رگیں تن گئیں وہ پیچھے ہوئی اور زور سے دروازہ بند کیا۔ اب اسے مزید فریش ہونے کی خواہش نہ تھی۔ وہ تیز تیز چلتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

حنین کے کپڑوں پہ کیک کا ٹکڑا گرا تھا، وہ سیم کو لیے اندر آ گئی۔ کیک کے بعد سب پھر سے بکھر گئے تھے۔ کھانے میں ابھی وقت تھا۔ حنین کو یاد تھا کہ گیسٹ باتھ روم کدھر ہیں۔ داخلی رستے میں سے دروازہ کھلتا اور اندر شیشے کی دیوار کے ساتھ قطار میں بیسن تھے۔

"کچھ لوگوں کے چہرے کو دیکھ کر لگتا ہے ان کو

بھڑوں نے کاٹا ہے۔ مگر نوشیرواں بھائی کے بالوں کو دیکھ کر مجھے یہی لگتا ہے۔" راہداری سے گزر کر اندر جاتے شیرو کو دیکھ کر سیم نے تبصرہ کیا۔ حنین کو شدید ہنسی آئی مگر اس نے زور سے سیم کے چٹکی کاٹی۔

"اپنی کمنٹری بند رکھو۔" وہ نل پہ اوپر نیچے ہاتھ مارنے لگی، وہ کھل نہیں رہا تھا۔

چونکہ دروازہ کھلا تھا اور ہر گزرتا شخص دکھائی دے رہا تھا، تب ہی ہاشم نے چوکھٹ پہ رک کر پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے، بچو؟"

حنین نے خوشگوار حیرت سے سر اٹھایا۔ وہ ان کو دیکھ کر بالخصوص رکا تھا۔ سب سے ہٹ کر بھی اس سے ملاقات ممکن تھی؟ پھر جھینپ گئی۔

"یہ نل نہیں کھل رہا۔"

"آہستہ سے اس کے نیچے ہاتھ لے کر جاؤ۔" ہاشم نے مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔ حنین نے آہستہ سے نل تلے ہاتھ کیے۔ پانی کی دھار بہہ پڑی۔

"اوہ۔" وہ جھینپ گئی۔ ہاتھ دھو کر ہٹائے۔ دھار غائب۔ آٹومیٹک۔ اسے کیوں بھول گیا؟

سیم اندر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ حنین پیپر ٹاول سے ہاتھ خشک کر کے چوکھٹ تک آئی۔

"تو کیا سبجیکٹس ہیں تمہارے؟" ہاشم نے بات کا آغاز کیا۔

"لٹریچر!" وہ نگاہیں جھکا کر جھینپ کر مسکرائی۔

"اوہ ۔۔۔ میں سمجھا شاید ۔۔۔" وہ حیران ہوا تھا۔ حنین کے چہرے پہ سایہ گزرا۔ ہاشم نے اسے غور سے دیکھا اور بات بدل دی۔ "تو کیا لٹریچر میں بھی نقل ہو سکتی ہے؟"

"نقل ہر سبجیکٹ میں ہو سکتی ہے مگر آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے نقل کی تھی یا نہیں؟"

"میں یہ کبھی نہیں پوچھتا۔" وہ مسکرایا۔ "مگر یہ ضرور پوچھوں گا کہ تمہارے گلاسز کہاں گئے۔ تم تو چشمش ہوتی تھیں نا۔"

"اتر گئے۔ بھائی نے لیزر کروا دیا تھا۔" اس نے قدرے اعتماد سے ہاشم کو مسکرا کر دیکھا۔

"آپ کو میری عینک یاد ہے، مگر صبح آپ نے پوچھا کون حنین؟" وہ ہلکا پھلکا سا شکوہ کر گئی۔

"کیونکہ میرے جاننے والوں میں دو اور حنین بھی ہیں۔ ایک اپنے نام کے دونوں N کے درمیان آئی لگاتی ہے اور دوسری ڈبل ای۔ تم کیا لگاتی ہو؟"

"ڈبل ای۔"

"گڈ! خیر آتی جاتی رہا کرو سونیا، ممی، سب سے ملتی رہو ۔۔۔ یا بھائی سختی کرتا ہے؟" ہاشم نے مسکرا کر پوچھا مگر وہ بہت گہرے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"سونیا اور آپ کی ممی میری عمر کی نہیں ہیں۔ اور بھائی سے اچھا میرے لیے دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" وہ بھی مسکرا کر بولی مگر بھائی کا منفی انداز میں ذکر اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ ہاشم مزید کچھ کہتا مگر کان میں کوئی آواز آئی وہ معذرت کرتا آگے بڑھ گیا، پھر کان میں موجود آلہ انگلی سے دبا کر بولا۔

"ہاں خاور بولو؟"

"سر! آپ وہیں رکیے، میں آرہا ہوں۔" خاور لان میں تھا اور ادھر آرہا تھا۔ ہاشم وہیں رک گیا مگر پھر کوئی اور مل گیا تو وہ ان کا حال احوال پوچھنے کھڑا ہو گیا۔ خاور منتظر سا کھڑا رہا۔ وہ فارغ ہو کر اپنے چیف سیکیورٹی آفیسر کی طرف مڑا۔

"کیا ہوا؟" استفسار میں سختی تھی۔

"آپ کو یہ دیکھنا چاہیے۔" خاور نے ٹیبلیٹ آگے کیا۔ اس کی اسکرین پہ پانچ کیمروں کی فوٹیج آرہی تھی۔ خاور نے ایک پہ انگلی رکھ کر اسے بڑا کیا۔ ہاشم نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہ اس کے کمرے کے بند دروازے کا منظر تھا۔ خاور نے اسے تیزی سے ریوائنڈ کیا اور پھر پلے کیا۔

سیڑھیوں سے دو چار لوگ اترتے چڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں ایک سیاہ سوٹ اور گھنگھریالے بالوں والا لڑکا بھی تھا جو سر جھکائے زینے پھلانگتا اوپر گیا۔ ہاشم کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جا کر دروازہ بند کیا۔

ہاشم کو لگا، اس کے منہ پہ کسی نے دروازہ دے مارا ہو۔ اس کی آنکھوں میں سرخی ابھری، مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"یہ کتنی دیر پہلے کی ہے؟"

"تیرہ منٹ!"

اور تیرہ منٹ قبل جب وہ ہاشم کے کمرے میں آیا تھا تو اس نے لیپ ٹاپ میں فلیش لگانے میں تین سیکنڈ بھی نہ لگائے تھے۔ لیپ ٹاپ بند رہا مگر فلیش کی بتی چمکنے لگی۔ اس نے پنجوں کے بل کارپٹ پہ بیٹھے تیزی سے ٹیب کھولا۔

"آپ کی ڈیوائس کا رابطہ ایک ہارڈ ڈرائیو سے ہو چکا ہے۔ کیا آپ تمام ڈیٹا کاپی کرنا چاہیں گے؟"

"بہت خوشی کے ساتھ!" دھڑکتے دل سے اس نے یس دبایا۔ پاس ورڈ اس نے "سونیا" ٹائپ کیا۔ ہرا سگنل، سعدی نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔

ڈیٹا کاپی ہونے لگا۔ دس فیصد، بیس فیصد ۔۔۔ چالیس ۔۔۔ وہ بار بار مضطرب نظروں سے بند دروازے کو دیکھتا ۔۔۔ پچپن فیصد ۔۔۔ ساٹھ ۔۔۔

نیچے کھڑے ہاشم نے شعلہ بار نظروں سے خاور کو دیکھا۔

"تیرہ منٹ سے وہ میرے کمرے میں ہے اور تم اب بکواس کر رہے ہو؟" وہ دبا دبا سا گرجا۔ خاور تھوک نگلتے پیچھے ہوا۔

"سر آپ کسی سے بات کر رہے ۔۔۔"

"دو بندوں کو لے کر میری بالکونی پہ جاؤ، میں ادھر سے جاتا ہوں۔" ساری شائستگی، مہمان نوازی دفعان کر کے وہ تیز تیز زینے تک آیا ۔۔۔

"ستر فیصد ۔۔۔ بہتر ۔۔۔ چھہتر۔" سعدی بے چینی سے انگلیاں مروڑ رہا تھا۔

ہاشم کوٹ کا بٹن کھولتے زینے پھلانگ رہا تھا۔ کسی آندھی طوفان کی طرح۔ وہ جیسے ابھی جا کر سعدی کو گریبان سے دبوچ لینا چاہتا تھا، اس الو کے پٹھے نے "ہاشم بھائی" کو ابھی بہت انڈر اسٹیمیٹ کیا تھا۔

"پچاسی ۔۔۔ نوے۔" سعدی نے فلیش انگلیوں سے پکڑ رکھی تھی، گنتی ختم ہو اور وہ اسے کھینچ لے۔

ماتھے پہ پسینہ تھا۔

ہاشم نے دھاڑ سے دروازہ کھولا۔ غصے سے بھری اس کی نگاہیں آگے پیچھے دوڑیں۔

کمرا خالی تھا۔ سعدی وہاں نہیں تھا۔ البتہ ۔۔۔ ہلتا ہوا پردہ ہٹا ہوا تھا، بالکونی کا دروازہ پورا کھلا تھا۔

وہ اندھا دھند باہر بھاگا۔ بالکونی میں بھی وہ نہ تھا۔ وہ تیزی سے بیرونی زینے اترنے لگا۔ اس طرف لان خالی اور نیم اندھیرا تھا۔ خاور اور دو سوٹ پہنے آدمی بھاگتے ہوئے ادھر آرہے تھے۔ ہاشم کا ماتھا ٹھنکنے لگا۔ وہ کہاں گیا؟

اندر خالی کمرے میں حرکت ہوئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر سعدی آہستہ سے نکلا اور اسی آہستگی سے کمرے سے باہر آکر دروازہ بند کر دیا۔

"کیا ہے ہاشم بھائی! کہ آج کل کے بچے تھوڑے سے زیادہ اسمارٹ ہیں۔" کان کھجاتے ہوئے اس نے معصومیت سے خود کلامی کی اور اسی اعتماد سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

داخلی دروازے کے قریب دیوار پہ بہت سے ڈیجیٹل فوٹو فریم آویزاں تھے۔ ان میں تصاویر سلائیڈ شو کی صورت حرکت کر رہی تھیں۔ حنین اور سیم باتیں کرتے ہوئے کافی شوق سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ ہاشم، نوشیرواں وغیرہ کی تصاویر۔ بچپن، یونیورسٹی۔

سعدی ابھی سیڑھیاں اتر کر آیا ہی تھا کہ۔

"ہے سعدی!" نوشیرواں جو جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک مجسمے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، پکار کر بولا۔ سعدی گھوما۔

وہ عادتاً "بغیر کوٹ کے، سنہری شرٹ پہ سیاہ ویسٹ میں ملبوس تھا، اور استہزائیہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"اپنے بہن بھائی کو لے آیا کرو نا کبھی ادھر۔ دیکھو کتنے ایکسائیٹڈ ہو رہے ہیں۔ انہوں نے شاید ایسی چیزیں پہلے نہیں دیکھی ہیں۔"

سعدی نے ایک نظر دور کھڑے دونوں پہ ڈالی۔

"ہاں، انہوں نے تم جیسی چیزیں کم ہی دیکھی ہیں۔" مگر نوشیرواں نے جیسے نہیں سنا۔

"مگران کا قصور نہیں ہے' غربت اور چھوٹا خاندان' بہت بڑی مصیبت ہے۔" تاسف سے کہتے اس نے سرہلایا۔

"اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھڑک کر تمہارے اوپر حملہ کروں اور تم سب میں میرا تماشا بناؤ تو ایسا نہیں ہو گا۔ میں مہمان ہوں' آداب مہمانی مجھے آتے ہیں۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ مڑ گیا۔ اس کا رخ داخلی دروازے کی سمت تھا۔

"تمہاری بہن کافی بڑی ہو گئی ہے۔" نوشیرواں نے پھر پکارا۔ اب کے حملہ مختلف نوعیت کا تھا۔

سعدی کے قدم زنجیر ہوئے۔ اس نے گردن موڑی۔ آنکھوں میں سرخی ابھری' لب بھنچے' مگر اس سے پہلے کہ وہ جھپٹ کر بھنچی ہوئی مٹھی کو نوشیرواں کے چہرے تک لے کر جاتا۔

"اے۔۔۔ کیا بولا ہے؟ کس کی بہن کی بات کی ہے ہاں؟" فارس برہمی سے بولتا تیز تیز قدم اٹھاتا ادھر آرہا تھا۔ ایسے کہ وہ جو سعدی سے دو انچ لمبا تھا۔ سعدی کے آگے آکر نوشیرواں کی طرف بڑھا۔

نوشیرواں واقعی گڑبڑایا تھا۔ اس نے فارس کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر لاپروائی سے شانے جھٹکے۔

"ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟" وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔

"بکواس مت کرو۔۔۔ میری بہن کی بیٹی کا نام مت لینا آئندہ۔۔۔ ورنہ ہاتھ پاؤں سلامت نہیں رہیں گے تمہارے۔ بات سمجھ میں آئی یا نہیں' ہاں۔" گھورتے ہوئے انگلی سے اس کے سینے کو دھکیلا۔ تب ہی ہاشم نے آکر تیزی سے دونوں ہاتھوں سے دونوں کو دور کیا۔ وہ ابھی ابھی سیڑھیاں اترتا ادھر آیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کیا ہوا ہے؟" صلح جو انداز میں اس نے فارس کا کندھا تھاما' مگر فارس نے جھٹکے سے چھڑایا اور طیش بھری نگاہوں سے ہاشم کو دیکھا۔

"اپنے بھائی کو سمجھالو' اس طرح کی بکواس آئندہ کی تو میں زبان سے جواب نہیں دوں گا۔" اردگرد موجود لوگ دیکھنے لگ گئے تھے۔ دور کھڑے حنین اور سیم بھی متوجہ ہو گئے۔ ماموں اور نوشیرواں مدمقابل تھے۔

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ میں معذرت کرتا ہوں۔۔۔ تم ٹھنڈے ہو جاؤ۔"

کہتے ہوئے وہ بار بار سرد نگاہوں سے سعدی کو بھی دیکھتا۔ فارس "ہونہہ" سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا اور سعدی' ہاشم سے نگاہ ملائے بغیر اپنے بہن' بھائی کی طرف چل دیا۔

"میرا قصور نہیں تھا بھائی۔۔۔ میں نے۔۔۔"

"تم دونوں میرے کمرے میں آؤ۔" ہاشم نے اس سے اور خاور سے سختی سے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"وہ مجھے چکمہ دے کر نکل گیا۔ میری ناک کے نیچے وہ میرے کمرے میں گھسا اور۔۔۔" اس نے غصے سے کہتے کاؤچ کو ٹھوکر ماری۔ خاور کمرے کی ہر شے چیک کر رہا تھا۔ کمروں کے اندر کیمرے نہیں تھے' سو اس کے آنے کا مقصد واضح نہ تھا۔

"مگر وہ اندر کیوں آیا تھا؟" نوشیرواں ہکا بکا رہ گیا' پھر حیرت کی جگہ طیش نے لی۔

"میں اس کو چھوڑوں گا نہیں' اس کی اتنی ہمت۔" وہ غصے سے کھولتا دروازے کی طرف بڑھا۔ ہاشم نے بازو سے پکڑ کر اسے روکا۔

"چپ کرو۔۔۔ فارس اور تم میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اس کی طرح ہر وقت ہاتھ کی زبان مت استعمال کیا کرو۔"

"مگر سر! وہ اندر کیوں آیا تھا؟"

"کچھ لینے آیا تھا یا کچھ رکھنے۔ پورے کمرے کو ڈی بگ کرو' مائیکرو فون' کیمرہ سب ڈھونڈو۔۔۔ اگر وہ جاسوس ہے تو اب تحمل سے تماشا دیکھے گا اور اگر وہ چور ہے اور کچھ چرایا ہے تو سب سے پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔" ہاشم تیز تیز چیزیں الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ ڈسٹرب تھا۔ غصے میں تھا۔ مگر ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ جیسے ہی ایگزٹ پہ پہنچے' تم اسے روکو گے۔ مجھے ایسے مت دیکھو۔ جو کہہ رہا ہوں' وہ کرو۔" خاور کو جھڑک کر وہ کہنے لگا۔

"اور ڈی اے؟"

"بھاڑ میں گئی ڈی اے۔"

وہ باہر آیا تو فیٹونا ٹرے اٹھائے جا رہی تھی۔

"میری اینجیو Angio سے نیکلس لے کر ممی نے کہاں پھینکا تھا؟" وہ اس کا راستہ روک کر بولا۔

فیٹونا یکدم رک گئی۔

"اسی گملے میں' کسی نوکر کی ہمت نہیں ہوئی کہ۔۔۔"

"میرا ایک کام کرو۔" وہ جلدی جلدی اسے سمجھا رہا تھا۔ فیٹونا سر ہلاتی الرٹ سی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی' جس پہ پسینہ تھا اور رنگ بھی زرد تھا۔ ہاشم ٹھیک نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ہم گھوم پھر کے کوچہ قاتل سے آئے ہیں

"بس اب گھر جا رہے ہیں۔" دونوں کو ساتھ لے کر لان کی طرف جاتے سعدی نے بتایا۔ تب ہی پیچھے سے آتی ملازمہ اس سے ٹکرا گئی۔ ٹرے گری' برتن بکھر گئے۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ سوری۔۔۔ پلیز۔" فیٹونا بوکھلاتے ہوئے معذرت کرتی برتن سمیٹنے لگی۔ سعدی نے "اٹس اوکے" کہہ کر کوٹ ذرا سا جھاڑا اور آگے بڑھ گیا۔

"ابھی چلے جائیں؟ مگر ابھی تو کھانا بھی نہیں لگا؟" حنین نے لان میں اپنی میز تک آکر دبا دبا سا احتجاج کیا۔ سیم خاموش رہا' وہ دونوں وجہ سے لاعلم تھے' مگر لاؤنج کا جھگڑا دیکھ چکے تھے۔

"کھانا کسی اچھے ریسٹورنٹ سے کھائیں گے۔ بس چلو یہاں سے۔" سعدی نے زمر کو دیکھا۔ وہ اکیلی کھڑی تھی اور وہ جلد بھلا دینے والوں میں سے کبھی نہیں تھی۔ سو فوراً" راضی ہو گئی۔ وہ اس ماحول سے فرار چاہتی تھی۔

"ہاں چلو۔۔۔ بڑے ابا نے بھی جلد آنے کو کہا تھا۔" جواہرات سے اسی نے اجازت لی۔ اس کے اصرار

اور حیرت کے باوجود۔ وہ واپس آئی اور چلنے کا اشارہ کیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں پہ کھڑا ہاشم ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔ کان کا آلہ انگلی سے دبایا۔ "اس کو بغیر تلاشی کے مت جانے دینا۔" وہ دھیرے سے بولا تھا۔

"راجر سر!" ایگزٹ پہ سوٹڈ بوٹڈ کھڑے خاور نے سن کر سر ہلایا' پھر ان کی طرف مڑا جو زمر کے پیچھے چلے آرہے تھے۔ زمر سنجیدگی سے آگے بڑھ جاتی' مگر خاور نے کھنکھار کر متوجہ کیا۔

"میم۔۔۔ سر۔۔۔ ذرا زحمت ہو گی آپ کو۔۔۔ پلیز۔۔۔" زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ سعدی کا حلق خشک ہوا' گڑبڑ۔۔۔

"کیا ہوا؟"

"دراصل۔۔۔ مسز جواہرات کا نیکلیس چوری ہو گیا ہے اور۔۔۔" خاور کی سمجھ میں نہیں آیا وہ ڈی اے (ڈسٹرکٹ اٹارنی) سے کیا کہے' مگر ڈی اے کو ادھورے فقرے سمجھنے میں دیر نہیں لگتی تھی۔

"اچھا۔۔۔ مسز جواہرات کا نیکلیس چوری ہوا ہے اور اب آپ ہماری تلاشی لینا چاہتے ہیں؟"

"نہیں میم۔۔۔ دراصل۔۔۔ جو لوگ گھر کے اندر گئے تھے' ان کو۔۔۔"

"مگر ہم تو ہاتھ دھونے گئے تھے۔" حنین نے ایک دم روہانسی ہو کر کہا۔ خاور نے بات سنبھالنی چاہی' مگر زمر کے تو سر پہ لگ چکی تھی۔

"اچھا! آپ کا مطلب ہے کہ میرے بچے چور ہیں؟"

"میم۔۔۔ سعدی صاحب اندر گئے تھے تو میرے پاس فونیج۔۔۔"

"ایک منٹ پہلے حنین اور سیم چور تھے۔ اب سعدی ہو گیا اور اگلے منٹ میں' میں ہوں گی؟ اور اب آپ یہاں ہمیں چوروں کی طرح لائن میں کھڑا کر کے ہماری تلاشی لینا چاہتے ہیں؟" وہ سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔۔۔ آپ کی نہیں۔"

"میری فیملی کے بچے ہیں یہ۔۔۔ ان کی تلاشی لینے

سے پہلے آپ کو میری تلاشی لینا ہوگی۔ مگر اس اندھیرے کونے میں نہیں' وہاں ان ڈھائی سو مہمانوں کے سامنے دوں گی میں تلاشی' تاکہ ان کو بھی پتا چلے کہ آپ لوگ عزت سے بلا کر عزت سے کیسے رخصت کرتے ہیں۔" صورت حال بگڑ گئی تھی۔

ہاشم اچنبھے سے ان کو دیکھتا اس طرف آرہا تھا۔

"زمر۔۔۔! سعدی۔۔۔! کھانا لگنے والا ہے۔ آپ لوگ اتنی جلدی کیسے جارہے ہیں؟" زمر نے چہرہ گھما کر تیکھی نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔

"میں بہت زیادہ سراہوں گی اس بات کو ہاشم! اگر آپ اپنی اداکاری پس پشت ڈال دیں' کیونکہ میں نہیں مان سکتی کہ آپ کا گارڈ آپ کے کہے بغیر ہمیں یوں روک سکتا ہے۔"

"مگر۔۔۔ کیا ہوا ہے؟ خاور؟" ہاشم نے حیرت اور الجھن سے خاور کو دیکھا جو نفی میں سر ہلاتا کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

"آپ کی ممی کا نیکلس چوری ہوا ہے۔ ہماری تلاشی لینی ہے۔" حنین نے بے بسی سے کہا۔

"تلاشی۔۔۔ واٹ؟" ہاشم نے بے یقینی سے خاور کو دیکھا۔ سعدی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اب قدرے اطمینان سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ خاور اس کے مکرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

"سر! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"یہ میرے مہمان ہیں خاور!" وہ دبا دبا سا اس پہ برسا۔ زمر نے سر جھٹکا۔

"اپنی وضاحتیں محفوظ رکھیں ہاشم! آپ میرے بھتیجے کو فارس کا بھانجا ہونے کی سزا نہیں دے سکتے۔"

سعدی نے چونک کر اسے دیکھا اور ہاشم نے بھی۔

زمر نے اچٹتی نگاہ اس پہ ڈالی۔

"نہ میں آج پیدا ہوئی ہوں' نہ آپ۔۔۔ سعدی' فارس کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ سو جب وہ رہا ہوا تو اتنے عرصے بعد آپ کو سعدی کو انوائٹ کرنے کا خیال آگیا۔ آپ کو جاننا تھا کہ فارس کیسے رہا ہوا یا پھر سعدی کو اس بات کی سزا دینی تھی' مقصد جو بھی تھا' آپ میرے بھتیجے کو یوں بے عزت نہیں کرسکتے۔ آپ کے اور فارس کے خاندانی جھگڑوں سے ہمارا تعلق نہیں ہے۔"

"میری بالکل سمجھ میں نہیں آرہا' یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"میں کچھ نہیں سمجھ رہی ہوں' چلو۔"

زمر کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ حنین اور سیم جھٹ پیچھے ہولیے۔ سعدی آخر میں نکلا اور پھر مڑ کر ہاشم کو دیکھا۔ ہاشم بالکل بدلی ہوئی نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

سعدی جلدی سے پلٹ گیا۔

"سر۔۔۔!" خاور نے بے بسی سے اسے جاتے دیکھا جو یقیناً "کچھ" لے کر گیا تھا۔

"جانے دو اسے۔ آج جانے دو۔" وہ کڑواہٹ سے کہتا پلٹ گیا۔ پیچھے کھڑے نوشیرواں نے تلملاہٹ سے یہ سب دیکھا تھا۔

"آپ اس کی پھپھو سے ڈر گئے؟ اس کو کیوں جانے دیا؟"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ آگے موقع آئے گا۔"

"اور اس کو بتایا کیوں نہیں کہ اس کی بہن نے صبح کیسے آپ سے مدد مانگی تھی؟" نوشیرواں اس کے ساتھ چلتا کھولن سے کہہ رہا تھا۔ اس کے دل میں سعدی کی رقابت کے انگارے دہکنا کم نہیں ہوئے تھے۔

"بتاؤں گا' جب اس کے منہ پہ تھپڑ مارنا ہوگا تب بتاؤں گا۔" وہ تلخی سے بڑبڑاتا آگے بڑھ رہا تھا۔

"مگر بھائی۔۔۔"

"مہمانوں سے بھرا پڑا ہے گھر' میں کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتا ابھی۔" اس نے ساری بات ہی ختم کردی۔ نوشیرواں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

اپنے ہی ہوتے ہیں جو دل پہ وار کرتے ہیں محسن
غیروں کو کیا خبر دل کس بات پہ دکھتا ہے

سڑک تاریک تھی۔ مگر سنسان نہیں۔ ٹریفک چل رہا تھا۔ سعدی خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا اور سیم پچھلی سیٹ پہ آنکھیں موندے پڑا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ ہاشم اس حد تک جاسکتا ہے۔" زمر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی تلخی سے بولی تھی۔ بھنویں ابھی تک ناراضی سے بھنچی تھیں۔

"پھپھو۔۔۔ ان کے گارڈ کی غلطی ہے۔ ان کو بلیم مت کریں۔ اس سب میں ہاشم بھائی کا کوئی قصور نہیں ہے۔" پیچھے بیٹھی حنین تیزی سے آگے ہوئی۔

"حنین! ملازم' مالک کے اشارے کے بغیر اتنا بڑا کام نہیں کیا کرتے اور ہاشم کے ملازم تو کبھی بھی نہیں۔"

"پھپھو ٹھیک کہہ رہی ہیں ہاشم بھائی ہمیں بے عزت کرنا چاہتے تھے۔" سعدی نے کہتے ہوئے کار روکی۔

"میرا ریسٹورنٹ جانے کا دل نہیں ہے سعدی! کچھ ٹیک اوے کرلیتے ہیں۔" زمر اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

سعدی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حنین کو اشارہ کیا کہ وہ پچھلی سیٹ پہ پڑے اس کے کوٹ سے والٹ نکال دے۔ ادھر حنین نے کوٹ اٹھایا' ادھر زمر نے پرس کھولا۔

"پھپھو! میں دے رہا ہوں نا۔" سعدی خفا ہوا۔

"ایک ہی بات ہے۔"

"پرس بند کریں پھپھو! میں دے رہا ہوں۔ حنہ! والٹ دو میرا!" اب کے سعدی کو درشتی سے کہنا پڑا' کیونکہ حنین والٹ نہیں دے رہی تھی۔ حنین نے والٹ نکالا بھی نہیں تھا۔ اس نے کچھ اور نکالا تھا۔

کسی احساس کے تحت زمر اور سعدی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دو انگلیوں میں جگمگاتا نیکلس اٹھائے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ زمر کی نگاہیں وہیں ٹھہر گئیں۔ سانس رک گیا اور سعدی کو تو اپنے اردگرد ہر آواز آنا بند ہوچکی تھی۔

"یہ۔۔۔ کوٹ میں تھا۔" حنین نے الجھن و پریشانی سے ان دونوں کو دیکھا۔

"یہ مسز کاردار کا ہے۔ میں اسے پہچانتی ہوں۔" سرد آواز میں وہ بولی اور ان ہی برفیلی نظروں سے سعدی کو دیکھا۔

"یہ ادھر کیسے۔۔۔؟" اور تب ہی حیران' پریشان سعدی یوسف نے چونک کر زمر کے تاثرات دیکھے۔

"نہیں پھپھو! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"سعدی! گاڑی چلاؤ۔" وہ سیدھی ہوگئی۔ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"پھپھو! آپ کو لگتا ہے کہ یہ میں نے چرایا ہے؟ میں چور ہوں؟" ہکا بکا سعدی کا تو جیسے دل ہی ٹوٹ گیا۔

"سعدی! گاڑی چلاؤ۔"

"یہ ہاشم نے مجھ پہ پلانٹ کیا ہے۔ اس نے مجھے سیٹ اپ کیا ہے۔ میں آپ کو سب بتاؤں گا' مگر مجھ پہ اعتبار تو کریں۔"

"اعتبار؟" زمر نے دکھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "اور اگر وہاں تمہاری تلاشی لی جاتی اور یہ تمہارے پاس سے نکلتا تو کیا میں اس شہر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہتی سعدی؟ میں نے تمہیں یہ سب نہیں سکھایا تھا۔ تم وہ سعدی نہیں ہو جس کو میں جانتی تھی۔"

سعدی نے بے بسی سے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مارا۔

"میں نے اگر یہ چرایا ہوتا تو کیا کوٹ اتار کر یوں پھینک دیتا؟ میں ایسا کرسکتا ہوں کیا؟"

"بھائی چوری نہیں کرسکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ کسی نے بھائی کی جیب میں ڈالا ہوگا۔" حنین سے مزید برداشت نہیں ہوا تھا۔

"کسی نے نہیں' ہاشم نے' یہ سب اس کا کیا دھرا ہے۔"

"سعدی! مجھے گھر ڈراپ کردو' ابھی اور اسی وقت۔" وہ رخ موڑ کر شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب کہ آپ کو ڈراپ کردوں؟ آپ مجھے اتنے کرائسز میں یوں چھوڑ کر نہیں جاسکتیں زمر۔"

جذبات کی انتہا تھی کہ اس کے لبوں سے "زمر" نکلا۔ وہ جو اکیس برس "زمر" رہی تھی اور پچھلے چار سال کی سرد مہری کی دیوار کے بعد "پھپھو" بنی تھی۔ اس کو یہ لفظ چابک کی طرح لگا۔ بہت تڑپ کر اس نے

سلگتی نظروں سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔

"اور میرے کرانسز میں تم میرے ساتھ تھے؟ یہ تو ایک چوری ہے' تم اچھا وکیل کرلو تو دنیا کی کسی بھی عدالت میں خود کو بے گناہ ثابت کروالوگے' یہ کرانسز نہیں ہے۔ کرانسز وہ تھا جس میں تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ تمہیں پتا ہے سعدی! جب کسی کی کمر چیر کر گردہ نکالا جائے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے؟ تم کبھی بھی وہ تکلیف نہیں سمجھ سکتے اور بات کرتے ہو کرانسز کی؟"

سعدی بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ حنین کو لگا وہ نیلا پڑ جائے گا۔ مگر وہ نہیں پڑا۔ ہر زہر نیلا نہیں کرتا۔

"آپ نے آج کہہ ہی دیا۔"

زمر نے سر جھٹک کر رخ موڑ لیا۔ اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ پڑ رہی تھیں۔

"ڈراپ می!" اس کو دیکھے بنا دو لفظ بولے۔ حنین بس اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سر ہلا کر کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ میں آپ کے پاس نہیں تھا۔ میرا ٹیسٹ تھا پھپھو! اور میں فیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔"

حنین کو لگا' سعدی کی آنکھوں میں آنسو ہیں یا شاید اس کی اپنی آنکھیں نم تھیں۔ وہ دل گرفتہ سی پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

"اٹس اوکے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

زمر نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ گھر آیا تو وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی اور امی البتہ اتنی خاموشی سے آکر نہیں بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس سوال تھے' کیا رہا؟ کون کون ملا' کھانے میں کیا تھا؟ مگر حنین اور سعدی کے پاس ان کے جواب نہ تھے۔

سعدی نے حنین کو پہلے ہی کچھ بتانے سے منع کر دیا تھا کہ امی دل کی مریض تھیں۔

سیم دنیا و مافیہا سے بے خبر نیم دراز سو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان کے جلووں کو زندگی کہہ کر
اپنی نظر کا وقار کھو بیٹھے

کنٹرول روم میں اندھیرا تھا۔ صرف بڑی اسکرینز کی روشنیاں ان کے چہروں کو چمکا رہی تھیں۔ ہاشم ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' مٹھی لبوں پہ رکھے' پارٹی کی فوٹیج دیکھ رہا تھا۔ نوشیرواں جیبوں میں ہاتھ ڈالے دیوار کے ساتھ کھڑا تھا اور جواہرات بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔

خاور کنٹرول پہ بٹن دبا تا ویڈیوز آگے پیچھے کر رہا تھا۔

"سارا گھر ڈی بگ کروالیا ہے' اس نے کچھ نہیں رکھا۔ میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہاری پوری فوج کی موجودگی میں وہ ہاشم کے کمرے میں داخل کیسے ہوا؟" وہ ضبط کھو کر خاور پہ برس پڑی۔

"اس نے کچھ نہیں رکھا' وہ کچھ لے کر گیا ہے۔" ہاشم غور سے اسکرین کو دیکھتے ہوئے۔

"اور ڈی اے اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی؟"

نوشیرواں کو اپنے علاوہ ہر ایک پہ شک تھا۔

"ناممکن۔" پھر ایک دم ہاشم سیدھا ہوا۔

"اسے۔ اسے پیچھے کرو۔"

خاور نے ریوائنڈ کیا۔ کیک ٹیبل پہ شہرین کیک کاٹ رہی تھی۔ پھر اس نے سونیا کی پلیٹ سے دل نکال کر ایک ڈش پہ رکھا' اب وہ فینونا سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر فینونا ڈش اٹھائے سعدی کی ٹیبل تک گئی۔ نظروں کے تبادلے۔ ہاشم کے لب بھنچ گئے۔

"یہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟" جواہرات کو حیرت ہوئی۔ حالانکہ وہ اس کے سامنے کئی دفعہ ملے تھے۔

"وہ اتنے سال میری بیوی رہی ہے اور سعدی' فارس کا بھانجا ہے۔ وہ یقینا" ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" ہاشم اکتا کر بولا' نگاہیں ابھی تک ان پہ تھیں۔

"اس دل پہ سونیا لکھا ہوا تھا نا؟ اس نے یہ سعدی کو کیوں بھجوایا؟"

"یوں ہی مہمان نوازی کر رہی ہوگی۔" نوشیرواں نے حمایت کرنے کی سعی کی' جواہرات نے خاموشی سے اسے گھورا۔ وہ چپ ہو گیا۔

ہاشم ایک دم اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ بمشکل ایک منٹ بعد وہ اسی طرح واپس آیا۔

"خاور! باہر جاؤ۔" تحکم سے کہا تو خاور فورا" باہر نکل گیا۔

"میرا لیپ ٹاپ باہر کیوں نکلا پڑا ہے۔ کس نے نکالا تھا؟" پھر اس نے چونک کر نوشیرواں کو دیکھا۔ "تمہیں میرا پاس ورڈ کیوں چاہیے تھا؟"

"وہ۔ شہری کو آپ کے ہنی مون کی پکچرز۔"

"تم نے اس کے سامنے میرا پاس ورڈ ڈالا؟" وہ غیظ و غضب سے غراتا اس کے سر پہ پہنچا۔ نوشیرواں نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"جی مگر۔"

"اس مطلب پرست عورت کے پاس سب تصویریں ہیں' اس نے تمہیں استعمال کیا میرا پاس ورڈ لینے کے لیے اور یہ۔ یہ تمہاری شہری نے اس گھٹیا آدمی کو میرا پاس ورڈ دے دیا۔ یہ۔" وہ ہذیانی انداز میں چلا' تا اسکرین کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"نہیں۔ شہری ایسے نہیں کر سکتی۔" نوشیرواں شاکڈ تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے۔ کیوں چھوڑا تھا میں نے اسے؟ وہ ایک مطلب پرست عورت ہے۔ مکار اور خود غرض۔ اس نے سعدی کے لیے تمہیں استعمال کیا اور اس نے پتا نہیں میرا کمپیوٹر کھول کر کیا' کیا دیکھا ہوگا۔" ہاشم کا سر چکرا کر رہ گیا۔

"شہری ایسے نہیں کر سکتی بھائی! آپ کو۔"

"بکواس بند کرو!" ہاشم نے اسے گریبان سے پکڑ کر دیوار سے لگایا اور سرخ پڑتی آنکھیں اس کی ششدر آنکھوں میں گویا گاڑ کر بولا۔ "میں نے اگر کسی چیز کو اگنور کیا ہے تو اس لیے کہ شاید تمہیں خود ہی عقل آجائے۔ وہ تم سے شادی کرے یا کسی سے بھی' مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا' لیکن اچھا ہوگا اگر تم خود اس بے وقوفوں کی جنت سے باہر نکل آؤ۔"

جھٹکے سے اس نے دم بخود کھڑے نوشیرواں کا گریبان چھوڑا' پھر بالوں میں ہاتھ پھیرتا' چلتا ہوا خود کو پرسکون کرنے لگا۔ جواہرات اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔

"وہ جانتی ہے تم اسے پسند کرتے ہو۔" اب کے وہ بولا تو لہجہ نسبتا" نرم تھا۔ "اور وہ اتنی خود غرض ہے کہ تمہیں دھوکا دینے میں اس نے لمحہ نہیں لگایا اور وہ بھی اس سعدی کے لیے۔ پتا نہیں اس نے تیرہ چودہ منٹ میں کیا' کیا دیکھا ہوگا؟" وہ تھک ہار کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔ جواہرات نے احتیاط سے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"تم نے۔ اتنے اہم ڈاکومنٹس لیپ ٹاپ میں کیوں رکھے تھے؟"

"اچھا اب میں اپنی رگوں سے خون بھی نکال لوں اس ڈر سے کہ کوئی خنجر نہ گھونپ دے؟ اور بہت کم ڈاکومنٹس ہیں لیپ ٹاپ میں اور وہ بھی سیکورٹی کی تہوں میں۔"

نوشیرواں نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ اسے یقین آگیا تھا اور اسی لیے اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ جواہرات نے اس کی کہنی کو نرمی سے چھوا۔

"اس سب میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ وس' پندرہ منٹ میں وہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا۔"

ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "یہ تمہاری غلطی نہیں ہے شیرو! جاؤ جا کر سو جاؤ اور رہی شہرین تو تم اس سے کوئی رشتہ جوڑنا چاہتے ہو تو جوڑ لو' مجھے کوئی اعتراض نہیں' بس سوچ سمجھ کر کرنا جو بھی کرنا۔ جاؤ۔ شاباش' آرام کرو۔"

وہ بڑے بھائی سے باپ بننے میں دیر نہیں لگا تا تھا۔

"سوری بھائی۔" اس سے نگاہ ملائے بغیر شیرو نے بہت سی باتوں کی معذرت ایک ساتھ کی اور کمرے سے نکل گیا۔ جواہرات حیران نظروں سے ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو کیا لگا تھا؟ میں نہیں جانتا؟"

"مجھے یہ لگ رہا ہے کہ شاید میں ہی تمہیں نہیں جانتی۔" وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ مسکرائی' پھر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"وہ کل کا بچہ۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر

کچھ کیا بھی تو میرے پاس اس کا حل ہے۔ جاؤ چینج کرو اور سو جاؤ۔"

ہاشم نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

"تم حساب دو گے سعدی۔"

☆ ☆ ☆

وقت کی اپنی عدالت بھی ہوا کرتی ہے
آج اس شہر میں قانون تمہارا ہی سہی

اور درد تو سعدی کے سر میں بھی ہو رہا تھا۔ مگر اس کو محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اندھیرے کمرے میں اس کا صرف لیپ ٹاپ آن تھا اور وہ آنکھیں سکیڑے ایک کے بعد ایک فائل کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب کوڈڈ تھا۔

جواہرات کے طنز، نوشیرواں کا تھپڑ، ہاشم کا جال اور زمر کی باتیں، سب اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہا تھا، مگر وہ ہر شے کو جھٹک کر صرف اپنی فلیش کی طرف متوجہ تھا جو بروقت "سو فیصد" کاپی کر چکی تھی۔ مگر اندر موجود فائلز ڈی کوڈ کرنے میں بہت وقت درکار تھا۔

"آپ حساب دیں گے ہاشم بھائی۔ میرے خاندان کو تباہ کرنے کا حساب آپ ضرور دیں گے۔" وہ خود سے بولا تو آنکھوں میں کرب اتر آیا۔

☆ ☆ ☆

سب نے ملائے ہاتھ یہاں تیرگی کے ساتھ
کتنا برا مذاق ہوا روشنی کے ساتھ

اتوار کو سوائے سورج کے، سب کچھ ہی سستی سے طلوع ہوا تھا۔ زمر فجر کے بعد سوئی تو پھر دیر سے اٹھی اور اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ تھیں۔ گھنگھریالے بال ہاتھوں سے سمیٹتے وہ سرہانے پڑے فون کی طرف متوجہ ہوئی جو بجے جا رہا تھا۔ گہری سانس لے کر اس نے کال لے لی۔

"کہیے ہاشم!"

وہ جو اپنے گھر کے اندرونی جم میں ٹریڈ مل پہ بھاگ رہا تھا۔ بے اختیار رکا۔ ہینڈز فری کان میں پکا کیا اور تولیے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے بولا۔

"میں اپنے ملازم کی بے وقوفی پہ معذرت کرنا چاہتا ہوں۔ جو ہوا اس میں میرا قصور نہیں تھا۔"

زمر کی آنکھیں پھر سے جلنے لگیں۔ سعدی کا آخری چہرہ یاد آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کو پالا تھا، بڑا کیا تھا، اس کو دکھ میں دیکھ کر دکھ بڑھ جاتا تھا، ایک غلطی پہ اتنا تو نہ سناتی۔

وہ خاموش رہی۔

ہاشم نے تولیے سے گردن کی پشت رگڑتے ہوئے دوبارہ کہا۔ "اور میں کسی بھی ایسے واقعے کی وجہ سے اپنے اور آپ کے ورکنگ ریلیشن شپ کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

پھر جوس کی بوتل اٹھائی اور منہ سے لگائی۔ تمتماتے چہرے پہ تناؤ تھا، احتیاط تھی۔

زمر نے پیر بیڈ سے اتارے، فون کندھے اور کان کے درمیان رکھا، پونی میں بال جکڑے۔

"میرا اور آپ کا ورکنگ ریلیشن شپ ون ٹو تھری پہ مبنی ہے ہاشم!" "ون، ہم ایک دوسرے کو اچھے سے جانتے ہیں۔ ٹو، ہم ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے اور تھری، اس سب کے باوجود ہم بہت عزت سے ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔ سو اس تعلق کو قائم رکھنے کے لیے بہتر ہے کہ ہم ظاہر کریں کل کچھ بھی نہیں ہوا۔" چپل پہن کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"درست!" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"مسز جواہرات کا نیکلس مل گیا؟" اس نے ذرا ٹھہر کر پوچھا۔

اور ہاشم کی آنکھوں میں بہت کچھ سمجھتی ہوئی مسکراہٹ اتری۔

"میری طرف سے وہ نیکلیس جہنم میں جائے۔"

"گڈ۔" زمر نے فون بند کیا تو وہ مسکراتے ہوئے مڑا۔ نوشیرواں جم میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ رات والے لباس میں تھا۔ بکھرا، مضمحل، جبکہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس ہاشم کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ایک پرسکون نیند کے بعد جاگا ہے۔

"بھائی! مجھے معاف کردیں۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" وہ قریب آیا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہاشم نے ہینڈز فری کان سے نکالتے ہوئے نرمی سے اسے دیکھا۔

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ شہری نے تمہیں یوز (استعمال) کیا ہے۔"

یہ نام سن کر نوشیرواں کی آنکھوں میں ملال ابھرا۔ اس کی چوٹ "صدمے" سے "غم" کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اس سے اگلا مرحلہ غصہ اور پھر انتقام تھا۔

"وہ مجھے یوں ایکسپلائٹ کرے گی، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔" وہ ایک دن میں جمع تعظیم کے صیغے سے واحد غیر تعظیم پہ گرا دی گئی تھی۔

"یہ بات تمہیں مجھ سے نہیں، اس سے کہنی چاہیے۔ میں سونیا کو ڈراپ کرنے ادھر جا رہا ہوں۔ چینج کرو اور میرے ساتھ آؤ۔" ہاشم نے اس کا کندھا تھپکا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر بڑے بھائی کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔

"اور وہ سعدی، اس کی کیا سزا ہو گی؟"

"اس کی سزا شروع ہو چکی ہے۔ وہ پکڑا گیا ہے۔ زمر نے نیکلس اس کی جیب سے برآمد کر لیا ہے۔ ابھی کال کی تھی اس کو۔"

"ڈی اے ڈسٹرکٹ اٹارنی نے خود بتایا؟" وہ حیران ہوا۔

"اس کے لہجے نے بتایا۔ یعنی کہ سعدی اپنا اعتماد کھو چکا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔" نوشیرواں کے شانے کو تھپتھپا کر وہ آگے بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

خوشی کی بات نہیں ہے کوئی فسانے میں
وگرنہ عذر نہ تھا آپ کو سنانے میں

زمر کال ختم کر کے باہر آئی تو بڑے ابا لاؤنج میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سامنے والے صوفے پہ آ بیٹھی۔ بڑے ابا نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک گلابی پڑ رہی تھی۔ صداقت نے چائے لا کر رکھی تو وہ سر جھکائے چینی ملانے لگی۔

"پارٹی کیسی رہی؟ تم رات بنا بات کیے اندر چلی گئی تھیں۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کے پوتے یا پوتی نے سویرے ہی فون کر کے ساری بات نہیں بتائی؟" اس کی آواز بھاری تھی۔ شاید وہ رات کو روئی تھی۔ وہ کسی کے سامنے نہیں روتی تھی۔ وہ مضبوط تھی۔ بڑے ابا کو ہر مضبوط انسان پہ اب ترس آتا تھا۔

"حنین نے بتایا ہے سب، مگر میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

زمر کپ لبوں سے لگا کر ٹی وی کی سمت دیکھنے لگی۔ اس کا رنگین شور جاری تھا۔ لاؤنج میں پھر بھی خاموشی محسوس ہوتی تھی۔ دونوں منتظر تھے۔ پھر وہی بول اٹھی۔

"اس کو پیسے چاہیے تھے تو مجھ سے مانگتا، کوئی مسئلہ تھا تو مجھے بتاتا... مگر..." شدت ضبط سے آنکھوں میں گلابی لکیریں ابھرنے لگیں۔

"تمہیں لگتا ہے، اس نے چوری کی ہے؟"

"وہ نیکلیس اس کے پاس سے ملا ہے۔ وہ اندر کمروں میں بھی گیا تھا، وہ اسی لیے آنے پہ راضی ہوا تھا کہ پارٹی گھر پہ ہے، ورنہ پہلے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجھے اس کے بعد کیا لگنا چاہیے، سوائے اس کے کہ اس نے مجھے دھوکا دیا۔"

بڑے ابا تھک کر اثبات میں سر ہلانے لگے۔ "ہاں وہ بڑا ہو گیا ہے، دھوکے دینے لگ گیا ہے۔ فریب کار بن گیا ہے۔ ایسا ہی ہے بالکل۔"

زمر کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا۔ "فریبی؟ اور سعدی؟" کچھ اندر تڑپا تھا۔

"ایسے مت کہیں، طنز میں بھی نہیں۔"

"نہیں... طنز نہیں، سچ ہے یہ، وہ کتنے آرام سے سب کو دھوکا دے دیتا ہے نا اور تمہیں تو پہلی دفعہ دھوکا

"نہیں دیا اس نے۔"

وہ جو دو انگلیوں سے کنپٹی مسل رہی تھی۔ چونک کر ان کو دیکھنے لگی۔

"کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟"

"وہ دھوکے باز ہے' اس سے فریب کی ہی توقع کرو زمر!" ان کی آواز بلند ہونے لگی۔ الفاظ کی نسبت لہجہ مختلف تھا۔ عجیب تھا' چونکا دینے والا تھا۔

"مت کہیں' کچھ مت کہیں۔" اور وہ متوحش ہو کر ان کو روکنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔

"تم نے اس سے کہا۔ وہ تمہاری تکلیف نہیں سمجھ سکتا' ظاہر ہے' وہ کیسے سمجھ سکتا ہے' اس نے تو تب بھی تمہیں دھوکا ہی دیا تھا۔"

زمر کے لب ادھ کھلے رہ گئے۔ ٹوٹے کانچ سے اس کا دل زخمی کیا جا رہا تھا۔ بڑے ابا اپنی جگہ سے آگے ہوئے' ذرا جھکے' زمر کی آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگے۔

"یاد ہے وہ یورپین عورت جس نے تمہیں گردہ دیا تھا؟"

زمر نے سر بھی اثبات میں نہ ہلایا۔ وہ بس ان کو دیکھ رہی تھی۔

"زمر! اس عورت نے گردہ نہیں دیا تھا۔ تمہیں وہ گردہ سعدی نے دیا تھا۔"

وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔۔۔ پھر مڑی' کھڑکی کے پٹ زور سے دھکیلے۔ تازہ ہوا میں دمے کی مریض کی طرح منہ کھول کر' آنکھیں بند کر کے سانس لینے کی کوشش کی۔

"وہ لڑکا کتنا جھوٹا ہے نا' اس نے تم سے جھوٹ بولا' دھوکا دیا' سب اس نے پلان کیا تھا۔ اس کا خون' گردہ' سب تمہارے جیسا تھا۔ مگر دل تم سے بڑا تھا۔ وہ کہتا تھا' یہ میرا ٹیسٹ ہے' میں تیمارداری کر کے نمبر بنا لوں یا پڑھائی کے بہانے' نظروں سے غائب ہو کر' اپنا فرض ادا کروں اور اگر برا بنتا ہوں تو بن جاؤں' مگر اس ٹیسٹ میں فیل نہیں ہونا چاہیے مجھے۔ کمر کو کاٹ کر گردہ نکالنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔ زمر! اس کو پتا ہے' وہ لڑکا آج ایک گردے پہ ہے۔ وہ چار سال سے ایک گردے پہ ہے۔ جب تم ہسپتال میں تھیں تو وہ بھی قریبی کمرے میں ایڈمٹ تھا۔ مگر اسے تو ہمدردی بھی نہیں ملی۔ وہ چار سال سے خاموشی سے تمہاری سرد مہری برداشت کرتا آ رہا ہے اور تم کہتی ہو وہ تمہاری تکلیف نہیں سمجھتا؟"

اس نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ اس کا رنگ سفید پڑ رہا تھا۔ شاید اب وہ نیلی پڑنے والی تھی۔ صرف دمے سے ہی رنگ نیلا نہیں پڑا کرتا۔

"مجھے۔۔۔ کیوں نہیں بتایا؟" رک رک کر الفاظ نکلے۔ اس سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ وہ کھڑکی کو پکڑے کھڑی تھی۔ گھٹن سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"بہت خوددار ہے میرا بیٹا' زمر! میں نے کتنی منت کی تھی اس کی۔ مگر وہ کہتا تھا۔ اگر پھپھو کو پتا چلا کہ یہ میرا گردہ ہے تو وہ کبھی نہیں لیں گی۔ پھپھو مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں' میں ان کا بھائی بھی ہوں' دوست بھی' بیٹا بھی' مجھے تکلیف سے نہیں گزار سکتیں۔ ایسے وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوں گی۔ میں آج بھی نہ بتاتا' اگر تم رات اس کو یہ نہ جتاتیں۔"

اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ گردہ کٹنے کی تکلیف زیادہ بڑی تھی یا دل کٹنے کی؟ اس سوال کو کسی جواب کی ضرورت ہی نہ تھی۔

وہ پژمردہ' نحیف سے چہرے کے ساتھ اس کی پشت دیکھ رہے تھے۔

"اگر آج تمہارے پاس ایک گردہ ہے' تو اس کی وجہ سعدی ہے۔"

وہ دھیرے سے پلٹی۔ اس کی آنکھوں کی گلابی لکیریں' سرخ پڑ چکی تھیں۔ شاید ان میں نمی بھی تھی۔ بھلے وہ انہیں نہ گرنے دے' مگر وہ بہرحال آنسو تھے۔

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آج اس کے پاس

ایک گردہ ہے تو اس کی وجہ میں ہوں؟"

اور یہ سوال نہیں تھا۔ سو اس کا کوئی جواب بھی نہ تھا۔ وہ نم آنکھوں سے اس کو دیکھتے رہے۔ جواب کا انتظار اسے بھی نہ تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

کھڑکی اب پوری کھل چکی تھی اور تازہ ہوا بہت امید افزا تھی۔

☆ ☆ ☆

الفت کے سودے کون کرے' نفرت کی جھولی کون بھرے
ہم کاروباری دنیا میں بیگانے ہی بیگانے ہیں

سیاہ بی ایم ڈبلیو اس بنگلے کے پورچ میں رکی۔ شوفر نے فوراً" دروازہ کھولا۔ ہاشم باہر نکلا اور سونیا کی انگلی پکڑے اسے بھی باہر لایا۔ پھر گلاسز اتار کر گریبان میں اٹکاتے ہوئے داخلی دروازے کو دیکھا' جہاں شہرین کھڑی تھی۔ وہ ابھی اٹھی تھی' مگر اب کٹ بال بالکل سیٹ تھے۔

"ہائے بابا!" سونیا سے ملنے کو وہ جھکا تو اس نے باپ کے دونوں گال چومے' پھر پیچھے اترتے نوشیرواں کو ہاتھ ہلایا۔

"ہائے شیرو!" وہ جو خشمگیں نگاہوں سے صرف شہرین کو دیکھ رہا تھا۔ بدقت مسکرا کر سر کو خم دیا۔ سونیا بھاگتی ہوئی ماں کے گلے لگ گئی جو اس کے لیے جھکی تھی۔ ان دونوں سے قطعا" بے نیاز۔

"میرا بے بی!" آنکھیں موندے' بچی کو ساتھ لگائے وہ بڑبڑائی۔ ہاشم ایک ہاتھ جیب میں ڈالے مسکرا کر دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"بتایا ہے مجھے سونیا نے رستے میں کہ اسے کتنی خواہش تھی ہمارے ہنی مون کی تصاویر دیکھنے کی۔"

شہرین بے اختیار سیدھی ہوئی' نگاہیں پھسل کر خود کو چبھتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے شیرو پہ گئیں۔ اس کی گردن میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔

"تو۔۔۔؟" وہ بظاہر لاپروا تھی۔ سونیا کو سر کے اشارے سے اندر بھیجا۔

"تو تمہیں لگتا تھا کہ تم مجھے بے وقوف بنا لوگی؟" وہ مسکراتے ہوئے آگے آیا۔ اس کے بالکل مقابل کھڑا ہوا اور آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ اکتائی۔

"شہرین! انسان میں اتنے گٹس ہونے چاہئیں کہ اپنے عمل کی ذمہ داری لے۔ تم سے اچھا تو سعدی نکلا۔ وہ ہاتھ لگائے میرے گارڈ نے تو سب بک دیا کہ کس طرح تم نے اسے پاس ورڈ دیا اور ہاں' وہ بھی میری ہی بیٹی کے کیک پہ۔ تم اچھی جاسوس بن سکتی ہو ویسے۔ تم نے آئی ایس آئی کے لیے اپلائی کیوں نہیں کیا۔"

شہرین کے ابرو حیرت سے اٹھے۔ "سعدی نے۔۔۔؟"

"اوہ۔۔۔ تمہیں لگا تھا' وہ نہیں بتائے گا۔"

شہرین کی آنکھوں میں غصہ اور بے زاری ابھری۔

"میں تم سے اتنی اکتا چکی ہوں کہ تمہارے خلاف مدد مانگنے والے کو انکار نہیں کر سکتی اور کسی اچھے دوست کو تو بالکل نہیں۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا دوست۔۔۔ کیا تم نے نوٹ کیا؟" مڑے بغیر نوشیرواں سے سوال کیا۔"

اور اس کو دوسری دفعہ صدمہ ہوا تھا۔ ابھی تک امید تھی کہ شاید۔۔۔ مگر اب نہیں' غم غصے میں بدلنے لگا۔ وہ بھائی کے عقب سے نکل کر آگے آیا۔

"کیا تمہیں میں ہی ملا تھا استعمال کرنے کے لیے؟" بھنویں بھینچے وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔" وہ بھی اس لوزر سعدی کے لیے؟ اس کو تو میں چھوڑوں گا نہیں اور بدلہ تو میں تم سے بھی لوں گا۔"

گو کہ ہاشم یہی چاہتا تھا' مگر نوشیرواں کا پارہ کی طرح تیز چڑھتا غصہ قابو کرنے کے لیے اسے اس کی کہنی تھامنی پڑی۔ نوشیرواں سر جھٹک کر رخ موڑ گیا۔ شہرین بس ضبط سے ان دونوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

"آئندہ میرے خلاف کسی کی مدد کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ پھر تمہیں ساری زندگی اپنی بیٹی کی شکل

نہیں دیکھنے دوں گا اور اگر کوئی شک ہو تو پہلی قسط تم تین دن بعد تب دیکھو گی جب تم چھٹیوں پہ دبئی اکیلی جاؤ گی۔ سونیا کو اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ دو دن گزار لو اس کے ساتھ۔"

شہرین کے تاثرات بدلے' بے چینی' پریشانی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"ہاشم! سونیا میرے ساتھ جائے گی' یہی طے ہوا تھا۔

"طے کرنے والا میں تھا' منسوخ بھی میں کر رہا ہوں۔" مسکراہٹ غائب تھی اور وہ درشتی سے چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ "خلع کے وقت اپنی بیٹی میں نے تمہارے حوالے کی کہ تم ماں تھیں۔ مجھے تم پہ ترس آگیا تھا۔ سو میں نے تم پہ احسان کیا تھا۔ تب سے ہفتے میں دو دن اپنی بیٹی کو لے کر جاتا ہوں' باقی وہ تمہارے ساتھ رہتی ہے' تمہیں میری طرف سے کوئی پریشانی نہیں ملتی' اور اس سب کا صلہ تم نے میری پشت پہ وار کر کے دیا۔" اس کی آواز اونچی ہو رہی تھی۔ نوشیرواں اب ذرا کم غصے سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ اندر سے پریشانی بھی تھی' شہری بیٹی کے بغیر کیسے رہے گی؟

"میں سونیا کے بغیر کیسے رہوں گی؟ تم یہ نہیں کر سکتے۔" اس کا سارا طنطنہ جھاگ بن کر بیٹھ گیا۔

"یہ تو پہلے سوچنے والی بات تھی۔ دو دن گزارو' اور تیسرے دن میری بیٹی کو واپس چھوڑ جاؤ اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میری بیٹی کو میری مرضی کے بغیر تم دنیا کے کسی ملک لے جانا تو کیا' اس ملک سے بھی نہیں نکال سکتیں۔"

"اس نے صرف پاس ورڈ مانگا تھا۔ اسے وہ واپس چاہیے تھا جو تم نے اس سے لیا تھا۔ مجھے نہیں پتا' وہ کس چیز کی بات کر رہا تھا۔ تم میرے ساتھ یوں مت کرو ہاشم۔"

ہاشم چونکا' پھر سر جھٹکا۔ "نہیں پتا تھا تو اس کی مدد کیوں کی؟ تمہاری بیٹی کا باپ ہوں میں اور یہ تمہاری بیٹی کا چچا ہے جس کو تم نے یوز کیا۔ سو اب تم سونیا کو نہیں لے کر جا رہیں۔" قطعی انداز میں کہہ کر وہ مڑ گیا۔ دونوں تیز تیز کار تک واپس آئے۔ دروازے جھٹ کھولے گئے۔ شہری کھڑی رہی' بے بسی' پریشانی سے لب کاٹتی۔

"میں نے سعدی کو انڈر اسٹیمیٹ کیا تھا۔" ہاشم بیٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔ نوشیرواں نے بے اختیار اسے دیکھا۔

"مطلب؟"

"کیا تم سن نہیں رہے تھے؟ اسے وہ چاہیے تھا جو میں نے اس سے لیا تھا۔ وارث کے لیپ ٹاپ کے ڈاکومنٹس' وہ میرے پاس تھے۔" کہتے ہوئے شوفر کو اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔

"مگر پندرہ منٹ میں وہ کتنے ڈاکومنٹس پڑھ سکتا ہے؟"

"شاید ایک بھی نہیں' مگر پندرہ منٹ میں وہ ان سب کو کاپی ضرور کر سکتا ہے۔" کہہ کر ہاشم جیسے ساری دنیا پہ لعنت بھیج کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

نوشیرواں خاموش ہو گیا۔ اسے شہری کی حالت دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ شہری کا قصور نہیں تھا۔ یہ سعدی تھا جو ہر چیز کے درمیان آیا تھا۔ اس کا قصوروار ہمیشہ سعدی نکلتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہمی نہیں تھے ہماری طرح کے اور بھی لوگ
عذاب میں تھے جو دنیا سے سوچتے تھے الگ

صبح کی سنہری سفیدی میں گرمی کی حدت بڑھتی جا رہی تھی۔ مرحوم ذوالفقار یوسف کے گھر میں چلتے ایئر کولر نے ٹی وی والے کمرے کو قدرے ٹھنڈا کر رکھا تھا۔ ندرت ادھر ادھر بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ راہ داری کی گول میز پہ بیٹھے حنین اور اسامہ کو لیکچر بھی جاری تھا۔

"اتنا نہیں ہوتا کہ جو چیز اٹھاؤ' اسے جگہ پہ رکھو۔"

"امی! میں سب کچھ جگہ پہ واپس رکھتا ہوں۔" سیم نے احتجاج کیا۔

"جی۔۔۔ مگر کسی اور کی جگہ پہ۔۔۔" حنین نے بات مکمل کی۔ وہ ساتھ چائے بھی پی رہی تھی۔

"تم تو جیسے سب ٹھیک رکھتی ہو نا۔ ابھی تمہاری الماری کھولوں تو کپڑوں کا ماؤنٹ ایورسٹ نیچے گرے گا۔"

"اور جیسے تم اس ماؤنٹ ایورسٹ تلے دب کر زخمی ہو جاؤ گے۔" اس نے سکون سے دوسرا گھونٹ بھرا۔ آج فرنچ چوٹی بنانے کی زحمت نہیں کی تھی' کھلے بال سیدھے' مگر ذرا بکھرے ہوئے تھے۔

ندرت مزید ان دونوں کو کچھ کہے بغیر راہ داری سے گزر کر سعدی کے کمرے تک گئیں۔ اتنا تو وہ دیکھ چکی تھیں کہ وہ فجر تک کام کرتا رہا تھا۔ پھر سو کر نو بجے اٹھ بھی گیا۔ اب وہ باہر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ بیڈ پہ بیٹھا جھک کر جوگرز کے تسمے باندھ رہا تھا۔ ندرت نے پیار سے اسے دیکھا۔ وہ بڑا ہو گیا تھا اور لمبا بھی' مگر اس کے چہرے پہ ایک نو عمر لڑکوں والی سادگی اور معصومیت اب بھی تھی۔ وہ سیدھا ہوا تو ماں کو کھڑے پایا۔ ستی ہوئی آنکھوں سے مسکرایا۔

"کیا باتیں ہوئیں بڑے ابو سے؟" وہ اٹھ کر لیپ ٹاپ بیگ میں سمیٹنے لگا۔

"وہی ان کی پرانی فکر' زمر کی شادی۔" انہوں نے تھکی ہوئی سانس کھینچی۔ سعدی خاموشی سے چیزیں سمیٹتا رہا۔

"وہ اس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں' مگر وہ نہیں مانتی' سعدی! تم سمجھاؤ نا' اب تو تمہاری بات چیت ہوتی ہے پھپھو سے' اور تمہاری بات تو وہ ہمیشہ مانتی ہے۔"

سعدی نے بیگ کا اسٹریپ کندھے پہ ڈالا' چہرے پہ چھائے حزن کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کچھ کہنے لگا تھا کہ فون بج اٹھا۔ جیسے جان بچ گئی۔ ندرت بات بھول کر واپس چلی گئیں اور اس نے ان جانا نمبر اٹھا لیا۔

"ملنا ہے مجھے اسی وقت' کدھر آؤں؟" فارس کے الفاظ بھی اسی کی طرح ہوتے تھے' ٹھک ٹھک۔

"میں تو نکل رہا تھا۔۔۔ آ۔۔۔ ریسٹورنٹ آجائیں۔" اس نے درمیان کا راستہ نکالا۔

"آدھے گھنٹے تک۔" اور فون بند۔

"یہ ماموں بھی نا۔۔۔ آگے پیچھے کی بات نہیں کریں گے کبھی۔" اس نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ پھر ندرت کی باتیں یاد آئیں۔ پھپھو کیا اب بھی اس کی مانتی تھیں؟ اوں ہوں۔

وہ باہر آیا تو حنین ہاتھ ہلا کر پرجوش سی سیم سے کہہ رہی تھی۔

"اور اتنے سے کھلے لان۔۔۔ سیم! تمہارا دل نہیں چاہتا کہ ہمارا بھی اتنا۔۔۔ بڑا گھر ہو اور خوب دولت ہو ہمارے پاس بھی۔ نہیں' یہ نہیں ہے کہ ہمارا چھوٹا گھر' مجھے برا لگتا ہے' یہ سب بھی اچھا ہے' مگر زیادہ بڑا گھر۔۔۔ سوچو سیم۔"

سیم نے پیچھے سے سعدی کو آتے دیکھ لیا تھا۔ سو جواب نہیں دیا۔ اس کو صحیح جواب معلوم ہی نہ تھا۔

"تم تو ہو ہی کنویں کے مینڈک' تمہیں کیا پتا۔ لیکن۔۔۔" وہ افسردہ ہوئی۔ "اگر میں یہ بات اپنی کسی دوست سے کرتی تو وہ کہتی کہ لالچ بری چیز ہے۔ کیا زیادہ پیسے کی خواہش ہونا بری چیز ہے۔"

"بالکل بھی نہیں۔" عقب سے آتے سعدی نے کہتے ہوئے اس کا کپ اٹھایا اور گھونٹ بھرا۔

حنین چونکی' مگر بھائی کو دیکھ کر مزید پرجوش سی پوچھنے لگی۔ "مگر کیسے بھائی؟"

"ہر کسی کا دل چاہتا ہے کہ اس کے پاس بہت پیسہ ہو' مگر لوگ یہ اعتراف کرنے سے ڈرتے ہیں' کہیں ان کو غلط یا لالچی نہ سمجھا جائے۔ ورنہ مال کی محبت بری بات نہیں ہے' زندگی میں اونچے گول ہونے چاہئیں' یہ انسان کو متحرک رکھتے ہیں۔ بس ان کو حاصل کرنے کے لیے غلط طریقہ نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ سلیمان علیہ السلام نے بھی تو اللہ کی یاد کے لیے مال کی محبت اختیار کی تھی نا۔"

حنین کھلے دل سے مسکرا دی۔ وہ ایسا بھائی تھا جس سے با آسانی سب کہا جا سکتا تھا اور وہ آپ کو بالکل جج نہیں کرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

نہ تکلف نہ احتیاط نہ زعم
دوستی کی زبان سادہ تھی

ریسٹورنٹ نیم ویران تھا۔ ان کا کاروبار ویسے بھی کوئی بہت فائدے میں نہیں تھا۔ پھر بھی گزارہ ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنی مخصوص میز پر بیگ رکھا ہی تھا کہ فون بجنے لگا۔

"سنڈے کو بھی لوگوں کو چین نہیں آتا۔" کہتے ہوئے جب نمبر دیکھا تو الرٹ سا ہو گیا۔

"سعدی! شہرین بات کر رہی ہوں۔" وہ بیزار مگر ضبط سے بولی تھی۔

"جی... میرے پاس ہے آپ کا نمبر' سوری میں آپ کا شکریہ نہیں ادا کر سکا۔"

"اب اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے' کیونکہ ہاشم ابھی ابھی یہاں سے نکلا ہے۔ وہ سونیا کو میرے ساتھ چھٹیوں پہ نہیں جانے دے رہا۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ تو تم بتاؤ گے۔ کیا اس لیے مجھ سے مدد مانگی تھی کہ پکڑے جانے پہ سارا ملبہ مجھ پہ گرا دو؟" وہ تیزی سے بولی۔ سعدی کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"کیا...؟"

"تم نے ہاشم کے سامنے میرا نام کیوں لیا؟"

"میں نے... ہاشم کے سامنے... کس نے کہا یہ آپ کو؟" وہ شاکڈ تھا۔ چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

"کیا ہاشم کے گارڈ نے جب تم پہ تشدد کیا تو تم نے میرا نام نہیں اگل دیا؟"

"کیا؟ یہ ہاشم... اف..." وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ "اس آدمی کو کوے کیوں نہیں کاٹتے۔ اس کے جھوٹ پہ یقین کر کے آپ نے اعتراف کر لیا؟ اف لکم" (اف ہے آپ کے لیے) اس کا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔ "میں نے کچھ بتایا' نہ مجھے کسی نے چھوا۔ اس سے زیادہ میں اپنی صفائی نہیں دوں گا۔"

شہرین نے گہری سانس لی۔

"مجھے تم پہ یقین ہے' وہ واقعی جھوٹ بول رہا تھا' بہرحال وہ جانتے ہیں کہ اس میں تمہارا ہاتھ ہے اور نوشیرواں مجھے سنگین نتائج کی دھمکی دے کر گیا ہے۔"

"نوشیرواں کیوں؟" وہ چونکا۔

"میں نے اس کے ذریعے پاس ورڈ لیا تھا۔"

سعدی چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اسے کچھ برا لگا تھا۔

"آپ کو نوشیرواں کو یوز نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اوکے... ساری غلطی میری... مجھے تمہاری مدد ہی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ایک تو میں نے اتنا خطرہ لے کر تمہارا کام کیا' صرف اس لیے کہ تم مجھے فیور دے چکے ہو اور آگے سے تم مجھے اخلاقیات کی تلقین کر رہے ہو؟" وہ تلخی سے بلند آواز سے کہے جا رہی تھی۔

"میں نوشیرواں کو پسند نہیں کرتا اور اس کی بالکل بھی عزت نہیں کرتا' مگر اس قصے میں وہ ڈائریکٹ انوالوڈ نہیں تھا۔ اس لیے اسے استعمال کرنے پہ مجھے افسوس ہوا ہے' بس یہی بات ہے۔"

"اور یہ سارا قصہ ہے کیا؟" شہرین نے پوچھا۔ سعدی خاموش ہو گیا۔

"خیر... جو بھی ہے' مجھے میری بیٹی چاہیے سعدی' تمہاری وجہ سے وہ اسے میرے ساتھ نہیں جانے دے گا۔"

"آپ اس کی ماں ہیں۔ اسے خاموشی سے لے کر نکل جائیں۔"

"تاکہ وہ اگلے چوبیس گھنٹے میں میرے سر پہ پہنچ کر میری بیٹی چھین لے اور کبھی مجھے اس کی شکل بھی نہ دیکھنے دے؟ میں اس کو لے کر دنیا کے کسی بھی حصے میں چلی جاتی' اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ وہاں نہیں پہنچ سکتا اور پھر میں کیوں بھاگوں؟ میری زندگی یہاں سیٹل ہے' دوست' ماں' باپ' سب یہاں ہیں اور میں اس روٹین میں خوش تھی۔ مگر..." اس کا گلا تھک گیا۔ سانس لینے کو رکی۔

"آئی ایم سوری۔"

"سوری کافی نہیں ہے۔ تم ہاشم سے بات کرو۔ تم نے اس کا جو چرایا ہے' اسے واپس کر دو۔"

"یہ تو میں کبھی نہیں کروں گا۔ لیکن اگر آپ نوشیرواں سے ایکسکیوز کر لیں تو شاید وہ کچھ کر سکے۔"

"ہم کیوں کچھ نہیں کر سکتے؟"

"میں آپ کو جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا۔ ایمان داری سے بتا رہا ہوں' میری بات ہاشم نہیں مانے گا۔ آپ شیرو نہیں تو سونیا کو راضی کریں' وہ ضد کرے گی تو ہاشم مان جائے گا۔"

وہ کرسی پہ بیٹھا' گلاس وال کو دیکھتے کہے جا رہا تھا۔ یک دم کوئی جھلک دکھائی دی۔ گہرے بھورے گنگھریالے بال۔ اس نے چونک کر گردن موڑی' پھر عجلت سے خدا حافظ کہہ کر فون رکھتا کھڑا ہوا۔

وہ اس کو دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ آنکھوں کا گلابی پن اب مدھم تھا۔ سعدی سانس روکے کھڑا تھا۔

وہ خوف زدہ تھا' پرامید تھا۔

وہ پریشان تھا' خوش تھا۔

زمر خاموشی سے کرسی پہ بیٹھی۔ چہرہ بنا تاثر تھا۔ بال جوڑے میں تھے' ایک لٹ گردن کو چھو رہی تھی۔

"بھابھی نے بتایا' تم ادھر ملو گے۔" سعدی کو دیکھتے ہوئے وہ متوازن لہجے میں بولی۔

(تو زمر گھر گئی تھیں؟ ایک ہفتے میں دوسرا چکر؟) سعدی بھی سر ہلاتا بیٹھا۔

"چھٹی پہ ہوں آج کل' کام وغیرہ ادھر لے آتا ہوں۔"

"آگے کا کیا ارادہ ہے؟" زمر لحظہ بھر کو بھی اس سے نظریں نہیں ہٹا رہی تھی۔

"کچھ عرصے بعد پی ایچ ڈی کے لیے جاؤں گا۔ مگر ابھی نہیں۔ حنین کی کسی اچھی جگہ شادی ہو جائے' پھر امی اور سیم کو ساتھ لے جاؤں گا۔" وہ احتیاط سے بول رہا تھا۔ زمر کا کوئی بھروسا بھی نہیں' کس بات سے رات والے واقعے کا ذکر چھیڑ دے۔

"اور تمہاری شادی؟"

سعدی نے مسکرانے کی سعی کی' مگر زمر کی خود کو اندر تک دیکھتی پرسکون نگاہیں ڈرا رہی تھیں۔

"وہ تو امی اور آپ ہی طے کریں گی' جس سے بھی کر دیں۔" سر جھٹک کر سعدی اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا' پھر چہرہ اٹھایا تو وہ ہنوز اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کہہ دیں' پھپھو! جو کہنے آئی ہیں۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" اس کی آنکھوں میں پھر سے گلابی لکیریں ابھرنے لگیں۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں چور نہیں ہوں۔ یوں دھوکا نہیں دے سکتا۔ ان کے گھر سے کچھ لیا ہے میں نے' اسی کو تلاش کرنے کے لیے وہ میری تلاشی لینا چاہتے تھے۔ مگر وہ سبز جواہرات کا نیکلیس نہیں۔"

سعدی رک گیا۔ زمر کی بھیگی نگاہیں اس پہ ویسے ہی مرکوز تھیں۔ سعدی نے آنکھیں سکیڑیں' زمر کو دیکھتا رہا' دیکھتا رہا' یہاں تک کہ ایک دم اس کو جیسے دھکا لگا۔ آنکھوں میں شاک سا پھیلا۔ زمر چوری کی بات نہیں کر رہی تھی۔

"امی نے... یا حنین؟" وہ قصوروار کا نام جاننا چاہتا تھا۔

"بڑے ابا نے۔" زمر نے بھیگے لہجے میں تصحیح کی۔ سعدی کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا۔ لب بھینچ کر دوسری سمت دیکھنے لگا۔ پھر سر جھٹکا۔

"میں ان کو اس کے لیے معاف نہیں کروں گا۔"

وہ بری طرح ہرٹ ہوا تھا۔ زمر کی آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ اندھیرے میں کھڑے شخص پہ کسی نے فلڈ لائٹس روشن کر دی تھیں۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا سعدی؟ مجھے کیوں دھوکے میں رکھا؟" صرف سعدی کے سامنے وہ رو سکتی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے تھے۔ سعدی نے کاؤنٹر پہ کھڑے لڑکوں کو اشارہ کیا۔ ان سب نے فوراً شکلیں کچن میں گم کر لیں۔

"اگر مجھے پتا ہوتا تو تمہیں ایسے کبھی نہ کرنے دیتی۔ کیوں نہیں بتایا؟ کیوں نہیں جتایا؟ ایک دفعہ تو کہا

ہوتا۔ غصے سے کہہ دیتے' لڑ کر کہہ دیتے۔ ہمارے درمیان تو بہت دوستی تھی۔"

"میں جتانے والا نہیں ہوں۔" اس نے مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

"اپنا کیوں نہیں سوچا؟ اس عمر میں کوئی گردہ دیتا ہے کیا؟ آگے لمبی زندگی پڑی ہے تمہاری' شادی کرو گے' بچے ہوں گے' ایک گردے کے ساتھ کیسے رہو گے؟" اس کا دل بری طرح دکھا ہوا تھا۔

"وہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ واک کرتا رہوں' شوگر وغیرہ نہ ہو تو سب ٹھیک رہے گا۔" جھکے ہوئے سر سے سادہ وضاحت دی۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا؟ میں تمہیں یہ کبھی نہ کرنے دیتی۔ یہ گردہ تو کیا پتا اسی وقت ضائع ہو جاتا' کیا پتا کچھ سال بعد ضائع ہو جائے' میں تو اسی اسٹیج پہ آجاؤں گی' اپنے لیے تمہاری صحت کے ساتھ اتنا بڑا نقصان میں تمہیں کبھی نہ کرنے دیتی سعدی۔"

"اسی لیے نہیں بتایا۔" اس نے گہری سانس لے کر سر اٹھایا۔ زمر کا چہرہ آنسوؤں سے گیلا تھا۔ آنکھوں میں فکر' اپنائیت' محبت' سب تھا۔ وہ چار سال پہلے والی زمر تھی۔ وہ "پھپھو" سے واپس زمر بن گئی تھی۔

"میں ہم دونوں میں سے پہلا دھوکے باز نہیں ہوں زمر! کیا آپ نے کبھی مجھے دھوکے میں رکھ کر کچھ نہیں کیا؟ کیا میرے لیے' حنین' اسامہ کے لیے آپ نے کچھ نہیں کیا؟ یاد ہے جب ہم اسکول میں تھے' میں۔۔۔"

"سعدی۔" اس نے روکنا چاہا۔

"نہیں' مت روکیں' سنیں۔۔۔ میں چھوٹا تھا' آپ مجھ سے آٹھ سال بڑی تھیں۔ آٹھ کلاسز آگے تھیں۔ ہمارا ایک ہی اسکول تھا۔ امی اور دادی کی نہیں بنتی تھی۔ ہم الگ رہتے تھے۔ ابو کے حالات اچھے نہیں تھے۔ مگر خوددار تھے۔ بڑے ابو کو ہوا نہیں لگنے دیتے تھے۔ پھر میں ان ہی کا بیٹا تھا۔ ان سے اسکول لے جانے کو پیسے نہیں مانگتا تھا۔ امی اور ابو اپنے مالی مسائل میں اتنے الجھے ہوتے تھے کہ خود سے دینے کا خیال بھی نہ آتا۔ میں گھر سے آدھی چیزوں کے بغیر آتا تھا۔ مگر اسمبلی سے کلاس میں واپس آتا تو میری جیومیٹری باکس میں پنسل' ربڑ' شارپنر' رولر اور وہ کیا تھا ہاں "ڈی" (پروٹیکٹر) وہ سب پورا ہوتا تھا۔ آپ بنا بتائے روز صبح میرا بیگ چیک کر کے چیزیں رکھ جاتی تھیں اور آپ اسمبلی سے لیٹ بھی ہو جاتیں' اسی لیے ڈانٹ بھی کھاتیں' مگر زمر آپ ہمیشہ سے بہت determined (مستقل مزاج) رہی ہیں' جو ٹھان لی' اسے کرنا ہے۔"

وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔ اسے یوں سر جھکا کر بولتے سننا اچھا لگ رہا تھا۔

"اور بریک میں مجھے ساتھ لے جاتیں۔ تب دو روپے کا سموسہ اور ایک روپے کی نمکو ہوتی تھی۔ آپ کہتیں' میں تین روپے لائی ہوں' میں "چیز" لے کر کھالوں گی' تم میرا لنچ کھالو۔ ان دنوں میں نہ لنچ لاتا تھا' نہ پیسے۔ آپ کہتیں' امی نے جو کباب دیا ہے' وہ مجھے نہیں پسند' تم لے لو اور میں یقین کر کے کھا لیتا۔ بہت دن بعد خیال آیا کہ کباب تو آپ کو بہت پسند تھے۔ بہت سالوں بعد خیال آیا کہ کبھی آپ کو کینٹین سے کچھ خرید کر کھاتے نہیں دیکھا۔"

زمر نے ہتھیلی سے آنسو رگڑے' پھر اداسی سے مسکرائی۔ "ان دنوں بڑے ابا کی نوکری چلی گئی تھی' ہمارے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ دونوں باپ' بیٹے خوددار تھے۔ میں دونوں کا بھرم رکھنا چاہتی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ میں۔۔۔ بہت دیر سے سمجھا کہ آپ پیسے نہیں لاتیں' میرے لیے آپ سارا دن بھوکی رہتی تھیں۔ جب امی نے کاروبار کا سوچا تو میں نے کہا کہ ریسٹورنٹ کھولیں' کسی کو کھانا کھلانے سے پیارا احسان بھی کیا ہوگا؟"

"سب اپنے گھر کے بچوں کے لیے یہ کرتے ہیں' اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔" مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

"میں چھٹی کے بعد کلاس فیلوز کے ساتھ "برف پانی" کھیل رہا تھا۔ جس لڑکے کی باری تھی' اس نے مجھے "برف" کر دیا اور اس سے پہلے کہ مجھے کوئی پانی کرتا' کسی بات پہ دو' تین لڑکوں نے مجھے بہت مارا۔ میں کمزور تھا۔ چھوٹا تھا۔ وہ بڑے تھے۔ مجھے مار' مار کر گرا دیا' میرے منہ پہ' کپڑوں پہ خون اور مٹی لگی تھی۔ آپ پتا نہیں کہاں سے آئیں۔ آپ نے مجھے اٹھایا' میرا چہرہ صاف کیا' اپنی یونیفارم کی پٹی سے خون صاف کیا۔ پھر پکڑ کر بینچ پہ ساتھ بٹھایا اور پوچھا "ان لڑکوں کا نام بتاؤ' کلاس اور سیکشن۔" میں ڈر گیا' کہا کہ جانے دیں' مگر آپ تو تاشروع سے ہی پراسیکیوٹر تھیں۔ آپ تو اڑ گئیں۔ وہ کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جن کے سعدی کو کوئی مار جائے اور وہ چپ کر کے بیٹھ جائیں۔ میں تو غلط چیز پہ چپ نہیں رہوں گی۔ "ہمارے سعدی" کو کس نے مارا ہے؟" آپ مجھے اسی طرح کہا کرتی تھیں۔ ہمارا سعدی اور اس وقت آپ کے یہی تین الفاظ تھے نام' کلاس' سیکشن' مجھے بتانا پڑے۔ تب مجھے پتا چلا آپ کتنی مستقل مزاج ہیں اور ہیڈ اسٹرانگ بھی۔ آپ ان لڑکوں کے پاس گئیں۔ ان کو کچھ نہیں کہا۔ صرف پیار سے ان کے ماں' باپ کے پتے پوچھے۔ پھر اللہ جانے کیسے آپ نے ان کے والدین کو اسکول بلایا۔ وہ لڑکے مجھے' ٹیچرز' پرنسپل' سب کو ایک کمرے میں اکٹھا کیا اور پھر آپ نے وہ لمبی تقریر کی۔ وہ شرمندہ کیا ان کو کہ مجھے یقین ہے' گھر جا کر ان لڑکوں کو مجھ سے زیادہ مار پڑی ہوگی۔"

زمر زمی سے ہنسے جا رہی تھی۔ سعدی نے عرصے بعد اسے یوں ہنستے دیکھا تھا۔

"میں دس سال کا تھا' جب آپ کی منگنی ہوئی تھی' پہلی منگنی۔" اس کے اگلے الفاظ نے زمر کی ہنسی ٹھہرا دی۔

وہ سر جھکا کر کہنے لگا۔ "ان کو شادی کی جلدی تھی' بڑے ابا نے سارا جہیز جمع کر لیا تھا۔ آپ نے انٹر کے بعد پڑھائی بھی بس کر دی' شادی کی تیاریاں عروج پہ تھیں۔ دادی نے سارا سامان اسٹور میں رکھا تھا۔ کپڑے' فرنیچر' سب اوپر نیچے گھسایا تھا۔ میں اور آپ وہاں بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ آپ مجھے بہت شوق سے اپنی چیزیں دکھا رہی تھیں۔ میں نے زندگی میں کبھی دوبارہ آپ کو اتنا خوش نہیں دیکھا' جتنا تب دیکھا تھا۔"

"چھوڑو اس بات کو۔۔۔" اس نے تکلیف سے پہلو بدلا۔

"مجھے تو وہ سب یاد ہے۔ آپ چلی گئی تھیں' میں اکیلا تھا' میں نے کچھ جلایا تھا' پھر میں سمجھا' آگ بجھ گئی ہے' یا پتا نہیں کیا' میں باہر آگیا' مگر آگ نہیں بجھی۔ سارا اسٹور جل کر راکھ ہو گیا۔ اگر وہ اسٹور الگ نہ بنا ہوتا تو سارا گھر جل جاتا۔ بڑے ابا کے پاس جہیز دوبارہ بنانے کی رقم نہ تھی۔ لڑکے والوں کے پاس مہلت دینے کا ظرف نہ تھا۔ آپ کی منگنی ٹوٹ گئی۔ دادی کو شک تھا کہ اس میں میرا ہاتھ ہے۔ مگر آپ نے سب کہا' یہ آپ سے ہوا ہے' آپ نے مجھ تک بات نہ آنے دی۔" میں نے پوچھا کہ کیوں جھوٹ بول رہی ہیں؟ تو آپ نے کہا۔ "سعدی! میں تمہیں پروٹیکٹ کر رہی ہوں' میں ہمیشہ تمہیں پروٹیکٹ کروں گی۔"

"اس میں تمہارا قصور نہیں تھا۔"

"تھا۔۔۔ اور آپ کی دوسری منگنی ختم ہونے میں بھی میرا قصور تھا۔ میں نے آپ کو مجبور کیا تھا۔ وارث ماموں کے کیس کے لیے۔ میں نے آپ کو اس میں پھنسایا تھا۔ کیا اس سب کے بعد بھی اور دوسری ان گنت قربانیوں کے بعد بھی جو آپ نے ہمارے لیے دیں' میں آپ کے لیے اتنا سا بھی نہیں کر سکتا تھا؟"

زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ بھی تمہاری وجہ سے نہیں ہوا۔ یہ میری قسمت تھی۔ میں چار سال غلط وجہ سے تم سے خفا رہی یا شاید میں انتظار کرتی رہی کہ تم خود۔۔۔ تم نے بھی تو میری موجودگی میں آنا چھوڑ دیا تھا۔"

"میں چاہتا تھا ہم ناراضی میں کم سے کم سامنا کریں۔ مجھے پتا تھا ایک دن ہماری صلح ہو جائے گی۔ خون کے رشتوں میں صلح ہو ہی جاتی ہے۔ مگر میں درمیان کی تکلیف سے بچنا چاہتا تھا۔"

زمر نے نم آنکھوں سے مسکرا کر اسے دیکھا جو سر جھکائے لب کاٹتا کہہ رہا تھا۔ یہ وہی بچہ تھا جس کو انگلی

پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ یہ اتنا بڑا کب ہوا؟

"کیا آپ کل رات کے لیے ابھی بھی ناراض ہیں؟" سعدی نے سر اٹھا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"میں کل بھی ناراض نہیں تھی، بس اپ سیٹ تھی۔"

"نکلنے سے پہلے ان کی نوکرانی مجھ سے ٹکرائی تھی، بری طرح، اسی نے میرے کوٹ میں ڈالا ہوگا، مجھے یقین ہے۔"

"ہوں۔۔۔ ہو سکتا ہے اس نے چرایا ہو، مگر پکڑے جانے کے خوف سے ایسا کیا ہو۔" وہ ٹشو سے آنکھیں کنارے پونچھتے اندازہ لگا رہی تھی۔

"زمر! ملازم، مالک کے کہے بغیر اتنا بڑا اسٹیپ نہیں لیتے۔ یہ سب ہاشم نے کروایا ہے۔" مگر زمر جو کل ہاشم سے بدگمان ہو رہی تھی۔ اب وہ "بدگمانی" زائل ہو چکی تھی۔

"ہاشم کو نیکلس چاہیے تھا۔ اس لیے وہ تلاشی لینا چاہتا تھا۔ شاید مجھ سے کوئی بھولا بسرا بدلہ بھی اتارنا چاہتا ہو۔ مگر وہ اتنا برا نہیں ہے کہ یہ خود رکھوا تا۔ ورنہ وہ صبح مجھے فون کر کے معذرت نہ کرتا۔" وہ رسان سے سمجھا رہی تھی۔ "اس کو پتا تھا کہ نیکلس تمہاری جیب میں ہے، مگر پھر بھی اس نے ہمیں جانے دیا، اس نے ہمیں بے عزت نہیں ہونے دیا۔ میں اس کے اس عمل کی قدر کرتی ہوں۔ خیر۔۔۔ اب تم وہ کیسے واپس کرو گے؟"

"خود جاؤں گا اور دے کر آؤں گا اور چونکہ وہ اتنے برے نہیں ہیں۔ تو میرے اس عمل کی قدر کریں گے۔" بظاہر سعدی نے نرمی سے کہا کہ وہ متنازعہ موضوع کو زمر کے ساتھ چھیڑ کر تازہ تازہ مندمل ہوتے زخم پھر سے نہیں کریدنا چاہتا تھا۔

ریسٹورنٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ سعدی چونکا، پھر بے اختیار کھڑا ہو گیا، زمر نے گردن موڑی۔ فارس وہیں رک گیا تھا۔ زمر نے رخ واپس موڑ لیا تھا۔ ٹشو سے آنکھیں تھپتھپا کر صاف کیں اور اٹھی۔

بوجھل سی خاموشی نے سب کو گھیرے میں لے لیا۔

"پھر ملیں گے۔" نرمی سے اس نے سعدی کا کندھا تھپکا اور مڑ گئی۔ فارس تیکھی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے مڑنے پہ شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔

وہ متناسب چال چلتی دروازے تک آئی۔ فارس ہٹ گیا۔ زمر نے بس ایک سرد، نفرت آمیز نگاہ اس پہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔ فارس کی پیشانی پہ بل پڑے اس نے اکھڑے تاثرات کے ساتھ اسے جاتے دیکھا اور سر جھٹک کر آگے آیا۔

"آئیں۔۔۔ بیٹھیں۔۔۔" سعدی نے احترام سے اشارہ کیا، مگر وہ کھڑے کھڑے تنے ابرو کے ساتھ اسے گھورتا رہا۔

"ایک دفعہ پوچھوں گا، سچ نہ بتایا تو اگلوانے کے سارے طریقے آتے ہیں مجھے۔"

"کیا ہوا؟" سعدی حیران ہوا۔

"جس روز میں رہا ہوا تھا، اس رات تم میرے کیس کے جج سے کیوں ملے تھے۔"

سعدی نے کچھ کہنا چاہا، مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ واقعی شاکڈ تھا۔ بے یقین تھا۔

"میں۔۔۔ آپ کو کیسے پتا چلا۔"

"اچھا تو تم واقعی اس سے ملے تھے۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔"

اور سعدی کو ایک دم اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ ظاہر ہے، اگر اس نے جج کو مجبور کیا تھا تو فیصلے والی رات کو ہی ملا ہوگا۔ اف۔۔۔

"اب انکار مت کرنا، اب دیر ہو چکی ہے۔" فارس نے کرسی کھینچی، ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ افراتفری پھیلا کر اس نے سعدی کو گڑبڑا دیا تھا۔

"کیا دیا ہے اس کو مجھے رہا کروانے کا؟"

"آپ بے گناہ تھے۔"

"میں نے پوچھا، کیا دیا ہے؟" اس کی آنکھوں کی سختی بڑھی۔

"ان کے کچھ خفیہ راز معلوم تھے مجھے۔ ان کو ایکسپوز کرنے کی دھمکی دی' وہ مان گئے۔" فارس ان ہی سخت تیوروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔"

"مجھے بھی قانون سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ ایک بے گناہ کو پھانسی تک دھکیلے گا۔ میرے پاس جج کو رشوت دینے کے لیے لمبی چوڑی رقم نہیں تھی۔ یہ میرا واحد آپشن تھا۔ جو قانون روٹی نہیں دے سکتا' وہ ہاتھ بھی نہیں کاٹ سکتا اور وہ جج اتنا معصوم نہیں تھا۔ اس نے پھانسی صادر کرنے کے لیے پیسے لے رکھے تھے۔ میں نے اس کو اسی شے سے روکا۔ کبھی کبھی اچھے کو برا کرنا پڑتا ہے' تاکہ وہ برے کو سزا دلوا سکے۔" اس نے مشہور مقولہ دہرایا۔ پھر اضطراب سے فارس کا چہرہ دیکھا۔

"کس نے پیسے دیے تھے جج کو؟" وہ پتلیاں سکیڑ کر سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

سعدی نے سوچا کہہ دے' ہاشم کاردار نے' مگر اول تو اس کے پاس ثبوت نہ تھے۔ دوم فارس یقین کیونکر کرتا؟ کیونکہ گرفتاری کے بعد سے اب تک ہاشم نے منہ زبانی ہمیشہ بظاہر فارس کا ساتھ دیا تھا اور فارس اسے جتنا ناپسند کرتا ہو' وہ ہاشم کو اپنے بھائی اور بیوی کا قاتل نہ مانتا' اور اگر مان بھی لے تو اس کا غصہ جو انٹیلی جنس کی نوکری نے دبا دیا تھا۔ جیل کے چار سال واپس لے آنے تھے۔ ادھر فارس کو یقین آتا ادھر جا کر وہ ہاشم کا گریبان پکڑ لیتا۔ کیا اتنی جلدی یوں اسے ہاشم کو خبردار کر دینا چاہیے؟ یا سب تیاری کر کے ایک ہی دفعہ حملہ کرنا چاہیے؟ وہ فائلز ابھی تک ڈی کوڈ نہیں ہوئی تھیں۔ سعدی نے فیصلہ کرنے میں لمحے لگائے۔

"جج نے نہیں بتایا' مگر میں پتا کروا لوں گا۔" وہ نگاہ ملائے بغیر لڑکوں کو آوازیں دینے لگا۔ "کیا لیں گے آپ؟"

"لے چکا میں سب۔" فارس نے ناک سے مکھی اڑائی اور اٹھ گیا۔

"ماموں... رکیں... بڑے ابا نے آپ سے ملنا ہے۔"

فارس جاتے جاتے مڑا۔ ماتھے کے بل ڈھیلے ہوئے۔ شیشے کی دیوار پہ نظر ڈالی۔ وہ کب کی جا چکی تھی۔

"کل ان کے گھر چلیں گے۔"

"گھر؟" اس نے ناگواری سے ابرو اٹھائی اور دوبارہ شیشے کی دیوار کو دیکھا۔

"وہ اس وقت گھر پہ نہیں ہوں گی۔ ان کی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے۔ آپ نے انکار کیا تو بڑے ابا کا دل ٹوٹ جائے گا۔" (یہ پلان پچھلے ہفتے سے بن رہا تھا۔)

فارس نے لب کھول کر بند کیے۔ متذبذب سا سر جھٹکا۔ "اچھا کل دیکھیں گے اور ہاں وہ موضوع ابھی ختم نہیں ہوا۔" تنبیہہ کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

سعدی نے گہری سانس لے کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

☼ ☼ ☼

پیر کی صبح ہر دوسرے آفس کی طرح وہاں بھی کاموں کی افراتفری پھیلی تھی۔ جواہرات باریک ہیل سے کوریڈور میں چلتی آ رہی تھی۔ گزرتے لوگوں کے سلام کا مسکرا کر سر کے خم سے جواب دیتی۔ وہ ہمیشہ کی طرح دمک رہی تھی۔ راہ داری کے سرے پہ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر کھول کر اندر آئی تو راستے بھر کی مصنوعی مسکراہٹ غائب ہوئی اور اس کی جگہ تشویش نے لے لی۔

لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کرتے ہاشم نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر واپس ٹائپ کرنے لگا۔ اس کا کوٹ اسٹینڈ پہ لٹکا تھا اور وہ مصروف لگ رہا تھا۔

"خیریت؟"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ لڑکا دو دن سے تمہارا سارا ڈیٹا لے کر بیٹھا ہے اور تم اتنے سکون سے کام کر رہے ہو۔" میز پہ ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے تشویش سے بولی۔ "پہلی بات' میرے ڈاکومنٹس سیکورٹی کی تہوں میں تھے' جنہیں وہ نہیں توڑ سکتا۔ میں ابھی چار بندوں کے ساتھ اس کے گھر پہ دھاوا بول سکتا ہوں۔ اس کے سارے کمپیوٹرز اور فائلز نکال سکتا ہوں' مگر میں اس کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ اس کے پاس میری کوئی کمزوری ہے۔" کرسی گھما کر ماں کو دیکھتے ہوئے ہاشم تحمل سے کہہ رہا تھا۔ "اور مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ اتنی جلدی میرا اتنا سارا ڈیٹا کاپی بھی کر سکتا ہے۔ خیر' جو بھی ہو' وہ میرے پاس سب سے پہلے آئے گا اور بالفرض اس کے پاس کچھ ہے بھی تو اس کو خاموش کروانے کے ایک سو ایک طریقے آتے ہیں مجھے۔ اب اپنی پریشانی کی دوسری وجہ بتائیں۔"

جواہرات نے گہری سانس لی' انگلی سے بال پیچھے کیے اور کرسی پہ بیٹھی۔

"تمہارا بھائی کہاں ہے؟"

"وہ آج پھر نہیں آیا؟ خیر گھر پہ سو رہا ہوگا۔"

"وہ گھر پہ نہیں ہے۔ دوستوں کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ مجھے اس کی فکر ہو رہی ہے۔"

ہاشم نے موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

"ہاں... شیرو کدھر ہے؟ اسے ڈھونڈ کر خبر دو مجھے۔" اور فون میز پہ ڈال کر ماں کو دیکھا۔ "مل جائے گا۔ آخر کہاں جاتا ہے اس نے؟"

"وہ ڈسٹرب ہے' شہری کی وجہ سے۔ اسے سمجھاؤ' ہاشم۔"

"میں سنبھال لوں گا' کیوں فکر کرتی ہیں؟"

"سعدی کو بھی تمہیں سنبھالنا ہوگا' کیونکہ جب تک سعدی کو سزا نہیں ملے گی' شیرو کا غصہ ہلکا نہیں ہوگا۔ مجھے ڈر ہے وہ کچھ غلط نہ کر بیٹھے۔"

"ممی! کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم شیرو کو اس کا غصہ نکالنے کے بجائے' غصہ کم کرنا سکھائیں؟"

"میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ تم سعدی کا کچھ کرو۔ وہ ویسے بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ جتنا سعدی اس کا راستہ کاٹے گا' اتنا ہی شیرو ہائپر ہوگا۔"

ہاشم کچھ کہنے لگا تھا... مگر موبائل بجا۔ اس نے کال اٹھائی۔ "ہوں... ٹھیک ہے۔" پھر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

"وہ شوٹنگ کلب گیا ہے اور وہ ٹھیک ہے۔ میں مل لوں گا اس سے' بے فکر رہیں۔" نرمی سے مسکرا کر وہ آگے جھکا اور جواہرات کا ہاتھ دبایا۔ وہ بدقت مسکرائی۔ ہاشم پھر سے کام کی جانب متوجہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

دوست ہیں دل میں' ذہن میں دشمن
کوئی بھی مجھ سے دور نہیں ہے

سعدی نے گلاس ڈور کھولا۔ اندر آفس میں سارہ کرسی پہ براجمان' گردن ترچھی کیے' ایک فائل پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ بس نگاہیں اٹھا کر اسے آتے دیکھا اور واپس لکھنے لگی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے اور رخسار سرخ گلابی ہو رہے تھے۔

"ڈاکٹر سارہ! میں نے یہ کام مکمل کر لیا ہے۔ فیلڈ رپورٹ تیار ہے۔"

اس نے سلام کے بعد کہتے ہوئے کاغذوں کا بنڈل میز پہ رکھا۔

"آپ کی تعریف؟" سارہ نے لکھتے ہوئے پوچھا۔

سعدی نے "اچھا؟" والے انداز میں ابرو اٹھائی۔

"آپ اکثر کرتی رہتی ہیں۔" کہہ کر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

سارہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر انگلی سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پہلے سیدھا ہوا' پھر کھڑا ہو گیا۔ سارہ نے قلم کی پشت لبوں سے لگائے اسے دیکھ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

"آپ کی شکل دیکھی بھالی ہے اوہ... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' آپ اس پروجیکٹ کے سینئر انجینئر ہیں۔"

"جی میم! اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میں نے ایک چھٹی کی درخواست دی تھی جو اپروو بھی ہوئی تھی۔"

"اور آپ نے چھٹی ختم ہونے سے پہلے آنے کی زحمت کیوں کی؟"

"پہلے میں بیٹھ جاؤں؟" اس نے پوچھا۔ وہ اسی طرح خفگی سے اسے دیکھتی رہی۔ سعدی پھر سے بیٹھا اور بنڈل اس کی طرف دھکیلا۔

"آپ کا کام وقت سے پہلے کردیا ہے۔ فیلڈ پہ جانے کی ساری تیاری بھی مکمل کرلی ہے۔ اب آپ وہ شکایت بتائیں جو آپ کو مجھ سے ہے۔"

سارہ نے فائل بند کی' ٹیک لگائی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"تمہیں پتا ہے سعدی! تھر کے اس فیلڈ پہ ہزاروں لوگ کام کررہے ہیں اور ان سب کے اوپر' اس عہدے پہ پہنچنے والی میں واحد عورت ہوں اور اس کی وجہ معلوم ہے کیا ہے؟"

"میرے جیسے ذہین اور قابل سینئر انجینئر کا ساتھ ہونا؟" سعدی کی زبان پھسلی۔

"اپنے کام سے کمیٹڈ ہو کر رہنا اور بلاوجہ کے ناغوں سے پرہیز کرنا۔"

"آپ کو پتا ہے' میں بلاوجہ چھٹیاں نہیں کرتا' اب بھی کئی کام تھے تو۔۔۔" وہ خاموش ہوگیا اور سنجیدہ بھی۔

"اتنے اہم کام کہ تم نے مجھے فارس کے رہا ہونے کا نہیں بتایا؟"

"آپ نے پوچھا ہی نہیں۔" اس نے سادگی سے شانے اچکائے۔

"پوچھا تھا میں نے۔ تم نے تو بات ٹال دی تھی۔"

"پوچھا نا۔۔۔ اب تو پتا چل گیا آپ کو۔" وہ خوش گوار انداز میں گفتگو کی نوعیت بدلنے لگا۔ سارہ اب فکرمندی سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"تم بہت پراسرار ہوتے جارہے ہو۔ اب تو کچھ بتاتے ہی نہیں ہو۔"

"ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ میں نے کہا تھا نا اس بندے کے لیپ ٹاپ تک پہنچ جاؤں۔ پھر۔۔۔"

"کون ہے وہ؟ کیا اسی نے وارث کو۔۔۔" سارے شکوے بھول کر سارہ نے آگے ہوتے احتیاط سے پوچھا۔ سعدی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بس تھوڑا سا انتظار کرلیں اور یہ سب مجھے سنبھالنے دیں۔" مسکرا کر بشاشت سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سارہ کی آنکھوں میں شکایت پھر سے عود کر آئی۔

"لڑکے۔۔۔ تم اگلے ہفتے مجھے فیلڈ پہ اپنے ساتھ چاہیے ہو' تیاری کرلو۔"

"راجر۔۔۔ باس۔۔۔" مسکرا کر ماتھے تک ہاتھ لے جاکر سلام کیا اور جانے کو مڑ گیا۔

سارہ نے بمشکل مسکراہٹ دبائے سر جھٹکا۔ "یہ سعدی بھی نا۔"

☆ ☆ ☆

یہ ہیں اہل دنیا کے دلچسپ دھوکے
کسی کو کسی سے محبت نہیں ہے

نوشیرواں شوٹنگ پوائنٹ پہ کھڑا تھا۔ اس کی لین میں سامنے ایک پتلا پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پستول پکڑے بازو سیدھے کیے۔ ایک آنکھ بند کیے' نشانہ باندھا' کانوں پہ پہلے ہی ہیڈ فون ٹائپ ایر پروٹیکشن پہنے ہوئے تھا اور آنکھوں پہ زرد گلاسز' ناک تک۔ اس نے فائر کیا۔ ایک' دو' تین' چار۔۔۔ سب دل کے آس پاس لگے۔ دل ٹوٹنے اور پھٹنے سے بچا رہا۔

"ہاتھ سیدھا رکھو' کندھے مت جھٹکو' اس پوائنٹ کو دیکھو۔" اپنے قریب ہاشم کی مدھم آواز سن کر وہ چونک کر مڑا۔ گلاسز لگائے' کیپ پہنے' ہاشم اس کو دیکھے بنا آگے ہو کر اس کے ہاتھ کو سیدھا کررہا تھا۔ نوشیرواں نے ہولے سے سر جھٹکا' بے زاری ظاہر کرنے کی کوشش کی' مگر چونکہ وہ ہاشم کی آمد سے بے زار نہیں ہوا تھا۔ سو ناکام رہا۔ اس کا بازو سیدھا کرکے ہاشم پیچھے ہٹا۔

"ہوں۔۔۔ اب نشانہ لو۔۔۔ پوری یکسوئی سے۔" اس کے کندھے کے پیچھے کھڑے ہوئے وہ پتلے کو دیکھ کر بولا۔ نوشیرواں نے پتلے کو دیکھا۔ پلکیں سکیڑیں' گہری سانس اندر کھینچی اور فائر کیا۔

دل اب بھی نہیں پھٹا۔

وہ اکتا کر سر جھٹکتا ایک طرف ہوگیا۔ مشین نے

پتلا پیچھے کرکے فریش پتلا سامنے کیا۔ ہاشم اس کی جگہ پہ آکھڑا ہوا۔ پستول کا اوپری حصہ پیچھے کرکے لوڈ کیا۔

"شہرین نہ اتنی خوب صورت ہے' نہ اتنی متاثر کن کہ تم ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں نکلے۔" دونوں ہاتھوں میں پکڑا پستول تاک کر نشانے پہ رکھتے وہ بولا۔

"وہ آپ کی بیوی رہی ہے۔" شیرو سر جھکا کر جوتے سے فرش مسلنے لگا۔ وہ اس موضوع سے بچنا چاہ رہا تھا۔

"مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا' تم بتاؤ' تمہاری وہ پسند تھی' محبت تھی یا عشق تھی؟" سامنے دیکھتے ہوئے ہاشم نے فائر کیا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ شوٹنگ رینج کے اس اندرونی کمرے میں گونجی۔ یکے بعد دیگرے دو گولیاں پتلے کے دونوں ہاتھوں پہ لگیں۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" شیرو نے بے زاری سے شانے اچکائے۔

"فرق پڑتا ہے' اگر یہ پسندیدگی تھی تو شام تک تمہیں ٹھیک ہوجانا چاہیے۔" کہتے ہوئے اس نے پھر فائر کیا۔ دونوں آنکھوں کے بیچ گولی نے سوراخ کردیا۔

"اگر محبت تھی تو کچھ دن لگیں گے۔" زوردار گونج کے ساتھ اگلی گولی پیشانی پہ ماری۔

"اور اگر عشق تھا تو پھر یہ لاعلاج ہے۔" آخری گولی دل پہ ماری' دل پھٹ گیا۔ ہاشم نے گلاسز اتارے' آنکھیں سکیڑ کر تنقیدی نگاہوں سے پتلے کا جائزہ لیا جسے اب پیچھے لے جایا جارہا تھا' پھر علامتی طور پہ پستول کی نالی پہ پھونک ماری' اسے پینٹ کی پچھلی جیب میں اڑسا اور پرسکون سا نوشیرواں کی طرف مڑا۔

"پسند سے زیادہ' محبت سے کم۔" وہ جوتے سے مسلسل فرش مسل رہا تھا۔

"یا شاید شہرین کے تمہیں استعمال کرنے سے زیادہ صدمہ تمہیں سعدی کے کہنے پہ استعمال کیے جانے پہ ہوا ہے۔"

نوشیرواں کے جھکے چہرے پہ مارے اہانت کے سرخیاں دوڑنے لگیں' مٹھیاں بھینچ لیں۔ ہاشم نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

"سعدی کو دنیا میں سب سے زیادہ محبت کس سے ہے' معلوم ہے؟"

نوشیرواں نے سلگتی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "ڈی اے زمر سے؟"

ہاشم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اور اس کی نظر میں ہم اسے گرا چکے ہیں۔ ان کے خراب تعلقات نیکلس برآمدگی کے بعد مزید خراب ہوجائیں گے۔ جلد سعدی میرے پاس آئے گا اور میں اپنے طریقے سے اس کو سنبھال لوں گا۔ اگر وہ میرے لیے کام کرنے لگ جائے تو سوچو ہمارا غلام بن کر ہمیں کتنا فائدہ دے گا۔"

"وہ کبھی ہمارا غلام نہیں بنے گا' ناممکن۔" اور اتنا تو نوشیرواں اسے جانتا ہی تھا۔

"میں اسے ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ لوں گا شیرو' ایک دن وہ میرے لیے کام کرے گا۔ اس کا ٹیلنٹ ہمارے حق میں استعمال ہونا چاہیے۔"

"مطلب آپ کو ابھی بھی سعدی کی فکر ہے؟" نوشیرواں کے اندر غصے کی نئی لہر دوڑی "وہ ساری زندگی مجھ سے مقابلہ کرتا آیا ہے' ہر جگہ مجھے پیچھے کرکے خود لوگوں کی تحسین بٹورتا آیا ہے۔ اس کے سامنے کبھی میں کچھ نہیں ہوتا' ہر کوئی اس کا معترف ہوتا ہے' آخر کیوں؟"

"کیونکہ وہ ایک خوددار اور ذہین نوجوان ہے۔ اس میں وقار ہے اور وہ رشتوں کا پاس کرنا جانتا ہے۔ وہ لوگوں کے لیے اچھا سوچتا ہے اور مشکل میں ان کی مدد کرتا ہے۔ انسان کو عزت کرانی پڑتی ہے اور یو نو واٹ' میں یہاں کھڑا ہو کر سعدی کی صلاحیتوں پہ دو گھنٹے مزید بھی بول سکتا ہوں' مگر نہ مجھے اس سے ہمدردی ہے اور نہ کوئی لگاؤ۔ مجھے تمہاری فکر ہے' کیونکہ میرے بھائی تم ہو' اس لیے اس شہرین ڈراما سے نکلو' آج پورا دن اس کا سوگ منالو اور کل صبح تم مجھے مضبوط اعصاب کے ساتھ واپس آفس میں نظر آؤ اور اس بارے میں' میں مزید ایک لفظ نہیں سنوں گا۔"

سختی و درشتی سے اس نے کہا تو شیرو کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھا۔ اس نے جی کہہ کر سر جھکایا۔ ہاشم اس کے برابر سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ نوشیرواں نے گلاس اب ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔ دنیا اب ذرا واضح نظر آ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اب تو سیل درد تھم جائے، سکوں دل کو ملے
زخم دل میں آچکی ہے، اب تو گہرائی بہت

لاؤنج کی چوڑی کھڑکی کے باہر دھوپ پگھل رہی تھی۔ کچن میں تلتے کبابوں کی خوشبو یہاں تک آ رہی تھی۔ وہیل چیئر پہ بیٹھے بڑے ابا بہت محبت و اپنائیت سے صوفے پہ سر جھکائے بیٹھے فارس کو دیکھ رہے تھے۔ قریب ہی سعدی کھڑا فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔

"اونہوں۔۔۔" نفی میں سر ہلاتے سعدی نے ان کا دوائیوں کا باکس کھول کر دیکھا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے میں کتنی گولیاں چھوڑ کر گیا تھا۔ آپ نے دو ہفتے میں صرف گیارہ روز کی دوا کھائی ہے۔"

فارس نے خاموشی سے بس نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا، البتہ انہوں نے مسکراتے ہوئے تفتیش کرتے لڑکے پہ نظر ڈالی۔

"وہ ختم ہو گئی تھیں، یہ نئی منگوائی ہیں۔ صداقت سے پوچھ لو۔"

"بیٹے اور غلام کی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی۔"

"میرا بیٹا آتا جاتا ہے، اس سے اچھی دوا کیا ہو گی میرے لیے؟" نرمی سے انہوں نے سعدی کا بازو چھو کر فارس سے تائید چاہی۔ فارس جو آگے کو ہو کر الرٹ سا بیٹھا تھا۔ زبردستی مسکرایا، پھر وہی سنجیدگی طاری کر لی۔ وہ بے آرام سا بیٹھا تھا۔

"میں اس بات کو ابھی ٹال رہا ہوں، ختم نہیں کر رہا۔" سعدی تنبیہہ کرتے ہوئے کھڑکی تک آیا اور باہر دیکھنے لگا جہاں پورچ میں اس کی کار کھڑی تھی۔ دوسری کوئی کار نہ تھی۔ زمر میڈیکل چیک اپ کے لیے گئی تھی اور اس کو آتے آتے بھی دو، تین گھنٹے لگ جانے تھے، سو وہ بے فکر تھا۔

"آگے کیا کرو گے فارس؟" وہ اب نرمی سے اسے دیکھتے پوچھ رہے تھے۔

"پرانی نوکری واپس لینے کی کوشش کروں گا۔"

"مگر کوئی مدد۔۔۔" فارس نے ہلکا سا ہاتھ اٹھایا۔

"میرے پاس کچھ سیونگز ہیں، بہت ہے میرے لیے، آپ نے پہلے ہی بہت احسان کیے ہیں مجھ پہ، مزید نہ لوں گا نہ لیتے اچھا لگوں گا۔" بنا کسی تاثر کے وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"میں جانتا تھا۔ تم رہا ہو جاؤ گے، جج کو تمہاری بے گناہی کا یقین آجائے گا۔"

فارس نے ترچھی نظروں سے باہر دیکھتے سعدی کو دیکھا۔ "جی سعدی بھی جانتا تھا۔"

جیبوں میں ہاتھ ڈالے، چیونگم چباتے سعدی نے مڑے بنا کہا۔ "میں نے سنا نہیں۔ کیا کسی نے میرا نام لیا؟"

اور "کسی" نے چہرہ واپس موڑ لیا۔

"مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ اچھا لگ رہا ہے، تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر۔"

"اوہ!" سعدی نے بے اختیار چیونگم اگلی اور ڈسٹ بن میں پھینکی، پھر گھبراہٹ سے باہر دیکھا۔ نیلی کار اس کی کار کے پیچھے رکی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل رہی تھی۔ گھنگھریالے بال ہاف بندھے تھے اور اپنا پرس اٹھاتے ہوئے وہ ایک جھولتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس رہی تھی۔

"آپ نے تو کہا تھا، وہ دو بجے سے پہلے نہیں آئیں گی؟" سعدی ہلکا سا بول پایا۔

فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ مگر اسے یہاں سے وہ نہیں نظر آ رہا تھا جو سعدی دیکھ رہا تھا۔

زمر اس کی گاڑی کے پاس رکی، پھر اچنبھے سے لاؤنج کی کھڑکی کو دیکھا۔ سعدی ادھر کھڑا نظر آیا کہ وہ شیشے کے بہت قریب کھڑا تھا۔ زمر ہلکا سا مسکرائی اور آگے بڑھ آئی۔ سعدی مسکرا بھی نہ سکا۔

وہ راہداری میں داخل ہوئی تھی کہ ٹرالی لاتا صداقت اسے دیکھ کر بوکھلا گیا۔

"باجی! آپ اتنی جلدی؟"

"ہاں۔۔۔ اپائنٹمنٹ کینسل ہو گئی۔ ڈاکٹر کو کہیں جانا تھا۔ سعدی آیا ہے؟" وہ سیدھی ڈرائنگ روم کی طرف آ رہی تھی اور اس کی آواز پہلے ہی ادھر پہنچ گئی تھی۔ بڑے ابا نے بے اختیار سعدی کو دیکھا۔

فارس ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"آج تو ہمارا سعدی اتنے عرصے بعد۔۔۔" چوکھٹ پہ زمر کے الفاظ ٹوٹ گئے۔

فارس سامنے کھڑا تھا۔ ابا وہیل چیئر پہ، سعدی کھڑکی کے ساتھ، فارس کو دیکھ کر اس کی بھوری آنکھوں میں پہلے بے یقینی ابھری، پھر صدمہ اور آخر میں شدید غصہ۔ اس کے لب بھینچ گئے۔ اتنی سختی سے کہ گردن کی نسیں ابھرنے لگیں۔ تیز نگاہوں سے سعدی کو دیکھ کر جیسے جواب مانگا۔

فارس تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر باہر کی طرف بڑھا۔

"یہ آدمی میرے گھر میں کیا کر رہا ہے؟" وہ ابھی نکلا بھی نہ تھا، جب وہ جواب طلب نظروں سے بڑے ابا کو دیکھ کر اونچی آواز میں بولی تھی۔

فارس لمحے بھر کو رکا، پھر تیزی سے نکل گیا۔

"اسے میں نے بلایا تھا، زمر!" بڑے ابا نے ملال سے اسے جاتے دیکھا۔

"آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ نہیں جانتے کہ وہ کون ہے؟"

وہ بے یقینی، حیرت و صدمے سے اتنا بلند بول رہی تھی کہ صداقت راہداری میں ہی تھم گیا۔

"وہ بے گناہ ہے۔"

"اور میں بے گناہ نہیں تھی؟ آپ کو اس سارے معاملے میں، میں معصوم نہیں لگتی؟"

"زمر۔۔۔" سعدی نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم تو بالکل خاموش رہو!" انگلی اٹھا کر اسے چپ کرایا۔ سعدی نے سر جھکا لیا۔

مرکزی دروازہ کھول کر بند ہونے کی آواز آئی۔

"اگر آئندہ یہ آدمی میرے گھر میں داخل بھی ہوا تو میں یہاں نہیں رہوں گی ابا۔"

فارس پورچ عبور کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اہانت اور ضبط سے اس کے کان سرخ ہو گئے تھے۔ بڑے ابا کا دل بری طرح دکھا۔

"وہ میرے اصرار پہ آیا تھا، اس کا کیا قصور۔"

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ سب۔۔۔" زمر نے پرس سے رپورٹس کے لفافے نکال کر زور سے میز پہ اچھالے، وہ سب بکھر کر نیچے لڑھک گئے۔ "یہ سب اس کا قصور ہے۔ آپ کے دو بچے ایک، ایک گردہ کھو چکے ہیں تو اس آدمی کی وجہ سے اور آپ اسے اپنے لاؤنج میں بٹھا رہے تھے؟ ابا! اس نے مجھے گولی ماری تھی، یہ وہی آدمی ہے۔"

"تم نے اسے یہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔۔۔ تم۔۔۔"

"مجھے پتا ہے یہ وہی تھا، مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ گلابی سرخ آنکھوں کے ساتھ پھٹے دل سے بولتی پلٹ گئی۔

صداقت سر جھکائے ٹرالی اندر لے آیا۔ سعدی نے گہری سانس بھری، آگے آیا، کباب اٹھایا، صوفے پہ براجمان ہوا اور اسے چکھا۔

"مزے کا ہے، آپ بھی لیں نا۔"

وہ ابھی تک دل مسوس کر بیٹھے تھے۔ گردن دائیں طرف گرائے۔ زرد رنگت کے ساتھ۔

"وہ کیا سوچتا ہو گا اور تم بھی اسے لے کر نہیں گئے، بے چارہ ٹیکسی پہ گیا ہو گا۔"

"اوہ چھوڑیں بڑے ابا! وہ بہت رف اینڈ ٹف ہیں، چار سال جیل میں چکی پیس کر آئے ہیں۔ ٹیکسی پہ جا کر گھل نہیں جائیں گے۔" وہ ذرا اٹھ کر دوسرا کباب اٹھا رہا تھا۔

"وہ میرا مہمان تھا۔ گھر آئے کے ساتھ کوئی ایسے کرتا ہے؟ اور وہ تو تھا بھی معصوم۔"

"آپ ایسا کریں۔" اس نے کباب توڑ کر منہ میں

رکھتے ہوئے کہا۔ "پھپھو کی شادی کر دیں۔"
بڑے ابا نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔
"میں کر سکتا ہوں؟"
سعدی نے چباتے ہوئے آنکھیں سیکڑ کر سوچا۔
"تھیکنکلی ہاں۔ hy po thetically شاید اور پریکٹیکلی تو بالکل بھی نہیں۔" امید سے شروع کی ہوئی بات کے آخر میں جھرجھری لے کر اس نے سر جھٹکا۔

بڑے ابا وہیل چیئر کے پہیے چلاتے اس کے قریب آنے لگے۔
"پڑھی لکھی بیٹیاں جب تیس عبور کر جائیں اور ان کے پاس نہ ختم ہونے والے دلائل ہوں تو ان کو کوئی شادی کے لیے مجبور نہیں کر سکتا اور۔۔۔" غم زدہ مسکراہٹ سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔ "اور وہ تو اسے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی' زندگی میں کیسے کرے گی؟"
کباب میں کوئی ہڈی تھی شاید جو سعدی کے حلق میں پھنس گئی۔ وہ بے اختیار آگے جھک کر کھانسا' پھر چہرہ اٹھا کر اڑی رنگت کے ساتھ ان کو دیکھا۔
"میں نے۔۔۔ یہ تو نہیں۔۔۔ کہا۔"
"چھ فٹ کا پوتا پچیس سال کا ہو کر' باہر سے ڈگری لا کر سمجھتا ہے کہ وہ دادا کی دوائیوں کی پرچی پڑھ سکتا ہے اور دادا اس کا ذہن نہیں پڑھ سکتا۔"
سعدی نے بوکھلا کر دروازے کو دیکھا۔
"آہستہ بولیے میں عاق کر دیا جاؤں گا۔"
بڑے ابا اداسی سے مسکرائے۔ "یہ میری بھی خواہش ہے ہمیشہ سے تھی' مگر وہ کبھی نہیں مانے گی۔"
سعدی بالکل چپ ہو گیا۔ تب ہی راہ داری سے قدموں کی آواز آئی۔ سعدی نے جلدی سے کبابوں کی پلیٹ واپس رکھی اور سیدھا ہو کر بیٹھا۔
"جاب پہ نہیں جا رہے آج کل؟" زمر اندر آئی' سامنے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھی۔ لباس بدل کر' فریش اور سنبھلی ہوئی تھی۔
"منڈے تک آف لیا ہے' کچھ کام نپٹانے تھے۔" وہ بظاہر سرسری لہجے میں کہتے ہوئے گاہے بگاہے محتاط نظر اس پہ ڈالتا۔
"اگر تمہیں میرا وہ رویہ برا لگا ہے تو میں معذرت کرتی ہوں' مگر مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں' کیونکہ اگر تم خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو تو تمہیں میں حق بجانب نظر آؤں گی۔" نہایت ٹھنڈے لہجے میں وہ شروع ہوئی۔ "میری زندگی کے کچھ اصول ہیں' میں جن کو پسند نہیں کرتی' ان سے بھی مل لیتی ہوں' مگر جن سے نفرت کرتی ہوں بالخصوص کسی ایسے شخص سے جس نے مجھے اتنا نقصان دیا ہو تو اس کو میں اپنے اردگرد برداشت نہیں کر سکتی۔ اس بارے میں مجھے اپنے جذبات چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔" آخر میں ہلکے سے شانے اچکائے۔
سعدی نے سر ہلایا۔ وہ جذبات نہیں' مگر ڈھیروں کرب چھپا کر آئی تھی۔
"آئندہ کچھ بھی ایسا نہیں ہو گا جو آپ کو تکلیف دے' زمر اور جو دے چکے ہیں' وہ ضرور بھگتیں گے۔"
"مجھے ان کے بھگتنے سے غرض نہیں ہے۔"
"مگر آپ تو انصاف' قصاص پہ یقین رکھتی تھیں۔"
"معاف میں نے ابھی بھی نہیں کیا سعدی! مگر میں زندگی میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ میں خود کو مزید تکلیف سے بچانا چاہتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔
"اور اگر یہ سب آپ کے بجائے آپ کے کسی قریبی شخص کے ساتھ ہوا ہوتا؟"
"تب میں ایک' ایک کو پراسیکیوٹ کرتی۔" اس نے ایمان داری سے جواب دیا۔ پھر بڑے ابا کو دیکھا۔ وہ افسردہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔
"آپ کو اس سے ملنا ہے تو ضرور ملیں' مگر میری موجودگی میں یہ مت کیا کیجیے۔"
"ہم نے تو یہی سمجھا تھا نا۔" سعدی نے بمشکل خود کو کہنے سے روکا۔
"سعدی چاہتا ہے' ہم کل رات اس کی طرف کھانا کھائیں۔" بڑے ابا نے بات بدل دی۔ نہ تائید کی' نہ

انکار کیا۔
زمر نے سعدی کو دیکھا جو متذبذب سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی۔
"شیور ہم ضرور آئیں گے۔"
سعدی کی رنگت واپس آئی' وہ مسکراتا ہوا اٹھا۔
"ہم سب انتظار کریں گے۔"
زمر کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

تم جسے نور صبح کہتے ہو
میں اسے گرد شام بھی نہ کہوں

رات کی سیاہ افشاں پورے شہر پہ جگمگا رہی تھی۔ کاردارز کے عظیم الشان قصر کے سامنے لان نشیب میں جاتا تو آگے انیکسی تھی۔ فارس دروازے پہ کھڑا چابیوں کے گچھے سے ایک لگا رہا تھا۔ جینز پہ بٹنوں والی شرٹ پہنے' کف کلائی پہ موڑے' اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔
دروازہ کھلا۔ اس نے اندر قدم رکھا۔ بنا دیکھے دیوار پہ ہاتھ مارا اور سیدھا دو سرا بٹن دبایا۔ داخلی حصے کی بتی جل اٹھی۔
وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندر آیا۔ گردن گھما کر چھت' کھڑکیوں' دیواروں کو دیکھتا' وہ راہ داری سے گزر رہا تھا۔
گھر باہر سے پینٹ شدہ تھا کہ کاردارز اپنا گھر پینٹ کرواتے تو اس کا بھی بیرونی حصہ کروا دیتے کہ ان کے لان سے وہ دکھائی دیتا تھا۔ البتہ اندر سے گھر معمولی تھا۔ نارمل فرنیچر' چپس کا فرش' دیوار اور چھت کے ملنے کی جگہ پہ اکھڑا پینٹ۔
وہ آگے بڑھتا گیا۔
لاؤنج چھوٹا سا تھا۔ اس کے ایک طرف کھانے کی گول میز رکھی تھی۔ ڈرائنگ روم الگ تھا۔ سیڑھیاں اوپر جاتیں۔ ایک طرف دروازہ تھا جہاں سے سیڑھیاں بیسمنٹ میں جاتیں۔ بیسمنٹ تہ خانے کی طرح

تھی۔ پورے گھر کے رقبے پہ پھیلا کمرا جس میں ستون تھے 'مگر دیواریں ندارد۔۔۔ اس تہہ خانے میں کاٹھ کباڑ تھا۔ فارس ادھر نہیں گیا۔ وہ اوپری منزل پہ آیا۔ وہاں وہ بیڈ روم تھے۔ وہ بڑے والے میں آیا۔ آگے ٹیرس بھی تھا اور اندر دیوار پہ ایک تصویر تھی۔

تصویر میں وہ ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔ بالکل ہلکا سا۔ ایش گرے ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا۔ بال اب جیسے تھے۔ ساتھ ایک ساڑھی میں ملبوس لڑکی کھڑی تھی۔ اسٹیپ میں کٹے بال' بڑے جھمکے' جاذب نظر' وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

فارس پلٹ گیا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ باتھ روم میں آکر اس نے نل کھولا اور آستین موڑ کر وضو کرنے لگا۔

ٹیرس سے باہر' روشنی میں نہایا قصر دکھائی دے رہا تھا۔ اندر ملازموں کی چہل پہل جاری تھی۔ جواہرات سربراہی کرسی پہ براجمان نزاکت سے چھری کانٹے سے اسٹیک کا ٹکڑا توڑ رہی تھی۔ دائیں ہاتھ بیٹھا ہاشم پلیٹ پہ جھکا کھانے میں مگن تھا۔ اس کے موبائل کی میسج ٹون بھی وقفے وقفے سے بج رہی تھی۔ جواہرات کے دوسرے ہاتھ بیٹھا نوشیرواں بے دلی سے کانٹا پلیٹ میں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔

"تم آج پھر آفس نہیں آئے۔" جواہرات نے کانٹا چلاتے' بس نگاہیں اٹھا کر شیرو کو دیکھا۔ اس نے بے زاری سے چہرہ اٹھایا۔

"آپ لوگ مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے؟"

"ممی!" ہاشم نے نگاہوں میں جواہرات کو تنبیہہ کی' اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"میرا خیال تھا تم اب تک اپنے بھائی کو سمجھا چکے ہو گے 'مگر یہ ہنوز اس عورت کے غم میں ہے۔ جو اس کو گدھا سمجھ کر استعمال کر کے چلی گئی۔"

"آپ چاہتی ہیں میں ٹیبل سے اٹھ جاؤں؟" اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔

"شیرو! بدتمیزی مت کرو۔ وہ ہماری ماں ہیں۔" اور جس طرح ہاشم نے صرف نگاہ اٹھا کر سختی سے کہا تھا' نوشیرواں نے گردن جھکالی۔ جواہرات نے گہری سانس لے کر گلاس لبوں سے لگایا۔

"میں اس دن کا انتظار کر رہی ہوں جب تمہیں احساس ہو گا کہ تمہاری ماں اور تمہارا بھائی تمہیں پروٹیکٹ کرنے کے لیے کیا کیا کرتے ہیں۔ اور یہ پورا ہفتہ ہم نے تمہارا خواہ مخواہ کا غصہ برداشت کیا ہے۔ تم ہمیں ہی مورد الزام ٹھہرا رہے ہو؟ اگر سعدی نے (اور اس نام پہ نوشیرواں کی کنپٹیاں پھٹنے کو تھیں) کچھ برا کیا بھی ہے تو تمہارے بھائی کے ساتھ اور جب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ اسے سنبھال لے گا تو تم کیوں اپنا خون جلا رہے ہو؟"

نوشیرواں نے کانٹا رکھ دیا۔ بس کھا چکا تھا وہ۔

"فارس چلا گیا؟" ہاشم نے دانستہ ماں کو دیکھتے ہوئے موضوع بدلا۔ وہ ابھی ۔۔۔ ٹھنڈے انداز میں شیرو کی مزید کلاس لے سکتی تھی مگر ہاشم کے مسلسل نگاہوں سے تنبیہہ کرنے پہ گہری سانس لے کر بولی۔

"مہمان سے چار دن بعد بو آنے لگتی ہے' سو آج اس کا گھر تیار کروا دیا تھا۔"

نوشیرواں اٹھنے کے لیے پرتول رہا تھا مگر بہرحال اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ بڑے بھائی اور ماں کے سامنے سے یوں اٹھ جائے۔

ہاشم کا موبائل پھر بجا' اس نے ایک ہاتھ سے کانٹا لبوں تک لے جاتے' دوسرے سے فون کان سے لگایا۔ "جی۔۔۔ جی۔۔۔ آپ کا کام ہو گیا تھا' میں صبح تک کیس فائل آپ کو بھجوا دوں گا۔ جی بالکل۔" اس نے پلیٹ پرے کی اور دوسرا نمبر ملانے لگا۔ ہاشم کے ہر وقت کے بجتے فون کے وہ عادی تھے۔

"جی زمر' کیسی ہیں آپ؟"

ان دونوں نے چونک کر اسے فون پہ کہتے سنا۔

"میں نے آپ کو ایک کیس فائل کا کہا تھا' وہ کالی ہو گئی؟ اچھا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں' آپ کے گھر سے پک کر لے گا۔" اس نے رک کر سنا۔

"آپ کدھر ہیں؟ خیریت؟ سعدی کی طرف؟ اچھا۔" ہاشم بات دہرانے کا عادی نہ تھا مگر چونکہ یہ اس کے لیے بھی غیر متوقع تھا' سو وہ دہرا گیا۔ نگاہ اٹھا کر شیرو کو دیکھا۔ وہ بھنویں بھینچے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"چلیں' جب آپ واپس آئیں۔۔۔ اچھا۔ صبح وہیں سے کورٹ جائیں گی؟ اوکے۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ آ۔ سعدی قریب ہے تو میری بات کروا دیں۔" وہ کہتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ جواہرات بھی نیپکن سے لب تھپتھپاتی ادھر ہی متوجہ تھی۔

"کیا حال ہے سعدی؟" وہ بولا تو آنکھوں میں سرد مہری در آئی۔ نوشیرواں نے "ہونہہ" استہزائیہ سر جھٹکا۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ ایسا ہے کہ صبح میری سیکریٹری تمہیں کال کر کے کل کی اپائنٹمنٹ دے گی' ضرور آنا' میں انتظار کروں گا۔" کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

"یہ گرایا آپ نے اسے ڈی اے کی نظروں سے کہ وہ ایک دفعہ پھر فیملی بن گئے؟"

"وہ کل آئے گا' میں اس سے بات کروں گا اور میں سب سنبھال لوں گا' اب وقت آگیا ہے کہ تم سعدی یوسف Obssession (آسیب) سے نکل آؤ۔" ہر فقرہ توڑ توڑ کر تحمل سے ادا کیا۔

"نوشیرواں۔۔۔ ریلیکس۔۔۔" جواہرات نے اب کے نرمی سے شیرو کا ہاتھ دبایا۔ اس نے بظاہر خود کو نارمل کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا' بہرحال تاثرات چھپانے میں ماں اور بھائی جیسا ماہر نہ تھا۔

"یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ بڑی بات تب ہوتی اگر سعدی کے ہاتھ کچھ ایسا لگتا جو ہمیں نقصان دے۔"

"میں سمجھ گیا۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ اپنا موبائل نکالتے ہوئے اٹھ گیا۔ جواہرات نے قدرے تشویش سے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"مسرور وغیرہ نے باہر کھانے کا پروگرام بنایا تھا' پہلے انکار کر دیا' اب چلا ہی جاتا ہوں' موڈ اچھا ہو جائے گا۔ ورنہ جب تک یہ سعدی یوسف زندہ ہے' میری زندگی مسائل کا شکار ہی رہے گی۔" سر جھٹک کر کہتا وہ نکلنے لگا' پھر جیسے اپنی ہی بات نے سوچ کا ایک نیا در دکھایا۔

"مگر کیوں نہیں جاتا یہ سعدی آخر! اتنے تو بم بلاسٹ ہوتے ہیں روز۔" وہ تو کہہ کر نکل گیا مگر ہاشم بے اختیار سانس روکے اس کو دیکھنے لگا۔

"سوچ سمجھ کر بولا کرو!" اس نے عقب سے قدرے برہمی سے پکارا۔ شیرو نے مڑے بغیر "بائے" کا ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھتا گیا۔

"مجھے یقین نہیں ہے' وہ دوستوں کے پاس جا رہا ہے۔"

"اگر آپ اسی طرح ہر وقت اس کو منفی رخ دکھاتی رہیں تو وہ واقعی کسی کے پاس جانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

"تمہارے خیال میں میں اس کی بھلائی نہیں چاہتی۔"

"کیا ہم سکون سے کھانا کھا سکتے ہیں؟" ہاشم واپس پلیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

"شیور!" جواہرات نے نزاکت سے شانے اچکائے' انگلی سے سامنے گرے بال پیچھے کیے اور گھونٹ گھونٹ جوس پینے لگی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نوشتہ شبانہ حیدر

دوسرا عشق

شینا ٹک ٹک کرتی اندر آرہی تھی۔ بعض اوقات تو دادی کا دل کرتا کہ جیراں سے کہہ کر شینا کی ساری سینڈلز کے نیچے کوئی نرم سا تلا لگوادیں۔ وہ جو ہر وقت ان کے دماغ میں ایک ٹک ٹک کا شور رہتا ہے۔ کم از کم اس سے تو نجات ملے۔ مگر ظاہری بات ہے۔ یہ وہ باتیں تھیں جو دادی صرف سوچ سکتی تھی۔

ان کی بہو کو یہ نہیں پسند تھا کہ وہ گھر کے معاملات اور خاص طور پر بچوں کے کسی معاملے میں بولیں۔ دادی پہلے بھی کم ہی دخل دیا کرتی تھیں اور کچھ عرصہ پہلے جب میاں کا انتقال ہوا تھا۔ انہوں نے بالکل ہی منہ کو تالا لگالیا تھا۔ بس شینا سے ہی وہ باتیں کرلیا کرتی تھیں۔

شینا ان سے پیار تو کرتی تھی، لیکن اسے یہ نہیں پتا تھا کہ گھر کے کسی کونے میں لیے ہوئے بزرگ کیا کرتے ہیں۔ زندگی میں ان کا مقصد کیا ہے۔ اس بات پر دادی جان شینا کو بے قصور سمجھتی تھیں۔ یہ فرض تو ان کے بیٹے اور بہو کا تھا۔ جب انہوں نے نہیں سمجھایا تو بچہ خود سے کہاں سیکھ سکتا ہے۔ اس لیے اس معاملے میں شینا کو پوری معافی تھی۔ لیکن باقی چیزیں ان کو کہاں فٹ کیا جائے۔ یہ تو دادی کو بھی پتا نہیں تھا۔

شینا کے عجیب و غریب فیشن، بالوں کے نت نئے اسٹائل، شلواروں کا کوئی عجیب سا ڈیزائن۔ ان کے زمانے میں تو گول شلواریں ہوتی تھیں۔ اب آج کل یہ چوکور شلواریں، وہ بھی نیچے سے کٹی ہوئی۔ انہوں نے دو تین دفعہ دبے لفظوں میں کہا بھی کہ اس کو سلوالو۔ اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھ کر پھر انسان پھٹے ہوئے کپڑے پہنے۔ یہ اچھی بات تو نہیں۔ انہوں نے تو یہ بات ڈرتے ڈرتے ہی کہی تھی، لیکن دادی کو بڑی حیرت ہوئی۔ جب بجائے برا ماننے کے وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر اس نے ان کے دونوں گالوں پر پیار کیا اور وہی اپنی اونچی ایڑی والی ہیل سے ٹک ٹک کرتی چلی گئی اور دادی دیکھ دیکھ کر ہولتی رہ گئیں۔

"ایسی پنسل جیسی کھڑی نوک کیسے سارے جسم کا بوجھ برداشت کرلیتی ہے۔" انہوں نے جیراں سے کہا۔ تو وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔

"لو میں نے کوئی لطیفہ سنادیا۔" دادی کو برا لگ گیا۔

"نہیں دادی! میں تو اس بات پر ہنس رہی تھی کہ آپ کو تو پتلی پنسل جیسی ہیل تو نظر آگئی۔ مگر اس پر کھڑی ہوئی لڑکی اس پر نظر نہیں گئی۔ وہ بھی تو پتلی پنسل جیسی ہی ہے۔"

جیراں نے اپنے ساتھ ساتھ دادی کے موٹاپے کو بھی گھسیٹ لیا۔ انہیں غصہ تو آیا۔ لیکن ملازم پرانے ہوجائیں تو اسی طرح ہوتا ہے۔

دادی نے دل میں پکا سوچ لیا کہ اب جیراں سے ذرا کم بات کریں گی۔ بہت سر پر چڑھ گئی ہے۔ لیکن جلدی ہی دادی کو احساس ہوگیا کہ ایسا بے وقوفانہ فیصلہ کرکے انہوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ جیراں ہی تو باہر کی دنیا سے رابطے کا ذریعہ تھی۔ اس سے ناراضی مول لینا کہاں کی عقل مندی تھی۔

نوکر بھی مالک کا مزاج سمجھتے ہیں اور جیراں تو یوں بھی کھلے ذہن کی مالک تھی۔ اس نے بھی دادی جان کی چار دن کی ناراضی کو بھلا دیا اور دونوں پھر باہم شیر و شکر ہوگئیں۔

"اماں جی... نوکروں کو اتنا سر نہ چڑھایا کریں۔" ان کی بہو کو یہ دودھ شکر والی دوستی ذرا نہ بھائی تھی۔ دادی جان ایسے موقعوں پر خاموش رہ کر تسبیح کے دانے گرانے لگتیں۔ بہت عرصہ پہلے انہوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اگر بہو کے ساتھ گزارا کرنا ہے، تو منہ کو سینا پڑے گا اور جس دن سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس دن سے ان کی زندگی میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت سکون تو آگیا تھا۔ اس سے دو فائدے ہوئے تھے۔ بہو کا دل بھی ہلکا ہوجاتا تھا اور گھر لڑائی جھگڑے سے بھی محفوظ رہتا تھا۔

ان کی بہو تنزیلہ زبیری ایک کلب کی سرکردہ رہنما تھیں اور ان کے پاس فالتو ٹائم نہیں ہوتا تھا کہ ان سے سوال جواب لیے جائیں، لیکن انسان تو پھر انسان ہی ہوتا ہے۔ دادی جان نے اس دن بہو کو ٹوک دیا۔

"دلہن! تم اپنے کاموں میں رہتی ہو۔" دادی کو جی کڑا کرکے بہو کے سامنے ان چیزوں کو کام کہنا پڑا، جنہیں وہ خرافات کہا کرتی تھیں۔ "میں کہہ رہی تھی کہ ذرا شینا کو بھی دیکھ لیا کرو۔"

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" تنزیلہ زبیری نے بیزار لہجے میں کہا۔ "روزانہ صبح ناشتے پر اور کبھی ڈنر پر بھی وہ ساتھ ہوتی ہے اور اتنی بڑی بچی کو دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس کے منہ میں فیڈر ڈالنی ہوتی ہے۔"



"نہیں ان کی گردن میں لگام ڈالنی ہوتی ہے۔" دادی نے صبر سے یہ جملہ سوچا کہا نہیں کہا تو یہ۔

"دلہن! تم میرا مطلب نہیں سمجھ رہی ہو۔"

"اماں! میں سب سمجھتی ہوں، مگر آپ کو کتنی دفعہ سمجھاؤں، وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ بچوں کو چوزوں کی طرح گھر میں رکھا جائے۔ آپ ہیں کہ سمجھتی نہیں ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے دلہن۔" دادی نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ لیکن بہو کا موڈ تو آف ہو گیا تھا اور اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ انہیں پتا تھا۔ ایک دو دن میں بات خلیق تک پہنچ ہی جائے گی۔ ویسے تنزیلہ زبیری جتنی بھی مصروف ہوں۔ ساس کی کوئی بات بیٹے تک پہنچانے میں کوئی سستی نہیں کرتی تھیں اور خلیق صاحب بھی صرف نام کے ہی خلیق تھے۔ انہیں یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ اماں گھر کے معاملات میں دخل دیں۔ اس سے دو نقصان ہوتے تھے۔ ایک تو گھر کا ماحول خراب ہو جاتا تھا۔ دوسرے پھر بیگم کا موڈ صحیح کرنے کے لیے انہیں اپنی جیب ہلکی کرنی پڑ جاتی تھی، تو اتنی بہت ساری چخ چخ سے تو یہی بہتر تھا کہ اماں اپنا منہ بند ہی رکھیں، لیکن پتا نہیں کیوں ہر تین چار مہینے بعد اماں یہ سبق بھول جایا کرتی تھیں۔

اور اس رات بھی یہی ہوا۔

"اُفوہ... اماں تو ایسے ہی کہتی رہتی ہیں، اس میں اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو ڈیر۔"

"مائی فٹ! میں کیوں پریشان ہوں گی۔ مجھے صرف غصہ ہے خلیق۔ اماں کیا بتانا چاہ رہی تھیں، مجھے کیا بچوں کی پروا نہیں ہے۔"

"اماں نے ایسا کچھ تو نہیں کہا ہے۔" خلیق صاحب نے حیرت سے کہا۔

"جو بات انہوں نے شہنا کے حوالے سے کہی ہے اس کا چھپا ہوا مطلب یہی تھا۔"

"اُف..." انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "کیا چیز ہوتی ہو تم عورتیں، ہم مردوں کو تو سامنے کے مطلب بھی سمجھ میں نہیں آتے اور تم لوگ چھپے مطلب... خیر کل اماں سے بات کروں گا۔"

دوسرے دن اگرچہ ان کے پاس بہت سارے کام تھے۔ ایک ضروری میٹنگ تھی۔ ڈیلی گیشن سے ملاقات کرنی تھی۔ لیکن جو سب سے اہم کام تھا۔ وہ اماں سے بات کرنے کا تھا۔ وہ انہیں یاد تھا۔

دادی جان صبح ہی صبح بیٹے کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ آج کتنے دنوں بعد بیٹے نے ان کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ آج بھی ان سے نظر بھر کر دیکھا نہیں گیا۔ انہوں نے فوراً" ہی نظر کی دعا پڑھ کر دم کیا۔

خلیق صاحب کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ دراصل ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح بات کریں، کیونکہ انہیں تو لگ رہا تھا کہ بات کچھ نہیں، لیکن بیگم صاحبہ کو برا لگا۔ تو پھر جائے فرار کہاں ممکن تھی۔ آخر انہوں نے بیچ کی راہ نکالی۔

"اماں! دو دفعہ اخلاق بھائی کا فون آ چکا ہے۔ آپ کو آنے کا کہا ہے۔ میں یہی بتانے کے لیے آیا تھا۔"

"اچھا...!" اماں کا چہرہ اتر گیا۔

وہ اخلاق صاحب کے پاس بہت کم جاتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

شہنا دوسرے دن صبح جاگی، تو اسے کچھ کمی کا احساس ہوا۔

"دادی جان! کہاں ہیں؟" اس نے جیراں سے پوچھا۔

"جی وہ تو بڑے صاحب کے یہاں گئی ہیں۔"

"مگر کیوں... کل تک تو وہ یہیں تھیں۔"

"پتا نہیں جی۔" جیراں نے صفائی سے دامن بچایا۔ حالانکہ اسے سب کچھ پتا تھا۔ مگر کون ان بڑے لوگوں کی باتوں میں پڑے۔ جن کے مزاجوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

"اچھا! ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ میں دادی کو لینے جا رہی ہوں۔"

"اچھا جی!" جیراں خوش ہو گئی۔ دادی کے بغیر اسے بھی یہ جگہ سونی لگ رہی تھی۔ پھر وہ اس کے دکھ بھی سن لیتی تھیں۔ تسلی بھی دیتی تھیں اور کچھ مدد بھی کر دیا کرتی تھیں۔

راستے میں دو دفعہ شایان کا فون آیا۔ اس نے دونوں دفعہ لائن کاٹ دی۔ وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ شایان سے بات کیا کرے گی۔ اس سے پہلے وہ رمیز کا فون بھی کاٹ چکی تھی۔

"توبہ کتنی پریشانی ہے۔" اس نے سیل فون کو سیٹ پر پٹخ دیا۔

"فیصلہ کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ دادی جان سے پوچھوں گی۔ دادی جان آپ مشکل فیصلے کے وقت کیا کرتی تھیں۔ کون سا راستہ اختیار کرتی تھیں۔ اس مسئلے نے تو میری راتوں کی نیند اڑا دی۔"

شہنا یہی سب کچھ سوچتی رہی اور ان ہی اوٹ پٹانگ سوچوں میں بڑے تایا کا گھر بھی آ گیا۔

نرگس تائی اسے باہر ہی مل گئیں۔ ان کا موڈ کچھ صحیح نہیں تھا، پتا نہیں کیوں۔

"تائی امی! خیریت، آج صبح ہی صبح آپ کا موڈ کیوں آف ہے۔" اس نے اپنے تراشیدہ بالوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"بس یوں ہی... تم بتاؤ صبح ہی صبح کیسے آنا ہوا۔"

"دادی جان سے ملنے آئی تھی۔"

"کیا واپس لے جانا ہے؟" ان کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی۔ اصل میں آج ہی انہیں اپنے میکے میں ایک فنکشن میں شرکت کرنی تھی۔ وہاں رات گئے تک کا پروگرام تھا۔ پھر اس کے علاوہ ایک دو دن میں ان کی بہن دبئی سے آ رہی تھی اور اس موقع پر ان کا ارادہ ایک شاندار دعوت اور تحفے تحائف کا تھا اور اب یہ سب کچھ ساس کی موجودگی میں تو نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ کل رات سے ہی سخت بدمزہ تھیں۔ ان کے بے وقت آنے پر۔ صبح سے ان کا غصہ نوکروں پر نکل رہا تھا۔ وہ رات کو اس بات پر اخلاق صاحب سے الجھی تھیں۔ حالانکہ لاکھ اخلاق صاحب نے کہا۔

"مجھے ہرگز بھی علم نہیں تھا کہ خلیق اماں کو لے کر آ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے یہی کہا کہ اماں کا دل تم سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ اسی لیے لے کر آ گیا ہوں۔ تو میں کیا انہیں گھر سے نکال دیتا۔"

"نہیں... گھر سے کیا نکالنا۔ میرے سر پر لا کر بٹھا دیا ہے۔ آپ نے ساری زندگی وہی کیا ہے۔ جس سے میرا دل جلے۔ آپ کو اچھی طرح سے پتا تھا کہ میرے اتنے سارے پروگرام تھے۔ لے کر سارے پروگرام کا ستیاناس ہو گیا۔ اب بتائیں میں کیا کروں۔" وہ ازحد برافروختہ تھیں۔

"یار! اماں کچھ بھی نہیں کہتی ہیں۔ تمہیں ان کی خاموشی پر بھی اعتراض ہے۔"

"ہاں ہے... سو دفعہ اعتراض ہے۔" وہ اپنا کلچرڈ لہجہ بھول کر جاہل عورتوں کی طرح بول رہی تھیں۔ "آپ مردوں کو کچھ نہیں پتا۔ ساس کی خاموشی میں بھی سو معنی ہوتے ہیں۔"

"اچھا دیکھو... کل اماں سے بات کروں گا، کہوں گا۔ ابھی واپس چلی جائیں۔ تھوڑے دنوں بعد لے آؤں گا۔"

"دیکھ لیجیے... میرے اوپر کوئی بات نہیں آئے۔" انہوں نے خبردار کیا تھا۔ شہنا کے آنے سے جو وہ خوش ہوئی تھیں۔ وہ بھی مایوسی میں بدل گئی تھی۔

"جاؤ جا کر مل لو۔ اندر بیٹھی ہیں۔" وہ بیزار لہجے میں کہتی ہوئی اندر مڑ گئیں۔

شہنا کمرے میں داخل ہوئی تو دادی جان نہ جانے خلاؤں میں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ شہنا ایک دم دادی سے لپٹ گئی۔

"دادی آپ کیوں آ گئیں، خیریت!"

"بس یوں ہی..." ان کی مسکراہٹ پھیکی تھی۔

شہنا اپنے مسئلے میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اس نے دھیان ہی نہیں دیا کہ دادی جو پہلے ہی کم بولتی تھیں۔ اب بالکل ہی کیوں خاموش ہو گئی ہیں۔ "دادی آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے؟" اس نے ان کے تھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔

"آپ نے چائے پی لی۔"

"نہیں ابھی ناشتے کے ساتھ ہی پی لوں گی۔"

انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔ گیارہ بج رہے ہیں اور آپ نے اب تک ناشتا بھی نہیں کیا۔ جبکہ آپ کو شوگر کی دوائی بھی کھانا ہوتی ہے۔ کیا تایا ابو آپ کے پاس نہیں آئے تھے۔"

دادی جان کو پہلی دفعہ اس کے جلدی جلدی بولنے کی عادت اچھی لگی۔ وہ جلدی جلدی بول رہی تھی اور کسی سوال کے جواب کا انتظار نہیں کر رہی تھی۔ اب وہ کیا بتاتیں کہ اخلاق صاحب صبح ان کے کمرے میں بھی آئے تھے اور باتیں بھی کی تھیں۔ وہ باتیں جو اکیلے میں بھی خود کو دہراتے ہوئے انسان ذلت محسوس کرے۔

اخلاق ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ پہلی اولاد پر انسان ناتجربہ کار ہوتا ہے' چھوٹے بچوں کے چھوٹے چھوٹے مسئلے بھی بڑے لگتے ہیں۔ چھوٹی سی بیماری بھی ہاتھ پاؤں پھلا دیتی ہے اور اخلاق تو تھا بھی بڑا نازک مزاج۔ ذرا سی بدپرہیزی ہوئی نہیں کہ وہ بیمار پڑا' وہ دو دو گھنٹے لائن میں لگ کر ڈاکٹر صاحب کو دکھاتی تھیں۔

ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ نو سے بارہ ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں وقت گزارنا اور جو پیسے ڈاکٹر کی فیس سے بچا پاتی تھیں' واپسی پر ان پیسوں سے کیلے یا اس طرح کی نرم سی چیز خرید لیتی تھیں۔

اس کے بعد خلیق' انہیں اپنے دونوں بچوں سے بے حد پیار تھا۔ بلکہ انہیں لگتا کہ دنیا کی ساری مائیں ہی پاگل ہوتی ہیں۔ خلیق کولڈ ڈرنک پر جان دیتا تھا اور اس کو ٹانسلز تھے۔ جب بھی کولڈ ڈرنک پیتا' زندگی ان کی اجیرن ہو جاتی۔ ڈانٹ تو پھر بہت سنی' لیکن وہ برس میں چھوٹی کولڈ ڈرنک رکھ کر لے جانے لگیں۔ وہ چھوٹا تھا۔ بچہ تھا۔ قدرے گرم سے بھی بہل جاتا تھا۔ ایسی اور کتنی ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں جنہیں یاد کرنا کبھی خوشی دیتا تھا اور اب وہ نہیں جانتی تھیں کہ اب یاد کرنا کیا دیتا ہے۔ وہ چھوٹے بچے پھر بڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ماں تھیں بیچ کا راستہ نکال لیتی تھیں۔ لیکن اولاد کبھی بیچ کا راستہ نہیں نکالتی۔

"دادی! کہاں کھو جاتی ہیں چلیں گھر' مجھے آپ سے ایک ضروری مسئلہ ڈسکس کرنا ہے۔" شینا نے بازو ہلایا۔

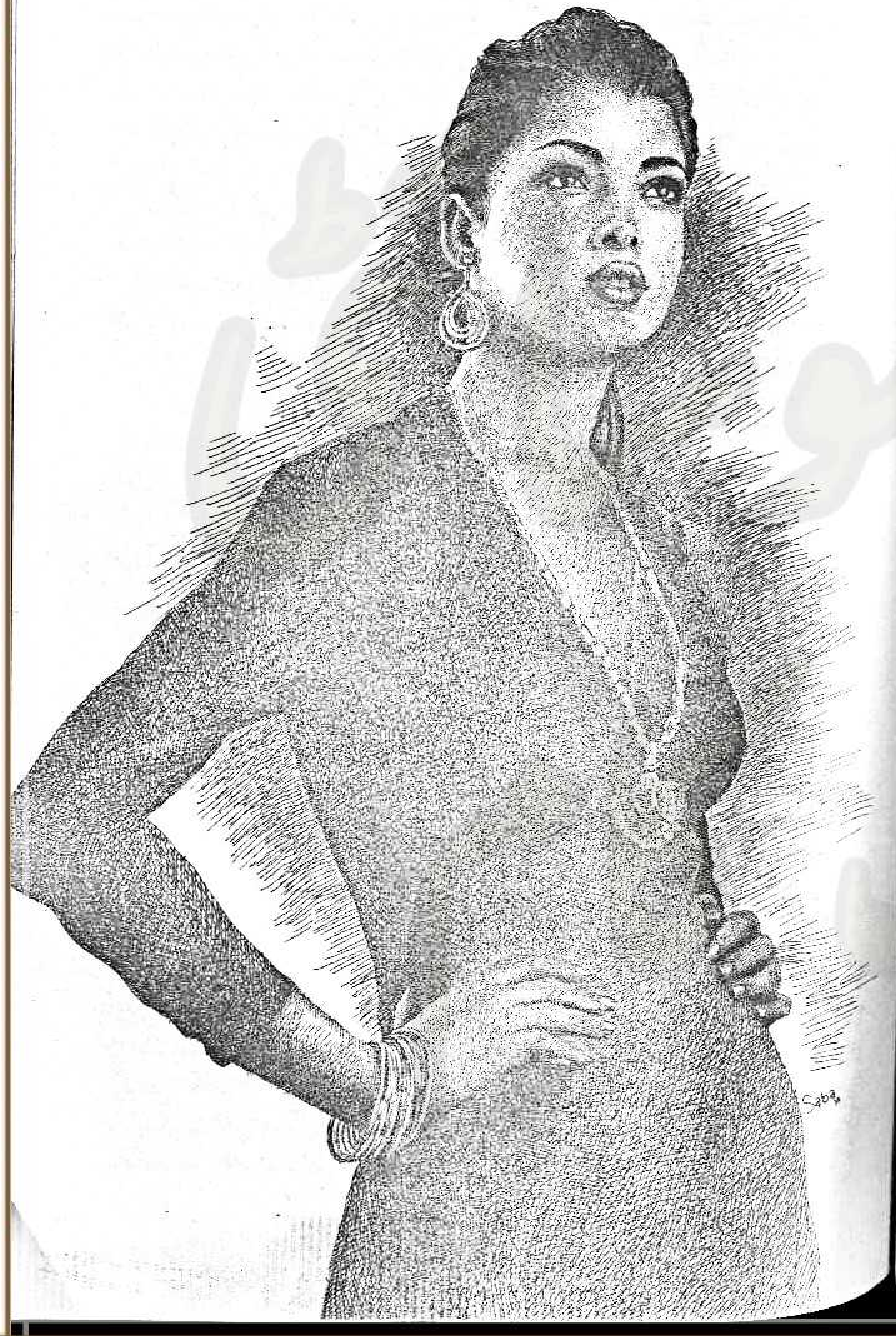
"اچھا ہیں' چلو۔" وہ ایک دم خوش ہو گئیں۔ جلدی جلدی انہوں نے سامان بیگ میں ڈالا۔ پاندان ہاتھ میں اٹھایا۔ بالوں کو دو ہاتھ مار کر ننھا سا جوڑا بنایا اور چادر پہن کر کھڑی ہو گئیں۔

"واہ دادی واہ! آپ تو لگ رہا تھا میرے انتظار میں تھیں۔" شینا نے مزے سے کہا۔ "خیر آپ جلدی سے آئیں' میں جب تک تائی کو بتا کر آتی ہوں۔"

گھر سے نکلتے وقت ان کا دل بہت بوجھل تھا۔ ابھی تو دل پر میاں کی وفات کے زخم بھی تازہ تھے۔ پھر اس پر اتنے تھوڑے سے عرصے میں بہت کچھ دیکھ لینا اور سمجھ لینا۔ بہت مشکل ہو جاتا ہے دل کو سنبھالنا اور سمجھانا۔

اور شینا انہیں نہ جانے کون سی کہانی سنا رہی تھی۔ ان کے زمانے میں تو ایسی باتوں کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ ایک محبت ہی انسان بڑی مشکل سے کرپاتا تھا اور شینا عجیب الجھن میں تھی۔ اسے اپنے منگیتر سے بھی محبت تھی اور اچانک ہی اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ایک لڑکے سے بھی دھواں دھار قسم کی محبت ہو گئی تھی۔ ویسے ساری زندگی اس نے کسی کو گھاس نہیں ڈالی تھی اور اب وہ سخت پریشان تھی۔ گھر میں شادی کی بات چل رہی تھی اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی' جذباتی اور جلد باز۔ وہ اسے سمجھائیں گی بتائیں گی جو ان کا فرض ہے' انہیں یقین تھا۔ وہ سمجھ بھی جائے گی۔ کیونکہ وقت کا سچ ایک جیسا نہیں رہتا۔ آج کا سچ اگر اس کی دو محبتیں ہیں۔ تو کل بھی یہی کچھ اس کی زندگی میں ہو گا۔ عورت تو ہمیشہ ہی دو عشق کرتی ہے۔ اسی کے گرد اس کی زندگی گھومتی ہے۔

پہلا عشق جو بھی ہو' دوسرا عشق تو اولاد ہی رہ جاتی ہے۔



سمیعہ صدف

ابھی وقت باقی ہے

"کان کھول کر سن لو میں ان ماؤں میں سے ہرگز نہیں ہوں جو بیٹیوں کے بے جا لاڈ اٹھاتی ہیں۔ بیٹیوں کو پھولوں کی سیج پر بٹھائے رکھتی ہیں اور ان کی آگے کی راہوں میں ببول اُگا جاتی ہیں۔ بیٹیوں کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالنے والی مائیں جب ان کا ساتھ چھوڑتی ہیں تا تب اولاد کو پتا چلتا ہے کہ اپنی کم عقلی اور بے جا لاڈ میں وہ اس کی راہ میں عمر بھر کے لیے انگارے دہکا گئی ہیں۔" بھابھی کی آواز نے اسے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے سے باز رکھا تھا۔

"ایک تو مجھے آپ کی یہ مشکل باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ صاف بات یہ ہے کہ میں پڑھی لکھی، خود مختار ہوں، کوئی جاہل، مجبور ہاؤس وائف نہیں ہوں۔ نہ ہی کوئی لاوارث اور بے آسرا۔ میں کیوں اپنی عزت نفس کا گلا گھونٹ کر کسی کے پاؤں میں جا گروں۔" قصلی کی آواز میں وہ ازلی خود اعتمادی تھی جو اکثر اسے دہلا دیتی تھی۔

"بیٹا یہ عزت نفس نہیں در حقیقت انا کی جنگ ہے اور اس میں پسپائی اختیار کرنا ہی دانش مندی ہے۔"

مکمل ناول



تمہارے بھائی جو آج تمہیں سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں، تمہیں وہ سگے اور میں دشمن نظر آ رہی ہوں کل کو جب تمہاری بھابھیوں کے ماتھے پر بل پڑیں گے نا تو یہی بھائی ان تیوریوں کو سیدھا کرنے میں گم ہو جائیں گے۔ شوہر کے آگے جھک جانے یا حق پر ہونے کے باوجود خاموش ہو جانے سے عزت گھٹتی نہیں ہے۔ عورت کی عزت اس کے مرد کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ اس میں کمی آئے سیدھی طرح اپنے گھر کا راستہ لو۔" ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ماما! آپ میری سگی ماں ہیں یا ساس۔ دشمنوں جیسی باتیں کر رہی ہیں۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"دشمن نہیں ہوں تب ہی سمجھا رہی ہوں اور اگر سختی کرنا پڑی تو وہ بھی کروں گی۔ اب میں تمہاری کوئی بکواس نہ سنوں۔ چپ چاپ منہ ہاتھ دھو اور ڈرائنگ روم میں آؤ۔ معیز سے سیدھے منہ بات کرنا۔ اب مجھے کوئی شکایت نہ ملے۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"مگر ماما..." اس کے لہجے میں ہنوز اعتراض تھا۔

"بیٹیاں تو ماؤں کا عکس ہوا کرتی ہیں مگر تم تو صورت کے علاوہ عادات میں بھی بالکل اپنے ددھیال پر گئی ہو۔ اللہ بخشے تمہاری دادی جان کو..." باہر کھڑے ہوئے اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بھابھی آگے کیا کہنے والی تھیں سو چپ چاپ آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔ ہیلو۔" کافی دیر ہیلو ہیلو کرنے کے بعد کہیں وہ جواباً "بولا تھا۔ حالانکہ ریسیور سے اس کی سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ غالباً" وہ اس بار بھی کسی بات پر خفا تھا۔

"کیا حال ہے؟ کیا بات ہو گئی ہے۔ بول کیوں نہیں رہے ہو؟ مجھے معلوم ہے کہ میں نے پورے دو ہفتے بعد فون کیا ہے اس لیے خفا ہو۔ بات تو کرو نا۔" کئی بے ربط جملے وہ ایک ہی سانس میں بولے چلے گئی تھی کہ کہیں بات ختم ہونے سے پہلے وہ فون بند ہی نہ کر دے۔ جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتا تھا۔

"بیٹا" اپنی ماما سے اتنے ناراض ہو۔ سوری کہہ تو رہی ہوں۔ بات کرو نا مجھ سے۔"

"آپ کو پتا ہے کہ آپ وچ (جادوگرنی) ہیں۔"

اس کی بات سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"کک۔ کیا؟ مگر وہ کیوں؟"

"ایسا کیوں کہا ہے تم نے۔" اس نے بے چینی سے دوبارہ پوچھا۔

"ہاں آپ ظالم جادوگرنی ہیں، وہ سنو وائٹ والی وچ کی طرح کی۔" اس بار اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا تھا۔

"آپ کو ایسا کس نے کہا ہے۔ آپ کے پاپا نے یا موسیٰ کی ممی نے؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر ایسا کون تھا جو اس کی اولاد کو اس کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔

"موسیٰ کی ماما نے۔" جواب حسب توقع تھا۔

"کیا؟ اس نے میرے بارے میں ایسا کہا؟" دکھ اور غصہ کے ملے جلے تاثرات سے اس کی آواز خاصی اونچی ہو گئی تھی۔

"نہیں۔ میں نے انہیں وچ کہا تھا کیونکہ انہوں نے میرا کان مروڑا تھا اور مجھے کھیلنے باہر بھی نہیں جانے دیا تھا۔" اس کے انداز میں شکایت تھی۔

"تو آپ نے پاپا کو کیوں نہیں بتایا کہ وہ آپ کو مارتی ہیں؟"

"کیا فائدہ۔ میں نے عیشا کو کاٹ میں سے گرا دیا تھا تو انہوں نے میرا کان مروڑا اور جب میں نے انہیں وچ کہا تو انہوں نے باہر جانے پر پابندی لگا دی۔ پاپا تو کہیں گے کہ مجھے اچھا بچہ بن کر ان کا کہنا ماننا چاہیے بالکل موسیٰ کی طرح۔ انہیں ہمیشہ موسیٰ ہی اچھا بچہ لگتا ہے۔" اس نے دو سال چھوٹے بھائی کا نام لیا تھا۔

"تو بیٹا آپ انہیں گڈ بوائے بن کر دکھاؤ نا، مگر میرے بارے میں انہوں نے آپ سے کیا کہا؟ مجھے وچ کیوں کہا؟" وہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر وہ اس کے بیٹے کو اس سے بدگمان کرنے کی سازش کیوں کر رہی تھی۔ شاید اپنی ماں کا بدلہ لینے کے لیے۔

"انہوں نے آپ کو وچ نہیں کہا۔ میں نے کہا ہے۔" وہ اتنی لمبی بات کر کے اب اکتانے لگا تھا۔

"مگر کیوں؟" وہ ایک بار پھر سے حیران ہو گئی تھی۔

"بی کاز انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ خود پاپا کو اور مجھے چھوڑ گئی تھیں۔ پاپا نے آپ کو نہیں چھوڑا تھا اس لیے وچ وہ نہیں آپ خود ہیں۔" اس نے ریسیور پٹخ دیا تھا اور وہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔

"میں تو تمہاری ماں ہوں بیٹا مجھ سے زیادہ تمہارا بھلا کون چاہ سکتا ہے۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

"ہاں، مگر بھلا چاہنے اور بھلا کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ ہر ماں اولاد کا بھلا چاہتی ضرور ہے، مگر ہر ماں اولاد کا بھلا کرتی نہیں ہے اور میں بھی انہی کم عقل اور خود غرض ماؤں میں سے ہوں۔"

ریسیور سینے سے لگائے وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"او کم عقل عورت، کہاں مر گئی ہے۔" آواز تھی یا شیر کی دھاڑ کہ جس سے پورا گھر گونج اٹھا تھا۔ وہ جو آٹا گوندھنے میں مصروف تھی حواس باختہ ہو کر فوراً" ہاتھ دھونے لگی۔

"اتنی گرمی میں انسان تھکا ہارا، نڈھال گھر آئے اور آگے کوئی پانی پوچھنے والا بھی نہ ہو۔ سو رہی ہو گی کہیں گھوڑے گدھے بیچ کر۔ کاہل اور نکھٹو پن تو گھٹی میں گھول کر پلایا گیا تھا نا۔" ہاتھ پونچھے بغیر پانی کی بوتل اور گلاس تھامے وہ بجلی کی سرعت سے پہنچی تھی، مگر جانتی تھی کہ بلاوجہ کی یہ جھاڑ اب وقفے وقفے سے جاری رہنی تھی۔ سردیوں کی جھڑی کی طرح۔

"ٹھاہ" کی آواز کے ساتھ گلاس دیوار سے ٹکرایا تھا۔ شکر تھا کہ وہ اسٹیل کا گلاس لے کر آئی تھی ورنہ اب تک گلاس کی کرچیاں پورے کمرے میں بکھری ہوتیں۔

"جاہل، گنوار، بازار میں اگر عقل مہنگے داموں بھی ملتی تو تجھے ضرور لا دیتا۔ اتنا ٹھنڈا پانی کہ گھونٹ بھرتے ہی گلا جکڑا جائے۔ کاش کہ تجھے عقل آ جائے پر تو تو نہ جانے کس مٹی کی بنی ہے کہ..." ٹھنڈی آہ بھر کر وہ گلاس اٹھانے لگی تھی۔

"اور چھوٹی کہاں ہے؟ جب دیکھو جاہل اور آرام طلب ماؤں کی طرح بچی کو محلے کے گھروں میں پھرنے کے لیے چھوڑا ہوتا ہے۔ آخر کو سوتیلی جو ہوئی۔ سگی ہوتی تو بچی کی تربیت اور پڑھائی کی طرف بھی دھیان دیتی۔" وہ بتانا چاہتی تھی کہ بچی کو ابھی ابھی نہلا دھلا کر سلایا ہے مگر کوئی سننے والا بھی ہوتا تب نا، خاموشی سے وہ کچن میں آ کر سر جھکائے آٹا گوندھنے لگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح عزت افزائی کا یہ سلسلہ اس کی ذات سے شروع ہو کر اس کے ماں باپ سے ہوتا ہوا پورے خاندان تک جاتا تھا۔

وہ بیڈ پر الٹی لیٹی میوزک آن کیے رسالہ پڑھ رہی تھی۔ بیڈ سے لٹکا پاؤں میوزک کے ساتھ ساتھ حرکت کررہا تھا۔ بیڈ کے ایک طرف نمکو کے خالی پیکٹ بکھرے ہوئے تھے اور سائیڈ ٹیبل پر پلیٹ میں فروٹس کے چھلکوں کا ڈھیر اور کولڈ ڈرنک کی بوتل دھری تھی۔

"زری او زری۔" اس کے متوجہ نہ ہونے پر نزہت نے ٹیپ کی آواز ہلکی کرکے اس کا بازو ہلایا تھا اس نے برا سا منہ بنا کر اس کی جانب دیکھا۔

"کیا ہے؟" انداز میں ناگواری تھی۔

"یہ چندا نے صبح سے رو رو کر اپنا برا حال کیا ہوا ہے۔ پہلے ہی اسے بخار اور موشن لگے ہوئے ہیں تم۔۔۔"

"اونہوں میں نے نہیں اٹھانا اسے 'میرے کپڑے گندے کردے گی۔" بات کاٹ کر اس نے ناک سکوڑا۔

"اچھا میں خود سنبھالوں گی اسے۔ تم ذرا ہاتھ دھو کر دو روٹیاں تو ڈال دو۔ تمہارے بھائی جان آفس سے بس پہنچنے ہی والے ہیں۔"

وہ عجلت میں کہہ کر روتی ہوئی بچی کی نیپی بدلوانے چلی گئی۔ دس منٹ بعد وہ اماں جان کے کمرے میں پانی کا جگ رکھنے گئی تو زری صاحبہ وہاں بیڈ پر پاؤں پسارے نمکو کھانے میں مصروف نظر آئیں۔

"زری تم سے روٹی بنانے کا کہا تھا۔" اس نے چندا کو ایک بازو سے دوسرے میں منتقل کرتے ہوئے یاد دہانی کرائی۔ اس وقت زری نے امداد طلب نظروں سے اماں جان کی طرف دیکھا۔

"ارے بہو ابھی تو یہ ذرا ماں کے پاس آکر بیٹھی ہے ویسے بھی اسے کہاں آتی ہے روٹی بنانی۔ تم نے پہلے ہی کیوں بنا کر نہیں رکھ دی۔ روز ہی تو بناتی ہو پھر آج کیا ہوا؟" انہوں نے تسبیح کے دانے آگے گرائے۔

"خالہ جان باقی سب کی تو بنا دی تھی 'مگر آپ کو تو پتا ہے کہ ارشد تازہ اور گرم روٹی ہی پسند کرتے ہیں تو ان کے لیے دوبارہ توا رکھنا پڑتا ہے۔ اب یہ آپ کی پوتی تو صبح سے پیٹ کے درد کی وجہ سے روئے ہی جارہی ہے۔ نہ گھڑی بھر کو چین لینے دے رہی ہے نہ اور کسی کے پاس جاتی ہے۔" اس نے اپنے تئیں وضاحت کی۔

"ایک تو تم آج کل کی مائیں بچوں کے دانت نکالنے کو سر پر ہی سوار کرلیتی ہو۔ یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ زری چھوٹی ہے 'موڈی بھی ہے اور پھر اس گرمی میں بچیوں کا کہاں دل کرتا ہے کچن میں قدم رکھنے کو 'روٹی بنانے سے تو اسے یوں بھی چڑ ہے۔" انہوں نے لاپروائی سے ہاتھ جھٹکا۔

"خالہ جان! اتنی چھوٹی کہاں ہے اس عمر میں تو میں احمر کو گود میں لیے لیے منٹوں میں گھر کا کام نمٹا لیا کرتی تھی۔" اس نے اپنے بڑے بیٹے کا نام لیا۔ زبان پھسل گئی تھی۔

"بچیوں کو کام کاج کی عادت شروع سے ہی ڈالی جائے تب ہی تو وہ آگے جاکر گھر سنبھال سکتی ہیں۔ ورنہ بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں اور سسرال والوں کی باتیں الگ سننی پڑتی ہیں۔ بس اللہ سب بچیوں کا نصیب اچھا کرے۔" ان کے ماتھے کے بل محسوس کرتے ہی اس نے نرم لہجے میں وضاحت دی حالانکہ غصہ تو بہت آیا تھا۔

"بس بس۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ میری بچیوں کی ماں بننے کی کوشش نہ کرو۔ معلوم بھی ہے کہ وہ سب سے چھوٹی اور گھر بھر کی لاڈلی ہے۔ اوپر سے اس قدر حساس ہے مگر تمہیں تو خدا جانے اس سے کیا چڑ ہے کہ جان کر اسے احساس دلاتی ہو کہ اس کی عمر میں تم بیاہی جاچکی تھیں۔ وہ تو میں نے ہی سگی بھانجی جان کر ہمدردی کرلی ہے ورنہ اس صورت اور عقل کے ساتھ کون بیاہنے آتا 'تم فکر نہ کرو۔ تمہارا نہیں کھاتی اس گھر اور اپنے بھائی پر پورا حق ہے میری بیٹیوں کا جب رشتہ طے کریں گے تو سب کام کاج ہر سلیقہ سکھا کر ہی رخصت کریں گے۔ تم خواہ مخواہ دخل مت دیا کرو۔" وہ اس کی نرمی سے کہی ہوئی بات سن کرتے سے ہی اکھڑ گئی تھیں۔

اتنا لمبا لیکچر بلکہ جھاڑ سن کر وہ برے برے منہ بناتی

باہر آگئی تھی۔

"احمر 'احمر 'یہ بہن کو ذرا تھوڑی دیر کھلاؤ میں دو روٹیاں ڈال لوں۔" گلا پھاڑ کر روتی چندا کو اس نے جھولے میں بٹھایا۔

"میں بھی خواہ مخواہ بھینس کے آگے بین بجانے لگ جاتی ہوں۔ پہلے پانچ سالوں میں آج تک کوئی ایک دن بھی ایسا آیا ہے جب بیماری یا کسی مجبوری کے سبب ہی مجھے کاموں سے چھوٹ ملی ہے یا کبھی کسی نے میری ہیلپ کروائی ہو۔" فریج سے آٹا نکال کر وہ پیڑے بنانے لگی۔

"نزہت جبین آپ کی ماسٹرز کی ڈگری ایک طرف اور ان لوگوں کی فلاسفی اور نظریات ایک طرف 'آپ چاہے جو بھی دلیل دے لیں مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ساس 'ساس ہی ہوتی ہے چاہے اپنی سگی خالہ ہی کیوں نہ ہو۔" روٹی بیلتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیسا ہے میرا بیٹا۔" پورے ایک ماہ بعد اس کی آواز سن کر اس کی ممتا کو سکون نصیب ہوا تھا۔

"ٹھیک۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کیا ہو رہا تھا؟ چھٹیاں کیسی گزر رہی ہیں۔"

"بور۔" جواب اس بار بھی ایک لفظ پر مشتمل تھا۔

پچھلے کچھ عرصے سے اس کا رویہ عجیب سے عجیب تر ہوتا جارہا تھا 'وہ اول تو لاکھ بلانے پر فون پر آتا ہی نہ تھا اور اگر آ بھی جاتا تو ہر بات کا مختصر ترین جواب دیا کرتا تھا 'انداز میں ناراضی تو نہ ہوتی تھی مگر بے زاری کا عنصر واضح تھا۔ وہ کرید کرید کر اس سے سوال کرتی تاکہ اس کے رویہ کی وجہ جان سکے مگر بے فائدہ۔ پچھلے چند سالوں میں اتنا تو اسے علم ہو ہی گیا تھا کہ اس کا باپ اسے پہلے کی طرح ہی چاہتا تھا اور اس کی دوسری بیوی۔۔۔؟ وہ اگر اچھی نہ تھی تو روایتی ظالم سوتیلی ماں بھی نہ تھی۔ اس کے کھانے پینے 'پڑھائی لباس ہر چیز کا باقی بچوں کی طرح ہی خیال رکھتی تھی۔ دیگر سوتیلی ماؤں کی طرح نہ تو اس کے باپ کو اس کی شکایتیں لگاتی نہ ہی اسے کسی قسم کے طعنے دیتی تھی 'مگر کبھی اپنے باقی بچوں کی طرح نہ اس نے پیار سے اسے گود میں بٹھا کر چوما اور لاڈ اٹھائے تھے اور نہ وہ خود اس کے پاس جاجا کر بیٹھتا اور فرمائشیں کرتا تھا۔ دونوں کے درمیان بس ایک خشک اور روکھا پھیکا سا تعلق قائم تھا۔

مگر وہ پھر بھی ماں تھی۔ اس کی سگی ماں اگرچہ وہ جانتی تھی کہ بارہ سالہ اس کا بیٹا بے حد سچا اور کھرا تھا 'مگر پھر بھی اسے کبھی کبھی وہم کا دورہ پڑجاتا تھا کہ اس کے ان بدلتے رویوں کے پیچھے اس کی سوتیلی ماں کی کوئی سازش یا ظلم کارفرما تھا کوئی دباؤ یا ڈر جس کی وجہ وہ بیان نہ کرپاتا۔ حقیقتاً یہ اس کا وہم تھا اور وہم کا علاج تو کسی ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں۔

"اچھا آپ کا رزلٹ آنا تھا نا۔ کیا بنا؟ کتنے مارکس آئے۔"

"سیونٹی ٹو (72) پرسینٹ مارکس ہیں۔" اس کے لہجے میں جتنا اشتیاق ہوتا جواب اتنا ہی بے زار کن لہجے میں ملتا 'اتنے کم نمبرز پر اسے شاک تو لگا تھا مگر وہ اس کا دل برا نہیں کرنا چاہتی تھی ورنہ وہ جس لائق فائق اور ذہین باپ کا بیٹا تھا 'اسے تو ٹاپ کرنا چاہیے تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو۔ ان شاء اللہ اگلی بار میرا بیٹا اس سے بھی اچھے نمبر لے گا۔" اس نے لہجے میں شہد ٹپکایا۔

"تھینکس۔" انداز میں خاصی بے رخی تھی۔

"پاپا نے کیا کہا آپ کے رزلٹ پر۔" اس نے پھر کریدا۔

"انہوں نے کہا کہ موسیٰ کی طرح آپ کا بھی اسکالر شپ آنا چاہیے تھا۔" اس سے دو سال چھوٹا بھائی بھی ڈبل پروموشن لے کر اس کا کلاس فیلو بن چکا تھا۔ اس جواب پر اس کا دل بجھ کر رہ گیا تھا 'ہر بار وہ عورت کسی نہ کسی روپ میں اس سے بازی لے جاتی تھی اور اب یہی کام اس کا بیٹا کررہا تھا۔

"کوئی بات نہیں آپ انہیں کہتے کہ ان شاء اللہ نیکسٹ ٹائم ضرور لوں گا۔" اس نے اپنے طور پر اس

کا حوصلہ بڑھایا۔
"نہیں لے سکتا۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا۔" سپاٹ لہجے میں کہا گیا تھا۔
"کیوں نہیں لے سکتے۔ آپ کے بابا نے پوری یونیورسٹی میں سیکنڈ پوزیشن لی تھی۔ آپ کے ماموں نے بھی ایف ایس سی میں بورڈ میں فرسٹ پوزیشن لی تھی اور یہ تو اسکول کا ایگزام تھا۔ دیکھ لینا اگلی بار آپ موسیٰ سے زیادہ نمبر لوگے اتنے تو ذہین ہو آپ۔ آخر کو میرا بیٹا ہے نا۔" اس نے پیار سے پچکارا۔
"اسی لیے تو نہیں لے سکتا۔"
اس جواب پر وہ گونگوں کی طرح کتنی ہی دیر ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہی تھی۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھابھی جلدی سے سب کے لیے شربت بنالائیں۔ سعد اور دعا کے لیے تھوڑے سے فرنچ فرائز بھی بنالینا جب تک کہ کھانا تیار ہوتا ہے۔" روبینہ نے شاپرز صوفے پر پھینکتے ہوئے پنکھا فل کیا۔
"اف اس بار تو گرمی جانے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ستمبر کا مہینہ چل رہا ہے۔" خورشید بیگم ہانپتے ہوئے چادر اتارنے لگیں۔
"لاہور میں تو بس سارا سال گرمی ہی رہتی ہے۔ سردی آتی ہی کب ہے۔" زری نے منہ بسورا۔
"اسی لیے تو اماں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ایک اے سی اور خرید لیں۔ اب بھلا اچھا لگتا ہے کہ بیٹیاں داماد گھر رہنے کے لیے آئیں اور گرمی میں سڑتے رہیں۔" روبینہ نے شاپرز سے سامان نکالتے ہوئے منہ بنایا۔
"ویسے اماں سب کے سب جوڑے کتنے شاندار بن کر آئے ہیں نا۔ کام اور کلر ایک دم زبردست۔" زری مارے اشتیاق کے نیچے ہی بیٹھ گئی تھی۔
"اور جو فرنیچر کا چنیوٹی ڈیزائن پسند کیا ہے اسے دیکھ کر تو سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ پورے خاندان میں کسی ایک گھر میں بھی ایسا شاندار فرنیچر نہیں ہے۔" اس کے انداز میں تفاخر تھا۔
"تو اور کیا سب دنگ رہ جائیں گے دیکھ کر۔ تمہاری بھابھی جو تعلیم کے بل بوتے پر بڑا اکڑتی ہے نا اس کی تو سات پشتوں میں ایسا شاندار جہیز کسی کا نہیں ہوگا میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ میری بیٹی کو کوئی کمتر نہ سمجھے پورا خاندان تو صورت اور عادات میں میری بیٹیوں کی مثالیں دیتا ہے اب خاندان سے باہر رشتہ کر رہے ہیں تو ان پر بھی خوب رعب پڑے۔ راج کرے گی میری شہزادی۔" ان کے چمکارنے پر اس کی گردن فخر سے تن گئی تھی۔
"مگر اماں! میں نے لہنگا وہ لال اور ہرا والا ہی لینا ہے۔ کیا ہوا جو تھوڑا مہنگا ہے۔ شادی کون سا بار بار ہوتی ہے۔" وہ ٹھنکی۔
"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ ارشد سے کہوں گی کہ آفس سے تھوڑا سا قرضہ لے لے مگر خیال رہے کہ بہو کو نہ پتا چلے۔" انہوں نے رازداری کے پیش نظر آواز ہلکی کی۔
"وہ لوگ تو زیور ڈالنے میں بھی اس قدر کنجوسی برت رہے تھے بس ایک ست لڑا ہار اور دو کڑے۔ وہ تو میں نے کہا کہ ہماری زری کو تو چوڑیاں بہت پسند ہیں مگر میں بھی دو گلوبند سیٹ لے لوں گی اور میرا خیال ہے کہ صوفہ سیٹ ایک اور بنوالیا جائے تو ٹھیک رہے گا۔" انہوں نے تائیدی نظروں سے بیٹیوں کی جانب دیکھا جو شربت پینے میں مصروف تھیں۔
"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ آخر میرے کمرے میں بھی تو صوفہ سیٹ ہونا چاہیے۔" اس نے سرہلایا۔
"میرا تو خیال تھا کہ ڈائننگ ٹیبل بھی بڑا والا لیتے مگر ان کنجوسوں کے گھر میں جگہ ہی کہاں ہے پہلے ہی ماموں اور شمعون کی بیویوں کے بھی رکھے ہوئے ہیں ایک تو یہ جوائنٹ فیملی بھی بڑا درد سر ہے تم پہلی فرصت میں ہی کوشش کرنا کہ نفیس بھائی سے کہہ کر ان کے وہ دوسرے فلیٹ میں شفٹ ہو جاؤ ورنہ یہ سسرال کے جھنجھٹ تو بہت بڑا عذاب ہوتے ہیں۔"

"ہائے آپی نزہت' روبینہ کی آواز سن کر وہیں رک گئی تھی۔
"منافقت' ڈبل پالیسی۔" اس نے سوچا تھا۔
"اسی لیے تو میں یہاں رشتہ کرنے میں ہچکچا رہی تھی کہ اتنا بڑا گھرانہ ہے اور سب اکٹھے رہتے ہیں مگر ارشد کا اصرار تھا کہ لڑکا بہت قابل اور شریف ہے اور خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں تو ہامی بھری۔" ان کے انداز میں فکر تھی۔
کیونکہ اس سے پہلے تو انہیں کبھی لڑکے کی شکل' قد و قامت پر اعتراض ہوتا' کسی کا رنگ سانولا لگتا' کسی کی بہنیں چالاک ہوتیں' کسی کا گھر تنگ مرغی خانہ' کوئی صاحب جائیداد نہ ہوتا اور کسی پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا۔ اس رشتہ پر بھی انہوں نے لاکھ پس و پیش کے بعد ہامی بھری تھی۔ ایک بوڑھی ماں' دو بھائی اور ان کی فیملی کے لحاظ سے ان کا ایک کنال کا گھر بھی اماں کو مرغیوں کا ڈربہ لگتا تھا۔ مگر اپنی تسلی کے لیے انہوں نے مرضی کے زیور کے ساتھ ساتھ اپنی مرضی کا حق مہر بھی لکھوایا تھا۔
"کل مجھے چار چھ گھنٹے کے لیے گھر بھی جانا ہے۔" روبینہ نے اعلان کیا۔
"آپا! کم از کم اب شادی تک تو یہیں رہو نا۔ اصغر بھائی کون سا دودھ پیتے بچے ہیں جو اکیلے نہ رہ سکیں۔ صرف دو ماہ تو رہ گئے ہیں اتنی ساری تیاری کون کروائے گا۔" دعا کو چپس کھلاتے ہوئے زری نے لاڈ سے کہا۔
"ہاں اسی لیے تو جا رہی ہوں کہ سارا سامان اور ضرورت کی چیزیں پیک کر کے ایک بار ہی لے آؤں روز کون بھاگتا رہے گا۔" اس نے سرہلایا۔
"ورنہ ان کی اماں تو کہیں گی کہ ہائے میرے منے کا کے کو کھانا کون بنا کر دے گا۔ کپڑے کون استری کرے گا' شکر ہے ابھی میں الگ رہتی ہوں۔ ورنہ ہر وقت کی کٹر کٹر کون برداشت کرتا۔" اس نے سر جھٹکا۔
"تو اور کیا آپا اگر تم سعد کی پیدائش کے وقت دو ماہ میکے آکر نہ بیٹھی ہوتیں اور وہ سب ہاتھ پاؤں جوڑ کر تمہیں منانے نہ آتے تو آج اسی عذاب میں رہ رہی ہوتیں۔" اس نے داد دینے والے انداز میں کہا۔
"ارے دعا کی بچی! بس کرو پوری پلیٹ صاف کر گئی ہو۔ کیک کے بھی دو پیس کھا چکی ہو۔ دیکھو ذرا چار سال کی عمر میں کتنا پیٹ نکلتا آرہا ہے تمہارا۔" اس نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی تھی۔
"اونہوں بچوں کو نہیں ٹوکتے کسی بھی بات پر۔ میں نے کبھی آج تک تم دونوں کو ٹوکا یا جھڑکا ہے۔"
اماں جان کی بات پر باہر کھڑی نزہت ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ ماما ماما پکارتا اس کی جانب لپک رہا تھا۔ تیزی سے وہ اس کی جانب دوڑی تھی۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرنے ہی لگا تھا کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا تھا' زور سے سینے سے لگا کر بھینچا تھا جیسے اس کی ترسی' پیاسی ممتا کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔
"ماما جھولا۔" اس نے باغ کے ایک کونے میں لگے جھولے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ اسے گود میں لیے جھولے کی جانب بڑھی تھی۔ اس میں سوار کرا کے وہ اسے ہلکا ہلکا جھولا جھلانے لگی تھی۔ وہ بھی خوشی سے قلقاریاں مارتا ہوا اس کی جانب ہاتھ بڑھاتا اور کبھی تالیاں بجانے لگتا تھا۔
اچانک تیز آندھی چلنے لگی تھی۔ جھولا یک دم تیز ہو گیا تھا۔ بچہ کے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے تھے۔ گرد و غبار کا ایک طوفان تھا جو یک دم بہت تیز ہو گیا تھا۔ جھولا اور تیز ہو گیا تھا اس کے سر سے بھی اونچا۔ دونوں ہاتھوں سے رسی مضبوطی سے پکڑے وہ اسے پکار رہا تھا مگر جھولا ہوا کے زور پر مزید اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ خوف زدہ ہو کر چلا چلا کر رونے لگا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر روکنا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ریت بھر گئی تھی اور وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ زور زور سے آنکھیں رگڑنے لگی۔ آنکھوں میں سے نکلتے پانی کے ساتھ ریت اور مٹی کے ذرات بھی باہر آنے لگے تھے' مگر

اس کی آنکھیں صاف ہوتے ہوتے اور سامنے کا دھندلا منظر واضح ہوتے ہوتے واضح طور پر بدل چکا تھا وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن آنکھیں پھر سے مل مل کر دیکھنے لگی تھی جیسے اپنی بصارت پر یقین نہ آرہا ہو۔ اب نہ وہ جھولا تھا' نہ وہ باغ۔ وہ ایک کھلے میدان میں ننگے پاؤں اور خالی ہاتھ لیے کھڑی تھی۔

اس کے علاوہ وہاں صرف ایک اور انسان تھا جس کی پشت اپنی طرف ہونے کی وجہ سے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"میرا بیٹا۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟ آپ نے اسے دیکھا ہے؟" وہ اس کا بازو ہلا کر پوچھنے لگی تھی۔ جواباً" وہ خاموش رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ چہرہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی مانوس سا لگ رہا تھا۔ سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان جس کی شیو ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے میلے اور چہرہ گرد آلود تھا اس کی آنکھوں کی لالی اور چہرے کے تاثرات اس کی تھکن کی چغلی کھا رہے تھے۔

"تت۔ تم۔ تم میرے بیٹے ہو نا۔" اس کے ذہن میں بجلی کا کوندا سا لپکا تھا۔ اپنے بازو کو اس کی گرفت سے آزاد کرواتا وہ اسے جھٹک کر آگے بڑھ گیا تھا وہ اسے چلا چلا کر بلانا چاہ رہی تھی مگر حلق میں جیسے پھندا سا لگ گیا تھا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو وہ اپنے کمرے میں ہی تھی۔ بیڈ کے دوسری طرف اس کا شوہر خراٹے لے رہا تھا۔ خواب سے حقیقت میں آکر اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"میرا لعل۔ میرا بیٹا یہاں کہاں۔ وہ تو وہ تو۔" پانی کا گلاس بھر کر اسے نے بیڈ کی پشت سے سر ٹکا لیا تھا۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ پورا ڈیڑھ سال ہو گیا تھا اسے ایسے ہی خواب دیکھتے ہوئے۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسے یاد کر کے روتی تھی مگر کسی طرح بھی اس کی مامتا کو قرار نہ آتا تھا۔

اس کا بیٹا اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اس سے میلوں کی دوری پر لاہور میں تھا۔ ڈیڑھ سال میں وہ صرف ایک بار اس سے مل پائی تھی۔ اس بار جب وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں دو ہفتے کے لیے میکے گئی تھی تو تب وہ سب لوگ چھٹیاں گزارنے پہاڑی علاقوں میں گئے ہوئے تھے۔ سو وہ اپنی پیاسی نگاہوں میں اس کی دھندلائی شبیہہ سموئے واپس آگئی تھی۔

گھونٹ گھونٹ کر کے اس نے پانی کا گلاس حلق سے نیچے اتارا۔ اسی وقت کسی کے ہاتھوں کا لمس اسے اپنے پاؤں پر محسوس ہوا تھا اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں وہ اپنی بڑی بڑی کشادہ آنکھیں لیے ایک ہاتھ میں فیڈر تھامے اس کے پاؤں کے پاس کھڑی اسے متوجہ کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں اس قدر گمن تھی کہ کس وقت وہ اپنی کاٹ سے اتر کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی اسے بالکل علم نہ ہوا۔

"ماما' ماما۔" اپنی جانب اسے متوجہ پا کر وہ ننھے ننھے قدم بڑھاتی آگے بڑھی تھی۔ "کیا بات ہے؟" اس نے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔

"دودو (دودھ) پینا جی۔" اس کی عادت تھی ہر جملہ کے آخر میں جی لگانے کی' خاص کر جب وہ کسی چیز کی ڈیمانڈ کر رہی ہوتی تب وہ کچن میں جا کر اس کے لیے دودھ گرم کرنے لگی۔ جبکہ وہ اس کا دم چھلا بنی حسب معمول ننگے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی مگر وہ اس عادت سے چڑ جاتی تھی۔ اسے سختی سے ڈپٹ کر فیڈر منہ میں ڈال کر بیڈ پر لٹا دیتی اور خود کسی کام میں مصروف ہو جاتی اس رویہ پر نہ وہ مزاحمت کرتی تھی اور نہ ہی روتی تھی کیونکہ وہ بڑی صابر بچی تھی مگر فیڈر پیتے ہوئے بھی اس کے چہرے کا رخ اور ایک ہاتھ اسی کی جانب رہتا تھا۔ کمرے میں اس کی حرکت کے ساتھ ساتھ وہ بیڈ پر لیٹے لیٹے اپنے زاویے تبدیل کرتی رہتی تھی جنہیں جان کر بھی وہ نظر انداز کرتی رہتی تھی۔ ہاں البتہ اس کی نظروں کے زاویوں سے وہ کچھ بھی نہ جان پائی تھی۔ اس کے تمام کام وہ بروقت نمٹا دیا کرتی تھی مگر کبھی بھی اسے پیار سے بلانے یا لاڈ اٹھانے کی

کوشش نہ کرتی۔ شاید وہ اپنے بیٹے سے دوری کا سبب اس نازک اور بے ضرر وجود کو گردانتی تھی۔

فیڈر اس کے منہ میں ڈال کر اس نے اسے بیڈ پر ہی لٹایا تھا کہ کہیں اس کی کھٹر پٹر کی آوازوں سے اس سوئے ہوئے کٹھور شخص کی آنکھ نہ کھل جائے' مگر وہ فیڈر منہ سے نکال کر اٹھ بیٹھی تھی اور ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی۔ اس نے کوفت بھرے انداز میں اسے پھر سے لٹانا مگر وہ دوبارہ اٹھ بیٹھی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اس نے بے زاری سے سرگوشی کی۔

"گودی (گود) آنا جی۔" پہلی بار وہ خود سے اٹھ کر اس کی گود میں آبیٹھی تھی۔

اس تین برس کی نا سمجھی بچی سے محبت کی واضح ڈیمانڈ پر وہ ایک لمحے کو تو حیران رہ گئی تھی۔ پھر اسے تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے پہلی بار اس نے اس کا ماتھا چوما تھا۔ دل کے منہ زور جذبات قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ وہ خود اپنی اس کایا پلٹ پر حیران تھی کہ کہاں اس کا سرخ و سفید' صحت مند پھولے ہوئے گالوں والا بچہ اور کہاں یہ سوکھی سڑی' عام سے نقش اور گندمی رنگت والی عام سی بچی۔ بے اختیاری میں اس کے گال چومتے ہوئے دل میں چھپی مامتا اور آنکھوں میں امڈ آنے والے سیلاب پر بند باندھنا اب ناممکن ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اس وقت کون آگیا؟" کال بیل کی آواز پر سب نے ہڑبڑا کر ملی جلی آوازوں میں یہ جملہ ادا کیا تھا' گھڑی رات کے بارہ بجا رہی تھی وہ سب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں بس جا ہی رہے تھے۔ پرس لٹکائے روتی ہوئی زری کو دروازے پر دیکھ کر سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ اماں جان کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ کافی دیر رونے کے بعد وہ بات کرنے کے قابل ہوئی تھی۔

"کیسے گھٹیا لوگوں میں بیاہ دیا ہے مجھے' جہاں کھانا پینا بھی ناپ تول کر دیا جاتا ہو۔" شربت کے دو گھونٹ بھر کر اس نے گلاس میز پر پٹخ دیا تھا۔

"پر ہوا کیا؟" اماں کا تو دل دہل کر رہ گیا تھا۔

"میں نے ذرا شام میں ایک گلاس دودھ کیا پی لیا۔ عمارہ بھابھی نے سو باتیں سنا دیں۔ ہائے میرا ولید تو فیڈر پیے بغیر سوتا ہی نہیں ہے۔ دودھ کیسے ختم ہو گیا۔" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے نقل اتاری۔

"ان کا لاڈلا دودھ کے بغیر ایک رات میں ہی بھوکا مر جائے گا نا۔ میرا کسی کو احساس نہیں کہ اس حالت میں مجھے اچھی خوراک کی کس قدر ضرورت ہے۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔

"بس اتنی سی بات۔" شربت کا جگ ہاتھ میں لیے کھڑی نزہت کی زبان پھسل گئی تھی۔ اماں اور روبینہ کی کھا جانے والی نظروں نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔

"نہیں۔ وہ دراصل میرا مطلب ہے کہ اتنی رات کو اکیلی آئی ہے زری۔ خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو۔ اس وقت گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔" اس نے کھسیانی ہو کر وضاحت کی۔

"تو اور کیا کرتی اور وہ میری ساس اس قدر میسنی ہیں کہ بجائے اس کے کہ ماموں بھائی کو دودھ لانے بھیج دیں' مجھے ہی قصوروار ٹھہرانے لگیں۔ کہتی ہیں کہ بچوں والا گھر ہے چیز ختم ہو جائے تو فوراً" مردوں کو بتانا چاہیے' تاکہ وہ وقت پر لا سکیں بھلا میرے کون سے بچے ہیں جو میں چیزوں کے ختم ہونے کا حساب رکھتی پھروں جو ٹھونستے ہیں ان کی مائیں جانیں یا باپ۔" وہ غصہ میں آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع کرا کے سب کو سونے کے لیے کمرے میں بھیجا گیا۔

نفیس احمد جو آفس کے کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے جیسے ہی گھر واپس پہنچے انہیں اماں جان کے کمرہ عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ ارشد کو بھی آفس سے

بلوالیا گیا۔ اندر کمرے میں پوری پنچائت بیٹھی تھی۔ سوائے نزہت کے، جسے کچن کے کاموں میں الجھا دیا گیا تھا مقصد اسے گھریلو معاملات سے الگ رکھنا تھا۔

"ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ کس بھوکے ننگے خاندان میں بیٹی بیاہ رہے ہیں جہاں ان کے نوالے تک گنے جائیں گے ورنہ ہم پر بیٹی بھاری تو نہ تھی۔" اماں جان کے اس قدر سخت الفاظ پر ارشد نے بھی معترضانہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا تھا، مگر بولنے کی جرات نہ ہوئی۔

نفیس احمد گھر سے تمام صورت حال معلوم کرکے نکلے تھے۔ قصہ یوں تھا کہ دن کو جو دودھ گھر میں آیا تھا وہ بروقت ابالے نہ جانے پر خراب ہوگیا تھا۔ فریج میں جو دودھ تھا وہ بھابھی نے ولید کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا، مگر دو سالہ ولید نے رات کو دودھ نہ ملنے پر نیند میں رو رو کر پورا گھر سر پر اٹھالیا تھا۔ فریج میں دودھ نہ پاکر عمارہ بھابھی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے کیونکہ اس وقت میاں کو باہر بھیجنے کا مطلب ان سے اچھی خاصی جھاڑ کھانا تھا۔

ساری صورت حال نفیس نے زری کے گھر والوں کے گوش گزار کردی تھی مگر اماں اور روبی اسے سازش اور گھٹیا پن قرار دے رہی تھیں۔ زری احتجاجاً" پورا ہفتہ میکے میں ہی رہی تھی۔ نفیس احمد ہر روز دفتر سے واپسی پر اس کے لیے ڈھیروں پھل اور دودھ بطور تلافی لے کر آتے تھے اور ہر بار کوئی نہ کوئی چبھتا ہوا جملہ ان کی سماعت کے حوالے کردیا جاتا۔

"میری بیٹی کی گود بھرنے والی ہے۔ سب جلتے ہیں اس سے۔"

اور کبھی زری کہتی۔ "میرے جہیز کا سامان دیکھ کر عمارہ بھابھی جیلس ہیں۔"

"بات کچھ بھی نہیں تھی جو اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کردیا گیا۔ بھلا سسرال میں اس طرح گزارے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔" نزہت کی بات پر ارشد محض سر ہلا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"سنیں وہ مجھے بازار لے چلیں گے؟ گرمیاں آگئی ہیں لان کے دو چار سوٹ لینے تھے۔ ریشمی کپڑوں میں کچن میں کام کرنا بڑا مشکل لگتا ہے۔" اس نے کریلے چھیلتے ہوئے سانس روک کر وضاحت دی۔

"ایسا کون سا محلے بھر کا کام کرتی ہو جو جتارہی ہو۔" اس کے لہجے میں کریلے کی کرواہٹ تھی۔

"وہ دراصل۔" الفاظ حلق میں اٹک گئے تھے۔

"کام ہی کتنا ہوتا ہے۔ سارا دن تو تم پنکھے کے نیچے بیٹھی آرام کرتی رہتی ہو۔ ایک بدمزہ روکھی پھیکی ہانڈی اور چار کچی پکی روٹیاں بنانے کو تم کچن کا کام کہتی ہو۔ ایسے کون سے پہاڑ توڑنے پڑ رہے ہیں تمہیں یہاں۔ کچھ سیکھو جا کر میری ماں سے کہ کیسے اپنی جوانی میں وہ چودہ چودہ افراد کے سب کام منٹوں میں نمٹالیا کرتی تھی۔ الٹے توے پر وہ تمیں، تمیں روٹیاں پکاتی تھی اور وہ بھی ایسی پتلی اور خستہ کہ بس۔" الفاظ کے کوڑے پچھلے چار برس سے اس کے وجود پر لگتے تھے اب تو اس نے محسوس کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ درد ہوتا بھی تھا کہ نہیں۔ بس سر جھکائے سنے جاتی تھی۔

"اتنا کام کرکرکے بھی جن کے ماتھے پر شکن اور زبان پر شکایت کا ایک لفظ نہ آئے ایسی ہوتی ہیں گھر بسانے والیاں، جو میاں کی کم تنخواہ میں بھی روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتی ہیں تم جیسی عورتوں کی طرح بے جا فرمائشیں نہیں کرتیں۔" اس نے پراٹھے کا آخری نوالہ حلق میں اتار کر چائے کا گھونٹ بھرا۔

"اس قدر بدمزہ چائے۔ یہ چائے ہے یا جوشاندہ۔" اس نے کپ میز پر پٹخ دیا ایسا کوئی پہلی بار تھوڑا ہی ہوا تھا۔ وہ جب بھی اسے مخاطب کرتا۔ الفاظ اور انداز دونوں میں زمانے بھر کی حقارت ہوتی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک بی اے پاس شخص تھا کوئی جاہل نہیں۔

وہ کتنی بھی کوشش کرتی مگر کبھی اس کی ڈانٹ پھٹکار اور کبھی سوچوں میں کھو کر کسی کام کو توجہ سے نہ کر

پاتی۔ کبھی سالن میں نمک مرچ کم زیادہ ہوجاتا، کبھی پیاز زیادہ لال ہوجاتی۔ کبھی روٹی جل جاتی، کبھی سوکھ کر پاپڑ بن جاتی۔ کناروں سے کچی گول اور پتلی روٹی بنانے کے تو اس نے خواب دیکھنے چھوڑ ہی دیے تھے، منہ ہی منہ میں کچھ ورد کرتی جب وہ کھانا میز پر لگاتی تو پہلے نوالے کے ساتھ ہی کبھی پلیٹ زمین پر جا پڑتی تو کبھی گلاس میز پر پٹخا جاتا اور پھر جو ذلت اگلے دو گھنٹے تک اس کے حصے میں آتی وہ الگ۔

"اسی لیے تو کما کما کر تھکتا رہتا ہوں کہ دو وقت کی روٹی بھی ڈھنگ کی نہ ملے۔ گھر کا حال دیکھو تو کوڑے کا ڈھیر لگا ہے۔ کپڑے دھل کر بھی داغوں سے بھرے ہوتے ہیں۔"

وہ رگڑ رگڑ کر گھر چمکانے میں مصروف رہتی، کئی کئی بار مشین میں کپڑوں کو ڈال کر دھوتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کے صاف ہونے کا یقین کرتی مگر اس کی آنکھوں میں نہ جانے کون سی خوردبین فٹ تھی کہ اسے کہیں نہ کہیں میل یا داغ نظر آہی جاتا اسے بستر کی چادر پر ایک شکن تک گوارا نہ تھی اتنی بڑی غلطی پھر بھلا وہ کیسے نظر انداز کردیتا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو دو دن کے لیے مشی کو لے کر لاہور سے ہو آؤں۔"

اس کی غرض پچھلی ذلت بھول بھال کر پھر اس کے آگے جھکنے پر مجبور کردیتی تھی وہ گداگر تھی اور گداگر کا کام ہوتا ہے مانگنا، چاہے بھیک ملے یا جھاڑ۔ ذلت تو دونوں صورت میں ہی مقدر بنتی ہے جب جھکنا مقدر ٹھہرا تو پھر عزت کا کیا سوال۔

"کیوں؟ وہاں کیا رکھا ہے؟" وہی کاٹ کھانے والا لہجہ۔

"وہ آپ جانتے تو ہیں بس ذرا عیادت کرلوں ایک نظر دیکھ آؤں تو تسلی ہوجائے گی دل کو۔" نظریں زمین میں گاڑے وہ منمنائی۔

"بہت شوق ہے گھر بار چھوڑ کر سیر سپاٹوں کا تو ابھی دفع ہوجاؤ، جب بیاہ کر آئی تھی تو پچھلے رشتوں کو دفنا کر آئی تھی نا۔" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

"بھائی جان واپس جارہے ہیں تو میں نے سوچا انہی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"تو جاؤ۔ ضرور جاؤ۔ مگر پھر اپنے بھائی کو کہنا کہ میری طرف سے بطور تحفہ واپسی پر تمہیں اپنے پاس اپنے گھر میں ہی رکھ لے۔ پہلے ہی مشکل سے جان چھڑا کر اس نے اپنی مصیبت میرے سر منڈھی ہے کہ میاں اب بجاؤ گلے کی گھنٹی۔"

اس کی زبان کو اب بریک لگنا مشکل ہی تھا وہ سر جھکائے پیروں کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو بیٹا۔ میں کتنی بار فون کرچکی ہوں۔ پلیز میری اس سے بات کرادو۔"

"جی وہ شاید بات نہیں کرنا چاہتا تب ہی ریسیور سائیڈ پر رکھ کر چلا گیا ہے۔" دوسری طرف شاید موسیٰ تھا۔ وقت اور عمر کے ساتھ آواز و انداز میں بھی بدلاؤ آرہا تھا اس کی آواز پہلے سے بھاری ہوگئی تھی اس لیے اسے پہچاننے میں دقت ہوئی۔

"اسے ایک بار پھر جا کر کہو نا بیٹا۔" اس نے منت بھری آواز میں کہا۔

"اچھا کہتا ہوں۔" انداز میں بے زاری تھی۔

"فار گاڈ سیک تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ یا تو جاکر بات کرو یا خود ہی صاف کہہ دو کہ نہیں کرنی بات۔ مجھے کیوں بیچ میں لاتے ہو۔" دوسری طرف موسیٰ سخت چڑ کر اسے کہہ رہا تھا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ فون پر آیا تھا۔

"کیا ہے؟ کیوں کرتی ہیں مجھے فون؟" سخت الفاظ اور رویوں کی تو وہ عادی ہوچکی تھی۔ کیا فرق پڑتا تھا اگر اپنا بیٹا بھی اسی طرح بات کرتا تھا تو۔

"ماں ہوں تمہاری۔ اس لیے کرتی ہوں۔"

"او سلی۔ صرف پیدا کرکے آپ نے ماں کی ذمہ داری تو پوری کردی نا۔ اب جان چھوڑیں میری۔"

وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں بچے یوں بھی بات بے بات چڑنے اور بدگمانیوں کا شکار ہونے لگتے ہیں وہ

تو پھر بھی بروکن فیملی کا ایک جذباتی طور پر منتشر لڑکا تھا ابھی ابھی لمبی بیماری سے اٹھا تھا۔ تین ماہ پہلے بائیک پر ون ویلنگ کرتے ہوئے اس کا شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ فریکچرز اور جگہ جگہ ٹانکوں نے جہاں اسے بستر سے نہ اٹھنے دیا وہیں اس کا ایک سال بھی ضائع ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ بھی موسیٰ کے ساتھ ہی فرسٹ ایر کے ایگزامز دے رہا ہوتا۔ اس کے پاپا سخت گیر باپ تو نہ تھے مگر اس بار انہوں نے اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی کیونکہ اب سوال اس کے مستقبل کا تھا۔ اس کی اسٹیپ مام نے دو چار جملے کہہ کر ہمیشہ کی طرح خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس سب سے جہاں اسے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اس کا باپ واقعی اس کی بہت کیئر کرتا تھا اپنی باقی اولادوں کی طرح، مگر ان سے کمپیئر کرتے ہوئے وہ ہمیشہ اسے ان کے مقابلے میں بی گریڈ دیا کرتا تھا اس بات سے اسے شدید چڑ تھی۔

"تم مجھ سے اتنا بدگمان کیوں ہو بیٹا۔ میری مجبوریاں تھیں ورنہ کون ماں اپنے لخت جگر کو یوں چھوڑتی ہے؟"

"اینی ویز جو کچھ بھی تھا۔ مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے آپ کی باتوں میں۔" اس نے شدید کوفت بھرے انداز میں کہا۔

"میں بہت دفعہ آنا چاہتی تھی تمہاری خیریت پوچھنے۔ تمہیں دیکھنے کو دل تڑپ تڑپ جاتا تھا تمہارے ایکسیڈنٹ نے تو میری جان نکال دی تھی۔ نہ تم سے بات ہو پاتی تھی نہ تمہاری صورت دیکھنے کو ملتی تھی۔ تمہیں کیا خبر میرا جو حال تھا۔ دن میں کئی کئی بار میں خدا سے شکوہ کرتی تھی کہ تمہاری جگہ مجھے کیوں نہیں کچھ ہو گیا۔ رات بھر جاگ جاگ کر تمہاری صحت کی دعائیں مانگی ہیں میں نے۔ نوافل ادا کیے ہیں۔ مجھے معاف کر دو بیٹا۔ میں بالکل اچھی ماں نہیں ہوں۔ میں بالکل اس لائق نہیں تھی کہ مجھے تم جیسا ہیرا بیٹا ملتا۔"

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ کیا نہیں تھا اس کی آواز میں درد، ملال، پچھتاوا سب کچھ ہار جانے کا دکھ۔ وہ دم بخود سا اس کی باتیں سنتا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ماما! ذرا ریزر پکڑائیں۔" وہ اپنی اسٹوری بک پر پنسل سے اپنا نام لکھ لکھ کر مٹا رہی تھی اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے ریزر تھمایا۔

"کاش قسمت کی تحریر مٹانے کے لیے بھی کوئی ربڑ ہوتا یا پھر کوئی ایسی ٹائم مشین ایجاد ہو سکتی کہ انسان اس کا بٹن دبا کر ماضی میں واپس پہنچ جاتا۔ زندگی پھر سے شروع کرتا۔ تب زندگی میں دور دور تک کوئی پچھتاوا نام کی شے نہ ہوتی۔ کوئی اگر یا کاش نہ ہوتا یا پھر زندگی بھی کہانی کی کوئی کتاب ہوتی جہاں گناہ گار کو اس کی غلطی کی سزا ملتی اور پھر انجام "سب ہنسی خوشی رہنے لگے" پر ہوتا۔" اس پر آج پھر مایوسی کا دورہ پڑا تھا۔

"روز حشر بھی انسان یہی سوچ رہا ہو گا کہ کاش یہ نہ کرتا اور یہ کرتا۔ مگر میری زندگی تو روز ہی کسی پل صراط سے گزرتی ہے۔ صرف ایک لفظ کاش کسی سیاہ دھبے کی مانند پھیل کر زندگی کی پوری کتاب کو سیاہ کر گیا ہے۔ اب نہ ہاتھوں میں سکت ہے نہ ہی وقت کہ اس کتاب کو پھر سے کسی خوشنما انداز میں لکھا جائے۔ کیسٹ کو ریوائنڈ کر کے پھر سے سنا جائے۔ زندگی کیوں ہمیں دوبارہ ایسا موقع فراہم نہیں کرتی کیوں پچھتاوا بن کر رہ جاتی ہے۔"

کچن میں برتن دھوتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچے جا رہی تھی۔

"ماما مجھے چپس بنا دیں۔" سات سالہ مشی بھاگتی ہوئی اندر آئی تھی۔ اس نے اس کے دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹ کر ساڑھی باندھی ہوئی تھی، کندھے پر اس کا پرس اور پاؤں میں اس کا ہیل والا جوتا۔ یہ سب لوازمات بتا رہے تھے کہ آج اس کی الماری میں بھونچال آیا ہو گا۔

"چلیں بچے! آپ جلدی سے اپنا کلاس ورک کمپلیٹ کریں سب نے مشی کی طرح نیٹ کام کرنا

ہے۔ دیکھا آپ نے کہ مشی کلاس کی سب سے اچھی بچی ہے۔ بالکل کسی فیری (پری) کی طرح" وہ ٹیچر کا روپ دھارے ہاتھ میں اسکیل اٹھائے فرضی بچوں کو لیکچر دے رہی تھی۔ بچے بھی کھیل میں ہمیشہ وہی روپ دھارتے ہیں جو وہ ہوتے نہیں مگر بننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ شاید اسی طرح ان کی ناتمام حسرتوں کو تسکین ملتی ہے۔

"چلیں بیٹا۔ جلدی سے اپنا ناشتا ختم کریں پھر ماما اور بابا آپ کو زو (Zoo) لے کر جائیں گے۔ ماما بابا کی پرنسس کو پارک بھی جانا ہے نا۔" اب کی بار وہ بالوں کا ٹیڑھا میڑھا سا جوڑا بنائے بالکل اس کی طرح دوپٹا سر پر اوڑھے اس کا کردار ادا کر رہی تھی۔

"بیٹیاں تو ماں کا پرتو ہوتی ہیں۔ عکس در عکس ایک ہی شبیہہ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مائیں بیٹیوں کی راہوں میں پھول بچھاتے بچھاتے انہیں کانٹے چننے کا ہنر نہیں سکھاتیں۔ پھر ایسی بے ہنر، ناتجربہ کار بیٹیاں پیروں کی ایڑھیوں میں چبھے کانٹے نکالنے کی کوشش میں اپنی انگلیوں کی پوریں چھلنی کر بیٹھتی ہیں۔ اولاد کو مرغی کی طرح اپنے پروں میں چھپائے رکھنے والی مائیں کس قدر خوش فہم ہوتی ہیں کہ جیسے ان کی یہ ڈھال ہمیشہ قائم رہے گی۔"

اس کی انگلی میں گلاس کا کانچ چبھ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ نلکے کے نیچے رکھ دیا۔ خون کا لال فوارہ پانی میں شامل ہو کر مدھم ہونے لگا تھا، مگر تکلیف ہنوز برقرار تھی۔

"کچھ زخم کبھی نہیں بھرتے۔ بظاہر ان کے نشان تک مٹ جاتے ہیں اور ان میں سے رسنے والے خون اور اٹھنے والی ٹیسوں کا کسی کو پتا بھی نہیں چلتا مگر وہ ناسور کی مانند کبھی ختم نہیں ہوتے۔" انگلی دباتے ہوئے وہ کراہی تھی۔

"ارے تم سے کہا بھی تھا کہ ماسی سے کہتیں کباب تل دے۔ اب کہیں چھالا ہی نہ بن جائے ہاتھ پر۔ لاؤ میں مرہم لگا دوں فوراً۔" ماضی کی بازگشت نشتر بن کر دل میں پیوست ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ ہمیشہ میری ہر بات کو چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں۔ مجھے تو بہت ٹینشن ہے۔ جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں یہی سوچتی رہتی ہوں کہ کیا بنے گا ان کا۔ آپ واحد مرد ہیں اس گھر کے اس گھر کے سربراہ ہیں تو اپنا حق استعمال کریں شروع میں ہی اگر بہنوں بیٹیوں کو سمجھا دیا جائے کہ راضی خوشی آتی ہیں تو سو بار آئیں مگر روٹھ کر کبھی بھی میکے کا رخ نہ کریں تو نوبت یہاں تک آئے ہی کیوں۔"

وہ حسب معمول کتاب ہاتھ میں اٹھائے لاپروائی سے سنے جا رہے تھے۔

"چلو روبینہ کی شادی تو پھر بھی فیملی میں ہوئی ہے، گزر گئی۔ جب بیٹیوں کے رشتے باہر کیے جاتے ہیں تو بہت سوچ سمجھ کر چلنا پڑتا ہے یوں دامادوں کو گھر بلا کر ان کی بے عزتی کرنا، باتیں سنانا کہاں کی عقل مندی ہے اور بحیثیت بیوی کیا زری کا یہ فرض نہیں تھا کہ گھر کے مسئلوں کا میکے میں اشتہار نہ لگائے، میاں بیوی میں سو باتیں، لڑائی جھگڑے چلتے ہی رہتے ہیں۔" دھلے کپڑے سمیٹتے ہوئے وہ مسلسل بول رہی تھی۔

"رشتوں کے درمیان واحد زنجیر زبان کا پردہ اور جھجک ہوتی ہے اور اگر یہ بھی نہ رہے تو باقی کچھ بھی نہیں بچتا۔" اس نے احمر کو بیڈ پر لٹایا جو آڑھا ترچھا ہو کر صوفہ پر ہی سو گیا تھا۔

"تم جانتی تو ہو کہ اماں جان بھلا کب کسی کے رعب میں آتی ہیں۔ نہ وہ کسی سے دبتی ہیں اور نہ ہی کسی کا ادھار رکھنے کی قائل ہیں۔" انہوں نے پاؤں کی جانب سے بستر کی چادر درست کی۔

"ہر جگہ مقابلہ بازی نہیں چلتی۔ مجھے وہ کچھ بھی کہہ لیں، میں ٹھہری بہو۔ زیادہ سے زیادہ پلٹ کر جواب دے سکتی ہوں، منہ بنا سکتی ہوں، مگر داماد کو اگر اس طرح بے عزت کیا جائے تو وہ ایک نہ ایک دن تو جتائے گا نا کہ میں داماد ہوں۔" اس کی بات سن کر وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ پائے تھے۔

زری بیٹے کی پیدائش کے تین چار ماہ بعد ہی سسرال سے الگ ہوگئی تھی۔ پھر بھی بات بے بات روٹھ کر میکے آنے کی عادت اب تک قائم تھی۔ ہر بار نفیس احمد اسے منانے آتے اور ساتھ ہی انہیں سب کی باتوں اور طعنوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا۔ سسرال آنا جانا اس نے بالکل ترک کردیا تھا۔ بلکہ عید بقرعید پر بھی وہ دو دن پہلے ہی ان کے ہمراہ میکے آجاتی تھی۔ سسرالی رشتہ داروں میں سے کوئی اگر اس کے گھر آبھی جاتا تو اس کا سرد رویہ محسوس کرکے دوبارہ آنے کی جرات نہ کرتا۔ نزہت دبے دبے لفظوں میں میاں کو بہت کچھ کہتی مگر وہ ایک بار ہی بہنوں کو نصیحت کرکے سب کی طویل ناراضی مول لے چکے تھے۔

یوں تو زری کو نفیس کے سب ہی رشتہ دار ناپسند تھے، مگر اسلام آباد میں مقیم زوبیہ خالہ اور ان کی بیٹی فرحانہ سے تو وہ خاص طور پر بیر رکھتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ نفیس احمد کے گھر والے اور وہ خود بھی ان کا رشتہ خوب صورت اور تعلیم یافتہ فرحانہ مرزا سے کرنے کے خواہش مند تھے، مگر کچھ خاندانی مسائل کے باعث یہ رشتہ طے نہ ہوسکا تھا کیونکہ فرحانہ کے تایا اور سرپرست اسے بہو بنانے کے خواہش مند تھے، مگر نفیس احمد کی شادی کے کچھ ماہ بعد ہی ان کے بیٹے نے کسی کلاس فیلو سے شادی کرکے یہ قصہ بھی تمام کردیا۔

جب بھی زوبیہ آنٹی یا فرحانہ کا فون آتا زری گھر بھر میں خوب ہنگامہ کرتی اور جی بھر کر انہیں کوسنے دیتی حالانکہ زوبیہ خالہ کبھی ان کے گھر تک نہ آئی تھیں۔ مگر اس روز تو حد ہی ہوگئی۔

نفیس احمد کی تمام فیملی عمرہ پر گئی ہوئی تھی کہ زوبیہ خالہ اور فرحانہ اچانک رات کی فلائٹ سے ان کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ فرحانہ نے ایم فل کے بعد جاب کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا اور اس کا انٹرویو لاہور میں تھا۔ دو چار بار کی ملاقاتوں میں انہیں زری کی طبیعت کا اندازہ بھی نہ تھا۔ وہ رات گئے آئیں اور اس کے ماتھے کے بل محسوس نہ کرتے ہوئے آرام کرنے چلی گئیں۔

اگلے دن وہ حسب معمول دیر تک سوتی رہی۔ گیارہ بجے اٹھتے ہی پہلا خیال یہ آیا کہ نفیس احمد کے آفس سے لوٹنے سے پہلے ان دونوں کو امی کی طرف جانے کا بتا کر واپس روانہ کردے یہی سوچتے ہوئے وہ کچن میں آئی تو وہاں فرحانہ کو چائے بناتے دیکھ کر اسے آگ لگ گئی۔ فرحانہ نے اس سے چائے کا پوچھا تھا۔

"فی الحال میں مسز نفیس ہوں، تم کن ہواؤں میں ہو؟" فرحانہ کے آگے جتانے والے انداز میں کہتی برتن ادھر ادھر رکھنے لگی جبکہ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں چائے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

اندر لاؤنج سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جب نفیس کی آواز اسے چونکا گئی۔ اس کے حساب سے تو انہیں آفس میں ہونا چاہیے تھا۔

"آپ فکر نہ کریں آنٹی! میں آپ کا اپنا بیٹا ہی تو ہوں۔" ان کے انداز کی اپنائیت اسے سر سے پاؤں تک جلا گئی تھی۔

"آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔ میں اپنے جاننے والوں کو بھی کہہ دیتا ہوں۔"

"بس بیٹا! میں نے تمہاری اماں اور بھائیوں کو بھی کہہ رکھا ہے کہ کوئی مناسب رشتہ ہو نظر میں تو بتائیں۔ میں جلد از جلد فری کے ہاتھ پیلے کردوں۔ اس سے پہلے کہ میری بچی کچھی سانسیں بھی ختم ہوجائیں۔"

وہ پچھلے کئی سالوں سے بی پی اور دل کے مرض میں مبتلا تھیں۔ ڈاکٹرز نے بائی پاس کروانے کا کہہ رکھا تھا، مگر وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوئے بغیر اس کے لیے قطعی آمادہ نہ تھیں۔

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ اتنی اچھی تربیت کی ہے آپ نے فرحانہ کی کہ جس کے گھر بھی جائے گی وہ ناز کرے گا اپنی قسمت پر اور دعائیں دے گا آپ کو اس اعلا تربیت پر۔" ان تعریفی الفاظ پر تو وہ جل کر کوئلہ ہوگئی تھی۔

"ہاں تو اور کیا۔ آنٹی جی وہ خوش قسمت میں ہی کیوں نہیں ہوسکتا۔ صاف اور سیدھی بات کریں جو

آپ دونوں کے دلوں میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان گول گول باتوں میں آنٹی جی کی بچی کچھی سانسیں بھی ختم ہوجائیں۔" اس کے کاٹ دار الفاظ پر وہ بت بن گئے تھے۔

"ہوش میں تو ہو زری۔ کیا اول فول بکے جارہی ہو۔" نفیس احمد نے اس کا بازو پکڑ کر اسے جھٹکا دیا۔

"آپ لوگوں نے تو میرے نیند میں ہونے کا فائدہ اٹھا کر رشتہ بھی طے کرلیا، میں کہاں ہوش میں ہوں۔ آپ کے تو دل کی کلی کھل گئی ہوگی نا اپنی فری کو اس گھر میں دیکھ کر اور معاف کیجیے گا آنٹی اگر آپ پر بیٹی اتنی ہی بھاری ہے کہ دونوں ماں بیٹیاں جاجا کر شادی شدہ مردوں کی منتیں کرنے پر مجبور ہوگئی ہیں تو نفیس ہی کیوں؟ مامون اور شمعون بھائی کی خدمات حاصل کریں۔ بڑا خوش رکھے گی آپ کی سگھڑ، تعلیم یافتہ بیٹی۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر لگا تھا، اس کے قدم ڈگمگا گئے حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ کبا اس شخص نے کبھی اسے ڈانٹا یا ذلیل کیا ہو اور آج خالہ اور اس کی بیٹی اتنی عزیز ہوگئیں کہ ان کی وجہ سے اس پر ہاتھ اٹھالیا۔ نفیس احمد نے اسے فوراً "باہر چلے جانے کو کہا تھا، جبکہ اس کے مڑنے سے پہلے ہی زوبیہ آنٹی صوفہ کا سہارا لینے کی کوشش کرتی ہوئی نیچے بیٹھتی چلی گئیں۔ پرس کندھے پر لٹکائے دوسرے بازو میں اپنے بیٹے کو سنبھالے گھر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے فرحانہ کو "امی، امی جان" پکارتے سنا تھا جبکہ نفیس احمد ایمبولینس کا نمبر ڈائل کررہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں نے جب منع کیا تھا تو کیوں کرتی ہیں بار بار یہاں فون۔" اس بار اس کی آواز میں ناراضی تھی مگر اجنبیت نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بات سے سخت افسردہ ہو کر دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کوئی سامع تلاش کررہا تھا۔ دس منٹ کی گفتگو میں کوئی سات بار اس نے یہ جملہ بولا تھا۔

"کیونکہ تم میرے بیٹے ہو اور چاہے تم مجھ سے کتنے دور ہو اور کتنے ہی ناراض کیوں نہ ہوجاؤ میں تمہیں ہرگز ہرگز بھول نہیں سکتی۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں کسی کا بیٹا نہیں ہوں۔ نہ آپ کا، نہ آپ کے سابقہ شوہر کا۔" اس نے منہ بنایا۔

"تو اپنے پاپا سے کیوں ناراض ہو؟" وہ فوراً" ہی اس کے غصہ کی وجہ جان گئی تھی۔ "کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ موسیٰ اور عیشا کے فادر ہیں اور میرا قصور یہ ہے کہ میں ان کی فیورٹ بیوی کا بیٹا نہیں ہوں۔ آپ کا ہوں۔"

"ایسا نہیں کہتے بیٹا۔ میں مانتی ہوں کہ جو بھی ہوا اس میں میرا قصور رہا ہے، مگر تمہارے پاپا کی تو کوئی غلطی نہیں۔ وہ تمہیں بے حد چاہتے ہیں۔" زندگی میں پہلی بار اس شخص کا دفاع کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ تو اسے چھوڑ ہی چکی تھی۔ کم از کم اب اس کے دل میں باپ کی محبت کا بھرم تو قائم رہنے دیتی۔

"خاک چاہتے ہیں۔ انہیں میری ہر بات میں کیڑے نظر آتے ہیں۔ میرا کھانا پینا، سونا جاگنا سب غلط۔ بات کرنے کا طریقہ غلط میری فیلڈ غلط میرے گریڈز سب کچھ غلط۔ کیونکہ میرے گریڈز ان کے باقی بچوں سے کم آتے ہیں۔ ان کی طرح میڈیکل، انجینئرنگ پڑھنے کے بجائے میں کامرس کیوں لینا چاہتا ہوں۔ کان پک گئے ہیں میرے یہ سب سن سن کر۔"

"تو آپ انہیں شکایت کا موقع نہ دیا کرو نا۔" "ان کی باتیں مانو گے تو انہیں آپ کا ہر کام پسند آئے گا۔" اس نے اپنے تئیں اسے بہلایا۔

"میں نے بھی کل انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ جو سختی اور رعب وہ مجھ پر دکھاتے ہیں نا اگر آپ پر اس کا آدھا بھی دکھایا ہوتا نا تو آج میں بھی ان کا پرفیکٹ بیٹا ہوتا۔" اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ اکثر ایسی بات کرجاتا تھا کہ اس کا دل کرتا شرم سے کہیں جا کر ڈوب مرے۔

"بھلا کوئی کہہ سکتا ہے یوں بچوں کی طرح ناراضی

دکھا نا میرا یہ بیٹا پورے انیس برس کا ہو گیا ہے۔" اسے خود پر قابو پانے میں کمال حاصل ہوتا جا رہا تھا۔

"نہیں تو میرے سب دوستوں پر ہی اعتراض ہے۔ لقمان روز روز کیوں چلا آتا ہے ' محمد کے موبائل پر ہر وقت لڑکیوں کے فون آتے رہتے ہیں۔ تیمور کی فیملی انتہائی کرپٹ ہے۔ فضا سے فاصلہ رکھو۔ تمہاری پھوپھو کی فیملی کافی کنزرویٹو ہے۔"

وہ آج دل کی ساری بھڑاس نکالنے پر تلا ہوا تھا۔ اور وہ بے حد خوش تھی کہ چلو کسی بہانے ہی سہی وہ اس سے اپنے دل کی باتیں تو شیئر کر رہا تھا۔

"فضا... فضا۔" اس نے ذہن پر زور دیا۔

"وہ تمہاری پھوپھو سائرہ کی بیٹی جو شاید تم سے کچھ ماہ چھوٹی تھی۔" اس کی یادداشت نے بروقت ساتھ دیا تھا۔ "اور اس کا ایک جڑواں بھائی بھی تھا۔ تمہارے پاپا کی کزن کے بچے ہیں نا۔"

"ہاں وہی..." انداز سرسری سا تھا۔

"اچھا تو وہ لوگ پاکستان کب شفٹ ہوئے۔" اس کے دوستوں میں محض ایک لڑکی کے ہونے نے اس کے تجسس کو ہوا دی تھی۔

"دو سال پہلے۔"

"تمہیں پسند ہے وہ؟" اس نے اس طرح پوچھا جیسے ماں بیٹے میں بڑی گہری دوستی رہی ہو۔

"اف موم! کی مام کی طرح آپ کی بھی وہی ٹیپیکل عورتوں والی سوچ ہے۔ میری کلاس فیلو ہے اور بہت اچھی فرینڈ بھی ' کیونکہ وہ میری سب فیلنگز کی بہت ریسپیکٹ کرتی ہے اور انڈر اسٹینڈ بھی اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔" بظاہر اس نے تردید کی تھی 'مگر اس کا وضاحتی انداز اسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

"میرا بیٹا۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے نا!"

وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

سیانے کہتے ہیں کہ کسی کو اس حد تک نہیں آزمانا چاہیے کہ مایوسی کے علاوہ ہاتھ کچھ بھی نہ آئے۔ پیمانے کو اتنا ہی بھرو جتنی گنجائش ہو ورنہ چھلک پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں چھید ہو جائے اور وہ کسی کے کام کا نہ رہے 'مگر انسان تو پھر انسان ہے حسیات سے عاری روبوٹ نہیں۔ ضروری تو نہیں کہ جو بول نہ سکے 'پلٹ کر جواب نہ دے وہ محسوس کرنے کی حس سے بھی عاری ہو۔ بات ظرف کی ہے اور کس کا پیمانہ ظرف کب اور کہاں لبریز ہو کر چھلک پڑے یہ کوئی نہیں جانتا۔

تو ایسا ہی کچھ ہوا تھا نفیس احمد کے ساتھ بھی۔ ان کی ہر دل عزیز خالہ جو دل کے مرض کے اس اسٹیج پر تھیں کہ ڈاکٹرز نے ذرا سے صدمے کو بھی جان لیوا قرار دے دیا تھا پورا ہفتہ اسپتال میں رہنے کے بعد انہی ڈاکٹرز کو سچا ثابت کرتے ہوئے سب دعاؤں اور آنسوؤں سے بے نیاز ہو کر بیٹی کو کوئی مضبوط چوار دیے بنا ہی چپ چاپ آنکھیں موند گئی تھیں۔ ان کی تدفین اسلام آباد میں ہونا تھی۔

جب نفیس احمد 'زری کو آخری رسومات میں شرکت کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی لینے آئے تو ایک محاذ جنگ ان کے لیے تیار تھا۔ یہ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ زری ان کے ساتھ چلنے کی ہامی بھرتی 'مگر اس کے گھر والے بھی ہمیشہ کی طرح یہ سمجھ کر بیٹھے تھے کہ ہر بار کی طرح آج بھی ان کے غضب کے آگے نفیس کی مزاحمت دم توڑ جائے گی 'مگر ہم جو سوچتے ہیں ہر بار ایسا نہیں ہوتا۔ وہ جو رسی ڈھیلی کرتا ہے کب اس کا سرا کھینچ لے 'اس کا اندازہ اگر انسان کو بروقت ہو جائے تو زندگی میں کوئی پچھتاوا 'کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔

"زری! میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"ارے واہ 'کوئی زبردستی ہے؟ نہیں جائے گی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ تمہاری خالہ کی موت کی ذمہ دار یہ نہیں ہے بلکہ ان کی اپنی لڑکی کے کرتوت ہیں اور بھیجیں یونیورسٹی اور دیں آزادی۔" نفیس احمد جیسے تعلیم یافتہ 'شریف النفس انسان کے لیے بھلا کہاں ممکن تھا جہالت سے مقابلہ کرنا تب ہی وہ ہمیشہ خاموش

ہی رہتے آئے تھے۔

"خالہ جان! آپ ہم میاں بیوی کے معاملات میں دخل مت دیں۔ ڈھائی سال ہو گئے ہیں مجھے آپ لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے ہوئے۔ آپ ہی ہیں جو اسے الٹی پٹیاں پڑھاتی ہیں اور آپ جیسی مائیں اپنی بیٹیوں کے گھر کبھی بسنے نہیں دیتیں اور اس جیسی کم عقل عورتیں جنہیں نہ خود میاں کی عزت کرنی آتی ہے نہ اوروں سے کروانی۔ نہ انہیں گھر کے جھگڑوں کا اشتہار لگاتے ہوئے بے عزتی کا احساس ہوتا ہے۔" آتش فشاں کے پھٹنے سے لاوا ابل رہا تھا۔ تباہی تو آنا ہی تھی۔

"بھائی! آپ غصہ مت کریں۔ یہ کم عقل ہے بے وقوف ہے۔ ہم سمجھائیں گے اسے۔ آپ تو..." زہت کو اماں جان کی کڑی نظروں نے خاموش کرا دیا تھا۔

"میرا خیال ہے زری! تمہیں چلے جانا چاہیے۔" ارشد نے بھی بیوی کی تائید کی تھی 'مگر گھر کی دیگر عورتیں ہرگز اس خیال سے متفق نہ تھیں۔

"ٹھیک ہے مت جاؤ۔ آج تک تم نے کبھی میری عزت کا خیال نہیں کیا۔ کبھی مشکل وقت میں میرے ساتھ کھڑی نہیں ہوئیں۔ لعنت بھیجتا ہوں میں اس رشتے پر 'میری طرف سے تمہیں طلاق ہے۔"

آخر انہوں نے طیش کے عالم میں وہ لفظ منہ سے نکال دیا تھا جو ہمیشہ سے زندگیاں تباہ کرتا آیا ہے۔

نفیس احمد کی فلائٹ کا وقت نکل رہا تھا اور خود اس کی زندگی میں سے کیا کچھ نکل رہا تھا۔ اس کا احساس اسے بہت بعد میں جا کر ہوا تھا۔ اس ایک مکروہ لفظ نے اسے جنت سے نکال کر پل صراط پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک لمحہ تو زری کا بھی دل کانپا تھا۔ اماں اور روبینہ بھی خاموش ہو گئی تھیں۔

"خدا کے لیے خاموش ہو جائیں نفیس بھائی۔ اپنے بچے کے لیے ہی سہی۔ بعد میں انسان لاکھ پچھتائے یہ لفظ کبھی واپس نہیں ہوتا۔" زہت چلا اٹھی تھی۔

شاید یکدم خاموشی اور پھر زہت کے چلانے کا اثر تھا کہ نفیس احمد ایک بار یہ لفظ ادا کر کے خاموشی سے چلے گئے تھے۔

"اماں 'اماں۔" زری اماں کی طرف لپکی۔ اسے بانہوں میں بھر کر وہ نفیس اور اس کے خاندان کو کوسنے اور بددعائیں دینے لگیں۔

"ہیرے جیسی بیٹی میں نے کن نیچ لوگوں میں بیاہ دی۔ تیرے لائق ہی نہیں تھے وہ۔ دیکھنا جب دماغ ٹھکانے آئے گا نا تو خود ہی ناک رگڑتے ہوئے آئیں گے۔"

"یا اللہ۔ اس لفظ پر تو عورت کانپ جاتی ہے اور یہ۔ کیا بنے گا ان کا؟" زہت حیرت کا مجسم بنی کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

زری کو اگر کوئی ملال تھا بھی تو وہ دو ماہ میں اماں جان کی اکڑ 'روبینہ کی شہہ اور ارشد کی خاموشی سے جاتا رہا تھا۔ اب انتظار تھا تو اس بات کا کہ کس دن نفیس میاں ہاتھ جوڑے اسے منانے آتے اور وہ لوگ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے مگر اس بار ایسا نہیں ہوتا تھا۔

وہ اسے لینے تو آئے تھے مگر ساتھ ہی فرحانہ اور

اپنے نکاح کا بم بھی اس کے سر پر پھوڑ گئے تھے۔ ان سب کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔

"ماضی کی پسند اپنی جگہ مگر میں نے شادی کے بعد کبھی فرحانہ کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ یہ تمہارا رویہ تھا جو مجھے ملال میں مبتلا کر تا گیا مگر پھر بھی میں نے کبھی بھی اس نہج پر آکر نہیں سوچا تھا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ کن حالات میں میں نے یہ نکاح کیا ہے۔ اس کے تایا اپنے بیٹے کے پاس جانے والے ہیں۔ ان کے بعد یہ اکیلی کہاں جاتی۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں وضاحت کی۔ حالانکہ خود ان کا دل زری اور اس کے گھر والوں کے رویہ سے سخت اوب چکا تھا مگر پھر بھی وہ اسے چھوڑنا ہرگز نہ چاہتے تھے۔

"فرحانہ کھلے دل سے سب قبول کرنے کے لیے تیار ہے' اسے صرف سہارا چاہیے تھا۔ مزید اس کی کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ میں اسے اماں کے پاس رکھوں گا اور زری بطور میری پہلی بیوی اور بچے کی ماں کے میرے ساتھ ہی رہے گی۔ آپ چاہیں تو اس کی سیکورٹی کے لیے میں۔"

ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہیں گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ مصالحت کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اماں جان تو اب اس کوشش میں تھیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے کیسے دیا جائے۔ ان کا تو وطیرہ تھا کہ کوئی گھور کر دیکھے تو آنکھ پھوڑ دو اور اگر کوئی ہاتھ اٹھائے تو ہاتھ توڑ دو۔ وہ ہرگز معاف کرنے والوں سے نہ تھیں۔

"بغیر اجازت دوسری شادی کرنے پر کیس کرو اس پر۔ جیل جائے گا نوکری ہاتھ سے جائے گی تب عقل ٹھکانے آئے گی اس کی۔" کبھی وہ سخت طیش میں آجائیں۔

"ہائے وہ وہاں بیٹھا نئی بیوی کے ساتھ عیش کر رہا ہو گا اور میری بیٹی یہاں اجڑی بیٹھی ہے۔ مگر اسے کیا پروا۔" اور کبھی دوپٹہ منہ پر رکھ کر رونے لگتیں۔ ایسے میں زری کا دل اور بھی بدگمانیوں سے بھر جاتا۔

"اور جیل سے واپس آکر اتنی ذلت کے بعد کیا وہ فرحانہ کو چھوڑ کر آپ کی بیٹی کو لینے آجائے گا کہ آؤ اور کرو مجھے ذلیل۔" نزہت تلملاتی رہتی۔

"میں نے اب واپس نہیں جانا۔ میری طرف سے اب یہ رشتہ ختم ہے بس۔" زری روز چیخ کر اعلان کرتی۔ نہ کوئی جھکنے پر آمادہ تھا اور نہ ہی کوئی کسی کو سمجھاتا تھا۔

"اماں بس آپ بھائی سے کہہ کر پہلی فرصت میں میرا سامان واپس منگوائیں۔ جہیز میرا اور عیاشی کرے وہ کم ذات۔" اس کی بس ایک ہی رٹ ہوتی۔ اماں اور روبینہ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ارشد کے سر ہو جاتے۔ ارشد کی طبیعت کچھ دن سے کافی خراب رہنے لگی تھی۔ نزہت نے انہیں آفس جانے سے بھی روک دیا تھا۔

"کیسی عورت ہے یہ گھر اور شوہر کے چھن جانے کے بجائے سامان کا غم کھائے جا رہا ہے۔" نزہت کبھی حیران ہوتی اور کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ مگر اس دن تو اس کی برداشت جواب دے ہی گئی۔ ارشد کی طبیعت صبح سے ہی بہت خراب تھی۔ وہ آفس گئے بھی مگر چھٹی لے کر واپس آگئے۔ سر چکرا رہا تھا۔ وہ میاں کے پاس بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی۔ جب باہر زری نے واویلا مچا رکھا تھا۔ پھر اماں جان اور وہ اندر ہی آگئیں۔

"سنا تم نے وہ جو بڑا کہتا تھا اسے ماں کے گھر ہی رکھوں گا' اب لے اپنے گھر لے گیا ہے۔ اب بھی کسر باقی رہ گئی ہے۔ ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ اس دن کے انتظار میں کہ وہ میری بیٹی کا سامان بھی اٹھا کر باہر پھینکوا دے۔" ارشد تکیہ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھے تھے۔

"جی بہتر میں نفیس سے کہتا ہوں کہ وہ سامان وہاں سے ٹرک میں لوڈ کروا کے بھجوا دے' آگے سے ہم اتار لیں گے اور پے منٹ بھی کر دیں گے۔" انہوں نے نزہت کو اشارہ کرتے ہوئے فون سیٹ قریب کرنے کا کہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہی رہی۔ نمبر گھما کر وہ بات کرنے لگے تھے۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ رات تک سامان پہنچ جائے گا۔

مگر اماں وہ ابھی بھی صلح کے لیے آمادہ ہے۔" انہوں نے امید بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھا وہ نظر انداز کرتی باہر نکل گئیں۔

"نہیں اماں جان! بھائی کو کہیں کہ جا کر خود اپنی نگرانی میں سامان لوڈ کروائیں۔ اس بے ایمان انسان کا کیا پتا کہ کوئی کام کی چیز رکھ ہی نہ لے۔" باہر زری نے ہنگامہ کر دیا تھا۔ نزہت کو تو سنتے ہی آگ لگ گئی۔

"حد ہوتی ہے خود غرضی کی بھائی کی طبیعت اور اس کی صحت جائے بھاڑ میں۔ بس ان کا کوئی بیش قیمت لوٹا یا بالٹی وہاں نہ رہ جائے۔ ارے محترمہ اس کا واحد بچہ تمہارے پاس ہے۔ لاکھوں کی مالیت کا زیور جو بری میں ڈالا گیا تھا وہ بھی اماں جان کے سیف میں پڑا ہے اور تم سامان پر مرے جا رہی ہو۔" میاں کی خراب طبیعت کے پیش نظر وہ بند کمرے میں اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ ورنہ آج یقیناً" وہ باہر جا کر اسے خوب سناتی۔ مگر دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"بیٹا آئی ایم سوری۔ مجھے پتا ہے آپ مجھ سے ناراض ہو۔ میں نے پرامس کیا تھا ان چھٹیوں میں آنے کا مگر وہ آپ کے فادر' مطلب انکل کی طبیعت خراب تھی تو میں۔۔۔"

"بس بس کوئی صفائی مت دیں میں نے آپ سے کچھ کہا ہے۔" اس نے بات کاٹ دی تھی۔

"میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مت آئیں۔ میں آپ سے نہیں ملوں گا اور نہ ہی میں نے آپ کا انتظار کیا۔"

اس کا لہجہ اور الفاظ دونوں اس کے جھوٹ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کا انتظار کرتا رہا ہو گا۔ چاہے جی بھر کر لڑنے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ہی سہی۔ مگر وہ اس پر شکر کرتی تھی کہ وہ اس سے بات تو کر لیتا تھا ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی آواز سننے کا بھی روادار نہ ہوتا۔ گزرے ہوئے سترہ سالوں میں وہ بمشکل سترہ بار ہی اس سے مل پائی تھی۔ اس نے ہاتھ کی انگلیوں پر گنا' جب آخری بار اسے چھوڑتے ہوئے وہ اس سے لپٹ کر رویا تھا تب وہ پانچ برس کا تھا اب سترہ سال بعد وہ پورے بائیس برس کا ہو چکا تھا۔ دوبارہ کبھی سال بھر کی ایک ملاقات میں وہ آکر اس سے نہیں لپٹا تھا۔ بلکہ اب تو بہت عرصہ ہوا اس نے اس کی طرف دیکھنے سے بھی پرہیز شروع کر دیا تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملتی بہت دل چاہتا تھا کہ اسے زور سے سینے سے لگائے۔ اس کے گال اور ماتھا چومے۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرے' انہیں سنوارے۔ مگر وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا کرتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کے باپ اور سوتیلی ماں نے کبھی اسے اس کی سگی ماں سے بدگمان نہ کیا تھا مع سوائے حقیقت بتانے کے۔

"آہ تمہارا یہ خاموش رویہ مجھے اور بھی پچھتاووں میں دھکیل دیتا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم مجھے کوسو' برا بھلا کہو۔ اپنے گھر کی تباہی اور بیٹے کی بربادی پر مورد الزام ٹھہراؤ کہ میں اسی قابل ہوں۔ مگر تمہاری یہ اعلا ظرفی مجھے کس قدر لہولہان کر دیتی ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میرا احساس زیاں کتنا بڑھ جاتا ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کسی کو بھی سب کچھ پلیٹ میں سجا کر پیش نہیں کرتی وہ غلط کہتے ہیں۔ آؤ دیکھو مجھے جیسی حرماں نصیب' تہی دامن عورت کو جو مثال عبرت ہے کسی کھنڈر کی مانند' دیکھو کہ زندگی نے مجھے سب کچھ پلیٹ میں رکھ کر ہی دیا تھا مگر میں جو ازل سے ناشکری اور گھمنڈی تھی اپنے تکبر اور انا میں بنی اسرائیل کی زندہ مثال بن گئی کہ جس نے من سلویٰ کی پلیٹ کو ٹھوکر مار کر بھوک پیاس کے لق و دق صحرا میں بھٹکنا اپنا مقصد بنا لیا۔"

"اگر آپ کو بات نہیں کرنی تو فون بند کر دیں۔ میرا ٹائم ویسٹ نہ کریں۔" وہ سوچوں کے گہرے بھنور میں گم تھی جب اس کی آواز اسے حال میں واپس کھینچ لائی۔

"اوہ ہاں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ آپ نے لاسٹ ٹائم بتایا تھا کہ انٹرن شپ کے سلسلے میں دوست کی طرف رہ

رہے ہو۔ تو ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ واپس گھر کب جانا ہے؟" اس نے گفتگو کا سلسلہ پھر سے جوڑا۔

"نہیں جانا گھر' میں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔" اس نے دھما کیا۔

"آپ کے ایکس ہز بینڈ سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا تو میں چھوڑ آیا ان کا گھر۔"

"گھر چھوڑ دیا تم نے..... مم مگر کیوں؟" اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ وہ ہمیشہ سے دھما کے کرتا آیا تھا۔ مگر اس بار تو حد ہو گئی تھی۔

"یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارا گھریلو مسئلہ ہے۔ آپ کا اس سے کوئی لنک نہیں۔" دوسری طرف سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سب بچے باہر لان میں کھیل رہے تھے۔ اماں جان روبینہ کے ساتھ کسی چہلم میں گئی ہوئی تھیں۔ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھانے والی نزہت تھی۔

"جی وعلیکم السلام۔ ہاں جی خیریت۔" قدرے آہستہ آواز میں وہ بہت محتاط ہو کر بات کر رہی تھی۔ زری اس کے پاس بیٹھی سیب کاٹ کر کھا رہی تھی۔

"زری وہ۔وہ....." وہ ہچکچائی

"کس کا فون ہے؟" اس نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑیں۔

"نفیس بھائی کا۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے ایک ہی سانس میں پورا جملہ ادا کیا۔ زری حیران رہ گئی۔

"تو کس لیے کیا ہے فون اس نے اور آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔" اس کی آواز میں دکھ اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"ایک بار ان کی بات سن تو لو۔" اس نے نرمی سے اصرار کیا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ چلائی تھی۔ نزہت گھبرا کر فون کی طرف لپکی۔

"ہیلو نفیس بھائی۔ وہ دراصل....." وہ کوئی بہانہ کرنا چاہ رہی تھی مگر وہ تمام گفتگو سن چکے تھے۔

"جی اچھا!" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا تھا۔

"زری وہ کہہ رہے ہیں کہ کیا میں اپنے بیٹے سے بات کر سکتا ہوں۔" اس بار وہ جواباً" خاموش رہی تھی۔ نزہت نے اس کی خاموشی کو غنیمت جانا تھا اور باہر بچوں کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"جی پاپا!" وہ فون کان سے لگا کر غور سے سننے لگا۔

"آپ آجاؤ نا!" بار بار ایک ہی جملے کی تکرار سے زری کو چڑ ہونے لگی تھی۔

"بس کر دو بیٹا فون رکھ دو۔"

"گھر جانا ہے۔ ماموں ہای گندے۔"

"نانو بھی گندی۔"

"آدی جان مارتی۔ مای چھالا دن ڈامہ دیتی نانون نئیں لاتی (مامی سارا دن ڈرامے دیکھتی ہیں کارٹون نہیں لگاتیں)۔"

اس معصوم سے بچے کے پاس جھوٹی بچی شکایتوں کا ایک انبار جمع تھا۔ نزہت حیرت سے اس کی بات چیت کان لگائے سن رہی تھی۔ مگر اس کی ماں کٹھور بنی ہوئی تھی۔ حقیقتاً تو سارا دن بچے کارٹون لگائے رکھتے تھے صرف آٹھ بجے وہ بڑی مشکل سے ریموٹ لے کر ڈرامہ لگاتی تھی۔ مگر وہ بھی بچوں کی ضد اور شور شرابے کی نظر ہو جاتا تھا۔

"امر بائی (احمر بھائی) جوس نئیں دیتا۔ چسپ نئیں دیتا۔"

"آپ آجاؤ نا۔" جوس' چپس' کھلونے' نمبال' کلرز' جھولا اس کے پاس فرمائشوں کی ایک لمبی لسٹ تھی جو وہ باپ کو بتاتا چا رہا تھا۔ حالانکہ یہ سب چیزیں اس کے پاس یہاں بھی تھیں۔ مگر اور بھی بچے تھے تو سارا دن ان ہی چیزوں پر جھگڑا چلتا رہتا تھا۔

"بس کر دو۔" زری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر پٹخ دیا تھا۔ وہ بیچارہ روتا ہوا باہر چلا گیا۔

"ندیدا کہیں کا۔ باپ منہ نہیں لگاتا اور یہ لے مظلوم بن کر دکھا رہا ہے کہ یہاں تو جیسے اسے کھانے کو بھی نہیں مل رہا۔" اس نے دانت پیسے۔

"کیا ہو گیا ہے زری! وہ بچہ ہے۔ جو محسوس کرے گا وہی بتائے گا نا۔" نزہت اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ وہ خود بے حد الجھی ہوئی تھی۔

"یہاں کیا کمی ہے بھلا؟"

"زری یہ تمہارے ماں باپ کا گھر ہے مگر اس کے لیے یہ اس کا گھر نہیں ہے۔ وہ یہاں کمفرٹیبل فیل نہیں کرتا تو بتا رہا ہے نا۔" نزہت نے ٹھان لی تھی کہ ایک بار تو وہ اسے ضرور سمجھائے گی۔ موقع اچھا تھا کیونکہ گھر میں اور کوئی بھی نہ تھا۔

"سب سے بڑی کمی تو باپ کی ہے نا۔ تم چاہے جو بھی کہو تم اکیلے اسے نہیں پال سکتیں۔"

"ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔ میں پال لوں گی۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ جیسے باپ ماں کی ممتا اور محبت نہیں دے سکتا' اس طرح ماں بھی اولاد اور خاص کر بیٹیوں پر رعب رکھنے اور نگرانی کرنے کا کام نہیں کر سکتی۔ تربیت کرنا کسی ایک کا کام نہیں۔" اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"مگر میں کسی صورت بھی اس عورت کو برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ بضد تھی۔

"ہاں کوئی بھی بیوی برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر ایک ماں کو اولاد کے لیے بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آج تم طلاق لے کر اسے جیسے تیسے پال بھی لو گی مگر کل کو جب یہ اپنی محرومیاں دیکھے گا تو الزام تمہیں ہی دے گا۔ کل ارشد نے اسے ڈانٹا تمہیں برا تو لگا ہو گا۔ بڑا ہونے کے بعد اسے بھی برا لگے گا نانی اور ماموں کا ڈانٹنا یا روک ٹوک کرنا۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ نزہت نے سوچا کہ لوہا گرم ہے چوٹ کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔

"میں سمجھتی ہوں کہ سوتن کو برداشت کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ مگر آج تمہارے پاس واحد پونجی تمہارا یہ اکلوتا بیٹا ہے سوچو اگر کل یہ بھی بدگمان ہو کر تم سے دور ہو گیا تو تمہارے ہاتھ کیا آئے گا سوائے پچھتاوے کے "آج جو بھی لوگ تمہارے ساتھ کھڑے ہیں کل کو وہی اپنی زندگیوں کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں ایسے مگن ہوں گے کہ انہیں تم اور تمہارا بیٹا نظر بھی نہیں آئے گا۔"

"مگر میرا قصور کیا تھا جو وہ اس چڑیل کو گھر لے آیا۔ میں نے تو نہیں مارا اس کی ماں کو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"گھر سنوارنا یا بگاڑنا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اپنے شوہر کو شادی کے بعد سب رشتوں سے مقدم رکھنا چاہیے۔ جس مرد کی عزت نہ کی جائے ایک وقت آتا ہے کہ وہ بیوی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ باہر کے لوگ بس تماشا دیکھ سکتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اپنے مسائل انسان خود ہی بہتر حل کر سکتا ہے۔" وہ کہنا تو چاہتی تھی مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ زری نے اگر یہ باتیں خالہ جان کو بتا دیں تو۔ لازمی بات تھی کہ اس کے لیے بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔

"ٹھیک ہے جو نقصان ہونا تھا وہ اب لوٹایا نہیں جا سکتا مگر ابھی بھی وقت ہے کہ ماتم کرنے کے بجائے تم یہ سوچو کہ جو پیچھے بچ گیا ہے اسے کیسے بچانا ہے۔ تم اپنا گھر چھوڑ کر یہاں بیٹھی رہو گی تو دوسری کی جگہ تو خود بخود ہی بن جائے گی۔ وہ جب نفیس بھائی کو ان مصیبت کے لمحات میں سہارا دے گی تو ان کے دل کے قریب ہوتی جائے گی۔" زری اس کی بات پر تڑپ گئی تھی۔

"بس میں نہیں برداشت کر سکتی وہ یا اسے چھوڑ دے یا پھر مجھے۔" قطعی انداز میں کہتی وہ اندر چلی گئی تھی۔ مزید بات چیت کی کوئی بھی گنجائش اب باقی کہاں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اماں جان کو گزرے دو ماہ ہو گئے تھے۔ اس کی عدت بھی تقریباً" ختم ہونے والی تھی۔ گھر کی خاموش اور سوگوار فضا کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ حالانکہ روبینہ چہلم تک وہیں رکی تھی۔ اس کے بعد بھی دو تین دن بعد چکر لگا لیتی تھی۔ اس کے آنے سے وہ کافی سنبھل جاتی تھی۔ مگر بچوں کے پیپرز کی وجہ سے اب آنا کم

کردیا تھا۔

"بھابھی! دودھ کہاں رکھا ہے؟" فریج میں تلاش کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ نزہت خاموشی سے کباب کی ٹکیاں بناتے ہوئے ٹرے میں رکھ رہی تھی۔ اس نے فیڈر کھنگالتے ہوئے دوبارہ استفسار کیا۔

"ختم ہوگیا ہے۔ آج دودھ والا نہیں آیا تھا۔" اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ ابھی دو منٹ پہلے تو اس نے اقصیٰ کو دودھ کا فیڈر بھر کر کمرے میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ پانچ سال کی ہونے والی تھی مگر ابھی تک فیڈر پیتی تھی۔

"اقصیٰ تو اب اتنی بڑی ہے۔ سب کچھ کھاتی پیتی ہے۔ مگر علی تو فیڈر کے علاوہ کچھ بھی نہیں پیتا۔ اب رو رہا ہے بتائیں بھلا میں کیا کروں۔" بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ارشد بھی آفس سے نہیں آئے تھے۔

"تم یہ کرو کہ اب میری اولاد کے نوالے گنو کہ کب کتنے فیڈر پیے۔ باپ ان کا اسی لیے خوار ہوتا ہے۔ رو رہا ہے تو سیریلیک یا چاول ابال کر کھلادو۔ اتنا بھی چھوٹا نہیں ہے کہ اور کچھ نہ کھا سکے۔" بظاہر تو وہ بڑبڑائی تھی مگر آواز اس تک پہنچ گئی تھی۔ وہ غصہ میں چاول ابالنے لگی تھی۔

"آپ کو پتا بھی ہے کہ وہ اس ٹائم صرف دودھ پی کر سوتا ہے اور کچھ پسند نہیں کرتا۔" وہ تیز لہجے میں گویا ہوئی۔

"مجھے کیا پتا ہوگا۔ میرے اپنے تین تین ہیں۔ بچے کے شوق اور چونچلے یا ماں سمجھے یا باپ۔" اس کے طنز پر وہ بھونچکا رہ گئی تھی۔ طلاق کے بعد انا کے بت پر ایک اور کاری ضرب لگی تھی۔

"بھابھی کی طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں رہتی۔ اوپر سے تین بچے کیا کم آفت ہیں کہ چوتھے کی بھی آمد آمد ہے اور پھر گھر کا سارا کام۔"

بھائی سے شکایت کرتے بھی جب ہاں' اچھا سے آگے کوئی جواب نہ ملا تب اس نے خود کو تسلی دی تھی۔ مگر اس کے ماتھے کی تیوریاں دن بدن بڑھتی ہی گئیں۔ وہ اس کی زبان کا مقابلہ نہ کرپاتی۔

پہلے تو اماں ہوتی تھیں اس کی ڈھال بنی رہتیں۔ مگر اب گھر کی مالک نزہت تھی۔ آٹھ سالوں کی محکومیت کے بعد تو اسے حکمرانی ملی تھی۔ ارشد تو اماں جی کی وفات' اس کی تباہی اور جاب کے مسائل کی وجہ سے پہلے ہی بیمار رہتے تھے۔ روبینہ نے بھی نزہت کے تیور دیکھتے ہوئے آنا جانا کم کردیا تھا۔ وہ خود بھی زیادہ تر کمرے میں ہی رہتی تھی۔ تاکہ ان کی تلخ نظروں اور کڑوی باتوں سے بچی رہے۔ مگر صبح صبح برتن پٹخنے کی آواز کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھلتی تھی۔ نزہت تو اب اپنا اور میاں کا ناشتہ بنا کر اور اپنے کمرے کی صفائی کرکے لاتعلق ہوجاتی تھی۔

"میں نوکر ہوں گھر بھر کی صبح صبح اٹھ جاؤ اور رات گئے تک بس سب کی چاکریاں کرتے رہو۔"

شادی سے پہلے تو اسے کام کاج کی عادت نہ تھی اور بعد میں بھی اس نے کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی۔ کبھی ہاتھ سے بچے کے کپڑے تک نہ دھوئے تھے اور اب گھر بھر کے میلے کپڑے' چادریں جمع کرکے مشین لگاتا۔ ماسی دو ہفتے سے نہیں آرہی تھی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ آج تو بھائی سے دوٹوک بات کرکے ہی دم لے گی۔ مگر بھائی نے خود ہی اسے کمرے سے باہر نکل کر گھر کے معاملات میں دلچسپی لینے کا کہہ دیا تھا۔

"اور ہاں دیکھو اب تم اس گھر کا فرد ہو تمہاری بھابھی تھک جاتی ہے اکیلے کام کر کرکے تھوڑا سا اس کا احساس کرکے اس کا ہاتھ بٹایا کرو۔ بچوں کو ہوم ورک کرادیا کرو تو تمہارا بھی دل بہلا رہے گا۔"

وہ ابھی بھابھی کے رویے کی شکایت لگانے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہ ارشد اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اٹھ گئے۔

چار و ناچار اس نے خود کو گھر کے کاموں میں مصروف کرنا چاہا تو اس کی ناتجربہ کاری آڑے آئی۔ کوئی بھی کام کرتی بگڑ کر کچھ کا کچھ ہوجاتا اور نزہت کے ماتھے کے بل اور بھی پیچیدہ ہوتے جاتے۔ سارا دن

اس کی بڑبڑاہٹیں اور طعنے جاری رہتے۔ جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا گیا۔

☆ ☆ ☆

تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کیوں کرتی

اقصیٰ سے چھوٹی فاریہ کے گرنے کی آواز پر وہ سب اس کی طرف لپکے تھے۔ علی جو کہ چار برس کا ہوگیا تھا فاریہ کو اٹھانے کی کوشش میں اس نے اسے فرش پر گرادیا تھا۔ چھ ماہ کی بچی کی ناک سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا اور چیخ چیخ کر اس نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔

"دفع ہوجاؤ بدتمیز۔" نزہت نے اسے تھپڑ رسید کرکے پیچھے کی جانب دھکیلا فاری کافی دیر تک روتی رہی تھی اور روتے روتے ماں کی گود میں ہی سوگئی۔ جب کہ وہ ابھی تک ماں کے ساتھ لگا سسکیاں لے رہا تھا۔

"ماما میں نے جان کر نہیں گرایا۔ میں تو اٹھا رہا تھا بہنا کو" وقفے وقفے سے وہ یہ بات دہراتا۔

"بھابھی کچھ تو خیال کریں وہ اتنا حساس ہے میں نے کبھی اسے ڈانٹا تک نہیں ہے اور آپ نے اس قدر زور سے تھپڑ لگادیا۔ بچہ ہے کون سا اس نے جان بوجھ کر گرایا ہے۔" اولاد پر بات آئی تو وہ برداشت نہ کرسکی تھی۔

"تم لوگوں کے گھر میں تو بس یہی اصول چلتا ہے کہ نہ جھڑکو نہ ڈانٹو۔ بس اولاد کو بگاڑے جاؤ۔ اولادیں جوان ہتھنیاں ہوجاتی ہیں پھر بھی خالہ اماں کی طرح وہی سبق پڑھے جاؤ کہ ابھی بچی ہے' حساس ہے۔ کچھ مت کہو۔ اتنا خیال تھا اگر اس کے احساسات کا تو رہتا تھا میاں کے گھر۔ ہم کیوں مفت کے لاڈ اٹھائیں ہم تو غیر ہیں سگی ماں تو تم ہو۔ پھر تم نے کیوں اپنے بچے کا خیال نہیں کیا۔ اس وقت تو بس ایک ہی رٹ تھی کہ میں نے نہیں جانا۔" الفاظ تھے کہ اس کی انا کے بت پر ایک اور کھلا طمانچہ جو اس کے چودہ طبق روشن کرگئے تھے۔

لفظوں کے دانت نہیں ہوتے مگر ان کا کاٹا بعض اوقات سانپ کے کاٹے سے بھی زہریلا ثابت ہوتا ہے۔

"کتنا لاڈلا تھا باپ کا۔ میں ذرا سا ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھتی تھی تو رخ موڑ کر باپ کے سینے میں سما جاتا تھا اور وہیں ناراض ہو کر سوجاتا تھا۔" اسے محسوس ہوا کہ اس کی انا کے بت میں جان تو پہلے ہی نہ تھی۔ اب تو وہ گرنے کے قریب تھا۔ اگلے دن چار و ناچار اس نے فون کرکے روبینہ کو بلوایا تھا۔ وہ بہت عجلت میں آئی تھی اور بڑی مشکلوں سے اس کے کہنے پر اس نے بھائی بھابھی سے بات کرنے کی ٹھانی تھی۔ اندر نہ جانے کیا باتیں ہورہی تھیں وہ خاموشی سے لاؤنج میں ٹی وی کی اسکرین کو گھورے جارہی تھی۔ نظریں بالکل ساکت تھیں۔ کافی دیر بعد اسے روبینہ تیز آواز میں کہتی سنائی دی تھی۔

"آپ بھی کچھ کہیں گے یا آپ نے زبان بھابھی بیگم کے حوالے کر رکھی ہے۔" اس کے اس قدر جارحانہ انداز پر تو زری بھی گھبرا گئی۔

"یہ کیا بولیں گے۔ انہیں اگر بولنا آتا تو تم لوگوں کے دماغ یوں آسمانوں پر نہ ہوتے۔ نہ تم دونوں یوں روٹھ روٹھ کر میکے آتیں' پہلی بار ہی سختی سے کہہ دیا ہوتا کہ آئندہ ناراض ہو کر مت آنا تو نہ آج زری بی بی اپنا گھر تباہ کرتیں اور نہ تم یوں سوال جواب کرنے کھڑی ہوجاتیں۔" مزید اندر کیا باتیں ہوئیں اسے کچھ سنائی نہ دیا۔ نہ ہی سننے کی تاب تھی۔

"خواہ مخواہ مجھے بھی ذلیل کروایا۔ اصغر منع بھی کررہے تھے کہ مت جاؤ۔ تم اپنا گھر تو خراب کرہی چکی ہو۔ اب بھائی کے گھر تو صبر اور برداشت سے کام لینا سیکھ لو۔ اب اماں تو ہیں نہیں اور کوئی ٹھکانہ بچا ہے اب تمہارا؟"

روبینہ جب غصہ میں آتی تو اس میں اور اماں جان میں کوئی فرق نہ رہتا تھا۔ مگر ہمیشہ بڑھاوا دینے والی بہن کے منہ سے اپنے لیے الفاظ سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اسے لگا کہ اب وہ کبھی کسی سے کچھ بھی نہیں کہہ پائے گی۔

"اب میں تمہاری وجہ سے اپنا میکہ تو نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے ان معاملوں سے دور رکھو پلیز۔" بڑی بہن کی طوطا چشمی نے اس کی زبان کو تالے لگا دیے تھے۔

"بلکہ میں سوچ رہی تھی کہ اصغر سے بات کرتی ہوں۔ ان کو کسی نے ایک دو رشتے بتائے تھے۔ مگر تم بھی عقل سیکھو۔ آئندہ زندگی میں پہلے والی بے وقوفیاں مت کرنا اب۔" وہ خود ہی خود سب طے کر کے چلتی بنی تھی۔

☼ ☼ ☼

شدید بے چینی کے عالم میں وہ کتنے دن اس کا نمبر ٹرائی کرتی رہی جو اس کے دوست کے گھر کا تھا۔ مگر وہ فون پر ہی نہ آتا تھا۔ کتنا ہی پوچھنے پر وہ آخر کار کچھ بتانے پر آمادہ ہوا تھا۔ ان دنوں وہ انٹرن شپ ختم کر کے کہیں جاب کر رہا تھا۔

"بس میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں فضا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اس بات پر ہمارا جھگڑا ہوا اور میں نے گھر چھوڑ دیا۔" اسے گھر چھوڑے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ کئی بار باپ نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی سے بھی نہیں ملتا تھا۔

"مگر کیوں؟ وہ تو تمہاری بہت اچھی دوست ہے اور تمہیں پسند بھی ہے۔" وجہ جان کر اسے حیرت کے ساتھ صدمہ بھی ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں۔

"تو اچھی دوست کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اچھی لائف پارٹنر بھی ثابت ہو گی۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"مگر بیٹا! آپ نے تو کہا تھا کہ وہ آپ کو انڈر اسٹینڈ کرتی ہے۔ کیئر کرتی ہے۔ اور آپ کے سب پرابلمز اور فیلنگز بھی سمجھتی ہے۔" اس نے اسے سمجھایا۔ اتنے سالوں میں وہ کبھی یہ فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ ان کے درمیان کتنی قربت اور کتنی دوری تھی، اس لیے کبھی اسے آپ کہہ کر مخاطب کرتی کبھی تم کہہ کر۔

"سو واٹ؟" اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔

"تو بیٹا ایک کامیاب شادی کے لیے یہی سب تو چاہیے ہوتا ہے۔"

"آپ کو پتا بھی ہے کہ کامیاب شادی کس چڑیا کا نام ہے؟" اس کے گستاخانہ لہجے اور لفظوں کے کوڑے سیدھا اس کے دل پر جا کر لگے تھے۔

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کی وہ شادی کامیاب تھی۔ جو پاپا کے ساتھ ہوئی یا یہ کامیاب ہے جسے آپ اب نباہ رہی ہیں۔ ایک انتہائی روڈ اور اِل مینرڈ بندے کی غلامی کرنا کیا کامیاب شادی کہلاتا ہے۔" اس نے انتہائی بدتمیزی سے کہا تھا۔ وہ چند ہی ملاقاتوں میں اس کے شوہر کا رویہ اور مزاج اچھی طرح بھانپ گیا تھا۔

"گھر تو صبر اور برداشت سے ہی بنتے ہیں بیٹا۔" اس نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح مرے ہوئے انداز میں کہا۔

"اس سے آدھا صبر اگر آپ نے پہلی بار کیا ہوتا نا تو۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ مگر اب تمہارے انکل بہت بدل گئے ہیں۔ بہت نرم مزاج ہو گئے ہیں۔ وقت بدل جاتا ہے بیٹا۔" اس کے لہجے میں زمانہ بھر کی تھکان تھی۔

"ڈزاٹ میک اینی سینس کہ جب وقت نہیں رہتا تو وقت بدل جاتا ہے۔" اس نے ہنسی اڑائی۔ وہ جواباً خاموش رہی تھی۔ اس نہج پر تو کبھی اس نے خود بھی نہیں سوچا تھا۔

"اچھا چھوڑو تم مجھے بتاؤ کہ آخر فضا میں برائی کیا ہے اور اگر کوئی ہے بھی تو تم اپنے پاپا سے بات تو کرتے نا۔" اس نے موضوع بدل دیا۔

"انہوں نے بات کرنے کی گنجائش چھوڑی ہی کب تھی۔ انہیں لگا میں فضا کو پسند کرتا ہوں تو جا کر پھوپھو سے بھی بات کر آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتیں میں نے انکار کر دیا۔" اس کے انداز میں لاپروائی تھی۔

"مجھے سچ سچ بتانا کیا تم اس میں انٹرسٹڈ نہیں تھے۔" اس نے یادداشت پر زور دے کر یہ سوال پوچھا تھا کیونکہ پچھلے کچھ عرصے میں وہ فضا کا کافی ذکر کرنے لگا

تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بیٹا جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ ہاں اگر کوئی بات نہ بتانا چاہتا تو رکھائی سے انکار کر دیتا تھا۔

"ہاں تھا اور اب بھی ہوں مگر پھر بھی میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ بات میں نے اس کی طرف پیش قدمی سے پہلے ہی اسے بھی بتا دی تھی۔" وہ آج بھی اس کے لیے پہیلی تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھتی ہے مگر وہ اکثر اس کے اندازے کے الٹ ثابت ہوتا تھا۔

"مگر اس کی کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیے نا۔" اس نے زور دیا۔

اور جواب میں اس کے کہے ہوئے ایک جملے نے ہی اسے پاتال کی تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا۔ اگر وہ اس کے سامنے ہوتا تو اس کے لٹھے کی طرح سفید ہوتے چہرے اور ساکت وجود کو دیکھ کر اس کی نبض ضرور ٹٹولتا۔

اور آج اٹھارہ سال بعد یکدم اس کا اس شخص سے ملنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ زندگی میں ایک بار پھر سے دلہن بنی تھی۔ مگر تب اور اب میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ کوئی مماثلت نہ تھی۔ کہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ بھی نظر میں جچتا نہ تھا۔ خوب سے خوب تر پہناوا، بہتر سے بہتر جہیز۔ مگر آج اس کا روپ کسی طرح بھی دلہن سے مشابہت نہ رکھتا تھا۔ نہ لال جوڑا پہنا نہ ہاتھوں میں مہندی رچی، نہ ڈھولک کی تھاپ پر سہیلیوں نے گیت گائے، نہ زیور، نہ کوئی ہار سنگھار نہ رخصتی کے وقت رونے دھونے کا کوئی منظر دکھائی دیا۔ کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں دھلا دھلایا چہرہ لیے وہ سوگوار حسن کی زندہ مثال دکھائی دیتی تھی۔ نہ چہرے پر حیا کی لالی تھی، نہ ہونٹوں پر سہیلیوں کے چٹکلے یاد کر کے کوئی شرمیلی مسکان ابھری اور نہ ہی دل میں کوئی امنگیں جاگیں۔ جہیز میں زیادہ تر اس کا پرانا سامان ہی روانہ کر دیا گیا تھا۔

اس کے ہونے والے دولہا نے کسی قسم کے شادیانوں اور رسموں سے صاف منع کر دیا تھا۔ کون سا یہ ان دونوں کی پہلی پہلی شادی تھی۔ آفتاب عالم کی پہلی بیوی اپنی دو سالہ بیٹی کو روتا چھوڑ کر ان سے طلاق لے کر کسی کزن سے شادی رچا کر باہر جا چکی تھی۔ اس صدمے کے بعد انہیں مزید ساتھی کی ضرورت نہ تھی۔ مگر گھر کی بکھری حالت کو سنوارنے اور بچی کی مناسب دیکھ بھال کے لیے گھر میں کسی عورت کا ہونا ضروری تھا۔ ان کا پوری دنیا میں اس بچی اور اپنی ماں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ ان کی ماں گاؤں کے ماحول کی پروردہ اپنے آبائی گھر میں ہی نوکروں اور دور پار کے رشتہ داروں کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ شہر کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی تھی۔

آفتاب عالم کا ایک خاصا چلتا ہوا میڈیکل اسٹور تھا۔ اس کے علاوہ زمینوں کی آمدنی بھی آ جاتی تھی۔ معاشی لحاظ سے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مگر بیوی کی بے وفائی کے بعد ان کے مزاج میں چڑچڑاپن شک اور غصہ بھرتا چلا گیا۔ لہٰذا اماں کے بہت اصرار پر وہ دوسری شادی پر آمادہ ہوئے تھے۔ مگر آنے والی عورت بھی مطلقہ تھی۔ ان کی فہرست میں ایک اور ایسی عورت کا اضافہ ہو گیا جو اپنا گھر تباہ کر کے آ رہی تھی۔ ایسی عورت بھلا ان کے نزدیک کسی نرمی، اعتبار یا محبت کی حقدار کیوں کر ہو سکتی تھی۔ جو اپنی اولاد کے لیے اچھی ماں ثابت نہ ہوئی وہ ان کی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ کئی بار وہ اس سوچ کے پیش نظر انکار کرتے کرتے رہ گئے۔

اپنے اکلوتے بیٹے سے دوری نے وہ پورا ہفتہ کانٹوں کے بستر پر گزارا تھا۔

"جانے بھابھی نے علی کو وقت پر کھانا دیا بھی ہو گا یا نہیں۔"

"میرے بغیر تو وہ سوتا بھی نہیں تھا۔" فکر میں گھل گھل کر وہ آدھی رہ گئی تھی۔

"روبینہ کہہ تو رہی تھی کہ اسے ساتھ لے جائے گی جب تک وہ ادھر ہے۔ مگر اس کے بچے بھی تو بہت عجیب مزاج کے ہیں۔ اسے تنگ نہ کریں۔"

وہ دن رات انہی سوچوں میں گم رہتی۔ اس نے گھر والوں سے ہفتہ بھر کی بات کی تھی مگر جب دس دن گزرنے پر بھی آفتاب عالم نے بچے کے بارے میں کوئی بات نہ کی تو وہ ان سے خود بات کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ مگر ان کے صاف اور واضح انکار نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ وہ اپنے گھر میں کسی اور کا بچہ رکھنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ وہ تڑپ اٹھی تھی۔ مگر وہ کسی صورت بھی اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار نہ تھے۔ بصورت دیگر وہ واپس جاسکتی تھی۔

اچھی طرح سوچنے کا وقت دیتے ہوئے وہ اسے تین دن کے لیے میکے چھوڑ گئے تھے وہاں پہنچی تو علی بخار سے نڈھال تھا۔ محض دس دنوں میں اس کا رنگ پیلا زرد ہوگیا تھا۔ روبینہ، بھابھی بھائی سب کے پاس اپنی اپنی مصروفیات کے عذر موجود تھے۔ بس ایک وہ ہی جو بھنور میں پھنس گئی تھی۔ مگر کوئی اس کی بات سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ سب اسے ہر حال میں میاں کی بات ماننے کا کہہ رہے تھے۔ اس کے پاس اور کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔ اپنے پانچ سالہ بچے کو خود سے جدا کرکے باپ کے حوالے کرتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مگر کسی کو اس پر رحم نہ آیا تھا۔

✲ ✲ ✲

اس کا خودسر، ضدی اور موڈی مگر جان سے عزیز بیٹا جو اس سے کبھی خفا ہوتا اور کبھی دل کی باتیں شیئر کرلیا کرتا تھا، اس سے ملنے کی خاطر تو وہ سال میں ایک آدھ بار ہی میلوں کا سفر طے کرپاتی تھی۔ مگر آج وہ بطور خاص بہت سالوں کے بعد اس شخص سے ملنے جارہی تھی جو کبھی آشنا مگر اب اجنبی تھا۔

ٹرین خراماں خراماں حیدر آباد سے لاہور کی جانب رواں دواں تھی۔ آفتاب کو رضامند کرکے وہ مشی کو ساتھ لے آئی تھی۔ مگر اس طرح کہ اس نے اپنی آمد کی کسی کو بھی خبر نہ تھی۔ چند دن اسے ہوٹل میں قیام کرکے پھر ہفتہ بعد آفتاب کے آنے سے پہلے بھائی کے ہاں چلے جانا تھا۔ اگر یہ بھید کھل جاتا تو بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہوسکتا تھا، مگر وہ ایک بار اپنی بچی کھچی متاع حیات کو سمیٹنے کے لیے یہ جوا کھیلنے کو تیار ہوئی تھی۔ اس سفر میں اس کی واحد ہمراز مشی تھی۔ جو کہ باپ کی نسبت اس کے زیادہ قریب تھی۔ فجر کا وقت تھا۔ اس کی منزل ابھی دور تھی۔ مشی اوپر برتھ پر جاکر سوگئی تھی۔ جبکہ خود اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ نگاہوں کے سامنے گزرے ہوئے ماہ و سال گردش کررہے تھے۔ آوازوں کی بازگشت جو اسے سونے نہیں دیتی اب بھی اس کے ہمراہ تھی۔

"وہ مرد ہے بھلا اس کا کیا جاتا ہے۔ محض بچوں کی کمی ہے نا وہ بھی دور ہوگئی تو اس کی لائف کمپلیٹ ہوجائے گی مگر پھر تمہاری اور علی کی جگہ کہاں ہوگی یہ بھی تو سوچو۔" بھابھی کے تلخ رویوں کو اگر ایک طرف رکھا جاتا تو صرف وہی تھیں جنہوں نے اسے وہ باتیں سمجھائی تھیں، جو باقی سب نے اسے بعد میں سنائیں جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ انہوں نے اسے تصویر کا وہ رخ بہت پہلے دکھادیا تھا۔ جو وہ گزشتہ کئی سالوں سے دیکھ رہی تھی۔

"اسے مجھ سے کبھی بھی محبت نہیں رہی۔ وہ شادی سے پہلے بھی اسی کو چاہتا تھا۔ اس وجہ سے تو اس نے مجھے کبھی کھلے دل سے قبول ہی نہیں کیا۔ ہمیشہ خشک، سرد اور روکھا پھیکا سا تعلق رہا ہے، ہم دونوں کا۔"

وہ بدگمانیوں کی زد میں تھی۔

"نکاح کے دو بول میاں بیوی کے دل میں محبت پیدا ضرور کرتے ہیں مگر وہ کوئی لیلیٰ مجنوں والا عشق نہیں ہوتا۔ اس محبت کو قائم رکھنے کے لیے کوشش کرنا پڑتی ہے خاص طور پر عورت کو، تبھی پرانی محبتیں پیچھا چھوڑتی ہیں۔ اس کے بغیر تو زندگی روکھی پھیکی ہی گزرتی ہے کیونکہ پرانی محبتوں کی بازگشت ایک کسک بن کر ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔" وہ بہت سوچ سمجھ کر نپے تلے الفاظ میں اسے سمجھاتی تھیں۔ شاید ان کی حد یہیں تک تھی۔

"ناراض آکر بیٹھنے میں کوئی عزت یا فائدہ نہیں ہوتا کسی کا بھی، بس جو بھرم قائم ہوتا ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے۔

کوئی بار بار منانے نہیں آتا، کوئی ایک بار صدا دے گا دو بار دے گا۔ تاعمر کوئی پیچھا نہیں کرتا۔ اس لیے اس سے پہلے کہ کوئی منانا چھوڑ دے، ہمیں خود ہی اسے آزمانا اور روٹھنا چھوڑ دینا چاہیے۔" حقیقت کے کتنے رخ تھے جو انہوں نے بارہا اسے دکھائے تھے۔ آج سالوں بعد وہ خود احتسابی کے عمل سے گزر رہی تھی۔

میں بھی کب چاہتی تھی کہ یوں ہو، مگر کیا کرتی میں نے ہمیشہ خود کو سب سے برتر سمجھا، ہمیشہ مجھے سب پر فوقیت دی گئی۔ میری انا یہ گوارا ہی نہ کرتی تھی کہ مجھے سیکنڈ گریڈ دیا جاتا۔ اسی انا کو قائم رکھنے کے لیے میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ مگر نتیجہ؟ اس نے خود سے سوال کیا۔

"پہلے اپنا آشیانہ توڑ کر تنکا تنکا بکھیرا اور پھر انا کا وہ بت بھی ریزہ ریزہ ہوگیا۔" آنسو اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ رات کا اندھیرا مکمل طور پر چھٹ چکا تھا۔ صبح کا آغاز ہوچکا تھا۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ اس کی منزل قریب تھی۔

✲ ✲ ✲

ٹکٹکی باندھ کر وہ اسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ جو کبھی بادل گرجنے سے یا آتش بازی کی آواز سے ڈر کر اس کی گود میں چھپ جایا کرتا تھا۔ اب اس کے قد سے کتنا اونچا نکل گیا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے دیکھ کر اندازہ لگایا، وہ اس کے کندھے تک آتی تھی۔ فخر سے اس کا سینہ چوڑا ہوگیا تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اسے سینے سے لگانا چاہتی تھی۔ رو رو کر اسے ان گزرے سالوں کا حال بتانا چاہتی تھی۔ جب اس نے کتنی راتیں جاگ کر روتے ہوئے گزاری تھیں۔ مگر ڈرتی تھی کہ اگر جواب میں وہ بھی اپنی بے خواب راتوں کے قصے بیان کرنے لگا تب کیا ہوگا۔ اس نے بھی تو انگلیوں پر گن رکھا ہوگا کہ کتنی راتیں اس نے کسی سائے کے خوف سے، بجلی کی کڑک سے ڈر کر تکیہ سے لپٹ کر گزاری تھیں۔ ماں کا لمس اور اس کے بازوؤں کی حدت کی طلب نے جاڑے کی کتنی راتیں اسے سونے نہیں دیا ہوگا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرا ہوگا تو کسی ہاتھ نے تھاما بھی ہوگا یا نہیں۔ جب کسی نے اسے مارا ہوگا تو اسے بچانے کون آیا ہوگا۔ جبکہ وہ خود تو اپنی خالی گود بھرنے کے لیے مشی کو سینے سے لپٹا لیتی، اسے چومتی، گود میں لٹا کر تھپکیاں دیتی۔ ذہن میں یہ تصور کیے کہ وہ اپنے بیٹے کو گود میں لٹا کر اس کے گال چوم رہی ہے۔

یہ من پسند کھیل اس نے اس بچی سے ہی سیکھا تھا۔ اپنی ناتمام خواہشوں کو تصور کا لبادہ پہنا کر پورا کرنے کا یہ کھیل کچھ دیر کو ہی سہی، پر اس کا دل بہلا دیا کرتا تھا۔ اس کے زیادہ زور سے لپٹانے پر جب وہ بچی نیند میں جاگ کر رونے لگ جاتی تو آفتاب عالم کی صلواتیں اسے خواب سے حقیقت میں لے آتیں۔

وہ ناراض اور لاتعلق سا ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اس سرد رویہ پر اسے ہمت ہی نہ ہوئی تھی کہ اسے سینے سے لگا لیتی۔ وہ بھی ان ہی پودوں کی طرح تھا جنہیں اگر ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لگا دیا جائے تو ٹھیک طرح سے پنپ نہیں پاتے۔ اس کی جڑیں تو اس سے الگ ہوکر بکھر گئی تھیں۔

"میں فضا سے ہرگز شادی نہیں کروں گا، کیونکہ وہ اور پھوپھو بالکل آپ جیسی ہیں۔ میں کسی بھی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا جو آپ جیسی ہو، چاہے وہ دنیا کی آخری لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔"

اس کا جملہ ایسا چبھتا ہوا تیر تھا جس نے اسے سالوں بعد نفیس احمد سے ملنے کے لیے حیدر آباد سے لاہور تک کا سفر کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ اب بھی نہ آتی تو کچھ باقی نہ رہتا۔ ماں اور باپ کی جس جنگ کے خمیازے وہ سالوں تک بھگتتا آیا تھا، اگر باپ اور بیٹے کی جنگ بن جاتی تو کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ شاید اس بار خدا بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا کہ……

آفتاب عالم اس کے محض ایک بار کہنے پر ہی مان گئے تھے۔

"مائیں تو بیٹوں کا آئیڈیل ہوا کرتی ہیں۔ مگر وہ کس قدر بدقسمت بیٹا تھا۔ جس کی ماں آئیڈیل تو کیا اچھی

ماں کہلانے کی بھی حق دار نہ تھی۔ دل میں درد سا اٹھا تھا۔

"اور فرض کریں اگر میری شادی کسی ایسی عورت سے ہو بھی گئی تو میں کبھی بھی اولاد پیدا نہیں کروں گا۔ مجھے اس دنیا میں ایک اور علی' ایک اور ناکام انسان ہرگز پیدا نہیں کرنا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔"

اس کی محرومیوں نے اسے بہت سے کمپلیکسز میں مبتلا کر رکھا تھا۔ پانچ فٹ گیارہ انچ کا وہ نوجوان بچوں کی مانند بلک بلک کر رو رہا تھا۔ سالوں کا غبار' ناراضگی اور شکوے تھے جو امڈ کر باہر آ رہے تھے۔ شاید اب سب کچھ آنسوؤں سے دھل کر صاف ہونے کا وقت تھا۔

اور حیران تو وہ خود بھی رہ گیا تھا۔ یہ وہ گھمنڈی اور ضدی عورت تو نہ تھی۔ جس کی کہانیاں وہ اپنے خاندان کی عورتوں سے سنتا آیا تھا۔

"جی اچھا۔ جو آپ کہیں۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

آفتاب عالم کی ہر بات پر شہد ٹپکاتے لہجے میں ان جملوں کے علاوہ وہ اور کچھ کہتی ہی نہ تھی۔ مخالفت یا روبرو مقابلہ تو دور کی بات تھی۔ اس نے تو صرف چند بار نزہت ممانی سے اپنی ماں کے بدل جانے کا سنا تھا۔ جس کے اس نے کئی بار اسے طعنے بھی دیے تھے۔ مگر سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کا دل عجیب طرح کی کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔

دوست کے گھر سے وہ تین' چار دن کے لیے ماموں کے گھر آکر ہی رک گیا تھا۔ مگر دل پر عجیب طرح کی بے کلی سی طاری تھی۔ اس نے آفس سے مزید چھٹی لے لی۔ ہر رات وہ فیصلہ کر کے سوتا کہ صبح واپس چلا جائے گا۔ مگر صبح اس کا ارادہ بدل جاتا۔ شاید سالوں سے جمی برف اب پگھل رہی تھی۔ "بیٹا! چائے کا کپ پورا اوپر تک نہیں بھرتے' چھلک جاتا ہے اور دوپٹا ٹھیک سے سر پر رکھو۔"

"کوئی بات نہیں' اگر ماں نے کچھ کہہ دیا تو وہ بڑی ہیں۔ بڑوں کا مقابلہ تو نہیں کیا جاتا نا۔ یوں بھی ان کا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح ہے اور میری بیٹی تو بہت صابر ہے۔"

وہ خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ بیٹی کو زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ سکھاتی یہ تو کوئی اور ہی عورت تھی۔

☼ ☼ ☼

میرے دشمنوں سے کہو کوئی
کبھی جو عہد نشاط میں
مجھے خود پہ اتنا غرور تھا کہیں کھو گیا
وہ جو فاتحانہ خمار میں
مرے سارے خواب نہال تھے
وہ نہیں رہے
کہ بس اب تو دل کی زبان پر
فقط ایک قصہ حال ہے
جو نڈھال ہے
جو گئے دنوں کا ملال ہے

میں فرزانہ آفتاب جو کسی زمانہ میں اماں جان کی لاڈلی زری' گھر بھر کی آنکھوں کا تارہ بھائی کی گڑیا رانی' ابا کی لاڈو تھی۔ فرزانہ توصیف عرف زری سے فرزانہ نفیس اور پھر فرزانہ آفتاب بننے کا سفر میرے حالات کی بھٹی میں تپ کر کندن بننے کا سفر ہے۔ بچپن سے ہر ایک سے لاڈ اٹھوایا' جو کہا وہ پورا کیا' جو چاہا وہ پایا' کس کی مجال تھی جو میرا کہا ٹالتا یا میری کسی بات پر تنقید یا اعتراض کرتا۔ میرے رونے اور خفا ہونے کو حساسیت' ضد کرنے کو لاڈ' کام چوری کو بچپنا اور بدتمیزی کو صاف گوئی کا نام دے کر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ شاید میں ان ماؤں کی بیٹیوں میں سے تھی جو ان ہی لفظوں کا سہارا لے کر اپنی اولاد کو فرار کا راستہ فراہم کرتی ہیں۔

کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ دنیا کا خوب صورت ترین بچہ ہر ماں کے پاس ہے۔ تب ہی ہر ماں کو اپنا کالا کلوٹا' سوکھا مریل بچہ بھی چاند کا ٹکڑا نظر آتا ہے۔ اس کی شخصیت کے بڑے بڑے شگاف معمولی دراڑیں

کہہ کر اگنور کر دی جاتی ہیں۔ میں بدصورت ہرگز نہ تھی' بلکہ حقیقتاً" چاند کا ٹکڑا تھی۔ مگر اس چاند میں داغ تھا۔ کم ظرفی اور بد سیرتی کا داغ' میری شخصیت کی دراڑیں مسلسل نظر انداز کر کے ایسے واضح شگاف بنا دی گئیں کہ جس نے میری ساری خوب صورتی کو میری قسمت کی طرح رات کی سیاہی میں بدل دیا۔

آپ کہیں گے کہ انسان باشعور ہے اسے عقل اور سوجھ بوجھ عطا کی گئی ہے' درست ہے۔ میں خود کو قطعا" بے قصور نہیں گردانتی' مگر شاید کم قصوروار کہہ کر اپنے تھوڑے سے دفاع کا حق تو رکھتی ہوں نا۔

کاش میری ماں نے مجھے یہ بتایا اور سکھایا ہوتا کہ زندگی میں ہمیشہ اپنی ذات کو ہی فوقیت نہیں دیتے اور وہ خونی رشتے جن میں ہم آنکھ کھولتے ہیں' ان کے علاوہ زندگی میں بننے والے کئی نئے رشتے بھی ان ہی کے برابر محبت' عزت اور خلوص کے حق دار ہوتے ہیں' جیسا کہ نزہت بھابھی' نفیس احمد اور اس کا خاندان۔

کاش نفیس احمد نے جو تھپڑ مجھے زوبیہ آنٹی سے بدتمیزی پر مارا' وہ تب مارا ہوتا جب میں پہلی بار اس کی ماں اور بھابھی سے جھگڑ کر میکے آکر بیٹھ گئی تھی۔

اماں کے مرنے کے بعد ارشد بھائی نے جس طرح میری بے عزتیوں اور حق تلفیوں کی طرف سے آنکھیں بند کیں' کاش وہ ان کی زندگی میں کر لی ہوتیں۔

نزہت بھابھی نے جو کم ظرفی کا رویہ اپنا کر میری زندگی میں سوچ کے دروازے وا کیے۔ کاش کہ بہت پہلے کیے ہوتے۔

روبینہ آپی نے میرے گھر کی تباہی پر جو مجھے مورد الزام ٹھہرایا۔ کاش اس سے پہلے ایک بار بھی انہوں نے میری حوصلہ شکنی کی ہوتی۔

اگر میرے مقدر میں نفیس احمد اور آفتاب عالم نام کے دو مرد لکھے ہی ہوئے تھے تو کاش کہ کاتب تقدیر نے ان کی محض ترتیب ہی الٹی بدلی کر دی ہوتی۔ کاش۔ کاش اور بس کاش۔ زندگی محض اس ایک لفظ کا طواف کرتے جیسے تیسے گزر ہی گئی۔

زمانہ جس کے تھپڑوں نے مجھے سر جھکا کر ایسے جینا سکھایا کہ پھر جھکا ہوا یہ سر دوبارہ کبھی اٹھ نہیں پایا۔ کاش کہ یہ سر اس وقت جھک گیا ہوتا۔ جب نفیس احمد نے اپنے منہ سے پہلی بار طلاق جیسا حلال مگر ناپسندیدہ لفظ نکالا تھا۔ اگر صرف اس وقت ہی جھک جاتا تو پھر تاعمر وقار کے ساتھ اٹھا رہتا۔ مگر زندگی ہماری مرضی کے مطابق کب چلتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر شخص دنیا میں ہی جنت پالیا کرتا اور پھر خدا کی بنائی ہوئی کسی ان دیکھی جنت کا تمنائی نہ ہوتا۔ مگر ایسا حقیقت میں تو کیا کہانیوں میں بھی نہیں ہوتا۔

مجھے اکثر اپنی بچپن کی کلاس فیلو سدرہ یاد آتی ہے۔ جس کے سسرال والوں کے مظالم اور میاں کے غیر ذمہ دارانہ رویہ اور بیروزگاری کی وجہ سے اس کے میکے والے اسے محض سال بھر میں ہی طلاق دلوا کر گھر لے آئے تھے۔ ایک بار کی ملاقات میں اس نے کہا تھا۔

"شوہر کے گھر میں اس سے کھائی ہوئی جوتیاں بھی ان جوتیوں سے بہتر ہوتی ہیں جو بعد میں آپ کے اپنے بہن بھائی اور زمانہ آپ کو ساری عمر لگاتا ہے۔"

اور تب میں اس کی بے وقوفانہ سوچ پر بہت ہنسی تھی۔ مگر خدا جانتا ہے کہ گزرے ہوئے کئی سالوں میں۔۔۔ میں نے نم آنکھوں سے بارہا یہ جملہ دہرایا ہے۔

"فرزانہ بیگم ذرا نمک دانی تو لا دو۔" آفتاب عالم کی آواز نے میری سوچوں کے سلسلے کو توڑا تھا۔ بہت عرصہ ہوا میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا ہے' ورنہ ضرور حیرت سے مر ہی جاتی کہ سالن کی پلیٹ اب تک فرش پر کیوں نہیں پہنچی گئی۔ پتھر میں سوراخ ہو ہی گیا تھا گو کہ عمر تمام ہوئی' مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ علی نے ایک بار کہا تھا کہ۔۔۔۔

"کیا فائدہ اگر وقت تب بدلے جب وقت ہی نہ رہا ہو۔" مگر مجھے اس کی اس بات سے اختلاف ہے۔ کسی بھی کہانی کی پوزیٹو اینڈنگ بہت سوں کے لیے اختتام نہیں' بلکہ شروعات ہوتی ہے۔

حیرت تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب میری سماعتوں نے یہ الفاظ سنے تھے۔

"فرزانہ بیگم! تم بریانی اچھی بنانے لگی ہو۔" اور تب بھی نہیں جب انہوں نے کہا تھا۔ "مشی کی ماں! میں ذرا کچھ مال پہنچانے لاہور جارہا ہوں۔ اگر تمہیں چلنا ہو یا کچھ منگوانا ہو تو بتاؤ۔" بہت طویل وقت لگا تھا مجھے کم عقل' جاہل اور پھوہڑ عورت سے فرزانہ بیگم اور مشی کی ماں کا رتبہ حاصل کرنے میں۔ کہنے کو تو سترہ' اٹھارہ برس کی مسافت تھی' مگر پل پل رہائی کا انتظار کرتے کسی قیدی کے لیے وہ سترہ صدیوں کے برابر تھے۔ زندگی میں اب بچا ہی کیا تھا' محض چند سانسیں اور میری زندگی کی واحد پونجی' میری کوکھ جنی اولاد میرا بیٹا' جو محرومیوں' بدگمانیوں اور ناراضیوں کی رو میں بہہ کر بہت دور جارہا تھا۔ باقی تو سب خسارہ ہی رہ گیا تھا۔

بس ایک امید باقی تھی کہ اپنی اس واحد پونجی کو ضائع ہونے سے بچالیتی جسے زندگی میں' میں اور کچھ بھی نہ دے پائی تھی۔ سو اسی وجہ سے میں زندگی میں پہلی اور آخری بار اس شخص کے آگے سوالی بننے لاہور جارہی تھی۔ جواب میرا کچھ بھی نہیں تھا۔ کاش یہ میں نے اس وقت کرلیا ہوتا۔ نہیں اب مجھے کسی بھی کاش کو اپنے تعاقب کا موقع ہرگز نہیں دینا تھا۔ ابھی وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ راستوں پر گرفت تھی اور مجھے اپنی پوزیٹو اینڈنگ کو کسی کے شان دار آغاز میں ڈھالنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"علی نفیس" ولد نفیس احمد کو بعوض پانچ لاکھ حق مہر۔

"قبول ہے۔" کی آواز کے ساتھ ہی اس ہال نما کمرے میں مبارک باد کی ملی جلی آوازیں گونجی تھیں۔ چھوہاروں کے پیکٹ اور مٹھائی کے تھال مہمانوں میں تقسیم کیے جانے لگے تھے۔ سامنے اسٹیج پر کریم پینٹ کوٹ میں بیٹھا میرا وجیہہ بیٹا اور اس کے پہلو میں بیر بہوٹی بن کر بیٹھی ہوئی وہ جو اس وقت بلیو کامدار سوٹ میں واقعی مثل شمع لگ رہی تھی' میری کل کائنات تھے۔

میری ٹیبل کے ساتھ کچھ فاصلے پر بھابھی کے ساتھ اقصیٰ' فاریہ اور معیز خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اقصیٰ کی چھوٹی بیٹی عبیرہ نیچے کارپٹ پر بیٹھی غبارے پھاڑ رہی تھی۔ جبکہ فاریہ اسے "چندا جونیئر" کہہ کہہ کر چڑا رہی تھی۔ چندا جو بچپن میں اس کی ماں کا نام ہوا کرتا تھا۔

ٹی پنک کلر کے لمبے فراک میں اپنے سلکی بال لہراتی گوری چٹی باربی ڈال جیسی فاریہ جو کسی بھی آنکھ کا خواب ہوسکتی تھی۔ دونوں ہاتھوں کی کلائیاں چوڑیوں سے بھرے' ماتھے پر نازک سی بندیا لگائے گھسا نما جوتا پہنے اس کا پانچ فٹ سات انچ کا سراپا اس وقت چاند کو بھی شرما رہا تھا۔ دولہا کی ماں ہونے کے باوجود میں حقیقت پسندی سے کام لوں تو حقیقتاً اگر وہ اس دو آتشہ حسن کے ساتھ اسٹیج پر جا کھڑی ہوتی تو تمام کیمرے اور تمام ستائشی نگاہوں کی زد میں محض وہی رہ جاتی۔

وہ میری نوجوانی کی مکمل تصویر تھی۔ جب میں حیدر آباد سے نفیس احمد سے ملاقات کی غرض سے نکلی تھی تو فاریہ کو بہو بنانے کا خواب میری آنکھوں میں دھنک کے رنگوں کی طرح رچا بسا ہوا تھا۔ فاریہ جو شکل صورت میں میرا مگر عادات و اطوار میں بھابھی کا عکس تھی۔ وقت اور حالات کے سانچے میں مکمل ڈھل جانے والی۔ میں نے سالہا سال کے تجربہ کے بعد لوگوں کی جو بات سچ پائی تھی کہ اگر کسی لڑکی کا رشتہ کرنا ہو تو پہلے اس کی ماں کے طور طریقے دیکھو' میرا بیٹا محض تئیس برس میں ہی جان کر فضا سے شادی سے انکار کر گیا تھا۔ میرا فضا کی ماما سے زیادہ واسطہ تو نہ پڑا تھا' مگر سن رکھا تھا کہ وہ اچھی خاصی انا پرست اور گھمنڈی عورت تھی۔

اگر زندگی کے اسٹیج پر محض تماش بین کی نظر سے دیکھا جاتا تو بظاہر نزہت بھابھی میں بہت سی خامیاں رہی ہوں گی شاید وہ اے اور بی کے بجائے سی گریڈ کی مستحق ہوں' مگر ان کے مقابلے میں' میں کیا تھی۔ محض صفر' میری آدھی زندگی کی اچھائیوں کا باقی زندگی کی کم ظرفیوں اور کوتاہیوں سے موازنہ کیا جاتا تو نتیجہ وہی نکلتا' جو کسی بھی عدد کو صفر سے ضرب دینے کے بعد نکلتا ہے۔ صرف اور صرف صفر۔

وہ تابعدار بہو تھیں' خدمت گزار بیوی تھیں' عقل مند اور دور اندیش ماں بھی۔ بس ایک بھابھی کا رول وہ کامیابی سے ادا نہ کرسکی تھیں تو کیا ہوا۔ بڑے سے بڑا ایوارڈ یافتہ ٹاپ کلاس اداکار بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کردار میں ناکام ضرور ہوا ہوتا ہے۔

شاید انہوں نے بدلے میں وہی لوٹایا جو ان کی ساس اور نندوں نے انہیں دیا تھا۔ پھر بھلا ان سے شکایت کیسی' اس لیے رویوں کی جمع تفریق میں پڑے بغیر ہی میں نے انہیں کھلے دل سے معاف کردیا تھا۔ بلکہ حقیقتاً میں تاحیات ان کی مقروض ہوجاتی' اگر وہ فاریہ جیسا گوہر نایاب میری جھولی میں ڈال دیتیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ انہوں نے انکار کردیا ہوگا تو آپ کا اندازہ غلط ہے۔ میں جب سالوں بعد علی

کے ساتھ چند روز رہی تو اپنے ٹوٹے' بکھرے ضدی اور بے حد جذباتی بیٹے کے لیے مجھے فاریہ جیسا سنووائٹ ٹائپ کردار مناسب نہ لگا۔ اگر نزہت بھابھی کی طرح کبھی اس کا ظرف بھی میرے اکھڑ اور جذباتی بیٹے کو سنبھالتے ہوئے جواب دے جاتا تو۔۔۔ وہ کانچ کے جیسے نازک خواب سنبھال سنبھال کر رکھنے کی عادی تھی اور میرا بیٹا پتھریلی چٹان۔ جس میں بہت غور کے بعد مجھے شگاف نظر آیا تھا۔ اسی لیے مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنا پڑی۔ تب جاکر مجھے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی پزل کا آخری ٹکڑا ہمارے سامنے ہوتا ہے' مگر ہماری آنکھیں اس تک پہنچ نہیں پاتیں۔

"لگتا ہی نہیں کہ یہ اتنی خاموش اور تابعدار سی لڑکی انکل آفتاب جیسے غصیلے انسان کی بیٹی ہے۔" بے خیالی میں علی کے منہ سے نکلا ہوا وہ جملہ ہی پزل کا آخری ٹکڑا تھا۔

مشعل آفتاب عرف مشی۔ جو شکل و صورت میں اپنے باپ کا عکس تھی۔ پانچ فٹ' تین انچ قد' دبے دبے نقوش' دبلا پتلا جسم گندمی رنگت کی وہ عام سی خاموش اور ریزروسی لڑکی' جس نے میری کوکھ سے جنم تو نہ لیا تھا' مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے دل اور دھڑکن کی مانند تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی محرومی کو دور کیا تھا۔ اگر جاڑے کی سرد اور طویل راتوں میں' میں نے اسے اپنی آغوش کی نرمی اور حدت مہیا کی تھی تو میری گود کے خالی پن کو بھرنے اور سالوں تک مجھے ماں جیسے ٹھنڈے میٹھے لفظ سے پکار کر زندہ رکھنے کی ذمہ داری اس نے بھی بخوبی نبھائی تھی۔ وہ کسی زری کی نہیں میری بیٹی تھی۔ فرزانہ بیگم کی۔ اس کی تربیت میرے ہاتھوں میں ہوئی تھی اور اس کی سلیقہ مندی' ہمدردی اور خدمت گزاری کا ایک زمانہ گواہ تھا۔

وہ ڈری سہمی لڑکی جس میں خود اعتمادی کی کمی اس کی ماں کے چلے جانے سے پیدا ہوئی تھی' مگر شخصیت کی ایک کمی نے اس میں کئی گنا اضافہ کیا تھا کہ وہ دیکھتی کہیں اور تھی اور نظروں کے زاویے کہیں اور جاکر ملتے تھے۔ جی ہاں معمولی سا بھینگا پن' جس کی وجہ سے میری ہیرا صفت بیٹی کی تمام خوبیوں کو زمانہ پس پشت ڈالتا آیا تھا۔ اس لیے انیس برس کی عمر میں وہ بہت کم گو اور ریزروسی ہو گئی تھی۔ لوگوں کے دل جیتنے کے لیے اس نے تابعداری کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ مگر پھر بھی لوگوں کی نظروں میں اس کے لیے رحم کی جگہ ستائش کے جذبات نظر آئے تھے۔ ہاں۔۔۔ مگر جب ہم ماں' بیٹیاں مل کر بیٹھتی تھیں' تو اس کی ہنس مکھ طبیعت کو دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ کیونکہ مشعل آفتاب کے اس دوسرے روپ سے وہ لاعلم تھے۔

مشعل آفتاب ہی تو مجھ فقیر کی گدڑی کا لعل تھی۔

مجھے نفیس احمد سے اس سلسلے میں زیادہ بحث نہیں کرنی پڑی۔ وہ اعلا ظرف انسان تھے۔ بیٹے کی خوبیوں اور خامیوں سے آشنا تھے۔ سو قائل ہو گئے۔ مجھے آفتاب عالم کو بھی زیادہ سمجھانا نہیں پڑا' کیونکہ اب میں جاہل کم عقل عورت نہیں' ان کے نزدیک مشی کی ماں تھی اور اس کی واحد دوست بھی۔ راستے خود بخود سہل ہو گئے تھے۔ ابھی وقت تھا کہ جو بیت گیا اس پر ماتم کناں ہونے کے بجائے غبار آلود گم گشتہ راستوں کو پہچان کر منزل کا صحیح تعین کرلیا جاتا اور ہم سب نے یہی کیا تھا۔

"زندگی کی کہانی کا انجام بچوں کی کہانیوں جیسا نہیں ہوتا کہ اس نے آئندہ کے لیے توبہ کرلی یا پھر شہزادہ اور شہزادی ہنسی خوشی رہنے لگی۔

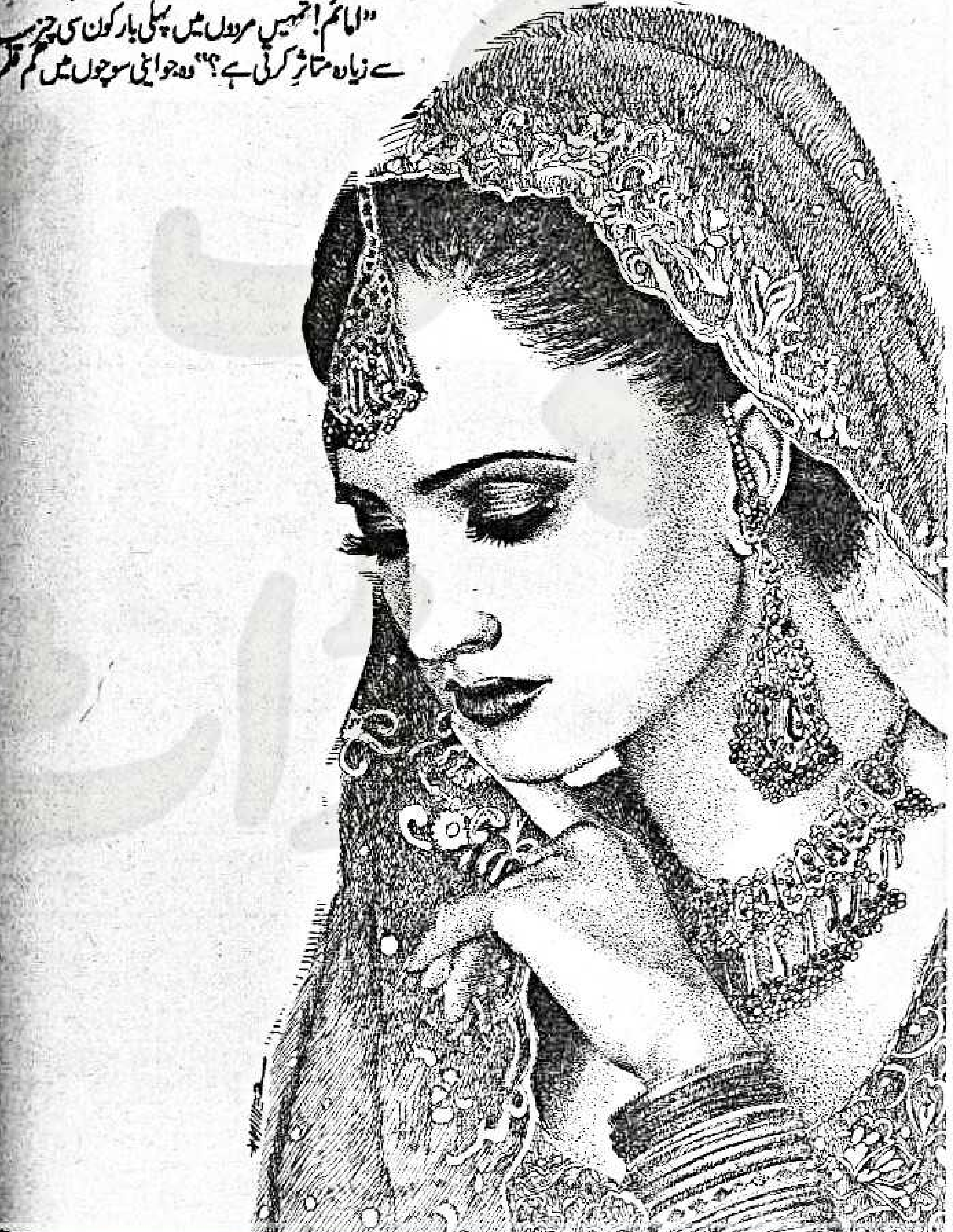
اس کہانی کے کردار وہ بکھرے ٹوٹے' نامکمل انسان ہیں۔ پرفیکٹ نہیں ہیں' مگر میں فرزانہ آفتاب آج سالوں بعد پورے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کرتی ہوں کہ یہ۔۔۔ پرفیکٹ کردار تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ایک پرفیکٹ زندگی کا آغاز کرنے میں کامیاب ضرور ہو جائیں گے۔ اس کہانی کا ابھی اینڈ ہوا ہے۔ دی اینڈ ہونا ابھی باقی ہے۔ خود اعتمادی اور سرشاری سے بھرپور انداز لیے میں مبارک بادیں وصول کرنے اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

☆

نازیہ جمال

بارش کے ہاتھ میں پھول

"امائم! تمہیں مردوں میں پہلی بار کون سی چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے؟" وہ جو اپنی سوچوں میں گم قلم



منہ میں دبائے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی ماہین کے غیر متوقع سوال پر چونک سی گئی پھر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہیئر اسٹائل! مردوں کو فوجی ہیئر کٹ بہت سوٹ کرتا ہے؟"

"ہاں! لیکن اب سارے مرد تو فوجی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے دیگر ہیئر اسٹائل کے مقابلے میں فوجی کٹ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔" ماہین نے حسب عادت ماتھے پر گرے بالوں کو جھٹکا۔

"جو چیز کم ہو اچھی بھی وہی لگتی ہے۔" امائم کچھ سوچ کر مسکرائی۔ ماہین جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نیلی دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"امی کہہ رہی ہیں اگر مذاکرات ختم ہو گئے ہوں تو مہربانی فرما کر چائے بنا لیں۔" انداز ہمیشہ کی طرح تیکھا تھا۔ دونوں نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ہونہہ! افسانوی دنیا کی بے تکی مخلوق۔" نیلی سر جھٹکتی باہر نکل گئی تھی اور اس کے پیچھے وہ دونوں بھی۔ شام کی چائے بنانے کی ذمہ داری ان دونوں کی تھی اور پھپھو ان کے اوقات کار پر بخوبی نظر رکھتی تھیں۔ ذرا سی تاخیر ہونے کی صورت میں ان کا "نیلی نامی" نمائندہ سر پر پہنچ جاتا۔

"تمہارا میاں تم سے بہت خوش ہو گا، جب تم اسے مزے مزے کے کھانے پکا کر کھلاؤ گی۔" امائم نے چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اگر وہ ڈائٹ کانشس نہ ہوا تو۔" ماہین نے کباب تلتے ہوئے جواب دیا۔ اس طرح کی ہلکی پھلکی باتوں کے دوران وہ اپنے ذمے سارے کام بخوبی نپٹا لیتی تھیں، چائے لے کر وہ لان میں چلی آئیں۔ پھپھو کی تیوریاں حسب توقع چڑھی ہوئی تھیں۔ شہریار بھائی نے انہیں دیکھ کر اخبار ایک طرف رکھ دیا تھا۔

"مجھے تو حیرت ہوتی ہے ایک ہی گھر میں سارا دن گزارنے کے باوجود تم لوگوں کی ایسی کون سی باتیں ہوتی ہیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔" نزاکت سے چائے کا کپ تھامے نیلی ناک چڑھا کر کہہ رہی تھی۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے، جہاں دو لوگوں کے دل، ذہن اور خیالات مل جائیں وہاں باتیں نہیں موضوع کم پڑ جایا کرتے ہیں۔"

امائم نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ماہین نے نظروں ہی نظروں میں اسے داد دی تھی۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ باتیں بگھارتے ہوئے کام کا وقت نکال دیا جائے۔" پھپھو کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"پھپھو! آپ نے کہا تھا سوا پانچ بجے چائے لان میں پہنچ جانی چاہیے اور اس وقت ٹھیک پانچ بج کر پندرہ منٹ ہو رہے ہیں۔" ماہین نے اپنی کلائی ان کے

ناولٹ



سامنے کی۔ اس بار امائم کی داد دیتی نظریں اس کی جانب اٹھی تھیں۔ شہریار بھائی نے خاموشی سے دونوں کی اشارے بازی ملاحظہ کی اور خالی کپ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جبکہ پھپھو کی ملامتی نگاہیں تائی امی پر جم گئی تھیں۔ وہ جب بھی لاجواب ہوتیں یونہی نظروں ہی نظروں میں اللہ جانے تائی امی کو کیا جتانے کی کوشش کرتی تھیں۔

"تم دونوں نے سوچ لیا ہے کہ میری کوئی بات نہیں ماننی؟" رات کو دونوں کی تائی امی کے سامنے پیشی تھی۔

"اونہوں! کوئی غلط بات۔" ماہین نے نفی میں سرہلایا۔

"بات نیلی نے شروع کی تھی۔" امائم نے یاد دلایا۔

"کیا تم دونوں کی بدتمیزیوں کو بڑھا چڑھا کر اپنے بھائی صاحب کو بتائیں گی اور الزام ہمیشہ کی طرح مجھ پر آئے گا کہ میری شہ پر یہ سب ہو رہا ہے۔" انہیں اصل پریشانی اسی بات کی تھی۔

"تو کیا ہوا۔ ہم ابا کو ساری بات بتا دیں گے۔" ماہین نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اور وہ تو جیسے مان ہی لیں گے ناں؟" وہ چڑ کر بولی تھیں لیکن دونوں ہمیشہ کی طرح اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے پر تیار نہیں تھیں کہ غلط بات پر کوئی سمجھوتا نہیں!

☼ ☼ ☼

پھپھو شادی کے محض دو سال بعد بیوگی کی چادر اوڑھ کر پھر سے میکے کی دہلیز پر آ بیٹھی تھیں۔ تب نیلی صرف چھ ماہ کی تھی۔ نام تو شہنیلا تھا لیکن کانچ جیسی نیلی آنکھوں کی وجہ سے پیار کا نام "نیلی" ہی ٹھہرا۔

ممتاز خان نے یہ سوچ کر کہ بیٹی خود کو بوجھ نہ سمجھے اور کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو گھر کے سارے معاملات ایک بار پھر ان کے ہاتھ میں دے دیے۔ تائی امی ایک بیٹے کی ماں ہونے کے باوجود کہیں پس منظر میں چلی گئیں۔ چھوٹے بھائی (امائم کے والد) ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ جب تک ممتاز خاتون زندہ رہیں۔ گھر کے تمام چھوٹے بڑے معاملات دونوں ماں بیٹی سنبھال لیتیں۔ تائی امی کی حیثیت گھر میں تیسرے درجے کے شہری کی سی تھی۔ کیونکہ دونوں بھائی آپا کا حکم سمجھ کر مانتے تھے۔

ممتاز خاتون کے وفات پانے کے بعد پھپھو نے اپنی پسند سے چھوٹے بھائی کی شادی کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی خوشیوں کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی۔ ریحان صاحب شادی کے محض دو سال بعد کار حادثے میں اپنی بیوی کے ساتھ موقع پر ہی وفات پا گئے۔

تین ماہ کی امائم اپنے عظیم نقصان سے بے خبر بھوک سے بلک رہی تھی۔ تائی امی نے تڑپ کر اسے اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ ایک ماہ پہلے ان کے ہاں ماہین کی پیدائش ہوئی تھی۔ انہوں نے دونوں کی پرورش میں دن رات ایک کر دیے ہر گزرتے۔ دن وہ یہ بھولتی گئیں کہ امائم کو انہوں نے جنم نہیں دیا۔

☼ ☼ ☼

ہوا کے رتھ پہ سوار بادلوں کے قافلے نے سارے آسمان پہ قبضہ جمایا تو آدھا ادھورا چاند با آسانی اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں روپوش ہو گیا۔ بجلی چمکی اور بارش کی بوندوں نے دھرتی کے سینے پر جل تھل کر دی۔

"آہا بارش!" ساون کی دیوانی امائم نے پلکوں کی منڈیر پر بیٹھے نیند کے پنچھی کو پھر سے اڑا دیا اور خود کھڑکی کھول کر بانہیں باہر پھیلا دیں۔ بارش کی کن من کو سننا اور محسوس کرنا کتنا جاں فزا ہے! وہ مسحور سی کھڑی رہی۔

ماہین صبح اپنے وقت پر بیدار ہوئی ۔۔۔ ہاتھوں سے بالوں کو سنوار کر ایک کندھے پر ڈالا اور سلیپر پاؤں میں اڑستی واش روم میں گھس گئی۔

"امائم! باہر چلیں؟"

"پھپھو سے اجازت کون لے گا؟"

"جس چیز کے بارے میں یقین ہو' وہ نہیں ملے گی تو اسے مانگنا بھی نہیں چاہیے۔" ماہین نے اس کا ہاتھ کھینچا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ تائی امی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھا۔ باہر جانے سے پہلے وہ ایک ساتھ پلٹیں' مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور چھپاک سے باہر نکل گئیں۔

تارکول کی سیاہ شفاف سڑک کے دونوں اطراف سرسبز گھنے پیڑوں پر ابھی بھی بارش کے قطرے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔

"امائم! بہت خوش نصیب ہوتی ہو گی نا وہ عورت جس کا شوہر اس سے بے پناہ محبت کرتا ہو؟"

"اونہوں! وہ مرد بہت خوش نصیب ہوتا ہو گا جس کی بیوی اس سے محبت کرتی ہو۔"

"تمہارا فلسفہ میری سمجھ سے باہر ہے۔" ماہین نے درخت کی بوندوں بھری شاخ پکڑ کر ایک دم چھوڑ دی تو نیچے کھڑی امائم بری طرح بھیگ گئی۔

"مرد کی محبت پانی کے بلبلے جیسی ہوتی ہے۔ ابھی بنا ابھی ختم! وہ محبت جو نظریہ ضرورت کے تحت جنم لیتی ہے' ضرورت ختم تو محبت بھی ختم۔ جبکہ عورت تو سراپا محبت ہے۔ جو ہستی اتنی عظیم ہو' محبت جس کے وجود سے پھوٹتی ہو' وہ کسی مرد کی محبت پر خوش نصیبی کا تاج کیونکر اپنے سر پر سجا سکتی ہے؟ یہ اعزاز تو اسے حاصل ہے۔ یہ اعزاز اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"اور مرد؟" ماہین کی آواز بوڑھے برگد کے پیڑ پر زور زور سے اپنے گیلے پر پھڑپھڑاتے کوؤں کی آواز میں دب گئی۔

"دنیا کی نظر میں ایک کامیاب مرد' جس کے پاس بے تحاشا دولت ہو' خوب صورت گھر' بیوی بچے ہوں' آسائشات ہوں اور زندگی کے کسی حصے میں اسے یہ پتا چلے کہ اس کی بیوی اس سے محبت نہیں کرتی تو یہ کتنی بڑی شکست ہے۔ اس مرد سے زیادہ کنگال' غریب اور شکست خوردہ اور کوئی ہو سکتا ہے بھلا؟" انہوں نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔

"تو امائم ڈیر! مجھے لگتا ہے تمہارا شوہر اس لحاظ سے دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہو گا۔" ماہین ہنسی تھی۔ امائم کندھے اچکا کر مسکرا دی۔

"ہیلو گرلز! موسم انجوائے کیا جا رہا ہے؟" ساتھ والی نگہت آنٹی کا امریکا پلٹ بیٹا وجدان آ ٹکرایا۔ دونوں ایک متانت بھری مسکراہٹ سے نوازتی آگے بڑھ گئیں۔ تائی امی کچن میں ناشتا بنانے میں مصروف تھیں۔ گرما گرم پوریوں کی مہک سارے گھر میں پھیل رہی تھی۔ دونوں وہیں پیڑھی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

"ختم ہو گئے سیر سپاٹے؟" پھپھو کی پیشانی پر پڑے بل ناقابل شمار تھے۔

"پھپھو! ہم مارننگ واک پر گئے تھے۔ ابا کہتے ہیں صبح اٹھ کر ایک آدھ گھنٹہ کی چہل قدمی حفظان صحت کے اصولوں میں سے سب سے بہترین اصول ہے۔" جواب ماہین کی طرف سے آیا تھا۔

"بلکہ میں تو کہتی ہوں نیلی! تم بھی ہمارے ساتھ چلا کرو۔ صحت اور مزاج دونوں پر اچھا اثر پڑے گا۔" امائم کے ہلکے پھلکے انداز پر نیلی بھڑک اٹھی۔

"بہت بہت شکریہ! مجھے تم دونوں کی طرح دبلا ہونے کی فکر میں اپنی ٹانگیں گھسانے کا کوئی شوق نہیں۔" دونوں نے سر ہلا کر گویا اس کی بات سے اتفاق کیا اور جی جان سے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

آج پھپھو ہفتہ بھر کا سودا سلف لینے کی غرض سے مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ سکون کی مہربان پری نے جادو کی چھڑی گھما کر سارے منظر بدل دیے۔

اگرچہ فضا میں ساون کا مخصوص حبس رچا ہوا تھا۔ امائم اپنے لمبے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی' جہاں ماہین' پھپھو کی نظر بچا کر دو چار بڑے بڑے آم اڑا کر اب چھت پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"اللہ کرے پھپھو دو چار گھنٹوں سے پہلے واپس نہ

آئیں۔" امائم نے آم کی قاشیں کاٹتے ہوئے صدق دل سے دعا کی اور ماہین نے باقاعدہ منہ پر ہاتھ پھیر کر آمین کہا تھا۔

"سنا تھا اہل پاکستان کو خدا نے فیاضی سے حسن عطا کیا ہے۔ اب جو ذرا غور کیا تو پتا چلا بات تو بالکل درست ہے۔" ریلنگ پر جھکا وجدان بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔ ماہین کا چہرہ لو دینے لگا۔

"اگر آپ کو کوئی خوب صورت لگتا ہے تو آپ ڈائریکٹ اس کی تعریف کر دیں لیکن پورے پاکستان کے لوگوں کو انوالو کر کے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟" ایسے جواب کی توقع امائم سے ہی کی جا سکتی تھی۔

"نائس!" وہ ہنسا تھا۔ گویا اس کی حاضر جوابی سے محظوظ ہوا ہو۔

"امائم! لگتا ہے پھپھو آگئی ہیں۔ جلدی چلو۔" ماہین بعجلت اس کا ہاتھ کھینچ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

"مجھے لگتا ہے یہ وجدان صاحب خوامخواہ ہم سے فری ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔" امائم نے خیال آرائی کی۔

"پتا نہیں!"

"اور مجھے تو یہ بھی لگتا ہے ان کے سامنے تمہاری اچھی خاصی بولتی بند ہو جاتی ہے۔" اب کی بار امائم نے لہجے میں مصنوعی شک سموتے ہوئے اسے سرتاپا دیکھا۔

"میں نے نوٹ نہیں کیا۔ اب کروں گی۔ ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔" ماہین لب دباتی ایک ساتھ دو سیڑھیاں پھلانگتی اس سے پہلے نیچے پہنچ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ اپنی نیلی بی بی آج کل کچھ مشکوک حرکتیں نہیں کرتی پھر رہیں؟" امائم تائی امی کو چائے دے کر آئی تو ماہین اسی ادھیڑبن میں لگی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے دیکھا نہیں سارا دن موبائل سے چپکی رہتی ہے۔ ہونٹوں کے کناروں سے چھلکتی مسکراہٹ اور چہرے پر بکھرتے رنگ ـــــ مجھے تو کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔"

"ہمیں کیا؟" امائم نے لاپروائی سے کہتے کلینزنگ اٹھا لیا لیکن ماہین جب تک بال کی کھال نہ اتار لیتی اسے چین نہیں ملتا تھا۔

"نیلی کا کلاس فیلو ہے عمیر۔ دونوں کی دوستی خطرناک حد تک آگے بڑھ چکی ہے۔ اب شہزادی بی بی کا پرزور اصرار ہے کہ وہ رشتہ لینے کے لیے اپنے گھر والوں کو جلد از جلد بھیجے۔" ایک ہفتے بعد وہ امائم کو ساری رپورٹ دے چکی تھی۔

"تمہیں کن سوئیاں لینے کی عادت کب سے پڑ گئی؟"

اتنی سنسنی خیز معلومات کے جواب میں اتنا روکھا پھیکا ردعمل۔ ماہین کچھ بدمزا سی ہو گئی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟" وہ بے یقینی سے منہ کھولے امائم کو یوں دیکھنے لگی گویا اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"امائم! کیا بتایا ہے تم نے پھپھو کو؟"

"جو کچھ تم نے بتایا تھا وہ سب بتا دیا بمعہ تفصیل۔" امائم نے ہاتھ جھاڑے۔

"اور انہوں نے تمہیں زندہ چھوڑ بھی دیا؟" ماہین کی حیرت کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

"ہفتہ بھر سے تم نے میرے کان کھائے تھے امائم ـــ اب کیا ہو گا؟ میں نے ایک دم ـــــ تمہاری ساری بے چینی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب پھپھو جانیں اور ان کی اکلوتی دختر نیک اختر۔" امائم کا اطمینان قابل رشک تھا۔

ماہین نے غور کیا پھپھو آج کل کچھ بے چین سی ہیں۔ اکثر فون پر کسی سے لمبی چوڑی گفتگو کرتی پائی جاتی ہیں اور کتنے ہی دنوں سے انہیں جھاڑنے کا

پروگرام بھی التوا میں ڈالا ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے بلی تھیلے سے باہر بس آیا ہی چاہتی ہے لیکن دو دن بعد ساری بلیاں ہی تھیلے سے باہر تھیں۔

"نیلی کی بات پکی ہو گئی ہے!"

پھپھو کی بڑی نند جو برسوں سے انگلینڈ میں مقیم تھیں اپنے انجینئر بیٹے کے لیے پاکستان میں لڑکیاں تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔ نظر انتخاب بالآخر نیلی پر ٹھہری اور بالا ہی بالا سارے معاملات طے پا گئے۔ تائی امی کا رنج و غم سے برا حال تھا۔ ساری عمر جس نند کی جی حضوری کی تھی اس نے مشورہ کرنا تو درکنار ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ البتہ تایا ابا سے اکیلے میں تفصیلی بیٹھک ضرور ہوئی تھی۔

"مبارک ہو نیلی!" دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں۔

"تھینکس!" انہیں ڈھونڈنے پر بھی اس کے چہرے پر کچھ کھو دینے کا ملال نظر نہیں آیا تھا۔

"معظم صاحب کیسے لگے تمہیں؟"

"ویری نائس!"

"اور وہ عمیر ـــــ" ماہین نے بے اختیار زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔ نیلی نے ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا پھر قدرے سنبھل کر دانستہ لاپروائی سے کہنے لگی۔

"اوہ! وہ ایک فلرٹی لڑکا تھا۔ میرے معیار پر پورا نہیں اترا۔"

"ویسے ٹریٹ تو چلے گی؟"

"شیور یار! دوں گی۔" وہ ایک ادا سے بال جھٹکتی وہاں سے اٹھ گئی۔

"بڑے پھنسے معظم صاحب!" یہ دونوں کی متفقہ رائے تھی۔

☼ ☼ ☼

امائم آٹا گوندھ رہی تھی۔ آخر میں اس نے آٹے کی بھور بنا کر سکھ چین کی چھاؤں تلے بکھیر دی۔ ڈھیر ساری چڑیاں پیڑ سے اتر کر بھور چگنے لگیں۔ امائم نے ذرا کی ذرا رک کر انہیں دیکھا۔ وہ یکدم سہم کر اڑیں اور سکھ چین کے پتوں میں چھپ گئیں۔ امائم جلدی سے کچن میں گھس گئی۔ ماہین تائی امی کے لیے سکنجبین بنا رہی تھی۔ امائم کو ایک گلاس پکڑا کر خود باہر نکل آئی۔

"امی! آپ نے شہریار بھائی کے لیے کیا سوچا ہے؟"

"کیا مطلب؟" امی نے گلاس تھامتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"مطلب یہ کہ امائم اور شہریار بھائی کی جوڑی کیسی رہے گی؟" وہ ماں کو پھپھو کے دیے دکھ سے نکالنا چاہتی تھی۔

"شہریار کے لیے میں کسی اونچے گھرانے سے ایک بہترین لڑکی لاؤں گی۔" ماہین کو دھچکا سا لگا تھا۔

"امی! امائم سے بڑھ کر بہترین لڑکی آپ کو اور کہاں ملے گی؟"

"امائم کو میں نے ماں بن کر پالا ہے۔ اس کے لیے میں ایک بیٹی کی ماں بن کر ہی سوچوں گی اور خبردار! جو تم نے امائم سے اس سلسلے میں کوئی الٹی سیدھی بات کی تو۔" ماں نے منع کیا مگر وہ بھلا کون سا منع ہو جانے والوں میں سے تھی۔

"امائم! اگر تمہاری شادی شہریار بھائی سے ہو جائے تو ـــ میرا مطلب ہے۔" وہ دوسرے ہی دن اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔

"نہیں ماہین! میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔" امائم ایک دم کچھ بے چین سی ہو گئی۔ ماہین بدستور کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"دو جمع دو چار کرنے والے لوگ اکثر زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جبکہ میں اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے سہارے اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔" وہ صاف گوئی سے کہہ رہی تھی۔ ماہین کے لبوں سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔

"اگر تمہارے دل میں شہریار بھائی کی محبت ہوتی تو بخدا میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انہیں تمہارے حوالے کروتی۔" اس نے بے حد خلوص سے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھپھو بے حد مصروف ہو گئی تھیں۔ نیلی کی منگنی دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے تیاریاں عروج پر تھیں۔ نیلی روز معظم کے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار نکل جاتی' واپسی مختلف شاپنگ بیگز کے ہمراہ ہوتی۔

تائی امی کا موڈ ہنوز خراب تھا۔

"امی! آپ کے یہ بگڑے تیور پھپھو کے شک کو یقین میں بدل دیں گے کہ آپ نیلی کو بہو بنانے کا خواب دیکھ رہی تھیں جو کہ چکنا چور ہو کر رہ گیا ہے۔"

ماہین کی بات خاصی کارگر ثابت ہوئی اور وہ سب بھول بھال کر منگنی کے فنکشن کی تیاریوں میں لگ گئیں۔

تقریب خاصے وسیع پیمانے پر منعقد کی گئی تھی۔ پھپھو نے اپنے سب جاننے والوں کو مدعو کیا تھا۔ نیلی پارلر سے تیار ہو کر اچھی خاصی خوب صورت لگ رہی تھی۔ امائم نے سیاہ اور ماہین نے ٹی پنک کلر کی فراک پہنی تھی۔

معظم کا دونوں سے سالیاں کہہ کر تعارف کروایا گیا۔ پھپھو کو ان دونوں کا معظم سے بے تکلف ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن امائم کو تو سارے اخلاقی تقاضے آج ہی نبھانے یاد آ رہے تھے۔ ماہین تائی امی کے بلانے پر اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔

"لگتا ہے آپ کے ہاں مہمانوں کو انوائیٹ کر کے بھول جانے کا رواج ہے۔" وجدان آنکھوں میں شکوہ لیے راستہ روکے کھڑا تھا۔

"جی نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل ہمارے گھر کا پہلا فنکشن ہے' اس لیے اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو دیکھ کر کنفیوژن ہو رہی ہے۔" انگلیاں مروڑتی وہ اچھی خاصی نروس ہو رہی تھی۔

"ویسے آپ کے عزیز و اقارب خاصے زندہ دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو لگے ہاتھوں ان کا تعارف بھی کروا دیں۔" اس کے اپنائیت بھرے تقاضے پر ماہین گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن وجدان وہاں سے ٹلنے پر قطعی آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مرے مرے انداز سے دور سے ہی ایک ایک کا تعارف کروانے لگی۔

"وہ پھپھو ہیں۔ وہ معظم بھائی کی امی' وہ راشدہ آپا' یہ آمنہ چچی۔" "اف موصوف کی دلچسپی دیکھ کر تو لگتا ہے سارے مجمع کا تعارف کرانا پڑے گا۔" ماہین کراہ اٹھی۔ بری پھنسی تھی۔ نیلی کے ساتھ جڑ کر بیٹھی امائم کو دور سے بھی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ اسٹیج سے اتر کر ان کے پاس چلی آئی۔

ماہین موقع سے فائدہ اٹھا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

سکھ چین کی مہربان گھنی شاخوں میں برسوں سے پناہ لیتی بھوری چڑیاں اچانک ایک ساتھ شور مچانے لگیں تو امائم نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ایک بلی نے ان کے آشیانے پر دھاوا بول دیا تھا۔ امائم جھاڑو پھینک کر تیزی سے اٹھی۔ بلی نے گھبرا کر ایک نظر اسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے جست لگا کر عقبی دیوار پر چڑھی اور پیچھے گلی میں چھلانگ لگا دی۔

یک زبان چہچہاتی چڑیاں ایک دم پر سکون ہو گئی تھیں۔ امائم نے پھر سے جھاڑو اٹھا لی۔

رات کے فنکشن کے اثرات ابھی تک یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ خشک پھولوں کی پتیاں' مٹھائی کے خالی ڈبے' چیونٹیوں کی لمبی قطار۔۔۔ فضا میں ایک دم حبس کے پنچھی نے پر پھیلا کر سارا ماحول بوجھل اور کثیف بنا دیا۔ امائم نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ گرد آلود آسمان کے سینے پر تیرتی چار پانچ چیلیں!

امائم چھت سے نیچے اتری تو ٹھٹک کر رک گئی۔ پھپھو اور تائی امی نے ایک ساتھ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے ان کی نظروں سے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ وہ الٹے قدموں باہر نکل گئی۔ بلی پھر سے دیوار پر چڑھی چڑیوں کو ہراساں کر رہی تھی۔ وہ نظریں چراتی اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

اگلی صبح پچھلے ایک گھنٹے سے تائی امی' پھپھو' شہریار بھائی اور تایا جان بڑے کمرے میں گفتگو میں مصروف تھے۔ ماہین نے سن گن لینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن کچھ پلے نہ پڑا تو جھنجلا سی گئی۔

"مجھے لگتا ہے آج کچھ ہو کر رہے گا۔" امائم کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا بلاوا آ گیا۔

"ہم نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے امائم! بی بی حاجراں جلد شادی کی خواہاں ہیں۔ اس لیے ہم نے انہیں نکاح کے لیے اس جمعہ کا دن دے دیا ہے۔"

اسے دھچکا لگا۔ اس کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ' اتنی عجلت میں اور اس سے پوچھے بغیر وہ کیسے کر سکتی ہیں بھلا؟ پھپھو اور بھی کچھ کہہ رہی تھیں اور وہ بنا پلک جھپکے انہیں دیکھے گئی۔

"جہانگیر نام ہے لڑکے کا۔ اتنی بڑی حویلی ہے۔ بی بی حاجراں جان چھڑکتی ہیں اپنے پوتے پر۔۔۔" وہ بغیر کچھ بولے پلٹی اور باہر نکل گئی۔

پھپھو نے کہا تھا۔ امائم اور ماہین میں سے جس کا چاہیں رشتہ دے دیں اور تائی امی نے امائم کا نام لے دیا تھا۔ اتنی دور کسی پسماندہ سے گاؤں کے اجڈ لوگوں میں اپنی بیٹی کو دینے کا فیصلہ وہ کیونکر کر سکتی تھیں۔ میں جو آج تک انہیں اپنی ماں سمجھتی رہی کوئی سچ مچ ان کی بیٹی تو نہیں بن گئی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے بدگمانی کی ایسی دبیز چادر سی تنی کہ اپنائیت اور خلوص سے رچا ہر منظر دھندلا گیا۔ وہ اپنے خود ساختہ گلے شکووں کے جنگل میں بھٹکتی خود سے الجھتی دور تک نکل گئی۔

گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ پھپھو' تائی امی' تایا ابا سب اپنے اپنے طور پر مصروف ہو گئے تھے۔ ماہین کی تو امائم کے اتنی دور جانے کا سن کر ہی جان پر بن آئی تھی۔ مزید امائم کا غیر معمولی گم صم رویہ اس کی حواس باختگی میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ تو دو ہی دن میں بوکھلا کر رہ گئی۔

"امائم! تمہیں یاد ہے۔ میں نے کہا تھا جب تمہاری شادی ہو گی تمہیں مہندی میں لگاؤں گی۔" اسے کب کی کہی اپنی بات یاد آ گئی تھی۔ امائم نے خاموشی سے اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلا دیں۔ ماہین سر جھکا کر اس پر نقش و نگار بنانے لگی۔

"امائم! پارلر سے ٹائم لے لوں کل کے لیے؟" نیلی کھٹ کھٹ کرتی اندر داخل ہوئی۔

"میں پارلر نہیں جاؤں گی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے ہم تمہیں گھر پہ ہی تیار کر لیں گے۔ ماہین تم میری ہیلپ کرا دینا۔" نیلی نے بیوٹیشن کا کورس کر رکھا تھا۔ ماہین اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

امائم کو اپنی کیفیت خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے ان سب کی محبت ڈھکوسلہ لگ رہی تھی۔ رشتہ طے کرنے سے پہلے کسی نے اس سے رائے تک لینا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ بات اس کے دل میں انی کی طرح گڑ گئی تھی۔

رات ساری اس نے ادھ سوئی ادھ جاگی کیفیت میں گزار دی۔ ماہین اس کا ہاتھ دبوچے بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ وہ امائم کو بے انتہا چاہتی تھی۔ امائم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور وضو کرنے غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر ماہین کی بند پلکوں پر چمکتے ستاروں کو دیکھا۔ وہ چاہ کر بھی اس سے ناراض نہیں ہو سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھلے احاطے میں لکڑی کی منقش کرسی پر اسے

بٹھایا گیا' زرق برق کپڑوں میں ملبوس عورتیں شہری دلہن کو دیکھنے کے اشتیاق میں شہد کی مکھیوں کی طرح امڈی پڑ رہی تھیں۔ نجانے کون کون سی رسموں کے بعد اسے اوپر اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بھاری لباس ڈھیر سارے زیورات' گرمی' حبس نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ اس پر واری صدقے جانے کے بعد بی بی حاجراں نجانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ پیاس کے مارے اس کے حلق میں گویا کانٹے سے اگ آئے تھے۔ کسی نے کولڈ ڈرنک تو دور سادہ پانی تک کا نہیں پوچھا تھا اس سے۔ وہ بھوک کے مارے پیٹ سے آتی آوازوں کو سنتی ضبط کیے بیٹھی رہی۔

دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ آنے والا مضبوط قدموں سے چلتا بیڈ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا۔ ایک' دو' تین' لمحے خاموشی کی نذر ہونے لگے۔ امائم کو اس کی خاموشی سے الجھن سی ہوئی تو بے اختیار سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔

"نیا لو!" بلا ارادہ اس کے منہ سے پھسلا تھا۔ پھر تیزی سے سر جھکا لیا۔ وہ کچھ دیر تک اس کے جھکے سر کو گھورتا رہا پھر اچانک بائیں جانب مڑا اور ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ اس کے کلون کی مہک چاروں اور چکرانے لگی تھی۔

"یوں اسٹیچو بن کر بیٹھے رہنے سے رات نہیں گزرے گی۔ چینج کرو اور آرام سے سو جاؤ۔"

گیلے بالوں میں برش چلاتے ہوئے وہ بے تاثر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اور بنا اس کی جانب دیکھے سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھا کر باہر نکل گیا۔ امائم جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

جہانگیر کی پیدائش کے پانچ سال بعد اس کی ماں جگر کے سرطان کا شکار ہو کر وفات پا گئی تو بی بی حاجراں نے نور محمد کی دوسری شادی کر دی۔ زرینہ فطرتاً" جھگڑالو اور تنگ مزاج تھی۔ شادی کے دوسرے ہی روز دونوں ساس بہو کے درمیان ہونے والی تلخ کلامی آنے والے طوفانی جھگڑوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو زچ کرنے اور نیچا دکھانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتیں۔ بڑی بیٹی رفعت ہو بہو ماں کا پرتو تھی۔ بیاہ کر ساتھ والے محلے میں چلی گئی۔ لیکن دادی کو ناکوں چنے چبوانے کے لیے ماں کا ساتھ دینے ہر روز میکے آ دھمکتی۔ بابر اور وجیہہ عمر میں اس سے چھوٹے تھے۔ آئے دن کے گھریلو جھگڑوں اور چپقلش نے جہانگیر کو وقت سے پہلے سنجیدہ اور ذمہ دار بنا دیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ کر اس نے اپنے کئی مربعے آبائی زمین کا سارا انتظام بخوبی سنبھال لیا تھا۔

زرینہ اس کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنے کی خواہاں تھی۔ جبکہ دوسری طرف بی بی حاجراں نے اس کی شادی کرانے کا حق خود کو تفویض کر رکھا تھا۔

"آپ دونوں مل کر کسی ایک لڑکی کو پسند کر لیں میں اسی سے شادی کر لوں گا۔" جہانگیر نے ہمیشہ کی طرح دونوں کا مان رکھنا چاہا۔ بابر خوب ہنسا تھا "سورج مغرب سے نہ نکل آتا' اگر دونوں ساس بہو کسی ایک بات پر متفق ہو جاتیں۔ دونوں کا مقصد ہی یہی تھا کہ اپنی پسند کی ایسی لڑکی لائیں جو مقابل کو دن میں تارے دکھانے میں ان کی معاون ثابت ہو۔"

اچانک بی بی حاجراں کے دماغ میں سوچ کا ایک کیڑا کلبلایا اور وہ خود کو داد دیے بنا رہ نہ سکی۔ شہری' پڑھی لکھی' طرح دار' مقابل کو جوتی کی نوک پر رکھنے والی مغرور بہو یقیناً "بہترین" "معاون" ثابت ہو سکتی تھی۔ انہوں نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے برسوں سے شہر میں مقیم اپنی خالہ زاد رقیہ سے خفیہ طور پر رابطہ بحال کیا اور آناً "فاناً" سارے معاملات یوں طے کیے کہ زرینہ "ہیں' ہیں" کرتی رہ گئی اور امائم دلہن بن کر اس گھر میں آ گئی۔

☼ ☼ ☼

ہلکا پھلکا تیار ہونے کے بعد وہ نیچے آ گئی تھی۔

"بھابھی! ادھر آ جائیں۔" وہ وجیہہ کی محبت میں بڑے کمرے میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم!" جہانگیر کے ساتھ والی کرسی خالی تھی وہ جھجکتے ہوئے اس پر بیٹھ گئی۔ زرینہ اور رفعت نے خاصی تیکھی نگاہوں سے سرتاپا اسے گھورا تھا' پھر "ہونہہ" کہہ کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"رات اس کی بہن کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی اسے زیادہ دیر تک بھوکا رہنے کی عادت نہیں ہے۔ یاد سے کچھ کھلا پلا دینا۔"

رفعت بنا کسی کو مخاطب کیے جتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بی بی حاجراں نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔

"ائے کیا کروں اتنی سوہنی اور کرموں والی بہو لا کر میں تو خوشی سے سب کچھ بھول گئی' یا اللہ! تیرا کیسے شکر ادا کروں تو نے مجھے ایسی بہو دی کہ دشمنوں کے سینوں پر تو مانو سانپ لوٹنے لگے۔"

امائم کو ان کے الفاظ و انداز پر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ جہانگیر ناشتا ختم کر کے اٹھا اور بنا ایک لفظ بولے باہر نکل گیا۔ سب کے سامنے اس کے رویے پر امائم ایک بار پھر الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ کہیں کچھ نہ کچھ غلط ضرور تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

ولیمہ کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ بارات والے دن ہی ساری برادری کو کھانا کھلا کر ولیمہ نپٹا دیا گیا تھا۔ بی بی حاجراں سارا دن سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہی تھیں۔ زرینہ اور رفعت اسے دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کرنے لگتیں مزید بابر اور وجیہہ کی معنی خیز مسکراہٹ۔ وہ بوکھلا سی گئی۔

"میں گھر دیکھ لوں؟" بی بی حاجراں سے اجازت لینے کے بعد وہ جلدی سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔ جدید طرز پر بنی وسیع و عریض حویلی کی جہانگیر نے حال ہی میں از سرنو تعمیر کروائی تھی۔

"ماہی اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟" آہستگی سے قدم آگے بڑھاتی وہ ماہی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اتنے نفوس کی موجودگی کے باوجود حویلی میں ایک وحشت زدہ خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

املتاس کے پتوں میں چھپی بھوری چڑیوں کی چہچہاہٹ فضا میں ہلکا سا ارتعاش برپا کر رہی تھی۔ وہ گھومتے پھرتے کچن میں آ گئی۔

"کچھ چاہیے؟" سکنجبین بناتی شادو نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ بی بی حاجراں اور زرینہ دونوں کچن میں جھانکتی تک نہیں تھیں۔ ایسے میں نئی نویلی دلہن کی کچن میں موجودگی اس کے لیے حیرت کا باعث بنی تھی۔

"مجھے آٹے کی تھوڑی سی بھور بنا کر دو گی؟" اس نے آٹا گوندھتی نذیراں سے کہا تو وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی پھر ایک پیالے میں آٹے کی بھور ڈال کر پیالا اس کی جانب بڑھا دیا۔ امائم نے وہ ساری بھور املتاس کے پیڑ کے نیچے بکھیر دی۔ ڈھیر ساری بھوری چڑیاں زمین پر اتر آئیں۔ وہ مسکراتے ہوئے پلٹی اور پیالا قدرے حیران کھڑی نذیراں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے اپنے سکھ چین کی چڑیاں یاد آ گئی تھیں۔

رات کا کھانا اس نے بی بی حاجراں کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اسے گھر کے مکینوں کا ایک دوسرے سے کھنچاؤ اور طنزیہ انداز بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ مختلف سوچوں کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی وہ بالآخر نیند کی آغوش میں سر رکھ کر سو گئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ اس کی آنکھ کھلی۔ بیڈ کے دوسرے کنارے پر لیٹے جہانگیر کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں اتنا وجیہہ مرد پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کھڑے کھڑے مغرور نقوش سے جھلکتی بے نیازی! وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی کہ جہانگیر نے ایک دم اس کی طرف کروٹ لے لی۔ امائم نے سٹپٹا کر اپنی نظروں کا زاویہ بدلا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"کیا یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے؟ کیا یہ کسی اور کو۔۔۔" اس سوچ نے اسے باقی کی ساری رات بے چین کیے رکھا۔ صبح آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔

"یا اللہ!" گھر والوں کے عجیب و غریب رویے نے

اسے بری طرح چکرا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"پتر! تیرے گھر والے آئے ہیں تجھے لینے۔ جلدی سے تیار ہو کر نیچے آجا۔"

بی بی حاجراں کے بلاوے پر خوشی سے بے قابو ہوتی وہ ایک ساتھ دو' دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ لیکن سامنے تایا ابا اور شہریار بھائی کے ساتھ جہانگیر کو دیکھ کر قدم بے ساختہ تھمے تھے۔ دوپٹا ٹھیک کرتے وہ آہستگی سے آگے بڑھی اور تایا ابا کے سینے سے لگ گئی۔

وہ جو کہتی تھی شادی کے بعد ایک بار بھی مڑ کر ان سب کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔ اور اب دل تھا کہ موم کی مانند پگھلا جا رہا تھا۔ جی چاہا گھنٹوں پہ محیط سفر لمحوں میں طے ہو جائے۔ تائی امی کو سامنے دیکھ کر وہ بے ساختہ ان کے گلے لگی تھی۔

"ابھی تک ناراض ہو؟" اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"تو آپ بے خبر نہیں تھیں اور میں سمجھی ۔۔۔ آپ نے میری ناراضی دور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ اس کی لبوں سے پھسل گیا تھا۔

تائی امی نے اسے دوبارہ سینے میں بھینچ لیا۔ وہ پہلی بار دل سے مسکرائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ماہین اس کا ہاتھ کھینچتی چھت پر لے گئی۔

"امائم! جہانگیر بھائی تمہیں کیسے لگے؟ تم خوش تو ہو ناں؟ میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں تمہارے لیے۔"

"تو اتنے خلوص سے مانگی گئی دعائیں رد ہو سکتی ہیں بھلا؟"

"تم سچ کہہ رہی ہو؟" ماہین نے بے ساختہ اس کے ہاتھ تھامے۔ امائم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہمسائے ٹھیک ہیں؟" اس نے ساتھ والی چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

"امائم! وہ اسموکنگ کرتا ہے۔" خاصے غمگین انداز میں اطلاع دی۔

"اچھا!"

"سگریٹ پیتے ہوئے وہ بالکل ٹام کروز دکھتا ہے لیکن اس سے اسے جگر یا پھیپھڑے کی کوئی خطرناک بیماری بھی تو لگ سکتی ہے۔" غمگین انداز میں اب کی بار تشویش بھی در آئی تھی۔

"اچھا!" امائم نے ہنسی دبائی۔ ماہین بری طرح چڑ گئی تھی۔

"تم کبھی نہیں سدھرو گی۔ شاید جہانگیر بھائی ہی یہ کمال کر ڈالیں۔" دونوں ایک ساتھ چلتی ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ جہاں سب جہانگیر کو گھیرے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"اچھا دیکھتے ہیں۔" امائم ہنسی تھی۔ جہانگیر نے بے اختیار چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اتنی بے ریا' شفاف ہنسی! کیا یہ ہمارے گھر کے سازشی ماحول میں رہ پائے گی؟

ایک سوچ ابھری اور اسے بے چین کر گئی۔

☆ ☆ ☆

"شہر سے بھولا کر تم نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا جو ہمارے سروں پر چڑھی جا رہی ہو۔" زرینہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"ہاں ہاں میں خوب جانتی ہوں اپنی کلموہی بھتیجی کو یہاں نہ دیکھ کر کیسے تیرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔" نیچے سے آتی چیختی چنگھاڑتی آوازیں سن کر امائم ننگے پاؤں بھاگتی باہر آئی تھی۔ زرینہ لال بھبھوکا چہرہ ہاتھ نچا نچا کر کہہ رہی تھی۔

"جس کے زعم میں تم یوں گردن اکڑائے بیٹھی ہو ناں جب یہی تمہیں اس عمر میں حویلی سے نکال باہر کرے گی تب کہنا۔"

"اس خوش فہمی میں مت رہنا یہ مجھے نہیں بلکہ تم سب کو چوٹی سے پکڑ کر سڑک پر نہ ڈال دے تب کہنا۔" جوابی گولہ باری ہوئی تھی۔ امائم ششدر رہ

گئی۔

"پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں' پر اللہ کو یاد کرنے کے بجائے فساد ڈالنے سے باز نہیں آتی۔ دادی۔" رفعت کے الفاظ و انداز پر تو اسے جھٹکا سا لگا تھا اور جواباً" بی بی حاجراں نے اسے جو بے بھاؤ کی گالیاں اور کوسنے دیے۔ امائم کا جی چاہا کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہیں دور بھاگ جائے۔

"جہانگیر! یہ ۔۔۔" سامنے سے آتے جہانگیر کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔ جہانگیر نے ایک نظر اس کے ہوائیاں اڑے چہرے پر ڈالی اور اسے اوپر آنے کا اشارہ کرتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

"وہ لوگ بہت برے طریقے سے لڑ رہی ہیں۔" بھاگنے کے سے انداز میں سیڑھیاں پھلانگنے سے اس کا سانس بھری طرح پھولا ہوا تھا۔

"تو کیا اچھے طریقے سے بھی لڑا جا سکتا ہے؟"

"نہیں! میرا مطلب ہے ۔۔۔"

"یہاں ایسے دنگل روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تمہارے سامنے شاید پہلا معرکہ ہے ان کا۔"

"لیکن بات کو بڑھانے کے بجائے مل بیٹھ کر سلجھایا بھی تو جا سکتا ہے؟"

"اور اگر کوئی سلجھانا ہی نہ چاہے تو۔" وہ براہ راست اس کی جانب دیکھ کر بولا۔ امائم چپ کی چپ رہ گئی۔

"بات سنو! بی بی یہاں تمہیں صرف اپنا مہرہ بنا کر لائی ہیں۔ اگر چل گئیں تو ان کے وارے نیارے لیکن میرا خیال ہے کہ تب تک تم اتنی بری طرح "پٹ" چکی ہو گی کہ خود کی پہچان کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ اپنے دل کی سرزمین پر دوسروں کی حسب منشا آبیاری کی جائے تو خوشی و مسرت کے پھول بہت جلدی کملا جاتے ہیں۔" امائم دم سادھے اس کا لفظ لفظ سنے گئی۔

"اور آپ؟ اس سب میں آپ کہاں ہیں؟" الفاظ بے اختیار اس کے لبوں سے پھسلے تھے۔

"میں تمہیں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے ۔۔۔" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ "یہاں کوئی تمہارا خیر خواہ نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل تمہیں خود ہی اس بات کا احساس ہو جائے گا۔ اگر تمہاری جگہ یہاں کوئی اور بھی ہوتی تو بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ ابھی وقت تمہاری مٹھی میں ہے۔ واپسی کے دروازے کھلے ہیں۔ جو چاہے فیصلہ کرو میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ کیونکہ مجھے زبردستی اور بے ایمانی سے سخت نفرت ہے۔" ایک نظر اس کے پتھرائے ہوئے چہرے پر ڈالتا وہ باہر نکل گیا۔

"تو امائم ریحان! زندگی نے تمہارے لیے یہ راستہ منتخب کیا ہے!" لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے اپنے سود و زیاں کا حساب لگانا چاہا۔

"اگر اپنی زندگی سے اس شخص کو نکال دوں تو مجھے صرف خسارہ ہی خسارہ نظر آتا ہے۔" فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ اسے یونانی دیوتاؤں جیسی آن بان رکھنے والے اپنے شوہر سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی۔ وہ اس محبت کی خاطر اپنا سب کچھ ہارنے کے لیے تیار تھی۔

"مجھے اب کہیں نہیں جانا۔"

☆ ☆ ☆

صبح ٹوٹ کے بارش برسی تھی۔ امائم ہلکی ہلکی کن من کی تال پر طاؤس کی مانند رقص کرتی رہی۔ اسے بارش سے عشق تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے سبک جھونکے اس کے نم بالوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے گزر جاتے' اس نے شرارت سے منڈیر پر بیٹھے سارے کبوتر اڑا دیے۔

"زندگی جذباتیت کے سہارے نہیں گزرتی۔" جہانگیر کو اس کا فیصلہ جذباتی ہی لگا تھا۔

"یہ مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے؟" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"وقت گزر جائے تو نقصان ناقابل تلافی بن جاتا ہے۔" وہ اسے ہر صورت چکی کے دو پاٹوں میں پسنے سے بچانا چاہتا تھا۔

"ناکامی کے خوف سے کوشش نہ کرنا بذات خود

ایک ناکامی ہے۔" کبوتر ایک ایک کرکے پھر سے منڈیر پر بیٹھنے لگے تھے۔

"مجھے الزام مت دینا۔" بوندیں ایک بار پھر گرنے لگی تھیں۔

"اگر مجھے آپ سے کوئی فیور چاہیے تو صرف اتنا کہ آپ کا نام میرے نام کے ساتھ جڑا رہے۔" محبت میں اتنی قناعت کہاں سے آجاتی ہے؟

وہ بے خود سا اس کے چہرے سے پھسلتی بوندیں دیکھتا رہا۔

زندگی پھولوں کی سیج دکھتی ضرور ہے لیکن اس کے اندر کتنے کانٹے چھپے ہوئے ہیں' یہ وقت بتاتا ہے۔

جہانگیر اس کے فیصلے کو جذباتی کیوں گردانتا تھا ہر گزرتے دن نے امائم کو بتا دیا تھا۔ بی بی سارا وقت اسے اپنے پاس بٹھا کر اپنے تئیں زرینہ اور رفعت کے خلاف اس کے کان بھرتی رہتیں۔ اسے اکساتیں کہ وہ بھی ان کے ساتھ جوابی کارروائی کرکے زبان درازی اور بدلحاظی کے سارے ریکارڈ توڑ دے۔

امائم کے لیے ان کی سازشی گفتگو سننا بہت کٹھن تھا۔ لازمی نہیں ہے شہری بدلحاظ و بے مروت ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی لازمی نہیں کہ دیہاتی جاہل اور اجڈ ہوں۔ اہمیت شہر یا گاؤں کی نہیں' فطرت کی ہوا کرتی ہے۔

بی بی حاجراں نے شہری بہو کا جو خاکہ اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا۔ امائم اس خاکے پر پورا نہیں اتری تھی۔ اس کی "جیو اور جینے دو" والی عادتوں نے کسی حد تک بی بی کو مایوس کر دیا تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھیں۔ دوسری طرف رفعت اور زرینہ اسے بی بی کا اہلکار سمجھ کر دوبدو مقابلہ کرنے کو بے چین نظر آتیں لیکن امائم کوئی موقع دیتی تب ناں۔

ان کے لاکھ تیوریاں چڑھانے' بڑبڑانے کے باوجود ادھر ادھر کی باتیں کیے جاتی۔ گاؤں کی رسم و رواج' میلوں تہواروں کے بارے میں اشتیاق ظاہر کرتی' خوب دل لگا کر دیسی' بدیسی کھانے پکاتی۔ زرینہ الجھ کر رہ جاتی کہ بہو واقعی اتنی سادہ اور بے ضرر ہے یا پھر ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور امائم سوچتی "انسان کو بامصرف زندگی گزارنی چاہیے۔ اگر اللہ نے اس کی قسمت میں یہی کچھ لکھا ہے تو اسے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے حقیقت جھٹلانے یا بزدل اور کم ہمت لوگوں کی طرح میدان چھوڑ کر بھاگنے کے بجائے حالات بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

"شادو! کم بخت جلدی سے چائے لے آ۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" زرینہ اپنے کمرے میں چنگھاڑ رہی تھی۔

"خبردار! پہلے میرا دلیہ بنا کر لا جلدی سے۔" بی بی دروازے پر آکر دھاڑی تھیں۔ امائم لوہے کے زنگ آلود جھولے پر بیٹھی ہاتھوں کا چھجہ بنا کر کیکر کی پھلیاں ٹونگتے طوطے کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

سرخ گانی سبز پہاڑی طوطا ٹیں ٹیں کرتا اڑ گیا تو ٹونگی ہوئی سبز پھلیاں اس کی گود میں آگریں۔ وہ اٹھ کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔

"ہزار بار کہا ہے تجھ سے" اس جہانگیر کے ساتھ ساتھ رہا کر۔ ساری زمینوں پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے کل کو سب کچھ اپنے نام کروالے گا اور ہمارے ہاتھ ایک ٹکا بھی نہیں آئے گا۔" چائے لے کر اندر بڑھتی امائم دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

"اوہو اماں! جہانگیر بھائی ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو میرے پڑھائی ادھوری چھوڑنے پر خفا ہیں۔ جب بھی کوئی کام کرنے لگوں کہتے ہیں ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ میں سب سنبھال لوں گا تم بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔" بابر جھنجلایا تھا۔

"لاکھ اچھا سہی پر ہے تو سوتیلا ناں۔ کبھی نہ کبھی اپنا اصل رنگ دکھا کر رہے گا۔ اس لیے کہتی ہوں تو بھی کچھ ہاتھ پاؤں مار۔ قیوم اور وارث سے میں نے بات کرلی ہے۔ وہ چپکے چپکے تمہیں سب بتا دیں گے اور خبردار جو کسی کے سامنے منہ سے بھاپ بھی نکالی تو۔"

امائم بہت برے دل کے ساتھ واپس مڑ گئی۔ جہانگیر ان لوگوں کے ساتھ کتنا مخلص ہے۔ وہ اچھی طرح

جان گئی تھی۔ اماں کی باتیں سن کر اسے بہت دکھ پہنچا تھا اور وہ کچھ بے چین سی ہو گئی۔ شام تک یہ بے چینی اچھی خاصی الجھن میں بدل گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" رجسٹر وغیرہ میں الجھے جہانگیر نے سر اٹھا کر محض ایک نظر اس کے پریشان چہرے کو دیکھا تھا۔

"یہ قیوم اور وارث کون ہیں؟"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" ہاتھوں میں دبے پین سے سر کو ہلکا سا کھجاتے ہوئے اس نے پوچھا تو امائم نے اماں اور بابر کے مابین ہونے والی ساری گفتگو اس کے گوش گزار کر دی۔

"آپ ان کا کتنا ہی خیال کیوں نہ رکھیں لیکن وہ پھر بھی آپ کو سوتیلے پن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ قیوم اور وارث جو کوئی بھی ہیں" آپ ان سے محتاط رہیں کہیں انجانے میں وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ ویسے بھی جب اپنے بے اعتباری پر اتر آئیں تو غیر بھی پیٹھ پیچھے وار کرنے سے باز نہیں آتے۔"

جہانگیر یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ اس کے لیے پریشانی کا اظہار کرتی امائم بہت خاص بہت اپنی سی لگی تھی اسے۔

"یہ سب کچھ میرے لیے نیا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ سے دیکھتا آیا ہوں اور سمجھتا بھی ہوں" لیکن بات یہ ہے امائم! جب یہ لوگ اپنی برائیوں پر اتنی مستقل مزاجی سے ڈٹے ہوئے ہیں تو میں اپنی اچھائیوں کو کیسے ترک کر دوں؟ یہ تو پھر برائی کی جیت ہوگی۔" اس شخص کا ظاہر زیادہ خوب صورت ہے یا باطن۔ امائم اندازہ نہیں کر پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

رفعت کی آمد ہمیشہ ہنگامہ خیز ہوتی تھی۔ آتے کے ساتھ ہی زرینہ کے کمرے میں گھس جاتی اور ایک دوسرے کے گوڈے سے گوڈا ملا کر نجانے کون سے ایسے قصے دہرائے جاتے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ کبھی آواز ایک دم اونچی ہو جاتی اور کبھی آہستہ ہوتے ہوتے بالکل معدوم! اور ایسے میں بی بی سن گن لینے کی خاطر جلے پیر کی بلی کی طرح یہاں سے وہاں چکراتی پھرتیں۔ اگر کوئی قابل گرفت بات سماعتوں میں پڑ جاتی تو آستینیں چڑھا کر میدان میں اتر آتیں اور پھر ایک زور کا معرکہ شروع!

اب بھی رفعت ماں کے کان میں گھسی نجانے کیا کہہ رہی تھی کہ زرینہ کے چہرے کے زاویے مسلسل تبدیل ہو رہے تھے۔ کبھی تذبذب سے رفعت کو دیکھنے لگتی تو کبھی ناک پہ انگلی دھرے کچھ سوچنے لگ جاتی۔ کھڑکی سے چپکی بی بی حاجراں کا رواں رواں سماعت بنا ہوا تھا لیکن مجال ہے جو کوئی بات کان میں پڑی ہو۔

"منحوس ماریاں! لگتا ہے گونگوں کی طرح اشاروں میں بات کر رہی ہیں۔" کلس کر سوچا اور ململ کے سفید دوپٹے سے پیشانی کا پسینہ صاف کرتی اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

"اے امائم پتر! ذرا اندر چل کر دیکھ تو یہ کٹنیاں آج کس کا تیاپانچہ کر رہی ہیں؟" گو کہ امائم ان کی توقعات پر کبھی پوری نہیں اتری تھی لیکن اتنی جلدی ہار ماننا انہیں قبول نہیں تھا۔ سو برابر کوشش کیے جا رہی تھیں۔

"بی بی! یہ چنگیر آپ نے بنائی ہے؟ کتنی خوب صورت اور نفیس ہے ناں۔" امائم ان کی بات سنی ان سنی کرتی چنگیر گھماتے ہوئے اشتیاق سے بولی تھی۔ بی بی نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں پکڑی رنگین چنگیر کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس دن اماں بھی کہہ رہی تھیں بی بی جیسی نفیس چنگیر کوئی نہیں بنا سکتا۔ پورے گاؤں میں ان کے ہاتھ کی بنی چنگیریں مشہور ہیں۔ میں کتنی بھی کوشش کر لوں پر بی بی جیسی نفاست نہیں لا سکتی۔"

"ایں! یہ زرینہ نے خود کہا ہے تجھ سے؟" بی بی حاجراں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"جی! بلکہ وہ تو کہتی ہیں بی بی اپنی جوانی میں بہت قابل ہوا کرتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کی بنی رضائیاں' سرہانوں کے غلاف پر کاڑھے پھول بوٹے" اور کروشیے

کے رومال وغیرہ دیکھنے کے لیے عورتیں خاص طور پر یہاں آتیں اور نمونے مانگ کر لے جاتیں۔"

بی بی حاجراں کے چہرے کے تنے نقوش ایک دم ڈھیلے پڑے تھے۔

"آپ نے تو کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔ یہ تو اچھا ہوا جو اماں نے مجھے بتا دیا بلکہ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے اب تک میں نے آپ سے کچھ سیکھا کیوں نہیں؟" ایک بے حد خوب صورت مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ ٹھہری تھی اور امائم کے ساتھ اپنی خوشگوار یادیں دہراتی وہ اپنی کچھ دیر پہلے والی ساری جھنجلاہٹ اور کوفت یکسر بھول گئیں۔

☼ ☼ ☼

"تو پھر ٹھیک ہے نا اماں؟" رفعت نے رائے لینے والے انداز میں ابرو اچکائے۔

"پر رفعت...!" زرینہ ہچکچائی تھی۔ رفعت سخت بدمزہ ہوئی۔ ایک گھنٹے سے وہ ماں کو قائل کرنے میں لگی تھی لیکن ماں کی اگر مگر نے اس کا دماغ پچی کر دیا تھا۔

"اوہو اماں! تو تو ایسے بدحواس ہو رہی ہے جیسے میں تیری کسی من پسند ہستی کو کھوہ میں دھکا دینے لگی ہوں۔"

امائم نے ہلکا سا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر قدم رکھا تو دونوں نے ایک ساتھ ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ امائم سادگی سے مسکراتی آگے بڑھ کر کھانا لگانے لگی۔ چکن پلاؤ، کیری کی چٹنی، اروی کا سالن اور شلجم کا اچار۔ اشتہا انگیز کھانا سامنے دیکھ کر زرینہ کو شدت سے بھوک کا احساس ہوا تھا۔

"رفعت! بچوں کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آئیں؟"

"فارغ تھوڑی نہ ہوتے ہیں سارا دن دادی اور پھپھیاں کاموں کے لیے دوڑائے رکھتی ہیں۔" تنک کر جواب دیا۔

"اچھا! اس دن مجھ سے چائنیز رائس کی فرمائش کر رہے تھے۔ میں انتظار کرتی رہی لیکن وہ آئے ہی نہیں۔" امائم نرمی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آں ہاں! وہ بیچارے تو روز کہتے ہیں مجھ سے لیکن کام بھی جان چھوڑیں تب نا۔" اب کی بار لہجہ کچھ بہتر تھا۔

"اچھا! وہ میں نے ان کے لیے کھانا نکال کر رکھ دیا ہے کچن میں۔ جب جاؤ تو یاد سے لیتی جانا۔" امائم کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

پوری طرح کھانے کی طرف متوجہ رفعت بمشکل سر ہلا کر رہ گئی۔

"دیکھ رفعت! کہیں..." اماں سیر شکم ہوتے ہی ایک بار پھر تذبذب میں مبتلا ہوئیں۔

"رہنے دے اماں! ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں دکھانے کے اور۔

اگر جو ہاتھی بھی ایسا سدھایا ہوا ہو تو..."

رفعت نے ڈکار لیتے ہوئے اماں کی ہچکچاہٹ کو گویا ناک پر بیٹھی مکھی کی طرح اڑا دیا۔

☼ ☼ ☼

جہانگیر کا سفید شلوار قمیص جما جما کر استری کرنے کے بعد اس نے الماری میں لٹکایا اور قدرے مطمئن سی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

ابھی رات کے صرف ساڑھے دس ہی بجے تھے لیکن عصر کے وقت سے شروع ہونے والی آندھی کا غبار ابھی تک آسمان پر چھایا ہوا تھا۔

گرد سے اٹا ہر منظر اپنا اصل چہرہ کھو بیٹھا تھا۔ غیر واضح، مبہم اور الجھا دینے والا سکوت! اسے یہ موسم ہمیشہ وحشت زدہ کر دیتا تھا۔

"امائم!" رفعت دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔

"وہ بابر کو... جلدی نیچے چلو۔" رفعت کی حواس باختگی نے اسے بری طرح بوکھلا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھ پاتی، رفعت اسے بازو سے کھینچتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

"کیا ہوا ہے بابر کو؟" اس کا دل کسی غیر معمولی پن کے احساس سے دھڑکا تھا۔ وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تھی۔

"بابر! تم ٹھیک تو ہو۔ کیا ہوا ہے؟" بستر پر چت لیٹے بابر پر جھکی وہ انتہائی تشویش سے پوچھ رہی تھی۔

"بابر!" اس نے آہستگی سے اس کا گال تھپتھپایا تو وہ حیرت و بے یقینی کی کیفیت میں گھرا اپنے اوپر جھکی امائم کو دیکھ کر جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"بھابھی!" کچی نیند کے خمار نے اس کی آواز میں بوجھل پن پیدا کر دیا تھا۔

امائم ششدر سی پیچھے ہٹی کہیں کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہوا ہے۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ باہر سے قدموں کی چاپ ابھری اور نامانوس سا شور بوجھل فضا میں کریہہ دراڑیں ڈالنے لگا۔ بابر نے جلدی سے قمیص پہنی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے پیچھے امائم بھی باہر نکل آئی۔ اپنی طرف عجیب نظروں سے دیکھتی بی بی حاجراں، زرینہ، وجیہہ اور شادو وغیرہ کو نظر انداز کر کے وہ رفعت کی جانب بڑھی۔

"رفعت..."

"چپ! بدذات۔ میں اچھی طرح جانتی تھی ایک نہ ایک دن تو اپنی اصلیت ضرور دکھائے گی۔" رفعت کی بات پر وہ چکرا کر رہ گئی۔

"اماں! وہ بابر کی طبیعت..."

"بی بی!" اسے قطار میں کھڑے سب تماش بین نظر آئے۔ بے اعتباری، بے یقینی، ملامت، تاسف! وہ بی بی کی نظروں میں دیکھ نہیں پائی تھی۔

"رات کے اس پہر جب شوہر گھر پر نہیں تو تو اپنے جوان جہان دیور کے کمرے میں کیا کرنے گئی تھی۔ وہ بھی ننگے سر ننگے پاؤں، ہاں؟" بابر ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں ٹکر ٹکر ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔ امائم کی نظر بھٹکتی ہوئی قدرے فاصلے پر بت کی مانند ایستادہ جہانگیر پر پڑی۔

"کیا یہ شخص میرا یقین کرے گا؟"

وہ آگے بڑھ کر اپنے شوہر کو حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی تھی لیکن قدموں نے اپنی جگہ سے ہلنے سے گویا انکار کر دیا تھا۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال پر شدید حیرت زدہ تھی۔

"ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے اور تو نے تو اپنے ہی..."

"نجانے شہر کی آزاد فضاؤں میں ایسے کتنے گل کھلائے ہوں گے۔"

"ہم نہیں رکھنے والے ایسی غلاظت..."

"بس!" بت میں جان پڑ گئی تھی۔ "کوئی ایک لفظ نہیں بولے گا اب۔" املتاس کے پتوں میں چھپا بین کرتا پنچھی ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

"جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ اور کتنا جھوٹ بولیں گے آپ لوگ کوئی حد ہے اس نفرت کی؟ میں سوتیلا تھا سو برا ٹھہرا۔

لیکن اس کا کیا قصور ہے جسے اس گھر میں آئے گنتی کے چند دن ہی ہوئے ہیں۔ فسادی لوگ خار دار جھاڑی کی مانند ہوتے ہیں۔ کوئی کتنا بھی دامن سمیٹ کر کیوں نہ گزرے پھر بھی وہ الجھنے سے باز نہیں آتے۔" رفعت کی طرف دیکھ کر وہ تاسف سے بولا تھا۔

"اور اماں! نفرت کی پٹی آنکھوں پر باندھتے ہوئے آپ کو اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ آپ اپنے مرحوم شوہر کو، خود کو اور اپنے ہی خون کو گالی دے رہی ہیں۔"

زرینہ کی آنکھیں زمین میں گڑ گئی تھیں۔

"بزرگ اپنے گھر کی خوشیوں اور سکون کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے اور بی بی! آپ نے کیا کیا ساری زندگی۔ ایک بار مڑ کر اپنی پچھلی زندگی کو دیکھیں کوئی لمحہ ایسا نظر میں آتا ہے جب آپ نے اپنے گھر کی خوشیوں کی بقا کے لیے کوئی چھوٹی سی قربانی دی ہو... گھر کے بڑے تو گھر والوں کے لیے گھنے سایہ دار شجر کی مانند ہوتے ہیں جو جتنا بھی بوڑھا ہو جائے اس کی خمیدہ شاخیں شفقت اور محبت کے پھلوں سے جھک جاتی ہیں۔ پر ٹوٹتی نہیں ہیں۔"

بی بی نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا تھا۔ وہ تو اسے

بے ضرر، بے خبر اور ایسی کٹھ پتلی سمجھتی رہیں جس کی ڈوریاں ان کے ہاتھ میں تھیں مگر اس برسوں بعد زبان بھی کھولی تو اس طرح۔

ہوا نے پانی سے بھرے بادلوں کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تو ٹپ ٹپ کر کے کئی بوندیں زمین پر گرنے لگیں۔

"جس گھر میں کسی کی عزت محفوظ نہ ہو وہ گھر رہنے کے قابل نہیں ہوتا۔" وہ امائم کی طرف پلٹا۔

"جہانگیر! میں..." اس نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے لیکن جہانگیر نے نرمی سے اسے ٹوک دیا۔

"جو گزر گیا واپس نہیں آسکتا لیکن اتنا یقین ضرور دلانا چاہوں گا آئندہ ایسی اذیت ناک صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا تمہیں۔ چلو!"

☼ ☼ ☼

نیلی کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ اس کے نکاح والے دن ماہین کی وجدان کے ساتھ منگنی تھی۔

امائم کو غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر ماہین خوشی سے اس سے لپٹ گئی۔

"امائم! گھر والے سب ٹھیک ہیں؟" پھپھو کا وہی ہمیشہ والا انداز۔

"تم خوش تو ہو ناں؟" تائی امی کی محبت بھری تشویش۔

سوال بھی عام تھے اور شاید لہجہ بھی! لیکن اس بار نجانے کیوں اسے جواب دینے میں دقت محسوس ہوئی تھی۔

"آؤ! چھت پر چلیں۔" جواب کا انتظار کیے بغیر ماہین ہمیشہ کی طرح اس کا ہاتھ کھینچتی اٹھا کر لے گئی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں نیلی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ پھپھو خلاف عادت ہر کام میں تائی امی کے مشوروں کو فوقیت دے رہی تھیں۔

امائم کو ماہین زبردستی اپنے ساتھ مہندی لگوانے پارلر لے گئی۔ پھپھو نے نیلی کو مایوں بٹھا دیا تھا۔

"ارے ارے شہریار بھائی! کہاں جا رہے ہیں؟ اندر مایوں کی دلہن ہے۔ بھائی کا اندر جانا مناسب نہیں۔"

امائم نے فوراً آگے بڑھ کر شہریار کا راستہ روکا تو وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم شادی کے بعد عقلمند نہیں ہو گئیں؟"

"آپ بھی ذرا اپنے سہرے کے پھول کھلنے دیں عقل و دانش کے ڈونگرے نہ برسنے لگ جائیں تب کہیے گا۔" ماہی نے لقمہ دیا تھا۔

"آج آخری دن ہے۔ میں کل سے اس کونے میں ہونقوں کی طرح سارا دن گدے پر نہیں بیٹھوں گی۔" اندر سے نیلی چلائی تھی۔

"فکر مت کریں شادی کے بعد اسے بھی عقل آجائے گی۔"

زیورات کے ڈبے اٹھائے اندر داخل ہوتی پھپھو کے چہرے پر اس کی بات سن کر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"کتنا شوق تھا مجھے تمہاری شادی پر ڈانس کرنے کا لیکن خیر، اب میں نیلی کی شادی پر تو ضرور اپنا ارمان پورا کروں گی۔" ماہین نے نیلی کے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے اپنے عزائم سے آگاہ کیا تھا۔

"پاگل! ارمان بہنوں نہیں بھائیوں کی شادی پر پورے کیے جاتے ہیں۔" امائم نے نیلی کے قریب آرام دہ انداز میں بیٹھتے ہوئے گویا ماہین کو لتاڑا تھا۔

"جانتی ہو نیلی! پہلے زمانے میں مایوں کی دلہن کو موبائل استعمال کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی۔"

ماہین نے نیلی سے کہا، جو کھٹا کھٹ میسج کر رہی تھی۔

"ہائے کیوں؟" نیلی نے موبائل دبوچ کر پریشانی سے پوچھا۔

"کیونکہ اس زمانے میں موبائل ہوا جو نہیں کرتے تھے۔" نیلی اسے گھورتے ہوئے پھر سے اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نیچے کچھ نامانوس سا شور سنائی دیا ماہین نے ریلنگ پر قدرے جھکتے ہوئے نیچے کا جائزہ لینا چاہا۔

"لو مہمان گرامی پہنچ گئے خیر سے۔"

"کون آئے ہیں؟" امائم نے سرسری سا پوچھا۔

"تمہارے پنڈ والے۔" اس نے جھٹکے جھٹکے شرارت سے جواب دیا۔

"کیا؟" امائم برش پھینک کر جلدی سے اٹھی، نیچے جھانک کر دیکھا اور سرپٹ سیڑھیوں کی جانب بھاگی۔

"اسے کیا ہوا؟" ماہین نے گیلے بال جھٹکے۔

دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترتی امائم آخری سیڑھی پر قدرے ٹھٹک کر رک گئی۔ زرینہ تڑپ کر اس کی جانب بڑھی تھی۔

"اماں!" امائم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے سامنے آن رکی "کیسی ہیں آپ؟" انہوں نے جواب دینے کے بجائے زور سے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

"میرے آنسو، میری شرمندگی اس اذیت کا مداوا نہیں کر سکتی جو ہم نے جان بوجھ کر تمہیں پہنچائی۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں لاؤنج میں موجود تمام نفوس دم بخود تھے۔

"اماں! پلیز بس کریں۔"

"ہم بدذات، کمینے گھٹیا لوگ تم فرشتہ صفت کی قدر نہ کر سکے۔" بی بی دوپٹے میں منہ چھپا کے رو دی تھیں۔

"بن ماں باپ کی بچی کی تربیت کر کے جس طرح آپ نے اس ہیرے کو تراشا ہے اس کا اجر تو اللہ ہی آپ کو دے گا اور ہم بدنصیب، ناعاقبت اندیش زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ہیروں کو پتھروں کی طرح رولتے رہے۔" پھپھو اور تائی امی کی آنکھوں میں اترتے نا سمجھی اور غیر یقینی کے رنگوں پر مسرت و طمانیت کا رنگ غالب آگیا تھا۔ امائم کو آج تائی امی کی مصلحت بھری خاموشی اور پھپھو کی سختیوں، روک ٹوک میں چھپی مصلحتیں سمجھ میں آرہی تھیں۔

تایا ابا کے ساتھ اندر داخل ہوتا جہانگیر ٹھٹک کر رک گیا۔

بی بی بہت وقت سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھیں۔

"جہانگیر میرے بچے! بے شک یہ شجر بہت بوڑھا ہے۔ اس کی خمیدہ شاخیں خود ساختہ تنازعات اور بے حسی کے کانٹوں سے ٹوٹنے لگی ہیں۔ اس شجر، بے ثمر کے چھدرے سائے تلے کوئی مسافر دو گھڑی بیٹھ کر آرام تک کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ برسوں سے بنجر ہے۔ اس کے پنچھی سے کہو آکر پھر سے اسے آباد کرے۔" اس کے چوڑے سینے پر سر ٹکائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"بی بی!" سب کے سامنے انہیں یوں شرمندہ دیکھ کر اسے بہت تکلیف پہنچی تھی۔

"پنچھی کہیں نہیں گیا۔ اسے لوٹ کر اپنے آشیانے میں آنا ہی تھا۔" وہ بہت محبت سے ان کے آنسو چننے لگا تھا۔

"نیچے کسی فلم کی شوٹنگ تو نہیں ہو رہی؟" نیلی نے ریلنگ پر جھکی ماہین سے پوچھا تھا۔

"حقیقی زندگی میں بھی کبھی کبھی فلمی موڑ آ ہی جاتے ہیں۔" ماہین نے سوچا امائم نے اپنی محبت سے سب کچھ جیت لیا ہے بنا کچھ ہارے!

☼

مکمل ناول



تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کرپارہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے، لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت پہ یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سرشعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں، مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سرشعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے اصرار پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہوپاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈرجاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔



بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ ینا راؤ اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھلی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈ پا گوتا یار دھا سے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امامہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر ابو سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں' وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ اسے سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امامہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امامہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امامہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امامہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امامہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امامہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امامہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے' لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈ پا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی کے انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوا لیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیتا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امامہ کی خاطر دلچسپی لیتا ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امامہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کر پا رہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امامہ کو

گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری' گھر جا کر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگران مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کر لیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کر لی۔

نور محمد' احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار' عمدہ خوشبو' نفیس گفتگو' اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔ اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنا لیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آگئی۔

امامہ اور عمر میں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات ینا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

۶
چھٹی قسط

"دنیا کے ساتھ وہ مت کیجیے جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔"

نور محمد کو لگا جیسے کسی نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہو۔ احمد معروف نے اس کو ایک عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ کیوں "دنیا" سے اس درجہ متنفر ہو گیا تھا کہ اس نے ہر چیز سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ "دین" میں اس کی اجازت نہیں تھی۔ اللہ کو یہ پسند نہیں تھا اور نبی اس رستے پر چلے نہیں تھے تو وہ کس کے کہنے پر یہ سب اختیار کر چکا تھا۔ وہ کیسے "تارک الدنیا" ہو گیا تھا۔ وہ کیسے "تارک الدنیا" ہو سکتا تھا۔

اس نے تو دنیا کو ایک عرصہ ہوا' نظر بھر کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا وہ "دنیا" کو اس قابل ہی کب سمجھتا تھا۔ دنیا میں اس کے لیے رکھا ہی کیا تھا۔ اس نے گہری گہری چند سانسیں بھری تھیں۔ اسے یاد آنے لگا تھا کہ دنیا میں اس کے لیے کیا رکھا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر دونوں گھٹنے سینے سے لگا لیے تھے۔ وہ ذہنی طور پر بہت تکلیف میں تھا۔ احمد معروف نے اس کو اس کی دنیا یاد دلادی تھی۔

"دنیا کے ساتھ وہ مت کیجیے جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔"

اس کے سینے پہ جیسے بوجھ بڑھ گیا ہو۔ عجیب سا احساس گناہ اسے اپنے حصار میں لے رہا تھا' وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چھوٹے سے کمرے میں بالکل تاریکی تھی۔ روشنی کا کوئی منبع یا ماخذ نہیں تھا مگر اسے نظر آ رہا تھا۔ تاریکی میں آنکھیں چند لمحے بعد کیسے دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہیں' کیونکہ تب انسان کے اندر کی روشنی اس کی مدد کو آجاتی ہے۔ جس کے اندر جتنی روشنی ہوتی ہے اتنی ہی اس کے اندر تاریکی کے خلاف لڑنے کی مزاحمت ہوتی ہے۔ وہ بھی دیکھ سکتا تھا اس کے روم میٹس سوئے ہوئے تھے۔ سفاک اور سرد خاموشی میں ان کی سانسیں ہی تھیں جو ان کے زندہ ہونے کا احساس دلاتی تھیں۔ اس نے اس جانب دیکھا جہاں احمد معروف سو رہا تھا' وہ اسے اس قدر بے چین کر کے خود کیسے سو سکتا تھا۔ اس نے بہت آہستگی

سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے زمین پر بچھے میٹرس کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

"احمد معروف! احمد معروف! اٹھیے۔۔۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" اس نے اپنی آواز کو بے حد پست رکھ کر اسے جگایا تھا۔ احمد معروف نے حیرانی سے اسے دیکھا مگر وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اس طرح جگائے جانے کے باعث پہلا تاثر پریشانی کا ہی ابھرا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے نہیں جگانا چاہیے تھا آپ کو۔۔۔ لیکن۔۔۔ میں ایسے نہیں سو سکتا۔"

"کیا ہوا ہے؟ آپ کو۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" احمد کے لہجے میں پریشانی کا تناسب بڑھ رہا تھا۔

"احمد معروف! کیا واقعی۔۔۔ دنیا بھی اللہ ہی کی ہے؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔ وہ وہیں ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کے دل کی عجب حالت ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اُسے ایسا سوال اس سے نہیں پوچھنا چاہیے۔ وہ اسے کم عقل، کم فہم سمجھے گا لیکن اس لمحے اس کی بے چینی کا علاج فقط اسی کے پاس تھا۔ وہ اور کسی سے اتنی باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی دوستی کو لاٹری کی رقم کی طرح کمایا تھا، لیکن وہ اسے محنت کی کمائی کی طرح احتیاط کے ساتھ سوچ سوچ کر خرچ کرتا تھا۔ ابھی بھی اس نے بہت جھجک کر سوال کیا تھا۔ وہ ریشم کے تھان کی طرح جلدی جلدی کھل جانے والا شخص ہی نہیں تھا لیکن اب جب کہ وہ کھل چکا تھا تو وہ ریشم کا تھان بن چکا تھا۔ اسے سمیٹنا آسان نہیں رہا تھا۔

"یہ بات آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔۔۔؟ یہ بات آپ کو معلوم نہیں ہے کیا۔۔۔؟ یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے۔" اس کے چہرے پر جواب دیتے ہوئے ایسے مسکراہٹ نمودار ہوئی جو نور محمد کے لیے بہت نئی تھی۔

"میں۔۔۔ میں کیسے بھول گیا۔۔۔ میں بھول گیا کہ دنیا کے ساتھ وہ نہیں کرنا جو ابلیس نے انسان کے ساتھ کیا تھا۔۔۔ مجھے بھولنا نہیں چاہیے تھا۔۔۔ نہیں بھولنا چاہیے تھا۔"

الفاظ اس کے منہ سے پھڑپھڑا کر نکل رہے تھے اس کا دل بہت بھرا ہوا تھا۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ احمد نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے؟" وہ اس کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ بس بعض اوقات بہت بے بس کر دیتا ہے۔ نور محمد نے بہت برداشت کیا۔ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ یہ صورت حال احمد کے لیے بہت عجیب تھی۔

"نور محمد۔۔۔! آپ کو میری بات سے تکلیف پہنچی ہے۔۔۔" وہ بے چین ہو کر مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے ساتھ لیٹے وجود میں کسمساہٹ ہوئی تھی۔

"کیا ڈرامہ لگا رکھا ہے رات کے اس پہر۔۔۔ پہلے ہی مجھے اتنی مشکل سے نیند آئی ہے۔۔۔ تم لوگوں کو یہ سب تماشے کرنے ہیں تو کمرے سے باہر نکل جاؤ۔"

نور محمد کے ایک روم میٹ نے سنگ دلی اور نیند کے غلبے میں ڈوبی آواز میں انہیں ٹوکا تھا۔ نور محمد نے اپنی آواز کو دبانے کے لیے ہاتھوں کو منہ پر رکھ لیا تھا۔ احمد معروف کو دلی افسوس ہوا۔ اسے وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ جانے انجانے نور محمد کے کرب کا باعث بنا تھا۔ اس نے تو بس "بات" کی تھی مگر نور محمد نہ جانے اس قدر جذباتی کیوں ہو گیا تھا۔ اس نے نور محمد کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ یہ کمرہ مزید گفتگو کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور اس لمحہ نور محمد کو دل کا حال سنانے کے لیے کسی سامع کی اشد ضرورت تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کتنا بھی اچھا اسٹوڈنٹ کیوں نہ ہو، لیکن میں اس کی خاطر اتنے برسوں میں بنائی اپنی ساکھ خراب

نہیں کر سکتا۔ ایک اچھا طالب علم تو ایک سال میں بنایا جا سکتا ہے مگر ایک ادارے کو بنانے میں دس سال لگ جاتے ہیں۔ میں کسی کو بھی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ میری دس سال میں بنائی ہوئی عزت کو دس منٹ میں قدموں تلے روند کر رکھ دے۔"

حمید کاردوانی کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔ وہ اس کی اکیڈمی کے چیئرپرسن تھے۔ اور اس کے ابو سے مخاطب تھے جنہیں فون کر کے اکیڈمی بلوایا گیا تھا اور سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ اس نے اس روز دیکھا کہ رائی کا پہاڑ آخر بنتا کیسے ہے۔ ایک لڑکی جس کا نام صبا نورین تھا اور جسے وہ صرف اس حوالے سے جانتا تھا کہ وہ اس کی کلاس فیلو تھی جو اس کے پاس چند ایک بار اسے نیچا دکھانے اور اس سے نوٹس مانگنے کی غرض سے آئی تھی وہ یکدم اس کی زندگی میں ایک اہم نقطہ بن گئی تھی۔ اکیڈمی میں موجود سب لوگوں نے جنید کی باتوں کو سچائی کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ سب مکمل سچ بے شک نہیں ہو گا لیکن سب جھوٹ بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ حقیقت کہیں نا کہیں ہوتی ہے تو افسانہ جنم لیتا ہے۔۔۔ میں بہت مایوس ہوا ہوں، مجھے یہ امید نہیں تھی کہ آپ کا بیٹا بھی اس قسم کی حرکتوں میں ملوث ہو سکتا ہے۔"

حمید کاردوانی اس کے ابو کے سامنے یہ سب کہہ رہے تھے۔ اڑتی چڑیا کے پر گننے کا دعوا کرنے والے حمید کاردوانی کیا اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے کہ ٹیبل کے پیچھے کھڑے اس بزدل، ڈرپوک اور احمق نظر آنے والے لڑکے کی آنکھوں میں چھپی حقیقت کو پرکھ سکتے۔ طلحہ اور جنید ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔ انہوں نے کلاس روم میں ہونے والے جھگڑے کو تین کے بجائے سات بنا کر حمید کاردوانی کو سنا دیا تھا جبکہ وہ سچا ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔ ثابت ہو گیا تھا۔ سچ اور جھوٹ میں فقط انداز بیاں کا فرق ہوتا ہے۔ انداز بیاں نے جھوٹوں کو سچا ثابت کر دیا تھا۔ اڑتی چڑیا کے پر گننے کا دعوا کرنے والے چڑیا اور کوے میں فرق نہ کر سکتے تھے، پر گننا تو دور کی بات تھی۔ کاردوانی

صاحب فرد جرم عائد کر کے اب اس کے ابو کی شکل دیکھ رہے تھے۔ وہ سننا چاہتے تھے کہ اس کے ابو اس کی صفائی میں کیا کہتے ہیں اور صرف کاروانی صاحب ہی نہیں وہ خود بھی سننا چاہتا تھا کہ اس کے ابو اس کی صفائی میں کیا کہتے ہیں۔

ذلت کیا ہوتی ہے۔ اس نے پہلی بار سمجھا تھا۔ یہ سب کچھ جو آج اس کے ساتھ ہوا تھا اس کے حواسوں پر بم کی طرح پھٹ چکا تھا۔ دراصل بات بہت تیزی سے پوری اکیڈمی میں پھیل گئی تھی۔ وہ لوگ جو اس کی حمایت اور صفائی میں کچھ کہہ سکتے تھے وہ اچانک غائب ہو گئے تھے۔ جنید اور طلحہ کے والدین کو بھی بلوایا گیا تھا مگر انہوں نے اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے فوراً اسے قصوروار ٹھہرایا تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو گئے تھے۔ اس وقت اسے بھی اپنے ابو کی آغوش کی ضرورت تھی ان کے کندھے کی جس پر سر ٹکا کر وہ خود کو ہر غم سے آزاد کر لیتا مگر ہمیشہ کی طرح ان کی آنکھوں میں لاتعلقی تھی، سفاکی تھی، بے رحمی تھی۔ ان کی آواز میں اس درجہ سرد مہری تھی کہ جب وہ بولے تو اس نے اپنی آنکھوں کے گیلے گوشوں کو برف بنتا محسوس کیا۔

"کاروانی صاحب! غلطی پہلی ہو یا آخری، غلطی ہوتی ہے اور میرے یہاں غلطی کی معافی نہیں ہے۔"

ان کے جواب نے اسے صرف حیران نہیں کیا تھا، باقی سب کچھ کر دیا تھا۔ حمید کاروانی نے اس کے ابو کا انداز دیکھنے کے بعد اپنا فیصلہ برقرار رکھا تھا۔ وہ مزید اسے اپنے ادارے میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے اگرچہ جنید اور طلحہ کو بھی فارغ کر دیا گیا تھا مگر ان کے لیے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ہر قسم کے احساس جرم سے عاری تھے۔

حمید کاروانی اپنا فیصلہ سنا کر فارغ تھے ایک طالب علم وہ ایک سال میں بنا سکتے تھے سو انہیں ایک اچھے طالب علم کی ضرورت کیا تھی۔ بیٹے تو اداروں میں نہیں بنتے سو اس کے ابو کو تو اس کی ضرورت ہونا چاہیے تھی۔

"میرے ابو کو بیٹے کی ضرورت ہونا چاہیے۔ مگر نہیں ہے۔ کیوں؟"

لرزتے دل اور جھکی آنکھوں کے ساتھ وہ اپنی کتابیں سمیٹ کر اکیڈمی کے گیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ ابو اس سے کچھ دیر پہلے باہر نکلے تھے اور پھر اس کا انتظار کیے بغیر اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیے تھے۔ اس نے انہیں لحہ بھر بعد ہی آنکھ سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشا بوندیں برسنے لگیں۔ اس کے ذہن سے جیسے سب کچھ مٹ رہا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا یا شاید وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔

وہ سائیکل پر بیٹھنے لگا مگر اس کا ذہن بالکل ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اسے بھول رہا تھا کہ اسے کس سمت جانا ہے یا پھر شاید وہ اس سمت جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دل ذلت، خوف اور بے بسی کے عفریتوں نے جکڑ رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اوئے گونگلو! ریل گاڑی میں پہلی بار بیٹھا ہے نا تو۔۔۔؟"

نجانے کس سمت سے آواز آئی تھی۔ کون پوچھ رہا تھا۔ وہ احمقوں کی طرح منہ اٹھا کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے ایک ننگ دھڑنگ، عجیب و غریب حلیے والا لڑکا کھڑا تھا جو پر تجسس نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا اور الٹے ہاتھ سے وہ بھٹہ کھانے میں مصروف تھا۔ اس کا حلیہ اس قدر غلیظ تھا کہ اس کو کھاتے دیکھ کر دیکھنے والے کو کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ بھکاری نما اس لڑکے کی آنکھوں میں ایسی کھوج تھی کہ اس کا دل سہم سا گیا۔ دل کی حالت تو پہلے ہی بے حد عجیب ہو رہی تھی۔ سارے جسم پر لرزش طاری تھی۔ اسے خود بھی نہیں پتا چل رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے یا کیا کرنے جا رہا ہے۔ وہ فقط ہر چیز سے خود کو چھپا لینا چاہتا تھا۔ اسے کسی ایسے گوشے کی تلاش تھی جہاں بیٹھ کر وہ اپنے ہاتھوں سے خود کو دنیا کے چہرے سے مٹا ڈالتا۔ دنیا کی ہر چیز یا اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی یا وہ خود ہر چیز کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا مگر وہ یہ سب کر نہیں پا رہا تھا۔ وہ پوزیشن ہولڈر مگر سرٹیفائیڈ احمق تھا۔

صبا نورین والے واقعے نے اسے اس قدر ذلت سے دوچار کیا تھا کہ اس کے حواس معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ اکیڈمی کے گیٹ سے اپنے ابو کے چلے جانے کے بعد اپنی سائیکل پر بیٹھ تو گیا تھا مگر کتنی دیر اس کے پاؤں پیڈل پر مضبوطی سے جمنے میں ناکام رہے تھے۔ اس کی آنکھیں لبالب پانی سے بھری تھیں۔ پارکول کی سڑک اس کے لیے دو آبہ نہریں بن چکی تھی۔ وہ سائیکل چلا نہیں پا رہا تھا۔ اسے لگا وہ شاید ڈوب رہا تھا۔

اس نے خود کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ کوشش وہ تب کرتا جب وہ اسے سمجھ ہوتی کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ اسے حقیقتاً "کچھ نظر آ رہا تھا نہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ سائیکل کے پیڈلز کو تیزی سے گھمانے لگا تھا۔ ہر ایک سیکنڈ بعد اس کی رفتار میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟ کیوں۔۔۔؟ میرے ساتھ ہی کیوں؟" اس کے ذہن میں اسی ایک جملے کی تکرار تھی۔ ایسی ذہنی حالت کے ساتھ نجانے کیسے وہ ریلوے اسٹیشن تک پہنچ گیا تھا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ یہاں سے دور چلا جانا چاہتا تھا اسی لیے وہ اسٹیشن تک آیا تھا۔ لیکن یہاں آ کر وہ دماغی طور پر بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن مزید کام کرنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن اس کے لیے ایک نئی جگہ تھی۔ وہ پہلے کبھی اس جگہ نہیں آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی لاتعداد چہرے بھانت بھانت کی آوازوں نے اسے مزید بوکھلا دیا تھا۔ ایک ہجوم بیکراں اس کی سائیکل کو اپنے ہمراہ لیے آگے بڑھ گیا۔ وہ کب کس طرح کس کے کہنے پر ٹرین میں سوار ہوا اسے کچھ پتا نہیں چلا تھا وہ فرار چاہتا تھا مگر ایسے نہیں۔ اسے اپنے آپ سے نفرت تھی مگر زندگی سے نہیں۔۔۔ یہ طے تھا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اور گھر سے بھاگ جانے کے متعلق تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا تو وہ ٹرین میں سوار کیوں ہو گیا تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ وہ جس مخدوش ذہنی حالت میں اکیڈمی سے نکلا تھا۔ یہ ساری صورت حال اسی ذہنی حالت کا نتیجہ تھی۔ وہ ابو سے ڈرتا تھا۔ ان کے رویے سے خفا بھی تھا اور خائف بھی اسی لیے وہ ایک کے بعد ایک الٹی حرکت کرتا چلا جا رہا تھا۔ جب اس بھکاری لڑکے نے ٹٹولتی نظروں سے اس سے سوال کیا تو وہ کافی بوکھلا گیا تھا۔ ٹرین نے ابھی چلنا شروع کیا تھا۔ ٹرین آگے اور اردگرد کی چیزیں پیچھے کی جانب سرکنے لگی تھیں۔ وہ دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہوتے ہی وہ ہجوم کی وجہ سے لڑکھڑاتے ہوئے دروازے تک جا پہنچا۔ گرد آلود ہوا کے تیز جھکڑ اس کے منہ پر تھپیڑوں کی طرح برسنے لگے تھے۔ یہی وہ لحہ تھا جب بھکاری لڑکا اس سے انکوائری کرتے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ اس لڑکے کی آواز نے ہی اسے جیسے ہوش دلایا تھا۔

اس کا دل چاہا تھا کہ بلند آواز میں چیخ چیخ کر روئے۔ وہ بہت ڈرپوک تھا۔ زندگی میں پہلی بہادری اس نے اسٹیشن تک آ کر کی تھی۔ دوسری بہادری اس کا ٹرین میں سوار ہو جانا تھا۔ تیسری بہادری یہ ہوتی کہ وہ حقیقت کا ادراک ہونے پر ٹرین سے چھلانگ لگا دیتا مگر وہ یہ کر نہیں پایا تھا۔ ٹرین کے دروازے سے آتی بدتمیز و بدہیئت ہوا اتنی خوف ناک تھی کہ وہ دروازے کی جانب دیکھ ہی نہیں پا رہا تھا کجا کہ وہ چھلانگ لگاتا۔۔۔ اس نے بے حد دقت سے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور وہ بے خبر تھا۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ مجھے واپس چلے جانا چاہیے، میرے ابو کو بے شک میری ضرورت نہ ہو مگر میری امی مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔" وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

"میں نے پوچھا تو ریل گاڑی میں پہلی بار بیٹھا ہے نا۔" اس لڑکے نے سوال دہرایا تھا۔ اب کی بار اس کا انداز بے حد بارعب تھا کہ وہ بلاوجہ ہی اثبات میں گردن ہلا گیا۔

"تجھے پتا ہے' یہ ریل گاڑی کہاں جارہی ہے؟" ہڈی ٹرین کے دروازے سے باہر اچھالتے ہوئے دوسرا سوال پوچھا گیا۔ اس نے گردن نفی میں ہلائی تھی۔

"ساہیوال ..... ساہیوال جائے گا تو؟" بھکاری نجانے کیوں ٹرین کا ہنکر پر سن بن رہا تھا۔

"نا..... نہیں۔" اس کی بہت سہمی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔

وہ جس بوگی میں سوار تھا' وہ ٹرین کی آخری بوگی تھی۔ تمام مسافر اپنی وضع قطع سے دیہاتی اور پسماندہ حال لگ رہے تھے۔ رش بھی اس قدر تھا کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں تھی اور شور اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی مگر بھکاری لڑکے کو انٹرویو کا شوق چرایا تھا۔

اس کے سہمے ہوئے "نہیں" پر وہ لڑکا چند لمحے آنکھیں سکیڑ کر اس کی جانب دیکھتا رہا پھر اس نے تن پر لٹکائی پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص کی جیب سے گولڈ لیف کی ڈبیہ نکال کر اپنے زخمی ہاتھ کی مدد سے ایک سگریٹ کھینچا تھا۔ سگریٹ سلگا کر بے حد اطمینان سے کش لگانے کے بعد اس کی جانب جھک کر اس نے آواز کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"گھر سے بھاگا ہے ناتو؟"

یہ سوال سن کر اس کی الجھی بکھری سانسیں رک سی گئی تھیں۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے سامنے کھڑا ننگ دھڑنگ' وضع قطع سے بھکاری دکھنے والا وہ لڑکا کوئی عام لڑکا تو نہیں تھا۔ وہ تو کوئی درویش تھا' پیر تھا' ولی اللہ تھا' جو چہرہ دیکھ کر دل کا حال جان لیتا تھا۔ اس نے بے حد عقیدت سے "پیرومرشد" کی طرف دیکھا اور پھر روتے ہوئے اس کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

"تم پڑھے لکھے لڑکے ویسے ہوتے کھچڑ ہی ہو..... آدھے گھوڑے' آدھے گھوتے..... ہوتے کچھ ہو' نظر کچھ اور آتے ہو' کہنا کچھ اور ہوتا ہے اور کہہ کچھ اور جاتے ہو' چاہتے کچھ ہو' ظاہر کچھ اور کرتے ہو..... میری باتیں سمجھ میں آرہی ہیں نا....."

سلیم نامی وہ بھکاری لڑکا بھنی ہوئی مرغی کی ٹانگ کو جبڑوں میں رکھ کر بھنبھوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ منہ بھرا ہوا ہونے کے باعث اس کی بات واقعی واضح طور پر سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ سلیم کی ہمراہی کو اپنے لیے ایک مضبوط سائبان سمجھنے کے باوجود دل ہی دل میں کچھ گھبرانے لگا تھا۔ لاہور سے بھائی پھیرو اتر جانے تک سلیم اس سے سب اگلوانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب ایک کوٹھری پر مشتمل چھوٹے سے ڈھابے میں مرغی کو ادھیڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی دھجیاں بھی اڑا رہا تھا۔

"جب اماں ابا کو پیچھے چھوڑ دیا تو پھر اب منہ لٹکانے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھی بھلی شکل کو تو بھینگا' چبا فریم بنائے رکھتا ہے۔ ایک بات سن میری..... تیرا پیو اچھا انسان ہوتا تو تجھے اس حال میں نہ پہنچاتا۔ اس نے تجھے بھری محفل میں ذلیل کیا..... تیرا ساتھ بھی نہیں دیا اور تو اسے یاد کررہا ہے..... قسمے میرا ابا ایسا ہوتا تو اسے ذبح کرکے کسی جنگل میں پھینک آتا۔"

سلیم کے انداز میں قطعیت بھری حقارت تھی۔ اسے برا لگا۔

"میرے ابو نے مجھے اس حال میں نہیں پہنچایا..... وہ بہت اچھے ہیں۔ یہ سب میری غلطیوں کی سزا ہے۔ مجھے جنید' طلحہ اور راشد جیسے لڑکوں کو دوست نہیں بنانا چاہیے تھا۔ وہ اچھے لڑکے نہیں تھے۔"

"اوہ تیرا باپ ان لڑکوں کا پیو تھا یا تیرا..... اسے سب کے سامنے کہنا چاہیے تھا کہ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے اور ان دونوں لڑکوں نے جو بکواس کی' وہ غلط ہے..... تیرا پیو اگر ایک بار تیرا ساتھ دیتا تو مجال ہے جو کوئی تجھے ذلیل کرجاتا۔ میری ایک بات یاد رکھنا کہ یہ جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں نا' یہ ہمیں بڑا ذلیل کرتے ہیں لیکن یہی اپنے کسی اور کو ہمیں ذلیل کرنے بھی نہیں دیتے۔ تیرا باپ تجھے گھر لے جا کر جتنا مرضی مار لیتا مگر سب کے سامنے ایک دفعہ تیرے موڈھے (کندھے) پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا..... چل کھبا (بایاں) ہی رکھ دیتا مگر تیرا حوصلہ تو بڑھ جاتا..... ان خبیثوں کے منہ تو بند ہو جاتے۔"

سلیم بات کرتے کھانے سے بھی خوب انصاف کر رہا تھا جبکہ وہ تو اس کی باتیں سن سن کر نئی نئی دنیائیں دریافت کرنے میں مگن تھا۔ اسے سلیم کی باتیں سچی لگیں' واقعی اسے بھی اس بات کا دکھ تھا کہ ابو نے اس کے بھروسے کا مان نہیں رکھا۔ اسے سلیم کی باتوں نے احساس دلایا کہ وہ ابو کی مار پیٹ کے ڈر سے گھر سے نہیں بھاگا تھا' بلکہ یہ ان کی آنکھوں میں چھپی نفرت اور حقارت تھی جس نے اس کی حسیات کو مفلوج کر دیا تھا۔ جنید اور طلحہ کے والدین بھی حمید کاروانی کے بلانے پر اکیڈمی آئے تھے' لیکن انہوں نے اپنے بیٹوں کو غلط نہیں کہا تھا جبکہ اس کے ابو نے سچائی کو پرکھا بھی نہیں تھا' اور فرض کر لیا۔

"اوئے کھچڑ! اب منہ لٹکا کر مت بیٹھ..... روٹی ختم کر ..... یہی زندگی ہے..... جن کو تیری پروا نہیں تجھے بھی ان کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔"

سلیم نے اخبار سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ایلومینیم کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا جبکہ اس نے چند لقموں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا' حالانکہ سلیم نے مرغی کے علاوہ بطور خاص اس کے لیے آلو قیمہ کا سالن بھی منگوایا تھا۔ سلاد اور رائتے کا لطف بھی تھا مگر گھر سے دوری کا احساس' آرام دہ بستر کا تصور اور سب سے بڑھ کر امی کے پیار بھرے لمس کی خواہش اسے پچھتاووں کا احساس دلا رہی تھی۔

"میری امی بہت اچھی ہیں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ وہ بہت پریشان ہو گئی ہوں گی..... رو بھی رہی ہوں گی۔"

اس نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔ سلیم نے ناک پھلا کر اسے گھورا۔

"اوئے یہ مائیں بھی باپوں کی چمچیاں ہوتی ہیں۔ ان سے کوئی اچھی امید نہیں رکھنا۔ یہ باپوں کے اشاروں پر ناچتی ہیں..... انہیں اولاد سے سوا (راکھ) محبت ہوتی ہے..... چل میرا یار! ایویں دل خراب نہ کر..... تیری ماں روتی ہوگی تو تیرا پیو ہے نا اس کے پاس۔ آپی چپ کروائے گا' چل میرا بھائی! تو روٹی کھالے..... اتنی نعمتیں تیرے آگے پڑی ہیں تو ناشکری مت کر..... پیٹ بھر لے..... کیا پتا کل ملے نہ ملے..... آج تو اوپر والے کا بڑا کرم تھا..... اچھی دیہاڑی ہوگئی تھی....."

سلیم کی ہوشیاری و تیز طراری' باتیں کرنے کا انداز اور اس کا شاہانہ ٹھاٹ باٹھ سب کچھ اسے بہت فطری لگا تھا۔ اسے لگا تھا کہ شاید اس طبقے کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ فلمیں نہیں دیکھتا تھا' اخبار و رسائل بھی نہیں پڑھتا تھا۔ اس کا سوشل سرکل بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کیسے کیسے لوگ بکھرے ہوئے ہیں۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ اسے سلیم کی محبت اور ہمدردی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ جس طرح اس کا خیال رکھ رہا تھا' اسے بار بار کھانا کھانے کی تلقین کر رہا تھا' اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بہل گیا تھا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟ اس نے بچی ہوئی روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"گھر.....؟ گھر سے بھاگ کر آگیا ہے اور اب مجھ سے گھر کا پوچھ رہا ہے..... ارے بیٹا! یہ گھر ور کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں روٹی ملے کھالو' جو پہننے کو ملے پہن لو' جہاں سونے کو جگہ ملے وہاں سو جاؤ..... یہی زندگی ہے..... اسے خوامخواہ کی تفتیش میں کیوں ضائع کرتا ہے؟"

سلیم کا لہجہ مطمئن تھا۔ وہ اپنی شلوار کی جیب سے دو تین والٹ نکال کر اب ان میں موجود چیزوں کو ایک جگہ جمع کر رہا تھا۔ روپے ایک جگہ اور باقی چیزیں ایک جگہ رکھنے کے بعد اس نے روپوں کو گننا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک نوٹ اس کی جانب بڑھایا۔

"تم بہت اچھے ہو سلیم....." وہ ممنون لہجے میں بولا پھر منہ میں لقمہ رکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے روپوں کی ضرورت نہیں ہے..... مجھے تم جیسے دوست کی ضرورت ہے۔"

"دیکھ کھچڑ..... سلیم کسی کا دوست ووست نہیں ہے..... تو مجھے بڑا معصوم لگا ہے۔ بس اس لیے تیری مدد کر رہا ہوں۔ مجھے رشتوں سے بڑی نفرت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو مجھ سے کوئی رشتہ جوڑے۔ میں تیرا

خیال رکھ رہا ہوں' تیرے بھلے کی باتیں کر رہا ہوں تو ان کو غنیمت سمجھ۔۔۔ تو میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو بے شک رہ لے مگر مجھے اپنا چاچا' ماما مت سمجھ۔"

سلیم نے نوٹ اس کی مٹھی میں دبایا اور باقی کی رقم دوبارہ سے جیب میں اڑس لی۔ اس کا دل سلیم کی باتوں پر ایک دفعہ پھر خوف زدہ ہوا تھا۔ وہ سلیم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ پہلی دفعہ اتنی رات کو گھر سے بلکہ شہر سے بھی باہر تھا۔ اس کو ڈھارس تھی تو بس سلیم کی۔ یہ سلیم کا دلایا حوصلہ ہی تھا کہ وہ پوری روٹی کھا گیا تھا۔ روٹی ختم کر کے اس نے پانی کا جگ اٹھانا چاہا تھا جب اسے احساس ہوا کہ سلیم کے چہرے کے تاثرات بدل رہے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"اوئے کھوتے بھاگ۔۔۔" سلیم نے نعرہ لگایا تھا۔

وہ حیران پریشان اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا' کسی نے اس کی گردن کو دبوچا تھا۔

"پکڑلوان حرام زادوں کو۔۔۔"

سلیم آنا" فانا" کوٹھڑی کی کھڑکی سے باہر کود گیا جبکہ وہ ہکا بکا مٹھی میں دبے نوٹ کو دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کا بیٹا ایک بہت منظم گروہ کا آلہ کار بننے سے بال بال بچا ہے۔ ہمارے مخبر کی اطلاع پر ہم پکڑنے کسی اور کو گئے تھے اور پکڑ کسی اور کو لائے۔ سلیم نامی وہ بھکاری نہ صرف جیب کترا ہے بلکہ بہت بڑا ٹھگ بھی ہے' وہی آپ کے بیٹے کو ورغلا کر لاہور سے بھائی پھیرو لے آیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کو بھی اپنے گروہ میں شامل کر لیتا۔ پولیس کی کامیاب کارروائی سے ہم اس کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔"

سب انسپکٹر بہت فخر سے اپنی کارکردگی ابو کو بتا رہا تھا جبکہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ کر کہیں دور چلا جائے۔ چند گھنٹوں میں اس کی زندگی میں اتنا کچھ ہوا تھا کہ وہ سوچتا تھا تو اس کا سر درد سے پھٹنے لگتا تھا۔ وہ بے حد سہما ہوا تھا۔ سب انسپکٹر نے سلیم کو فرار ہوتا دیکھ کر کوئی کارروائی نہیں کی تھی' لیکن اس کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ بلک بلک کر رونے لگا تھا۔ اس پر تشدد بھی کیا گیا تھا' پھر نجانے کیسے سب انسپکٹر کو اس پر ترس آ گیا تھا۔ اسی نے اس کا فون نمبر لے کر اس کے ابو کو لاہور سے بلوایا تھا اور اب وہ ایک بوسیدہ کرسی پر ابو کے ساتھ بیٹھا سب انسپکٹر کی باتیں سن رہا تھا۔ ابو کے آجانے سے اسے بے پناہ تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے اسے حسب معمول گلے نہیں لگایا تھا لیکن وہ چہرے سے پریشان لگ رہے تھے۔ ان کو پریشان دیکھ کر وہ مزید شرمندہ ہو گیا تھا۔

"میں نے ابھی اوپر اطلاع نہیں دی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ شریف لوگ ہیں۔ پولیس کیس ہینڈل کرنا آپ لوگوں کے لیے مرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو فورا" فون کروا دیا جی۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ معاملہ طریقے سلیقے سے نبٹ جائے۔۔۔ آپ پوچھ لیں اپنے بیٹے سے' ہم نے اسے ایک بھی تھپڑ نہیں مارا۔۔۔ آپ تسلی کر لیں۔۔۔ مجھے بھلے انسان لگتے ہیں آپ۔۔۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کے لیے یہ سب کچھ کس قدر پریشان کن ہے۔"

اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سب انسپکٹر اس کے ابو کو تسلی دے رہا تھا۔ اس نے ابو کی جانب دیکھا۔ ان کی نظریں بھی لحہ بھر کے لیے اس کی طرف اٹھی تھیں۔ کیا نہیں تھا ان کی نظروں میں۔۔۔ اس نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر کو اترتے ہوئے محسوس کیا۔ ان کا لہجہ بے حد سرد مہری لیے ہوئے تھا۔

"آپ کی مہربانی محترم۔۔۔ اپنا مطالبہ بتائیے۔۔۔" سب انسپکٹر سے بات کرتے ہوئے بھی ان کا چہرہ سرد مہری لیے ہوئے تھا۔

"آپ خود سمجھ دار ہیں جناب۔۔۔ میں منہ سے کہہ کر کیوں گنہگار بنوں۔۔۔ جو آپ کو مناسب لگے' وہ عطا کر دیجئے۔ آپ کا بچہ ہو یا ہمارا۔۔۔ بات ایک ہی ہے۔۔۔ آپ کو شکر کرنا چاہیے کہ یہ ہمارے ہتھے چڑھ گیا ورنہ آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔"

اس کے ابو نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر سب انسپکٹر کی ٹیبل پر عین اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ سب انسپکٹر نے فورا" لفافہ جھپٹ کر اپنی ٹیبل کی دراز میں رکھ لیا۔

"مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ ایک سمجھ دار انسان ہیں۔" سب انسپکٹر کی لن ترانی عروج پر تھی۔ اس کے ابو نے بے حد حقارت سے اس کو دیکھا اور اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اوئے حوالدار۔۔۔ انہیں باہر تک چھوڑ آؤ۔" سب انسپکٹر اپنی کرسی پر لڑھکتے ہوئے بولا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کبھی اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔۔۔ کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے کسی کی غلط بات برداشت کرنی پڑی ہو۔۔۔ پچھتانے کے لیے کبھی میرے پاس ایک ذرہ بھی نہیں رہا۔۔۔ کبھی کسی کو رشوت دی نہ لی۔۔۔ مگر آج۔۔۔ آج اس منحوس کی خاطر یہ قبیح فعل سرانجام دینا پڑا۔۔۔ کاش یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔۔۔ کم از کم آج کا دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔۔۔ یہ ہوتی ہے اولاد اور یہ ہوتے ہیں اس کے کرتوت۔۔۔ ایسی اولاد سے بہتر ہے انسان بے اولاد مر جائے۔۔۔ تمہاری اولاد نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کسی گاڑی سے ٹکرا کر ختم ہو جاؤں' ندی میں کود جاؤں یا زہر کھا لوں۔۔۔ اس سے کہو میرے سامنے سے دفع ہو جائے۔۔۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

اس کے ابو اس کی امی کے سامنے باآواز بلند اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کی بہن دروازے کے عقب میں دبکی کھڑی تھی' جبکہ وہ ابو کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹوں بعد گھر آیا تھا اور آتے ہی وہ کٹہرے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ ابو نے بھائی پھیرو سے لاہور تک کے رستے میں اسے کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ اس سے مخاطب بھی نہیں ہوئے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اونچی آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔ امی کی اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اسے گلے لگا لیتیں مگر ان کی آنکھیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ وہ بہت زیادہ روتی رہی ہیں۔ اسے بے پناہ پچھتاوے کا احساس ہوا تھا۔ ابو کی باتوں نے اس کے احساس جرم میں اضافہ کیا تھا۔ اسے خود سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ دنیا کا براترین بیٹا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں ابو۔۔۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔ آپ پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

وہ ان کے قدموں میں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن ابو نے اسے ٹھوکر مار دی تھی۔

"غلطی۔۔۔؟ یہ غلطی تھی؟ یہ گناہ تھا اور جسے گناہ کی عادت پڑ جائے اسے معاف کر دینا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ میں تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہوں نہ تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم آج سے یہ بات نوٹ کر لو' میں تمہارے لیے مر چکا ہوں۔ میرا تم سے کوئی واسطہ' کوئی تعلق نہیں۔"

وہ ہمیشہ اسے دھتکارتے آئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بھل بھل پانی بہنے لگا۔

"ایسے مت کہیں ابو۔۔۔ مجھے معاف کر دیں۔۔۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔۔۔ ایسے مت کہیں ابو۔"

اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کی امی نے بھی رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ابو نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کمرے کی جانب چل دیے تھے۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس کے ابو نے اس پر غلطی کے باوجود ہاتھ نہیں اٹھایا تھا' لیکن جو کچھ وہ کہہ کر گئے تھے' وہ کسی بھی طرح ایک طمانچے سے کم نہیں تھا۔ اس کے گال بنا تھپڑ کھائے دہکنے لگے تھے۔ اس کا سارا جسم جیسے آگ میں جل رہا تھا اور آنکھیں اشک بہا رہی تھیں۔ آگ پانی کے اس سنگم نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسے اپنا سر پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کندھوں سے لے کر گردن اور سر کے پچھلے حصے کی رگیں جیسے تن کر تاریں بن گئی تھیں۔

درد کے عفریت نے اسے جیسے پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔

"امی۔۔۔ امی۔" سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے اس نے انہیں پکارنا چاہا تھا۔

"اس سے بہتر تھا نور محمد! تو مر جاتا۔۔۔" اس کی امی اس کی حالت سے بے خبر لاچاری سے بولی تھیں۔ ہوش سے بے ہوشی کے سفر میں اس نے یہی آخری جملہ سنا تھا۔ اس کے حواس بالکل ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مرنا اور کیا ہوتا ہے۔ وہ مر ہی تو گیا تھا۔

"مرنا اور کیا ہوتا ہے احمد معروف۔۔۔ میں واقعی مر گیا تھا۔"

نور محمد نے آستین سے آنکھیں صاف کی تھیں۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے اپنے بارے میں زبان کھولی تھی۔ اپنے بارے میں اپنے منہ سے کسی کو بتایا تھا۔ سارے زخم جیسے ہرے ہو گئے تھے۔ گال پر امی کا وہ لمس جیسے ابھی تازہ تھا۔ احمد معروف نے اس کے زخموں کو ادھیڑ ڈالا تھا۔ وہ بلاوجہ تو بیزار نہیں ہوا تھا اس دنیا سے' وہ جان بوجھ کر تو تارک الدنیا نہیں ہوا تھا۔ کتنے اسباب تھے اس کے دل میں مدفن جو اس کی اس حالت کے ذمہ دار تھے۔ وہ جیسے تھک گیا تھا۔ اس نے احمد معروف کو سب بتا دیا تھا۔

"اور آپ مرے ہوئے شخص کو بتاتے ہیں کہ دنیا کی قیمت ہے' اہمیت ہے' ضرورت ہے۔۔۔" وہ اتنا رو رہا تھا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

احمد معروف کا دل بوجھل ہونے لگا تھا۔ اس نے بہت سے الفاظ جمع کیے تھے۔ وہ نور محمد کو مطمئن کرنے کے لیے مکمل تیاری کر کے آیا تھا' مگر اس کی آہ و زاری نے جیسے اس کے اپنے زخموں پہ موجود سخت کھرنڈوں کو کھرچ ڈالا تھا۔ وہ خود اس لمحے جیسے ایک مشکل ساعت کی گرفت میں تھا۔ اس کا اپنا دل قطرہ قطرہ سسک رہا تھا۔ بلک رہا تھا۔ وہاں بھی بہت سے راز دفن تھے' بہت سے ان کہے لفظ تھے' لیکن وہ کسی کو بتا نہیں سکتا تھا۔ کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔۔۔ سو اس نے اپنے سب الفاظ جمع کر لیے تھے۔

☆ ☆ ☆

"وہ میری زندگی کی بری راتوں میں سے ایک رات تھی۔"

میں کب سے بستر پر لیٹا تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک عجیب سی بیزاری تھی جو مجھے اندر ہی اندر لاحق تھی۔ ثیا کی باتوں نے نہ صرف مجھے دکھی کیا تھا بلکہ غصہ بھی دلا دیا تھا۔ غصہ مجھے اپنے آپ پر آیا تھا۔ میں اتنا احمق کیسے ہو گیا تھا کہ اس کے کہنے پر کتابیں کچرے میں پھینک دیں اور جس کی بنا پر اسے دوبارہ یہ موقع مل گیا کہ وہ جتا سکے کہ میں وفادار نہیں ہوں۔ اسی لیے میرا دل اتنی شدت سے چاہ رہا تھا کہ میں اپنی زندگی کو ریوائنڈ کر کے عین اس لمحے جا روکوں' جب میں نے کتابیں ضائع کرنے کے لیے کچرے میں پھینک دی تھیں۔

مجھے بے شک اس بات سے اتفاق بالکل نہیں تھا کہ ہماری خوراک ہماری اچھائیوں یا کجیوں کی ذمہ دار ہو سکتی ہے' لیکن اس کی یہ بات مجھے سو فیصد درست لگی تھی کہ اپنی لگن یا شوق سے کسی دوسرے انسان کی خاطر دست بردار ہو جانا دراصل غداری ہے۔ اس نے بہر حال مجھے غدار ثابت کر ڈالا تھا اور میں اس کے ساتھ وفا نبھانے کے شوق میں اتنا مرا جا رہا تھا کہ مجھ سے حماقتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ یہ تھی میرے اندر کی وہ بھڑاس جو مجھے کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی تھا اور مجھے نیند بھی بائیں کروٹ پر جلدی آتی تھی لیکن اس رات مجھے بائیں کروٹ بھی نیند کی منت سماجت کرنی پڑ رہی تھی۔

مجھے ثیا کی فلاسفی پر اعتراض نہیں تھا۔ وہ جو سوچتی تھی' جو کرنا چاہتی تھی یہ اس کا حق تھا' اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ اسے جو کھانا تھا یا جو نہیں کھانا تھا یہ اس کی اپنی پسند تھی' میں اس پر معترض نہیں تھا۔ مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ میں کوئی اعتراض کرتا' لیکن مجھے اس بات پر بہت بے دلی اور اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے مجھے میرے ایک اقدام سے ایک بار پھر وہ ثابت کر ڈالا تھا جو میں قطعاً" نہیں تھا اور سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ گھر آتے ہی مہمانوں کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔ کو ہو نے مجھے بتایا تھا کہ اگلے ہفتے عوف بن سلمان آ رہا تھا۔

عوف بن سلمان کا تعلق سعودی عرب سے تھا۔

اس سے میری پہلی ملاقات الریاض میں ان کے گھر پر ہوئی تھی جہاں بطور خاص میرے گرینڈ پیرنٹس کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کافی سال پہلے کی بات ہے۔ عوف بن سلمان کا تعلق کافی امیر کبیر خاندان سے تھا۔ وہ کوئی شہزادہ تو نہیں تھا' مگر ان کا رہن سہن کسی شاہی خاندان کے رہن سہن کو مات دینے کے لیے کافی تھا۔

ہمارے خاندانوں کے درمیان پہلے پہل کوئی دوستی نہیں تھی۔ دوستانہ تعلقات بہت بعد میں استوار ہوئے۔ دراصل گرینڈ پا نے جب بزنس کا دائرہ بڑھا کر سعودی عرب کو بھی ایکسپورٹ شروع کی تو عوف بن سلمان کے والد نے ان کی بہت مدد کی تھی۔ وہ خود بھی گرینڈ پا کے بڑے کسٹمرز میں سے ایک تھے۔ ان کے درمیان کاروباری تعلقات آہستہ آہستہ دوستانہ روابط میں بدل گئے تھے۔

عوف بن سلمان اور اس کے بہن بھائیوں' کزنز وغیرہ کی اسکولنگ لبنان اور فرانس میں ہوئی تھی۔ وہ سب بہت اچھی فرنچ بول سکتے تھے' گرینڈ پا اکثر ان کا ذکر کرتے تھے۔ گرینڈ پا کی تدفین کے بعد سلمان بن ہشام نے مجھے فون بھی کیا تھا۔ گرینی کی وفات پر ان کی اہلیہ کے تعزیتی خطوط بھی آئے تھے۔ سلمان بن ہشام صاحب سال چھ مہینے بعد مجھے فون بھی کر لیا کرتے تھے۔ عوف بن سلمان مجھ سے دو ایک سال بڑا تھا اور لندن میں پڑھ رہا تھا۔ رچمنڈ میں ان کا ذاتی گھر تھا۔ عوف طبیعتاً" مہم جو اور فطرت کا دلدادہ تھا۔ وہ اچھا فوٹو گرافر تھا اور اسے ویک فیلڈ بالعموم اور ہمارا وسیع و عریض فارم ہاؤس بالخصوص بہت پسند آیا تھا۔ اس نے نجانے کیسے خود کو میرا دوست فرض کر لیا تھا۔ وہ مجھے فون بھی کرتا تھا اور اس کے پوسٹ کارڈ بھی موصول ہوتے رہتے تھے۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کا ہر دو مہینے بعد مجھ سے ملنے آنا مجھے ہضم نہیں ہوتا تھا۔ میں انسانوں سے بڑا بیزار رہنے والا انسان تھا اور عوف بن سلمان جیسے انسان کے ساتھ وقت گزارنا تو بہت مشکل تھا' حالانکہ وہ ایک مقناطیسی شخصیت کا مالک تھا۔ قد کاٹھ کے معاملے میں اسے اوپر والے نے بہت نوازا تھا۔ باسکٹ بال کے متعلق اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

وہ ایسے کپڑے پہنتا تھا جو اس کی شخصیت کے سحر کو کئی گنا بڑھا دیتے تھے۔ اور "پرفیومز" کا ایسا بڑا ذخیرہ اور اس کا بے دریغ استعمال اسے سچ مچ کا شہزادہ ثابت کرتے تھے۔ اس کی طبیعت میں بھی شاہانہ انداز جھلکتا تھا۔ خود پسندی اور غرور اس کی عادات میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جبکہ مجھے وہ بے حد ناپسند تھا اور وہ خود کو میرا دوست کہتا تھا۔ اسی لیے اس کی آمد کا سن کر میرا مزاج مزید خراب ہونے لگا تھا کیونکہ مجھے زندگی میں خوشامد نہ کبھی آئی تھی اور نہ کبھی بھائی تھی۔

میں اکتا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سینے پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔ مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی وہ ایک داستان یاد آئی جس میں ایک شخص کسی شہزادے کے خوفناک ہیئت والے کانوں سے واقف ہو کر اپنے دل کی بھڑاس کو ایک گڑھے میں نکال دیتا ہے اور پر سکون ہو جاتا ہے۔ دراصل ہم سب کو ایک ایسے ہی گڑھے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے جسے ہم اگال دان کی طرح استعمال کر کے خود ہلکے پھلکے ہو سکیں۔ میں نے بھی ایسا ایک گھڑا ڈھونڈ لیا تھا۔ میں نے کاغذ قلم تھام لیا۔ میرے سینے کا بوجھ جب بھی بڑھ جاتا تھا۔ میں اپنے اسی گھڑے کو دراز سے نکال لیا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟" ثیا نے فرنچ فرائز کا قتلہ گارلک ساس میں ڈبو کر میری جانب بڑھایا۔ ہم ایک اوپن ایر کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔

موسم میں بڑی میٹھی سی حدت تھی جو بھلی محسوس ہوتی تھی۔ اس حدت سے بھی زیادہ مٹھاس اس لمحے مجھے ثیا کی ادا میں محسوس ہوئی۔ ساری خفگی جیسے برف کی طرح پگھل کر پانی بن گئی تھی۔ میں نے وہ قتلہ پکڑنا چاہا تو اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اسے مجھے دینے سے انکار کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں وہ قتلہ اس کے ہاتھ سے کھاؤں۔ میں نے اس پر قربان ہوتے ہوئے قتلے کا آدھا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ لیا تھا بقیہ بچ جانے والے حصے کو اس نے اپنے منہ میں رکھ لیا۔

ثیا میں مجھے نجانے کیا کشش محسوس ہوتی تھی لیکن ایک بات حتمی تھی کہ میرا ہر عہد اس کے معاملے میں تاش کے پتوں کا محل ثابت ہوتا تھا۔ میں اس سے دور رہ سکتا تھا نہ خفا۔ اس نے فون کر کے بس مجھے ملنے کے لیے کہا تھا میں اس کی ساری دل دکھانے والی باتیں بھول کر کاٹھ کے الو کی طرح اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی کاٹھ کا الو بننے میں بھی کتنا سُرور آتا ہے' یہ صرف محبت کرنے والا دل جان سکتا ہے۔ میں بھول گیا کہ اس نے مجھے گزشتہ بار غدار کہا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ اس کی وجہ سے میں ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا۔

"میں نے پوچھا تھا' تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔ اس کی آنکھوں پر سن گلاسز تھے لیکن ان میں شرارت کا عکس واضح محسوس ہوتا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری رائے ہے یا اندازہ؟" میں نے ایک اور سوال پوچھا۔

"رائے نہ اندازہ۔۔۔ یہ میرا یقین ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولی پھر اس نے جوس کا ایک گھونٹ بھرا اور مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر گویا ہوئی۔

"زندگی کی جتنی بھی اچھی چیزیں ہیں نا۔۔۔ ان کے متعلق تمہارا جواب کرسمس کے درجہ حرارت کی طرح ہوتا ہے۔۔۔ یعنی ہمیشہ منفی۔"

اس کے چہرے پر شرارت نہیں تھی لیکن میں نے خود ہی فرض کر لیا کہ وہ یہ بات مذاق میں کہہ رہی ہے۔ محبت میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبوب کی آدھی باتیں تو ہماری خود ساختہ ہوتی ہیں۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔۔۔ تم مجھے انڈر ایسٹی میٹ کر رہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور فرنچ فرائز کا ایک ٹکڑا بغیر ساس لگائے منہ میں رکھا۔ مجھے لہسن کی یہ ساس ناپسند تھی۔

"اچھا؟" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر ٹیبل پر جھکتے ہوئے میرے ذرا قریب ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم نے کبھی ڈرائیونگ کی ہے؟" میں نے قہقہہ لگایا۔ اس کا جواب بھی کرسمس کا درجہ حرارت ہی تھا۔

"جانے بھی دو ثیا۔۔۔ میرا لائسنس نہیں ہے۔" وہ گہری سانس لے کر دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

"میرے پاس بھی نہیں ہے۔۔۔ میں چودہ سال کی عمر سے ڈرائیونگ کر رہی ہوں۔" اس نے جتایا اور پھر ناک چڑھائی۔

"کبھی اسموکنگ کی ہے تم نے؟"

"اونہہ۔۔۔ دھوئیں سے الرجی ہے مجھے۔۔۔ کھانسی ہونے لگتی ہے۔" میں ناگواری سے بولا تھا۔

"اس لیے کہ تم نے ابھی تک پنگھوڑے میں سونا چھوڑا اور نہ فیڈر پینا۔۔۔ تم نے اسموکنگ نہیں کی تو پھر تمہیں کیا پتا کہ مورفین اور میری جوانا کن جادوگرنیوں کے نام ہیں' ان میں کیا سحر چھپا ہے اور زمین پہ بیٹھ کر آسمان کو چھونے کا کیا مطلب ہے۔ زندگی کی سب اچھی چیزیں تمہیں اچھی نہیں لگتیں۔ تم ہر خوشی کو اپنے لیے حرام کر کے بیٹھ گئے ہو۔ میں تمہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ تم جوہڑ کی مچھلی ہو کیونکہ اس کا بھی کوئی نا کوئی وژن ہو گا۔۔۔ تمہیں برا تو لگے گا مگر میں پھر بھی کہوں گی کہ تم بالٹی کے پانی کا خوردبینی کیڑا ہو۔۔۔ بالٹی بھی وہ جو اندھیرے کمرے میں

پڑی ہوتی ہے۔ تم ایسی ہی بالٹی کے اندر گھوم گھوم کر زندگی گزارتے رہنا چاہتے ہو۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے فضا میں انگلی کو گھمایا تھا۔ وہ مجھے دائرہ بنا کر دکھا رہی تھی۔

"ارے یار۔۔۔ نکلو اس بالٹی سے' کب تک گول گول گھومتے رہو گے' یہ بالٹی تمہیں چکرا کر رکھ دے گی۔۔۔ دنیا تمہارا ساتھ دینے کے لیے اس بالٹی میں نہیں اترے گی' تمہیں ہی اس بالٹی سے نکل کر دنیا میں اترنا ہو گا' تم سمجھتے ہو کتابیں تمہیں سب سکھا دیں گی' ایسا نہیں ہوتا دوست! تم جتنی دیر میں کتاب ختم کرتے ہو نا' میرے جیسے لوگ اتنی دیر میں اسی کتاب کے پنوں (صفحات) کا جہاز بنا کر دنیا گھوم آتے ہیں۔۔۔ سمجھ رہے ہو میری بات؟"

وہ ہاتھ میرے چہرے کے سامنے ہلا کر پوچھ رہی تھی۔ میں واقعی چونک گیا۔ مجھے اس کی باتوں سے اتفاق تھا نہ مجھے اس کی صاف گوئی بھائی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی اس کی شخصیت میں کہ میں شرمندہ ہو گیا۔ جو انسان آپ کو اچھا لگتا ہو' اس کو بھی آپ صرف اچھا ہی اچھا نظر آنا چاہتے ہیں۔

"میری بات کا برا نہ ماننا' مجھے تم اچھے لگتے ہو' اس لیے مجھے تمہاری فکر ہے' پروا ہے۔"

اس نے جوس کے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیا تھا۔ اس کا جملہ زمین کو میرے قدموں تلے سے کھینچ لے گیا تھا' اور وہ بھی اتنی نرمی و لطافت سے کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میں اب کھڑا یا بیٹھا نہیں تھا بلکہ اڑ رہا تھا سبک روی سے' سکون سے۔ میں اس کے سحر سے اتنا مدہوش تھا کہ سانس بھی مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے کانوں میں صرف ایک فقرے کی تکرار ہو رہی تھی۔

"مجھے تم اچھے لگتے ہو اس لیے مجھے تمہاری فکر ہے' پروا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"تم تو بالکل نہیں بدلے۔۔۔ ویسے کے ویسے ہو۔" عوف نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے بظاہر دوستانہ انداز میں کہنے کے ساتھ ساتھ اپنی ٹھوڑی اور بائیں گال پر ہاتھ پھیر کر جتایا تھا کہ میں نے اب تک شیو کرنا شروع نہیں کیا۔ وہ گزشتہ بار بھی مجھے یہ احساس دلا چکا تھا۔ مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ خواہش کے باوجود میرے چہرے پر ابھی اتنی نشانیاں ظاہر نہیں ہوئی تھیں کہ میں باقاعدہ شیو کر سکتا۔ میں نے جلے دل کے ساتھ مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ کاؤچ کی پشت سے ٹیک لگا کر اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔

"اب تم کچھ بڑے ہو جاؤ دوست۔۔۔ دنیا تم سے دس قدم آگے چل رہی ہے۔"

وہ ہمیشہ سے دوستانہ استحقاق کا مظاہرہ کرتا آیا تھا۔ میں نے اس کے انداز میں کسی اور کے انداز کی جھلک محسوس کی۔

میں بچپن سے بڑا ہوں۔۔۔ بڑے ہونے کا تعلق شخصیت کی ظاہری خوبیوں سے نہیں ہوتا۔۔۔ یہ کچھ ایسی چیز ہے جو یہاں ہوتی ہے۔"

"میں نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر اسے دوبارہ بجایا۔ وہ مزید مسکرایا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔ میں کبھی کبھی حیران ہوتا تھا کہ میں اس سے اتنا خار کیوں کھاتا ہوں؟ حالانکہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ وہ میرے لیے بہت سے تحائف لایا تھا اور اس کے انداز میں اپنائیت بھی تھی۔ وہ رات کو پہنچا تھا اور اب صبح ہو چکی تھی۔ میں جان بوجھ کر اس کی آمد کے چودہ گھنٹے بعد اس سے مل رہا تھا۔ وہ شاور لے کر آیا تھا اور اس نے ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر شرٹ پہنا تھا جو یقیناً" کسی مشہور برانڈ کا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے جمے تھے اور زبردست قسم کے فرانسیسی ایوڈی ٹوائلٹ کی مہک آس پاس بکھری ہوئی تھی۔ چہرے پر ہلکی داڑھی بڑھا لینے کے باعث اس کا چہرہ مزید بھرا بھرا لگنے لگا تھا۔ مجھے عادت نہیں تھی' یہ شاید میرا شوق تھا کہ میں لوگوں کا اور اپنا موازنہ کرتا رہتا تھا۔ اس کے مقابلے میں میرا پورا وجود بہت گیا گزرا سا لگتا تھا۔ اس سے

پہلے کہ میرا احساس کمتری مجھ پر حاوی ہو جاتا' میں نے اس کے سامنے پڑی تپائی پر رکھا اخبار اٹھا لیا۔ اخبار اچھی ڈھال ثابت ہو سکتا تھا اس کے سامنے تپائی پر خشک میوہ جات' تازہ کیک اور خوبانی کی مٹھائی بھی رکھی تھیں۔ اس نے مجھے اخبار اٹھاتے دیکھ کر خود ایک اخروٹ کا ٹکڑا اٹھا لیا تھا۔

"ابھی بھی کتابیں شوق سے پڑھتے ہو؟" اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں ۔۔۔ اب کتابوں نے مجھے شوق سے پڑھنا شروع کر دیا ہے۔"

اس نے مختصر مگر مہذب قہقہہ لگایا۔

"میں تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے تمہیں کافی پسند کرتا ہوں۔"

"اچھا ۔۔۔؟" میں مسکرایا اور اخبار کو اپنے سامنے پھیلایا۔

"حالانکہ یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے اکثر لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔"

"لوگوں کی فکر مت کرو دوست ۔۔۔ ہیرے کی قدر جوہری کو ہوتی ہے یا پھر خود ہیرے کو ۔۔۔ تمہاری لفظوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت اس قدر بے مثال ہے کہ میں اس کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرتا ہوں۔"

اس کا مزاج کافی خوشگوار ہو رہا تھا۔ میں نے اخبار دیکھتے ہوئے اس کا پسندیدہ موضوع تلاش کرنا شروع کیا تھا۔

"تمہاری فوٹوگرافی کیسی چل رہی ہے؟"

"زبردست ۔۔۔ میں تمہیں دکھاؤں گا اپنا کام ۔۔۔ تم میرا کیمرہ ورک دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے۔ کیمرے کی آنکھ اس قدر طلسماتی ہوتی ہے کہ انسان اس کے سحر سے نکل نہیں سکتا۔ یہ ایک الگ ہی دنیا ہے' ایک الگ زاویہ ۔۔۔"

اس نے محبت بھری نظروں سے اپنی ساتھ والی نشست کی جانب دیکھا جہاں اس کا کیمرہ پڑا تھا۔ یہ کیمرہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے کیمرے کو بھی شاید اسی شاہی پروٹوکول کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

"مجھے حیران کرنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ مجھے فوٹوگرافی پسند نہیں۔"

"زندگی کی سب اچھی چیزوں کو دشمن بنا رکھا ہے تم نے ۔۔۔ اس میں تمہارا قصور نہیں دوست ۔۔۔! یہ تمہاری کم علمی ہے۔ اکثر کم فہم لوگوں کو فوٹوگرافی ناپسند ہوتی ہے۔"

اس نے کیمرہ ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی اس لیے نہیں کہ اس کی بات مجھے اچھی لگی تھی بلکہ اس لیے کہ مجھے اس نے ثیا کی یاد دلا دی تھی۔ ثیا بھی تو میرے بارے میں یہی رائے رکھتی تھی۔

"فوٹوگرافی کو ناپسند کرنا اگر کم فہمی ہے تو مجھے اپنی اس خوبی پر فخر ہے۔"

میں نے اخبار میں گم ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اپنے کیمرے کے عدسے کو گھما رہا تھا۔

"ہر چیز ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی ۔۔۔ شیر گوشت کھاتا ہے گدھا گھاس کھاتا ہے۔ شیر گھاس نہیں کھا سکتا اور گدھے کو گوشت میں لذت محسوس نہیں ہوتی ۔۔۔ یہ کم علمی' کم فہمی نہیں' یہ بدقسمتی ہے اب اس پر فخر محسوس کرنے مت لگ جانا۔"

وہ کیمرے کو آنکھ سے لگا کر لینس ایڈجسٹ کرنے لگا تھا۔ میں اخبار کے آخری حصے میں پہنچ گیا تھا' جہاں سیاسی تبصرے تھے ۔۔۔ میں چونکہ عوف بن سلمان کے ساتھ باتوں میں بھی مصروف تھا' اس لیے یکسوئی سے پڑھ نہیں پا رہا تھا۔

"یہ فوٹوگرافی ہے یا کچی عمر کی پہلی محبت ۔۔۔ اتنی عقیدت تو محبت میں ہی ہوتی ہے۔"

میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھیلائیں۔

"میرے لیے فوٹوگرافی محبت بھی ہے' عقیدت بھی ۔۔۔ یہ میرا شوق نہیں میرا جنون ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے ۔۔۔ تم لفظوں کے بنے ہو ۔۔۔ لٹریچر کے آدمی ہو۔ آرٹ کیا ہے اور کیا کیا کر سکتا ہے یہ سمجھنے کے لیے تمہیں دو زندگیاں چاہئیں۔"

اس کے ساتھ میری سماعتوں نے کیمرے کی کلک کلک کو بھی سنا۔ مجھے ایک بار پھر ثیا کی یاد آئی۔ مسکراہٹ میرے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ میری زندگی کا یہ ایک ایسا روشن باب تھا کہ جس کا خیال ہی مجھے ہائی وولٹیج بلب بنا دیتا تھا۔

"زندگی تو ایک ہی بہت ہے دوست ۔۔۔! آرٹ سمجھ میں نہیں بھی آیا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا محبت کو میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

میں نے کہتے کہتے نظریں اخبار کی جانب ہی رکھی تھیں۔ اس نے کیمرہ دوبارہ اپنے ساتھ والی نشست پر رکھا پھر بغور مجھے دیکھا۔

"اتنا بڑا دعوا مت کرو ۔۔۔ یہ حرافہ تو ولیوں کی سمجھ میں نہیں آئی ۔۔۔ ہم تم کیا چیز ہیں۔"

وہ شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بن یافع کافی لے کر آ گیا تھا۔ بن یافع مسلمان نیگرو تھا۔ موٹے ہونٹوں اور کرخت ہاتھوں والے اس شخص کو بطور خاص عوف کی وجہ سے ملازم رکھا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ ثیا ہے ۔۔۔" میں نے پرشوق انداز میں ثیا کو دیکھتے ہوئے عوف سے اسے متعارف کروایا تھا۔ وہ بھورے اور سرخ رنگ کے فراک میں ملبوس اپنے سیاہ بالوں کو پشت پر پھیلائے اس وقت بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ میرا دل احساس تفاخر سے بھر گیا۔ یہ تھا میرا وہ قابل فخر حوالہ جس سے میں عوف بن سلمان کو چاروں شانے چت کر سکتا تھا۔ میرے دل میں نجانے کیوں ہمہ وقت یہ خواہش مچلتی رہتی تھی کہ عوف بن سلمان کو شکست سے دوچار کر سکوں۔ میں اعتراف نہیں کرتا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ میں اس سے حسد کرتا تھا۔ ثیا سے ملوانا بھی اسی لیے چاہتا تھا کہ اسے دکھا اور جتا سکوں کہ دیکھو میری گرل فرینڈ کتنی طرح دار ہے۔ میں اور عوف اپنی اپنی بائیسکل پر سوار رائڈ کے لیے جا رہے تھے۔ میں نے پہلے ہی ثیا کو بتا رکھا تھا کہ میں اسے لینے کے لیے آؤں گا اس لیے وہ تیار ہو کر دروازے پر کھڑی تھی۔

"میرے فرینڈز مجھے پیار سے ٹی کہتے ہیں۔" ثیا مسکراتے ہوئے بالکل سامنے آ گئی۔ عوف نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا۔

"حالانکہ انہیں تمہیں کافی کہہ کر بلانا چاہیے۔" وہ بائیسکل سے اترتے ہوئے بولا تھا۔ میں نے اور ٹی نے ایک ساتھ استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔ عوف نے کندھے اچکائے۔

"کامن سینس ۔۔۔ تم ہو ہی اتنی براؤن براؤن' کریمی کریمی سی۔"

میں نے اور ثیا نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ ہم دوبارہ بائیسکل پر سوار ہونے کے بجائے دھیرے دھیرے چلنے لگے تھے۔ ہم فارم ہاؤس سے ذرا دور جانا چاہتے تھے۔ عوف نے کیمرے کو گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ وہ آج کھل کر اس کا استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔

"تمہارے دوست تمہیں "عوف (آف) کی بجائے "آن" کہتے ہیں کیا؟" ثیا بے تکلفی سے بولی تھی۔ میں نے پہلے ہی اسے عوف کے متعلق بتا رکھا تھا۔ عوف نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا پھر بولا۔

"عون (آن) میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔"

"تمہارے بھائی کا نام آن (عون) ہی ہو سکتا تھا۔" ثیا نے بے ساختہ کہا' پھر کندھے اچکا کر بولی۔ "کامن سینس ۔۔۔ آف (عوف) کے بعد آن (عون) ہی ہونا ہے نا ۔۔۔ آف' آن' آ' آن۔" اس نے بائیسکل پر لگے بٹن کو دبا کر پچھلی اور سامنے کی طرف والے چھوٹے بلب کو جلاتے بجھاتے ہوئے وضاحت کی۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔ عوف نے کھل کر مسکراہٹ کا مظاہرہ کیا۔ میرا دل چاہا میں ثیا کو بانہوں میں بھر کر گول گول گھماتے ہوئے تین چار چکر دے ڈالوں۔ وہ خوب صورت اور طرح دار ہی نہیں تھی۔ اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ گفتگو کے فن سے بھی آشنا ہے۔

"بہت خوب ۔۔۔ تو مس "ٹی" اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔ میرا مطلب ہے اپنی ان خوبیوں پر روشنی ڈالیے جن کی بنا پر بلی نے آپ کو اپنا دوست بنایا۔"

عوف نے میری طرف اشارہ کر کے اسے مزید بولنے پر اکسایا۔

"مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے دراصل یہ بلی ہے جس میں بہت سی خوبیاں ہیں اور مجھے فخر ہے اس پر اور اسی لیے میں نے اسے دوست بنایا ہے۔"

اس نے چلتے چلتے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ مجھے لگا اب کی بار میں خود ہی گول گول گھومنے لگا ہوں۔ سیب گرا تو نیوٹن نے قانون بنا ڈالا۔ گلیلیو خود گرا تو ایک نئی دریافت کر ڈالی۔ میں اگر سائنس دان ہوتا تو اس لمحے میں بھی کوئی نئی تھیوری ضرور پیش کر دیتا اور وہ یہ کہ محبت میں کوئی ایسی طاقت ہے کہ یہ آپ کے وزن کو بالکل زیرو کر دیتی ہے اور آپ اتنے ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں کہ روئی کی طرح ہوا میں ادھر ادھر اڑتے پھرتے ہیں۔ ثیا نے اس لمحے مجھے بہت اہم اصول سے متعارف کروا ڈالا تھا۔ میں نے بمشکل خود پر قابو پا کر تشکر بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

"ثیا بہت اچھا رقص کرتی ہے۔"

میں نے محبت بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم چلتے چلتے درختوں کے جھنڈ تک آ گئے تھے۔ عوف نے بنا کوئی تاثر ظاہر کیے گردن ہلائی۔ وہ اپنے کیمرے کو سیدھے رخ سے پکڑ رہا تھا۔

"تم سے مل کر اچھا لگا ثیا!" اس کا انداز رسمی تھا۔ ثیا نے بھی رسمی انداز میں گردن ہلائی۔

عوف درختوں کے سائے میں چھپی کسی نادیدہ چیز کو فوکس کرنے کے لیے رک گیا تھا۔ ثیا چند لمحے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اس نے اکتا کر مجھے دیکھا۔ وہ یقیناً بور ہو رہی تھی۔ اس نے عوف بن سلمان کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے ہاتھ کو تھام لیا تھا اور مجھے اس کا استحقاق بے قابو کرنے لگا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر دائرے میں میرے گرد گھومنے لگی تھی۔ اس نے رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہولے ہولے کسی موسیقی کے بغیر بھی وہ ہوا کی طرح جھوم سکتی تھی، چند لمحوں میں ہی وہ ایک عجیب سماں باندھ چکی تھی، وہ خود گا رہی تھی اور رقص کر رہی تھی۔ عوف جو پہلے اس کی جانب ذرا بھی متوجہ نہیں تھا۔ اب بس اسی کی جانب دیکھنے میں مگن تھا پھر میں نے اس کے کیمرے کو حرکت میں آتے دیکھا۔ وہ ثیا کو اپنے کیمرے میں نہیں اپنے طلسم میں قید کر رہا تھا۔ میں ایک جانب کھڑا دونوں کو دیکھنے لگا تھا۔

حسد اور رقابت کے بارے میں مجھے صحیح طریقے سے اسی دور میں سمجھ میں آیا تھا۔ اس سے پہلے میں گرینی اور اپنی نام نہاد ماں کی محبت کو دوسروں کے ساتھ بانٹ کر استعمال کر چکا تھا۔ لاتعلقی کو میں اپنی ذات پر بہت مرتبہ برت چکا تھا لیکن ثیا کے ساتھ میرا ایسا رشتہ بن چکا تھا کہ اس کا ذرا سا نظر انداز کیا جانا مجھے سخت چبھ رہا تھا۔ وہ دونوں مجھے نظر انداز کر کے گھل مل گئے تھے۔ یہ چیز میرے لیے بہت بے چینی کا باعث تھی۔ مجھے ثیا پر بھروسا تھا، اس کی محبت پر بھروسا تھا لیکن عوف بن سلمان بدنیت انسان تھا۔ اسے ہر چیز بالخصوص اچھی چیز پر دسترس حاصل کرنے کا شوق تھا۔ وہ لڑکیوں کو پھانسنے کا ماہر تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا لڑکیاں اس کے ارد گرد منڈلانے لگتی تھیں۔

اس دن بھی اس نے ثیا کی لاتعداد تصویریں اتاری تھیں اور ثیا بھی اس کی گرم جوشی کا جواب مثبت انداز میں دیتی رہی تھی۔ مجھے افسوس ہوا۔ مجھے ان دونوں کو ملوانا نہیں چاہیے تھا۔ عوف چند دنوں کے لیے تو آیا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں ان دونوں کی ملاقات کرواتا۔ میری چھٹی حس نے الارم بجانا شروع کر دیے تھے۔

"میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" عوف نے مجھے دیکھتے ہی بے تابی سے کہا تھا۔

میں نے سرد نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ صبح سے غائب تھا اور ثیا بھی موجود نہیں تھی۔ میں نے تین چار بار اس کو فون کرنے کی کوشش کی تھی اور ہر بار اس کی کرخت لینڈ لیڈی نے مجھے ڈانٹ کر فون بند کر دیا تھا۔

میرے اعصاب جیسے تھک سے گئے تھے۔ عجیب کشمکش تھی جو ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا میرا

اندازہ درست تھا کہ عوف بن سلمان میری گرل فرینڈ کو شخصیت اور دولت کی چکا چوند سے بہلانے پھسلانے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر شاید وہ اس کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔

"تم آؤ میرے ساتھ۔" اس نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں چپ چاپ اس کے ہمراہ ہو لیا تھا۔ ہم ہال اور پھر بڑے سے کوریڈور سے نکل کر احاطے میں آ گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح باہر کی تمام چھوٹی بڑی غیر ضروری لائٹس آن تھیں۔ فوارہ روشنیوں میں نہایا ہوا تھا اور گرم پانی کی بوچھاڑ مسلسل ہو رہی تھی۔ اس کے قریب گزرنے پر چند بوندیں مجھ پر بھی گریں۔ دل چاہا پانی کو آگ لگا دوں۔ ہر چیز میرا تمسخر اڑاتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم خاموشی سے انیکسی میں آ گئے تھے۔ بن یامین آتشدان میں حرارت بڑھانے کا سامان کر رہا تھا ہمیں دیکھ کر مودب انداز میں کھڑا ہو گیا۔ عوف نے اسے کافی کے لیے کہا اور مجھے اپنے بیڈ روم میں آنے کا اشارہ کیا۔

"میں تمہیں کچھ ایسا دکھانا چاہتا ہوں کہ تم ساکت رہ جاؤ گے۔" اس کا لہجہ پر اصرار تھا۔ میرا دل بالکل ڈوب گیا۔

اس نے سابقہ انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے ایک فائل کھول کر بستر پر کچھ پھیلا کر رکھنا شروع کیا تھا۔ میں نے بغور دیکھا۔ مجھے صورت حال کو ٹھیک سے سمجھنے میں کچھ لمحے لگے تھے۔

"تم آرٹ کو بے کار سمجھتے ہو نا ـــ شاید یہ تمہارے موقف کو بدلنے میں معاون ثابت ہوں۔"

اس نے مطمئن سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ میں بستر کے قریب ہوا، جہاں جا بجا ثیا کی مختلف تصویریں بکھری تھیں۔ تصویروں کا سائز مختلف تھا اور تصویریں بھی کچھ مختلف سی تھیں۔ میں بستر پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک ہی لباس میں ایک ہی جگہ پر کھینچی گئی تصویریں تھیں۔

"یہ دیکھو ـــ سحر خود مسحور دیکھا ہے کبھی ـــ نہیں دیکھا تو یہ تصویریں دیکھو۔"

وہ ایک کے بعد ایک تصویر میرے ہاتھ میں دینے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے تین چار فلمز ایک ساتھ خرچ کر ڈالی تھیں۔ وہ رقص کے دوران لی گئی تصویریں تھیں اور کیا تصویریں تھیں۔ میری نگاہیں جیسے واقعی ان پر جم سی گئی تھیں۔ میں نے ایک تصویر کو پکڑے رکھا اور باقی بستر پر پھیلا دیں۔

ثیا سفید رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھی جو پھڑپھڑاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بازو اور پنڈلیاں اس کے ریشمی ملائم لباس کی طرح نمایاں ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سفید رنگ کیا چھپاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ ثیا کے جسم کا ہر وہ حصہ بھی کسی قدر نمایاں تھا جسے اس سفید رنگ نے بظاہر چھپانے کی کوشش کی تھی۔ قدرت نے ثیا کو جتنی خوب صورتی عطا کی تھی، عوف نے اسے ایک کلک میں قید کر دینے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ ثیا کا چہرہ، اس کا جسم، اس کا ریشمی لباس ہر چیز کیمرے نے اتنے دل موہ لینے والے انداز میں قید کی تھی کہ آنکھیں اپنا زاویہ لمحہ بھر کے لیے بھی بدلنے کو تیار نہیں تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تم میرا کام دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے ـــ میں نے کہا تھا نا کہ کیمرے کی آنکھ طلسماتی ہوتی ہے کہ انسان اس کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔"

عوف کا انداز پرجوش تھا۔

"یہ دیکھو، دیکھو تو سہی، میں نے اسے اتنی مہارت سے قید کیا ہے کہ ہر رنگ نمایاں ہے ـــ ثیا کا، اس کے لباس کا، اس کی آنکھوں کا اور اس کی رقص پر مہارت کا ـــ اس کا چہرہ دیکھو، اس کے تاثرات دیکھو ـــ وہ مسکراتے ہوئے رونے لگی ہے یا روتے روتے مسکرا دی ہے، اس کی آنکھوں میں جو نمی نمایاں ہے ـــ وہ غم کے آنسوؤں کی ہے یا خوشی کے آنسوؤں کی ـــ کیمرہ ورک میرے دوست ـــ کیمرہ ورک۔"

وہ بے پناہ خوش تھا۔ میرے ہاتھوں میں اس کی تھمائی ہوئی تصویریں لرزنے لگی تھیں۔ ثیا کہیں سے بھی ثیا نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کوئی دیوی تھی۔ اس لباس میں نجانے کیا تھا کہ ثیا ملبوس ہونے کے باوجود

بے لباس محسوس ہوتی تھی۔ سفید گاؤن نے کیا کیا واضح کر دیا تھا۔ میں نے سینے میں قید اپنی سانس کو بہت ہمت سے آزاد کیا تھا۔ مجھ پر ایک طلسم طاری ہو رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ثیا ان تصویروں میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ثیا کا یہ روپ میں نے کئی بار اپنے خوابوں میں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کے مسکراتے تاثرات، بند آنکھوں کے ساتھ میں نے لاتعداد بار دیکھے تھے۔ عوف کا کیمرہ کیا جادو کر چکا تھا۔ وہ میرے خواب کو مجسم میرے سامنے پیش کر رہا تھا۔

"ثیا بہت باکمال اور منفرد ہے۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ عوف نے میرے ہاتھ سے تصویریں پکڑ لیں اور انہیں بستر پر ترتیب سے پھیلا کر رکھنے لگا تھا۔

"ثیا باکمال یا منفرد نہیں ہے ــــ اسے جس آرٹ فارم پر مہارت حاصل ہے نا۔ وہ یقیناً "باکمال اور منفرد ہے۔ رقص میں اس کا کوئی ثانی نہیں ــــ وہ ایسے رقص کرتی ہے جیسے وہ انسان نہ ہو، ہوا ہو، پانی ہو۔ میں نے ثیا کو نہیں اس ہوا کو، اس لہر کو کیمرے میں محفوظ کیا ہے۔ میں نے ثیا کے رقص کے جنون کو اس کیمرے میں محفوظ کر لیا ہے۔ کیا کوئی اور ایسا کر سکتا تھا ــــ میں بہت خوش ہوں میرے دوست، میں نے ایک نئی چیز کر دکھائی ہے ــــ یہ معجزہ ہے معجزہ ــــ آرٹ وِد اِن دا آرٹ ــــ شعلے کے اندر شعلہ بھڑک رہا ہے، میرے ہنر نے ثیا کے ہنر سے مل کر کیا تخلیق کر ڈالا ہے۔ میرا جنون اس کے جنون سے باہم مل گیا ہے اور نتیجتاً "یہ تصویریں تمہارے سامنے ہیں۔ یہ کسی بھی انسان کے ہوش اڑا سکتی ہیں۔"

اس نے ایک تیسری تصویر، تصویروں کے پلندے سے نکال کر مجھے پکڑا دی تھی۔ وہی ثیا، وہی بے لباسی کا موجب لباس، وہی قاتلانہ آنکھیں اور وہی کپکپی طاری کرتا اس کا جسم، چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ۔ میں نے تصویر سے نظریں ہٹا کر لمحہ بھر کے لیے عوف کو دیکھا۔ وہ ابھی بھی تصویروں کو ترتیب سے بستر پر رکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی سحر کے اثر میں محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔ کیا جو میری کیفیت تھی، وہی کیفیت عوف پر بھی طاری تھی۔ میں نے بددل ہو کر وہ تصویریں بیڈ پر رکھ دیں۔ کچھ ایسا تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

"مجھے امید ہے کہ تم اب یہ کہنے کے قابل نہیں ہو کہ تمہیں آرٹ میں دلچسپی نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آرٹ کا طلسم ہوتا کیا ہے ــــ یہ صرف آرٹ نہیں ہے یہ "سائنس" ہے جادو ہے، کرشمہ ہے ــــ مٹی سے گندھا جسم بیک وقت آگ، پانی اور ہوا بن جاتا ہے اور میرا ہنر ان چاروں حالتوں کو ایک ساتھ قید کر لیتا ہے ــــ کمال ہے یار ــــ کمال ہے۔"

وہ تصویروں کو دیکھ دیکھ کر قربان ہوا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کی آنکھیں نوچ لوں، جو چندھیائی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس دوران بن یافع دستک دے کر اندر چلا آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کی ٹرے تھی۔ اس نے دبے پاؤں آگے آ کر ٹرے میرے آگے کر دی تھی۔ میں نے مگ اٹھایا۔ وہ میری طرف سے ہو کر بیڈ کے دوسری جانب گیا تھا اور اس نے عوف کی جانب ٹرے کی تھی تاکہ وہ اپنا مگ اٹھا سکے۔ مجھے یہ سوچ کر برا لگا کہ وہ بھی ثیا کی تصویروں کو دیکھے گا۔ میری نظروں کا محور بن یافع تھا۔ اس نے اپنا ٹرے والا ہاتھ عوف کے آگے سے ایک انچ بھی نہیں سرکایا تھا، جب تک اس نے اپنا مگ اٹھا نہیں لیا۔ وہ چونکہ تصویروں میں مگن تھا اس لیے میری نسبت اس نے مگ اٹھانے میں کچھ دیر کر دی تھی۔ بن یافع نے صرف ایک بار بستر پر رکھی تصویروں کو دیکھا پھر میں نے اس کی آنکھوں کو پھیلتے دیکھا۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ میں نے بن یافع کی آنکھوں میں پہلے تحیر پھر ناپسندیدگی اور آخر میں تاسف کو ابھرتے دیکھا۔ ایک نظر ڈالنے پر اس کی آنکھیں تین طرح کے تاثرات سے دوچار ہوئی تھیں اور ان میں سے کوئی بھی وہ نہیں تھا جو میرے یا عوف کی آنکھوں میں ان تصویروں کو دیکھ کر ابھرا تھا۔ اسی ایک لمحے میں نے بن یافع کو کچھ بڑبڑاتے دیکھا۔ وہ خالی

ٹرے کو لے کر واپس چلا گیا تھا جبکہ میں خود خالی سا ہو کر وہیں بیٹھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہ کیا کہا ــــ کیا کرنا چاہتی ہو تم اپنی تصویروں کے ساتھ؟" میں نے کچھ ہکا بکا سا ہو کر پوچھا تھا۔ وہ اپنے مخصوص دل ربا انداز میں مسکرائی۔

"تم بس دیکھتے جاؤ اور سر دھنتے جاؤ ــــ مجھے اپنی صلاحیتوں کو۔ اپنے آپ کو منوانے کا طریقہ سمجھ میں آ گیا ہے۔"

اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ میں جیسے پگھل کر بہنے لگا۔ وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو اس کے معاملے میں جتنا سمجھاتا تھا اتنا ہی بے بس پاتا تھا۔ میں خود کو نصیحتیں کر کر کے بھی تھک گیا تھا۔ وہ میری گرل فرینڈ تھی، میری جاگیر نہیں تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس کے معاملے میں میرا احساس ملکیت بے حد توانا اور طاقت ور تھا۔ میں نے کبھی اپنی جاگیر پر بھی کہ اپنی ماں پر بھی کبھی حق نہیں جتایا تھا، لیکن ثیا میں کچھ ایسی بات تھی کہ اسے کہیں حفاظت سے اپنی تحویل میں رکھوں، جبکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آزاد فضاؤں کا پرندہ تھی۔ اسے بلندی عزیز تر تھی۔ اسے محدود ہو جانے کا مشورہ دینے کا مطلب تھا اس کی خفگی کو ہوا دینا جس سے میرا دل بہت ڈرتا تھا، مگر وہ جو کرنے والی تھی اسے سوچ کر بھی دل کو اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"ان تصویروں کو کسی مقابلے میں بھیجنے کی کیا ضرورت ہے ــــ میرا مطلب ہے۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ دی۔

"کیوں ــــ یہ اتنی اچھی ہیں ــــ اتنی دل فریب ــــ کوئی ایک نظر دیکھ لے تو پلک جھپکنے کے لیے ترسے ــــ کیا تم نے کبھی کسی عورت کو مجسم ہوا دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے میں بغیر پروں کے ہوا میں اڑ رہی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ میں اچھی رقاصہ ہوں مگر عوف بن سلمان نے ثابت کیا، میں بہت اچھی، بہترین رقاصہ ہوں۔ میں اپنے اس ہنر کو دنیا کے سامنے لانا چاہتی ہوں۔"

اس کے انداز میں رعونت کے ساتھ ساتھ مستقل مزاجی بھی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آیا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ یہ تصویریں کس قسم کی تھیں۔ وہ ان میں بالکل بے لباس لگتی تھی اور وہ اس کو اپنا ہنر سمجھتی تھی۔ وہ اور عوف ان تصویروں کو ایک جوائنٹ وینچر کے طور پر فرانس میں ہونے والے کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ یہ مقابلہ مظاہر قدرت کو اس کی اصل حالت میں قید کرنے کے عنوان کے تحت منعقد کیا جا رہا تھا اور ان دونوں کا خیال تھا کہ یہ تصویریں سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے مقابلے میں صف اول پر آجائیں گی۔ انہوں نے اس مقابلے کے لیے عنوان بھی سوچ لیا تھا اور وہ مجھے اب بتا رہی تھی۔

میں ایک رات پہلے بہت دیر تک گرم پانی کے پول میں سوئمنگ کرتا رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا کہ ثیا اور عوف کے درمیان کوئی کھچڑی نہیں پک رہی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے دوست بھی نہیں ہیں اور مجھے اس سلسلے میں کسی قسم کے عدم تحفظ کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوئمنگ ہمیشہ میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوتی تھی اور مجھے اس سے بہت ذہنی سکون ملتا تھا، لیکن ثیا نے اب ایک اور کچوکا لگا دیا تھا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنی تصویروں کے ساتھ جو مرضی کرے لیکن پتا نہیں دل کا کون سا حصہ تھا جو تڑپ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ثیا کو روکا جائے۔

"مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔" بالآخر میں نے کہہ دیا۔ اس نے میرا چہرہ دیکھا پھر ناک چڑھائی۔

"مجھے پتا ہے تم جیسے بورنگ انسان کو ہر وہ چیز بری لگتی ہے جس میں مزہ ہو، لطف ہو، گرم جوشی ہو تم انسان نہیں ہو، سادھو ہو۔" اس کے لہجے میں اعتدال تھا۔ اس کا مطلب تھا اسے میری بات بری نہیں لگی تھی۔

"تم کچھ بھی کہو ــــ میں برا نہیں مانوں گا ــــ لیکن

میں تمہیں ان تصویروں کو کسی مقابلے میں بھیجنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔" میں نے محبت اور مان بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اس نے یک دم میری جانب رخ کیا اور میں نے اس کے چہرے کو رنگ بدلتے دیکھا۔ تحیر اور تمسخر باہم متماثل تھے۔

"اوہ بدھو..... میرے ڈیڈی بننے کی کوشش مت کرو..... میں نے تم سے کب اجازت مانگی ہے۔"

میں نے اس کی بات پر دکھی ہونے کے باوجود یہی تاثر دیا کہ میں دکھی نہیں ہوا۔ میں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"تم میری گرل فرینڈ ہو..... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں بھی تمہارا برا چاہ سکتا ہوں..... بتاؤ۔"

میں نے بات کی ابتدا کی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم میرے اچھے دوست ہو..... دوست بن کر رہو..... میرے باپ مت بنو اور تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی اپنے باپ کی بھی پروا نہیں کی۔ محبت کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مالک بن جاؤ۔ مجھ پر اپنی مرضی مسلط کرو۔ میری زندگی پر صرف ایک انسان کی مرضی چل سکتی ہے اور وہ میں خود ہوں۔ تم دوستی کے دائرے سے تجاوز کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ بھڑک کر بولی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا بھی نہیں تھا کیونکہ میری نگاہ سامنے دروازے پر پڑ چکی تھی جہاں عوف کھڑا تھا۔ وہ شاید کچھ لمحے پہلے ہی آیا تھا۔ اس نے یقیناً" میری اور ثیا کی باتیں سن لی تھیں۔ میرے ماتھے پر تیوریاں نمایاں ہونے لگیں۔

"اتنا بھڑکنے کی کیا ضرورت ہے..... کیا بحیثیت بوائے فرینڈ میں تمہیں تمہارا اچھا برا بھی نہیں سمجھا سکتا۔"

میں نے اس سے کہا تھا اور کھا جانے والی نظروں سے عوف کی جانب دیکھا تھا۔ یہ سارا اسی کا کیا دھرا تھا۔

"بوائے فرینڈ؟" ثیا نے دہرایا اور میری جانب مڑی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ ایسا تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔

"بوائے فرینڈ' بوائے فرینڈ کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ میں نے تم سے کب کہا کہ تم میرے بوائے فرینڈ ہو۔"

وہ غرا کر بولی تھی۔ مجھے مزید دھچکا لگا۔ وہ دروازے میں ایستادہ عوف کو دیکھ چکی تھی۔

"مجھے معاف کیجئے گا..... میں مخل ہوا' میں پھر آجاؤں گا۔"

عوف نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے فوراً" معذرت کی۔ اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ اور اداکاری کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میرے سینے سے دبی دبی سانس خارج ہوئی۔ ثیا کے بدلے اور اکھڑے رویہ کا ذمہ دار یہی شخص تھا۔

"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... یہاں کچھ ایسا نہیں چل رہا کہ تم شرمندگی محسوس کرو بلکہ تمہاری مداخلت اور معاونت اچھی رہے گی..... تم یہاں آؤ اور اپنے دوست کو سمجھاؤ..... اسے کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔"

ثیا کے انداز میں اس کے لیے ملائمت جبکہ میرے لیے بے پناہ اکتاہٹ تھی۔ میں نے پلکوں کو تین چار بار جھپکا۔ میں ایسا نہ کرتا تو میرے گال بھیگنے لگتے۔

"ثیا! میری بات سنو' ایسے مت کہو۔ تم ناراض مت ہو' تمہیں اگر میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں..... تم وہی کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے مگر پلیز' تم مجھ سے ناراض مت ہو۔ اوکے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ فوراً" مجھ سے چھڑا لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ اکتائی ہوئے لگنے لگی تھی۔

"بچوں کی طرح بی ہیو مت کرو احمق.....! مجھے تمہاری اسی بات سے چڑ ہوتی ہے..... تم اب نکل آؤ اپنے ڈزنی ورلڈ سے..... بڑوں کی طرح سوچنا سمجھنا

شروع کرو۔ میرے اور تمہارے درمیان کوئی کورٹ شپ نہیں چل رہی کہ تم مجھے ایسے عاشقوں کی طرح رو رو کر دکھاؤ۔ ہم اچھے دوست ہیں..... میں تمہاری دوستی کی قدر کرتی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہاری ہر حماقت میں حصہ دار بن جاؤں۔ تم ایک بات اپنے ذہن میں بٹھالو..... میں تمہاری گرل فرینڈ نہیں ہوں..... سمجھے تم....."

اس کے خشک انداز نے میری آنکھوں کی نمی میں اضافہ کر دیا۔ اب کی بار میں اپنے گالوں کو بھیگنے سے بچا نہیں پایا تھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں ثیا.....! بہت محبت کرتا ہوں۔ میری محبت کو اس طرح ٹھکراؤ مت۔ مجھے پتا ہے تمہیں اس شخص نے ورغلایا ہے..... تم اس کی باتوں میں آکر مجھے دھتکار رہی ہو نا۔" میں اب باقاعدہ رونے لگا تھا۔ دھندلی آنکھوں سے دیکھنے پر بھی پتا چل رہا تھا کہ عوف جا چکا ہے' لیکن پھر بھی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

"یہ..... یہ بہت گھٹیا انسان ہے ثیا..... یہ تمہیں مجھ سے متنفر کر رہا ہے..... مجھے پہلے ہی اس پر شک تھا..... چھچھورا شخص ہے یہ....."

اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ناگواری سے مجھے دیکھا۔

"تمہیں صرف غلط فہمی ہی نہیں ہے' تمہیں یقیناً" کوئی نفسیاتی بیماری بھی ہے۔ کوئی عارضہ بھی لاحق ہے تمہیں۔ تم اپنا علاج کرواؤ۔ پاگل ہو تم..... میں نے چند دن ہنس کر تم سے بات کیا کرلی' تم اپنے آپے سے باہر ہوگئے..... تم نے سب کچھ خود ہی فرض کرلیا..... غور سے میری بات سنو..... میرے دل میں تمہارے لیے ایسے کوئی محسوسات نہیں ہیں..... ارے یار.....! ہو بھی کیسے سکتے ہیں۔ تم اپنی جانب دیکھو..... اپنی اوقات دیکھو..... اپنی شکل..... اپنے طور طریقے..... تم ابھی بھی اس قابل نہیں ہو کہ کوئی جوان اور خوب صورت لڑکی تمہیں اپنا بوائے فرینڈ کہہ سکے۔ میں تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے زمین سے اگنا سکھا رہی تھی' اور تم..... تم اس بات کا انتقام لینا چاہتے ہو مجھ سے یا مجھے سزا دینے کا ارادہ ہے۔"

وہ بولتی چلی جا رہی تھی اور میں گنگ ہوگیا تھا۔ مجھے مناسب الفاظ ہی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ وہ مجھ سے اس قدر متنفر ہوگئی تھی کہ میری محبت کو میری غلط فہمی کہہ رہی تھی۔

"ثیا.....! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ بہت زیادہ۔ میں تمہاری خاطر کچھ بھی کرنے مرنے کو تیار ہوں ثیا..... ایسے مت کرو ثیا۔"

میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کی تھیں۔ ثیا کے چہرے کے تاثرات بے حد سرد تھے۔ لیکن میرا دل اس کی سرد مہری سے خائف نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ثیا کو عوف نے بہکا دیا ہے۔

"چپ کرو بے وقوف انسان..... کیسے بچوں کی طرح رو رہے ہو' تمہارا رویہ مجھے مزید غصہ دلا رہا ہے۔ تم ابھی جاؤ یہاں سے..... تمہارا دماغ ٹھکانے آجائے تو واپس آجانا..... میں تمہیں ساری صورت حال دوبارہ سے سمجھا دوں گی۔" وہ بے انتہا تپ کر بولی تھی اور میں لاچار کھڑا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ سب میری وجہ سے نہیں ہوا..... میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں نے اسے ورغلایا ہے نہ کبھی پھانسنے کی کوشش کی ہے۔ میں ایسا کروں گا ہی کیوں؟ یہ میرا معیار نہیں ہے۔ تمہیں سن کر حیرانی ہوگی اور شاید برا بھی لگے کہ مجھے وہ لڑکی اچھی ہی نہیں لگتی' ذرا سی بھی نہیں' وہ خود پسند اور بناوٹی بھی ہے۔ اسے جھوٹ بولنے کی عادت ہے اور وہ اپنے مفاد کی خاطر انسانوں کو ٹرمپ کارڈ کی طرح استعمال کرتی ہے۔"

عوف نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے سپاٹ انداز میں کہا تھا۔ اس نے میرا ہر الزام مسترد کر دیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کا سر پھاڑ دوں یا گلا دبا ڈالوں۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ یہاں سے دفع ہو جائے لیکن وہ پہلے سے ہی اپنی چیزیں اکٹھی کر رہا تھا۔ مجھے اپنے کمرے

میں آتا دیکھ کر اس نے بن یافع کو وہاں سے باہر بھیج دیا تھا۔

"تم چوبیس چوبیس گھنٹے اس کی تصویریں بناتے ہوئے گزارتے ہو' اس کے ساتھ فرانس جانے کی تیاری کرتے ہو اور پھر کہتے ہو' وہ مجھے اچھی نہیں لگتی ..... جھوٹے ..... بہت جھوٹے ہو تم۔" میں نے غرا کر کہا۔ میرا گلا روتے رہنے کے باعث پہلے ہی کافی تکلیف میں تھا۔ وہ میری جانب مڑا۔ اس کے ہاتھ میں فوٹو البم تھا جسے اس نے بیڈ پر پھینک دیا۔ پہلی بار وہ برہم محسوس ہوا۔

"میں جھوٹا نہیں ہوں ..... ایک بات اپنے ذہن میں بٹھالو ..... میں جس خطے سے تعلق رکھتا ہوں' وہاں جھوٹ بولنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اگر وہ لڑکی اچھی لگتی تو میں کہہ دیتا لیکن اگر میں کہہ رہا ہوں کہ وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تو تم بھی مان لو کہ میں سچ کہہ رہا ہوں میں اس کے ساتھ وقت گزارتا ہوں نہ اس کے ساتھ کوئی منصوبہ بندی کی ہے۔ میری دلچسپی اس کی ایک صلاحیت میں ہے جو قدرت نے اسے عطا کی ہے۔ میرے دوست! میں اس کا نہیں اس کے ہنر کا دل دادہ ہوں۔ ایک آرٹسٹ ہونے کی بنا پر میں صرف اس کے آرٹ کا قدر دان ہوں۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ مجھے اس کی بے تکی وضاحت پر مزید غصہ آیا۔

"مجھے تمہاری اس تھیوری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے اس بات سے بھی غرض نہیں کہ تم سچ بولتے ہو یا جھوٹ ..... ایک بات میں بہت اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ تم ایک بدنیت انسان ہو۔ اپنی بدنیتی کو آرٹ کا لبادہ پہن اوڑھ کر چھپانے کی کوشش مت کرو۔"

اپنی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے اس کے چہرے کے رنگوں کو بدلتے دیکھا۔ وہ بہت غصے میں آچکا تھا۔ اس کی آنکھیں آگ اگلتی محسوس ہونے لگیں۔

"تمہیں آرٹ کی سمجھ ہے نہ ہی تم اس کا احترام کر سکتے ہو ..... میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم جیسوں کو آرٹ کو سمجھنے کے لیے دو زندگیاں چاہیے ہوتی ہیں۔ تمہیں تو دو بھی ناکافی ہوں گی ..... تم میرے جذبات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میں ذہنی طور پر اتنا سستا نہیں ہوں کہ کوئی بھی بھوری لڑکی مجھے بدنیتی پر مجبور کر دے۔ میں نے اس کی جانب جب بھی غور سے دیکھا۔ کیمرے کی نظر سے دیکھا۔ مجھے جب بھی اس کی شخصیت میں کشش محسوس ہوئی' کیمرے کی وجہ سے ہوئی۔ کیمرہ وہ پل ہے جو ہمیشہ میرے اور اس کے درمیان رہا لیکن تم کہاں سمجھو گے۔ اس ایک لڑکی نے تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ میرے لیے وہ ایک اوبجیکٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ میں ایک جھینگر کی تصویر بناتا ہوں تب بھی ایسے ہی خوش ہوتا ہوں جیسے اس لڑکی کی تصویر کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ مجھے تمہاری باتوں سے بہت تکلیف پہنچی ہے۔ تم میرے بارے میں ایسے الفاظ استعمال بھی کیسے کر سکتے ہو۔"

وہ واقعی یک دم رنجیدہ سا لگنے لگا۔ میں اس کی بات سن کر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے ابھی بھی اپنے ٹوٹے دل کا ذمہ دار لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' دروازہ یکدم کھلا تھا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

"تم جا رہے ہو؟" اندر آنے والی شخصیت نے مجھے بالکل نظر انداز کر کے اس سے پوچھا تھا۔ عوف بن سلمان نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مجھے دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

"کیوں ..... کیوں جا رہے ہو تم ..... تم نے رات کہا تھا کہ تم مزید ایک ہفتہ ٹھہر جاؤ گے ..... مت جاؤ ابھی ..... میں نے تمہارے لیے کچھ اچھی چیزیں پلان کی ہیں ..... بہت مزہ آئے گا ..... مت جاؤ میری جان۔"

کہنے والے کے انداز میں لجاجت تھی اور مان بھرا اصرار بھی۔ میری آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

وہ میری ماں تھی۔ اس کے انداز میں عوف کے لیے کچھ ایسا تھا کہ میرے زمین آسمان ہل گئے تھے۔ مجھے لگا میں کھڑا کھڑا زمیں بوس ہو گیا ہوں۔ مجھے لگا میں مر گیا ہوں۔

☼ ☼ ☼

"شہروز سے بات ہوئی؟"

ممی کے سوال پر اس کا دل چاہا' اپنا سر دیوار میں دے مارے۔ وہ جانتی تھیں کہ شہروز کراچی گیا ہوا ہے اور اس کی کالز لے رہا ہے نہ میسجز کا جواب دے رہا ہے' لیکن پھر بھی وہ پاپا کے سامنے اس سے شہروز کے متعلق استفسار کر کے کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھیں۔ پاپا اس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگے تھے۔ اسے بے پناہ کوفت ہوئی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے ان کی خیریت دریافت کی تھی۔

ان کی طبیعت گزشتہ رات سے کچھ خراب تھی۔ انہوں نے سر ہلایا۔ وہ بولنے کے معاملے میں کافی کفایت شعار تھے جہاں "جملے" کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہاں وہ لفظ اور جہاں لفظ چاہیے ہوتا تھا وہاں وہ فقط اشاروں سے کام لے کر بات سمجھا دیا کرتے تھے؟ وہ بہتر محسوس کر رہے تھے' اس لیے انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی تھی' ٹھیک محسوس نہ کر رہے ہوتے تو چپ رہ کر بتا دیتے کہ ابھی بھی بہتر نہیں ہیں۔

"الحمد للہ ..... صدیقی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی آج' آپ کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے بتایا حالانکہ وہ کافی الجھ گئی تھی۔ وہ فی الفور ان کی توجہ شہروز کے موضوع سے ہٹانا چاہتی تھی۔ انہیں ذیابیطس تھی اور وہ عارضہ قلب میں بھی مبتلا تھے۔ گزشتہ کچھ عرصہ سے انہیں آرتھرائٹس کی تکلیف بھی ہو گئی تھی حالانکہ وہ خود ایک اچھے پیڈیاٹریشن تھے لیکن ذیابیطس نے ان کو بڑا وہمی اور زود رنج قسم کا بنا دیا تھا۔ وہ کچھ مہینوں سے اس بات پر بضد رہنے لگے تھے' ان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے اور یہ کہ ان کے پاس وقت کم ہے اور اب شہروز اور زارا کی شادی ہو جانا چاہیے۔ یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں تھا کہ اس پر بحث چھڑتی۔ زارا ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی شادی کی عمر بھی ہو چلی تھی۔

دوسری جانب شہروز بھی گھر کا آخری بیاہنے والا فرد رہ گیا تھا۔ اس کے ماں باپ کے علاوہ اس کے بھائی بھابھیاں بھی بے چینی سے گھر کی اس آخری شادی کے منتظر تھے' مگر شہروز ذاتی طور پر ابھی مزید ایک ڈیڑھ سال شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا تھا۔ ایک اچھا صحافی بننا اس کا خواب تھا اور اس خواب کی تکمیل کے لیے وہ بہت پُرجوش تھا۔ اس نے انٹرن شپ کے بعد اسی اخبار کو جوائن کیا تھا جہاں سے انٹرن شپ کی تھی اور جلد ہی اسی اخبار کے چینل میں ملازمت مل جانا اس کے لیے بہت معنی رکھتا تھا۔ اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔

زارا کے منہ سے شادی کی بات سنتے ہی وہ اس بات پر اصرار کرنے لگا تھا کہ زارا پھپھو کو تب تک اس کے ڈیڈی سے بات کرنے سے روک کر رکھے' جب تک کہ وہ اسے گرین سگنل نہیں دے دیتا۔

یہ بات زارا نے ممی کو تو بتا دی تھی مگر پاپا کو بتانے کی اس میں ہمت تھی نہ اس کی ممی میں جبکہ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ٹال مٹول شاید زارا کی جانب سے ہو رہی ہے اور یہ بات ان کے لیے کہیں نہ کہیں پریشانی کا باعث بن رہی تھی' اسی ایک موضوع کی ٹال مٹول زارا کی ذہنی پریشانی میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ اسی لیے زارا کوشش کرتی تھی کہ ان کے سامنے شہروز کا ذکر کم سے کم ہو۔ شہروز نے جب سے نیوز چینل جوائن کیا تھا' وہ ویسے ہی ان کی گڈ بک میں نہیں رہا تھا۔ انہیں اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ چینل کی وجہ سے وہ زیادہ کراچی میں رہے گا تو فیملی کو کہاں رکھے گا۔ زارا ان کی اکلوتی بیٹی تھی وہ اسے شادی کے بعد اپنے قریب لاہور میں ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنا کیریر بنانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے بہتر ہوتا کہ خاندانی بزنس جوائن کرتا۔

وہ اس قدر وہمی ہو چکے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ

شہروز کے گھر والے بھی اسی لیے اس کا ساتھ دے رہے ہیں کہ اس کے بھائی چاہتے ہیں' وہ خاندانی بزنس سے دور رہے۔ یہ وہ خدشات اور اعتراضات تھے جو وہ گاہے بگاہے کرنے لگے تھے' اسی لیے زارا ان کے سامنے شہروز کا ذکر سن کر جزبز ہو رہی تھی۔ اس وقت تو زارا می پاپا کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی مگر رات کے کھانے پر پھر یہی مسئلہ زیر بحث آ گیا تھا۔

"زارا! میں اب مزید تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تمہارے پاپا کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں تمہیں فوراً" سے پیش تر منور بھائی سے شادی کی بات کروں۔ وہ پہلے ہی مشکوک ہو رہے ہیں کہ میں اس قدر ٹال مٹول کیوں کر رہی ہوں۔ میں اور — منور بھائی دونوں تمہارے اور شہروز کی وجہ سے تمہارے پاپا کی نظر میں برے بن رہے ہیں۔"

می نے اپنی پلیٹ میں ——— پلاؤ میں موجود چکن کے قتلے کو کانٹے کی مدد سے سامنے کیا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات نے زارا کو سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے چکن کے قتلے کو نہیں اس کی ذات کو اپنے سامنے کر لیا ہے۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"می! وہ کراچی گیا ہوا ہے۔ کچھ دن میں واپس آئے گا تو بات کروں گی اس سے۔"

اس نے ان کی جانب دیکھے بنا چاول والی ڈش اپنی جانب سرکائی تھی۔ وہ بہت شوق سے کھانے کی میز پر آئی تھی۔ چاول دیکھ کر بھوک بھی دوبالا ہو گئی تھی مگر می کے ایک سوال نے اس کا موڈ خراب سا کر دیا تھا۔ اس کا پروفیشن اس قسم کا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بہت تھک جاتی تھی۔ ہاسپٹل کے کتنے مسائل تھے۔ دوسرے پروفیشنز کی طرح میڈیکل کے پروفیشن کی بھی اپنی ہی ایک کھچ کھچ تھی۔ کولیگز میں کھینچا تانی' سینئرز کی ڈانٹ ڈپٹ پھر مریضوں کے ساتھ سارا دن کی سرکھپائی' وہ کون سا سارا دن جھولا جھول کر گھر واپس آتی تھی۔ اس کی اپنی کتنی بے شمار الجھنیں تھیں جبکہ اس کے مسائل کو کبھی کسی نے مسائل سمجھا ہی نہیں تھا۔ وہ جب بھی اپنا کوئی مسئلہ زیر بحث لانا چاہتی تھی یا اپنے کسی ایشو کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی تو اسے جذباتیت اور حساسیت کہہ کر نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔

بعض اوقات وہ اس قدر الجھ جاتی کہ وہ اپنے مسائل کے بارے میں کس سے بات کرے' اپنے ذہنی خلجان کو کس کے ساتھ بانٹے۔ اس کی زندگی میں دوست احباب تھے ہی کہاں۔ اس نے بہن بھائیوں دوستوں سہیلیوں کے روپ میں ہمیشہ کزنز ہی دیکھے تھے۔ اس کے اکلوتے پن نے اس کے والدین کو اس کے بارے میں بے حد حساس بنا دیا۔ می کو ہمیشہ یہ ہی وہم رہتا تھا کہ وہ اپنی معصومیت میں دوستوں کے ہاتھوں بے وقوف نہ بن جائے سو اس کے دوستوں کے متعلق وہ اپنی احتیاط برتتی رہی تھیں کہ اگر اس کے دوست بن بھی جائے تو می کی وہمی طبیعت کے باعث خائف ہو کر خود ہی راستے سے ہٹ جاتے۔ وہ اسے کزنز کے ساتھ مصروف دیکھ کر مطمئن رہتی تھیں پھر جب سے اس کی اور شہروز کی انگیجمنٹ ہوئی تھی' اسے خود ہی دوستوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ منگنی سے پہلے بھی وہ اپنے اسکول کے' پڑھائی کے مسئلے اسی سے ڈسکس کرتی تھی پھر منگنی کے بعد تو جیسے رہ ہی شہروز گیا تھا۔

اسے کوئی دوسرا نظر آتا تھا نہ اسے کبھی ضرورت محسوس ہوئی تھی لیکن اب جب شہروز اس درجہ مصروف ہو گیا تھا تو اسے کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ اس کی زندگی میں بہن بھائی کی کمی تو تھی ہی دوست نہ بنا کر اس نے اس کمی کو مزید بڑھا لیا تھا اور بالخصوص اب جب وہ اپنے والدین اور شہروز کے درمیان پنگ پانگ بنی ہوئی تھی تو اسے یہ کمی زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ می کو آج کل اس کو دیکھتے ہی شہروز کی یاد آ جاتی تھی جبکہ شہروز کے پاس اب وقت ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اس کو آمادہ کر پا رہی تھی نہ می کو مطمئن اور خود تو وہ بے چین تھی ہی جس کا کسی کو احساس ہی نہیں تھا۔

"یہ بات تو تم گزشتہ کئی دن سے کہہ رہی ہو' آخر تم

اس سے صاف بات کیوں نہیں کرتیں۔"

"می! آپ —" زارا نے زچ ہو کر ان کی جانب دیکھا تھا۔

وہ اسے اطمینان سے کھانا بھی نہیں کھانے دینا چاہتی تھیں۔ اس نے پلیٹ میں چاول نکالنے کے لیے وہ چمچ جو ہاتھ میں پکڑا تھا' اٹھا کر دوبارہ ڈش میں رکھ دیا۔

"آپ سب کچھ جانتی تو ہیں پھر کیوں ایک ہی بات بار بار پوچھتی ہیں۔"

اس نے اپنی اکتاہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے انہیں مطمئن کرنا چاہا تھا۔

"زارا! مجھے صاف صاف بتاؤ۔ سب ٹھیک ہے نا — تم دونوں کا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا' اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھے کھل کر بتاؤ۔ میں روز روز تمہارے پاپا کے سامنے بہانے نہیں بنا سکتی۔" وہ مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔

"می! اب ایسی بھی جھگڑالو نہیں ہوں میں' پہلے میرے اور شہروز کے کون سے جھگڑے ہوتے رہے ہیں کہ اب جھگڑے کی نوبت آئی ہو گی۔ وہ واقعی مصروف ہے اور میری کالز نہیں لے رہا۔" اس نے اپنی جانب سے بے حد تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

"تم کس قدر صلح جو ہو اور شہروز کس قدر مصروف ہے' یہ دونوں باتیں مجھے مت بتاؤ تم' میں تمہاری ماں ہوں تم جو کتابیں اب پڑھ رہی ہو نا' یہ میں تم سے کافی عرصہ پہلے پڑھ چکی ہوں۔ میں ضرب المثل اور محاوروں سے مطمئن ہونے والی انسان نہیں ہوں۔ میں نے آج روبینہ بھابھی سے بات کی تھی۔ وہ تو کہہ رہی تھیں شہروز پرسوں رات واپس آ گیا ہے۔"

می نے طنزیہ انداز میں کہا۔ زارا نے حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ واقعی نہیں جانتی تھی کہ شہروز واپس آ چکا ہے۔ اس نے صبح سے کئی بار کال کی تھی مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ زارا کا خیال تھا کہ وہ کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا ہوا ہے تو یقیناً" اسی کی مصروفیت میں کال نہیں ریسیو کر رہا۔

"شہروز واپس آ چکا ہے کیا؟ آر یو شیور می؟" اسے یقین نہیں آیا تھا اور دوسری جانب می کا بھی یہی حال تھا۔

"اب تم کہہ دو' تمہیں یہ بات نہیں پتا تھی۔" ان کے لہجے میں اب کی بار طنز ہی نہیں بے یقینی اور خفگی بھی تھی۔

"می! واقعی یہی بات ہے — مجھے نہیں پتا تھا قسم سے۔" اسے اب رونا آنے ہی والا تھا۔ می نے اس کی بات کاٹ دی۔

"زارا! خدا کے لیے جھوٹ بولنا بند کر دو اور مجھے صاف صاف بتا دو اگر تم دونوں کے درمیان کوئی ایشو چل رہا ہے تو —"

"می! میری بات سے آپ کو تسلی نہیں ہو رہی تو آپ خود شہروز سے بات کر لیں مگر خدارا! مجھے معاف کر دیں۔ میں اکتا گئی ہوں اس بحث سے اب — شہروز سے بات کرو تو وہ آپ کو سمجھانے کے لیے کہتا ہے آپ سے بات کرو تو آپ کہتی ہیں۔ شہروز کو سمجھاؤ۔ میں آپ کو یہ یقین تو دلا نہیں سکتی کہ مجھے واقعی شہروز کی واپسی کا علم نہیں تھا۔ میں شہروز کو یہ نہیں سمجھا سکتی کہ پاپا میری وجہ سے پریشان رہنے لگے ہیں۔ میں تھک چکی ہوں اس کھچ کھچ سے — مجھے کچھ نہیں پتا' آپ لوگوں کی مرضی ہے جو مرضی کریں مگر مجھ سے اب کوئی بات نہ کرے۔"

اس نے بمشکل آنسو روکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ زیادہ رونا تو یہ سن کر آنے لگا تھا کہ شہروز واپس آ چکا تھا مگر اس نے اسے فون کرنے کی زحمت تک نہیں کی تھی۔ می نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکی نہیں تھی اور اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم یقین کرو یار! اتنا مصروف ہوں کہ کئی دن سے گھر میں اطمینان سے بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔"

شہروز نے پنیر کیک کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ کیک کچھ نرم ہو چکا تھا اس لیے

احتیاط کے باوجود اس کے کچھ ذرے شہوز کی ٹھوڑی پر لگ گئے تھے۔ زارا نے آگے بڑھ کر ٹشو پیپرز کے ڈبے میں سے ٹشو پیپر کھینچ کر اس کی جانب بڑھایا۔ وہ کبھی اتنی عجلت میں کھانے کا عادی نہیں رہا تھا۔ وہ اگر کہہ رہا تھا کہ وہ بہت مصروف ہے تو اس کا ہر عمل اس بات کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ اپنی ممی کو ان کے گھر لے گیا تھا مگر زارا کو نہ پا کر اس نے اسے ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ اسپتال کے قریب واقع کافی شاپ پہ آجائے۔ زارا گھر جانے کے لیے نکل رہی تھی مگر اس کا ٹیکسٹ دیکھ کر اسے زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ناراضی کا اظہار بھی کرنا چاہتی تھی مگر شہوز کے مقابلے میں ہمیشہ اس کا دل اس کا حریف ثابت ہوتا تھا۔ وہ خود کو اس کی بتائی کافی شاپ میں پہنچنے سے روک نہیں پائی تھی اور اس کو دیکھ کر تو سارا غصہ لحہ بھر میں غائب ہو گیا تھا۔

"میں صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آیا ہوں ورنہ آج کل تو میرے پاس خود کو دیکھنے کا وقت بھی نہیں ہے"

وہ جتا نہیں رہا تھا۔ زارا جانتی تھی ان کے تعلق میں ایسی چیزوں کی گنجائش کبھی نہیں رہی تھی۔ اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ شہوز کو دیکھ کر خوش ہی نہیں مطمئن بھی تھی۔ جن سے محبت ہو ان کا ذرا سا التفات بھی مسرور و ممنون کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس آج کل خود کو دیکھنے کا وقت بھی نہیں جبکہ آج کل وہ کس قدر دیکھنے کے قابل ہو رہا تھا' اس کی شخصیت کتنی نکھرتی جا رہی تھی۔ اسے الیکٹرانک میڈیا جوائن کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر اس کے مثبت اثرات اس کے پورے وجود کا احاطہ کرنے لگے تھے۔

زارا نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ وہ کیسی ظاہری شخصیت کا مالک ہے۔ وہ تب سے اس کی محبت میں مبتلا تھی جب انسان کو اپنے خدوخال کی صحیح پہچان نہیں ہوتی تو بھلا کسی دوسرے کے بارے میں کیسے جانچا جا سکتا ہے اور پھر ایک عام فہم سی بات ہے کہ دنیا کا خوب صورت سے خوب صورت انسان بھی آپ کے محبوب سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو سکتا۔ شہوز زارا کے لیے دنیا کا وجیہہ ترین مرد تھا۔ اس کے باوجود وہ محسوس کر سکتی تھی کہ شہوز کے کپڑوں اور گلاسز سے لے کر پاؤں میں موجود سلیپرز تک ہر چیز جیسے اس کی شخصیت کے چارم میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ واقعی نکھرتا جا رہا تھا۔

"تم اب کیا میری بلائیں لیتی رہو گی یا کچھ ارشاد بھی فرماؤ گی۔" شہوز نے بھانپ لیا تھا کہ وہ اس کا جائزہ لینے میں مگن ہے۔

"شہوز! تم کتنے ہینڈسم ہو گئے ہو۔" اس نے تعریف کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اسے بالکل بھول چکا تھا کہ وہ اس سے کال ریسیو نہ کرنے کا گلہ کرنے والی تھی اور کچھ ناراضی بھی ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

"اچھا واقعی ــــ اس کا مطلب بھابھی کی بات کا یقین کرنا چاہیے ــــ وہ بھی صبح یہی کہہ رہی تھیں" اس نے زارا کے آگے بڑی پلیٹ میں موجود کیک کا بھی ایک بڑا ٹکڑا کانٹے کی مدد سے اٹھایا تھا۔ زارا نے اپنی پلیٹ بھی اس کے سامنے رکھ دی۔

"کیا کہہ رہی تھیں بھابھی؟" زارا نے کافی کا مگ اٹھایا۔ اس نے بھی لنچ نہیں کیا تھا مگر شہوز کو رغبت سے کھاتا دیکھ کر اس کا اپنا پیٹ جیسے بھر گیا تھا۔

"بھابھی کہہ رہی تھیں کہ شہوز! تم نے انگیجمنٹ کرنے میں جلدی کی ورنہ اب ایک سے ایک خوب صورت لڑکی تمہیں مل سکتی تھی۔"

وہ اسی انداز میں کھاتے ہوئے بول رہا تھا۔ زارا کو حیرانی ہوئی تھی نہ غصہ آیا تھا۔ یہ اس کے لیے کسی بوسیدہ میگزین میں پڑھے گئے بوسیدہ سے لطیفے کی طرح تھا' ایسی باتیں مذاق میں وہ ایک عرصہ سے سن رہی تھی۔

"میں نے کہا' مجھے خوب صورتی کے ساتھ بونس میں محبت بھی چاہیے۔ میرے لیے زارا کافی ہے"

وہ اب مسکرا رہا تھا گویا اسے اندازہ ہو کہ زارا اس کی یہ بات سن کر خوش ہو گی۔ زارا کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بلاوجہ وضاحتیں دینے کے لیے پر تول رہا ہے حالانکہ اس نے اس سے ابھی تک اس کے گزشتہ رویے کا گلہ نہیں کیا تھا۔

"تم بول کیوں نہیں رہیں' میں مان لیتا ہوں کہ میں ہینڈسم ہو گیا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم مجھے دیکھتی ہی رہو۔ اپنی زبان کو بھی زحمت دو یار ــــ! اس میں کہیں زنگ تو نہیں لگ گیا۔" زارا کے حصے کا کیک بھی ختم کر کے اب وہ بھی کافی کا مگ اٹھا چکا تھا۔

"زنگ تو لگنا ہی تھا اس کو' استعمال جو نہیں ہوتی یہ ــــ" اس نے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔

"اتنی کسر نفسی سے بھی کام مت لیں خاتون ــــ اگر آپ کی زبان پہ زنگ لگ چکا ہے تو آپ کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں آ سکتا ہے کیونکہ آپ دنیا کی واحد لڑکی ہوں گی جن کی زبان نے یہ کارنامہ سر انجام دیا ہو گا" وہ مزاحیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میں واقعی کم بولنے لگی ہوں شہوز! ممی سے کتنی باتیں کر سکتی ہوں میں اور پاپا تو شروع سے ہی کم گو ہیں تم جانتے ہی ہو اور پھر تم بھی کتنے کتنے دن کے لیے کراچی چلے جاتے ہو۔ کس سے بات کیا کروں میں ــــ" وہ چپ سی ہو گئی تھی پھر اس نے گہری سانس بھری تھی اور کچھ لفظ اکٹھے کیے تھے۔

"میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں اور اکیلا تو ریڈیو ٹی وی ہی بجتا اچھا لگتا ہے۔"

اس کے جملے میں گلہ تھا نہ شکوہ بس جیسے کوئی اپنی کسی محرومی کا ذکر کرتے ہوئے کچھ آزردہ سا ہو جاتا ہے ایسا ہی رنگ اس کے چہرے پہ بکھرا تھا اور لحہ بھر میں غائب بھی ہو گیا تھا۔

"آئم سوری یار! پر میں بھی کیا کروں۔ مصروفیت ہی اتنی ہے۔ ابھی تھوڑا ٹریننگ سیشن ہے نا' اس لیے محنت بھی کرنی پڑ رہی ہے کچھ عرصہ میں سب بیلنس ہو جائے گا پھر میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ روز فون کر لیا کروں گا مگر پلیز' ناراض مت ہو۔"

شہوز نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

زارا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا یعنی وہ ابھی

بھی صرف فون کرنے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پھر واپس کراچی جانے والا تھا اور اس کی پلاننگ میں ابھی شادی نہیں تھی۔ اس نے گہری سانس بھری۔

شہروز کو بھی محبت تھی اس سے' اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ اسے بھی زارا کے چہرے کے ہر رنگ سے آشنائی کا دعوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ناراض ہو گی اور وہ اس کی ناراضی کو اہمیت بھی دیتا تھا لیکن کیا اتنا کافی تھا۔ زارا نے اس کی جانب دیکھا پھر وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ بولے گی تو آنسو بہنے لگیں گے۔ ممی نے اسے صبح الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ شہروز سے کھل کر بات کرے ورنہ وہ اپنے بھائی سے بات کریں گی۔ دوسری جانب اس کے پاپا کا شوگر لیول کنٹرول نہیں ہو رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس کی وجہ ٹینشن اور ڈپریشن ہے۔ صبح بھی وہ بہتر محسوس نہیں کر رہے تھے جس کی وجہ سے ممی اسے جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی تھیں۔

"زارا! ایسے مت کرو یار! میں خود کو بلاوجہ مجرم محسوس کرنے لگتا ہوں۔ تم بولنا نہیں چاہتیں تو مت بولو مگر جھگڑا تو کر لو۔ مجھے سکون ملے گا۔"

اس کی خاموشی سے تنگ آکر وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے رکھے بولا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب زارا کا سارا ضبط ختم ہو گیا تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ کر کے بہنے لگے۔

"مائی گاڈ!" شہروز حق دق رہ گیا تھا۔ اس کی ہمدردی کو اتنی بے دردی سے وصول کیا جائے گا اس نے سوچا نہیں تھا۔ وہ سامنے سے اٹھ کر اس کے ساتھ والی کرسی آ بیٹھا تھا۔

"آئم سوری زارا.... پلیز ایسے مت کرو۔" وہ اس کی دل جوئی کر رہا تھا جبکہ یہ دل جوئی ہی زارا کو مزید رلا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ بہت اچھا ہے۔ اسے یقین تھا' وہ اس کی پرواہ کرتا ہے اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ بار بار نہ بھی کہے تب بھی وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے مگر وہ کیا کرتی۔ وہ عجیب کشمکش میں گھری تھی۔ ممی' پاپا اور شہروز' وہ تینوں اگر تکون تھے تو وہ اس تکون کے درمیان نکتہ بن گئی تھی۔ اسے بار بار اپنے منہ سے شادی کی بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بے شک کزنز تھے ایک دوسرے کے ساتھ بہت بے تکلف تھے مگر وہ ان باتوں کو بنیاد بنا کر ایک ہی بات مسلسل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی نسوانیت ہرٹ ہوتی تھی۔

"اچھا آئی پرامس۔ نیکسٹ ٹائم میں کبھی تمہیں کال کرنا نہیں بھولوں گا اور ہمیشہ وقت پر تمہارے میسجز کا جواب دوں گا۔" اس نے جیسے یقین دہانی کروائی تھی اور ساتھ ہی اس کی جانب ٹشو پیپر بڑھایا تھا۔

"اٹس او کے شہروز۔! میں دراصل پاپا کی وجہ سے بھی کچھ پریشان ہوں۔ ان کا شوگر لیول کنٹرول میں نہیں آ رہا۔"

اس نے اپنی آنکھیں صاف کی تھیں۔ صد شکر اس کے پاس آنسو بہانے کی معقول وجہ تھی۔ قدرت کے بھی عجیب ہی کام ہیں۔ اس نے عورت نام کی مخلوق کے جذبات بناتے وقت پتا نہیں کیا سوچا تھا۔ عورت کے جذبات عجیب تضادات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ عورت بے شک مرد کی وجہ سے آنسو بہا رہی ہو مگر ہر بار اس امر کا اعتراف کرنا اسے اچھا نہیں لگتا' کم از کم اس مرد کے سامنے نہیں جس سے اسے محبت کا دعوا بھی ہو جبکہ المیہ یہ ہے کہ اسے سب سے زیادہ رونا بھی اسی مرد کے سامنے آتا ہے جس سے اسے محبت کا دعوا ہوتا ہے۔

"ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے وہ.... تم خود ایک ڈاکٹر ہو تم جانتی ہی ہو شگر جیسا مرض آہستہ آہستہ ہی کنٹرول میں آتا ہے۔ تم پریشان مت ہو پلیز" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ زارا نے گہری سانس بھری تھی۔ اس سے مزید وہ بات کرنا فضول تھا جو وہ کرنا چاہتی تھی۔

"جسے بیٹھا ہوا شخص نظر نہیں آتا' اسے کھڑا ہوا بھی کہاں نظر نہیں آئے گا" اس نے کسی کے منہ سے یہ جملہ کبھی سنا تھا۔ آج اس جملے کی عملی تفسیر دیکھنے کو بھی مل گئی تھی۔

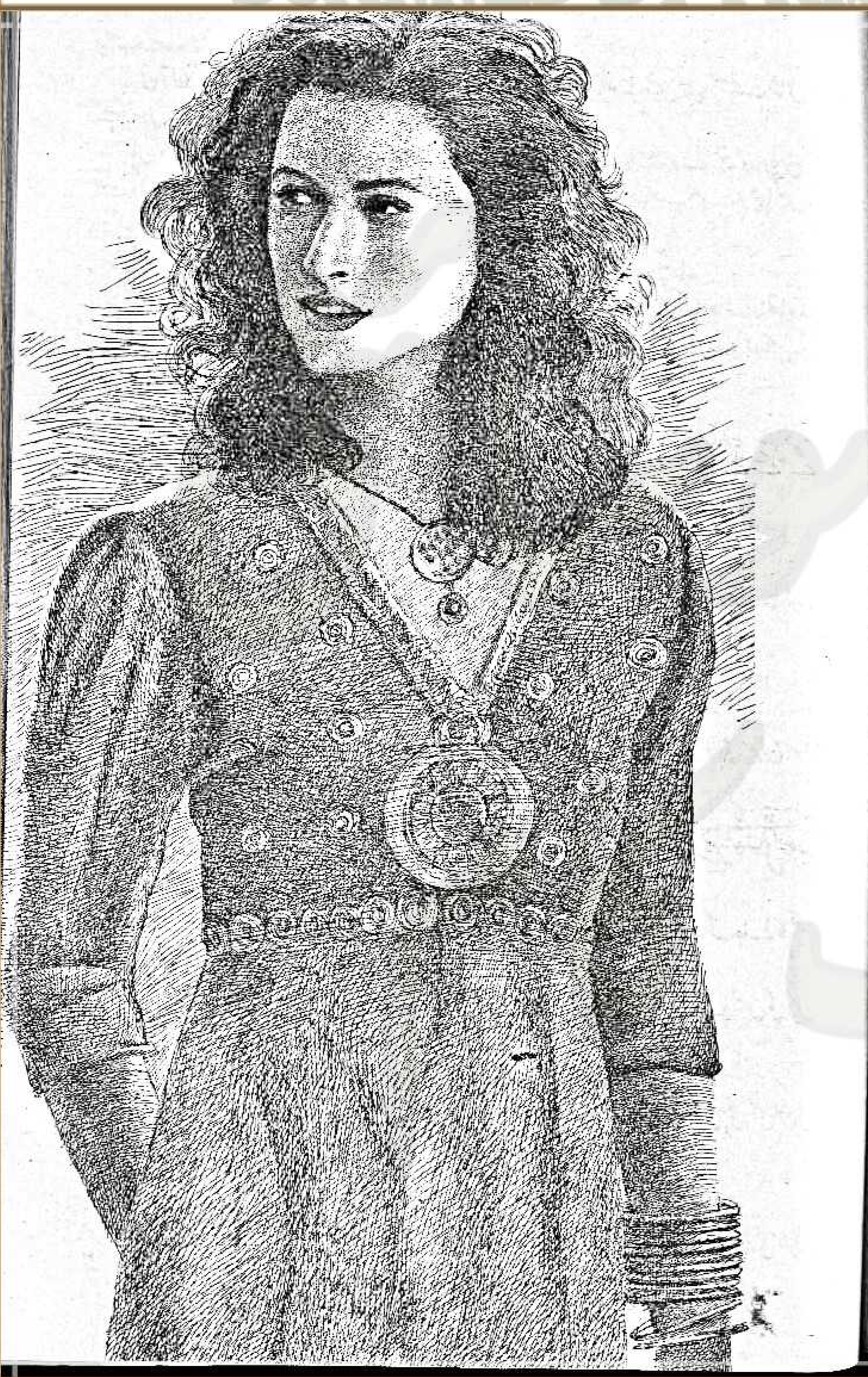
گھر پہنچ کر بھی اس کا دل بہت بیزار تھا۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی تھی۔ اس کا دل فی الوقت کسی کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے زندگی میں کبھی بے اعتبار کہلایا جانا پسند نہیں رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی تھی کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ اسے الجھن ہوتی تھی جب بھی کبھی اسے ممی مشکوک نظروں سے دیکھتی تھیں اور ایسی صورت حال میں وہ ہمیشہ ان سے ناراض ہو جایا کرتی تھی مگر بھلا ہو اس محبت کا جو اس کے دل میں شہروز کے لیے تھی جو اس کو اس کے اپنے والدین کی نظر میں بے اعتبار بنا رہی تھی اور وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

وہ اکتائے ہوئے انداز میں بستر پر گر گئی تھی۔ اس کی زندگی میں عجیب سا خلا پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھ نہیں پاتی تھی۔ ایک طرف اس کے پاپا تھے جو اپنی بیماری کی وجہ سے اتنے وہمی ہو گئے تھے کہ ان کے لیے اب آدھا بھرا ہوا گلاس بھی بھرا ہوا نہیں رہا تھا۔ وہ ہر چیز کا منفی رخ دیکھتے ہی نہیں تھے بلکہ اسے دل میں بسا لیتے تھے۔ ممی کے لیے وہ ابھی بھی ایک چھوٹی بچی تھی اور ان کا خیال تھا کہ ساری دنیا سارا وقت بس ان کی بیٹی کی معصومیت سے فائدہ اٹھانے اور اسے بے وقوف بنانے کی پلاننگ کرتی رہتی ہے۔

شہروز کا رویہ بھی اس کی سمجھ سے بالا تر تھا۔ وہ پتا نہیں واقعی مصروف تھا یا اس سے کنی کترا رہا تھا۔ زارا کے لیے یہ صورت حال سخت ذہنی اذیت کا باعث بن رہی تھی اور المیہ یہ تھا کہ وہ اس متعلق کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ ممی سے بات کرتی تو شہروز ان کی نظر میں مزید برا بنتا تھا' شہروز سے بات کرتی تو وہ خود بری بنتی تھی۔ یہاں ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ کسی کے سامنے اپنا دل ہلکا کر لیتی مگر بہت یاد کرنے پر بھی کوئی ایسا غمگسار یاد نہیں آ رہا تھا جو اس کے دل کی بات سن اور پھر سمجھ بھی لیتا۔ زندگی کو اگر چار دیواروں والا بند کمرہ تصور کر لیا جائے تو "دوستی" اس چار دیواری میں ایک چھوٹا سا روزن ہوتی ہے یہاں سے آنے والی تھوڑی سی روشنی بھی انسان کے لیے بعض اوقات بڑی اہم ہوتی ہے۔ وہ اس کو تاریکی میں صحیح سمت کا تعین کرنے میں مدد کرتی ہے۔ زارا کو ایسے ہی ایک روزن کی فی الوقت اشد ضرورت تھی۔

اس نے خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنا موبائل اٹھا لیا اور وہیں لیٹے لیٹے اس میں سے اپنی کونٹیکٹس لسٹ چیک کرنے لگی تھی۔ نمبرز چیک کرتے کرتے اس نے ایک نمبر پر توقف کیا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے آپشن نکال کر کال کے آپشن پر انگلی رکھ دی تھی۔ ٹیپو کو کال جا رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



عنیزہ سید

جو وے کوہ گراں تھے ہم

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو ویسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

۲۹

اُنتیسویں قسط

"ابھی ہم جیسی زندگی گزار رہے ہیں یوں کہ ٹانگیں قبر میں لٹکی ہیں اور سر دنیا میں موجود ہے تو ایسی حالت میں کسی سے جھوٹ کیوں بولیں گے توبہ توبہ!" فضل حسین نے خرخراتی آواز میں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"تو جب آپ جوان تھے اور بھاگ دوڑ کر سکتے تھے۔ جھوٹ بول لیا کرتے تھے۔" ماہ نور نے حیرت سے ان کی



جانب دیکھا۔

"ہاں تو اور کیا!" فضل حسین کے بجائے میمونہ بی نے جواب دیا "وہی جھوٹ جس میں مصلحت شامل ہوتی ہے انہوں نے بھی خوب بولے ہم نے بھی خوب بولے۔"

"ہاں بولے تھے" فضل حسین ماہ نور سے مخاطب ہوئے۔ "بلال صاحب کے واسطے بولے تھے' وہ جو بی بی تھیں تصویروں والی نا۔ انہوں نے صاحب کے منہ پر تصویروں والی کتاب ماری تو انگریز میم صاحب ہم سے پوچھا کیں۔ کئی بار "کیا معاملہ ہوا تھا دونوں کے درمیان" ہم نے بولا ہم تو نہیں جانتے" صاف مکر گئے۔"

"تصویروں والی میم صاحب؟" ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے فضل حسین کی طرف دیکھا۔

"انگریز بیگم صاحب ہم سے یہ بھی پوچھا کیں 'صاحب اور ان کی پہلی بیگم کے درمیان کیا معاملہ ہوا تھا بولیں۔ بتاؤ فضل حسین! وہ پہلی بی بی سعد صاحب کو چھوڑ چھاڑ کر کدھر گئیں' ہم نے انہیں کبھی نہیں بتایا کہ ہم نے کیا ان کو خونم خون دیکھا تھا ہم بولے کچھ پتا نہیں۔"

"خونم خون۔" ماہ نور نے میمونہ بی کی طرف دیکھا۔

"ارے یہ تو سترے بہترے ہو گئے' یادداشت جواب دے گئی۔" میمونہ بی تیزی سے بولیں "جانے کدھر کدھر کی جوڑتے رہتے ہیں۔"

"اتنا تو میں جانتی ہوں آنٹی کہ سعد کی مدر کا مرڈر ہوا تھا' انکل اسی لیے یہ لفظ بول رہے ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟" میمونہ بی کی آنکھیں پھیلیں۔

"مجھے رابعہ آنٹی سب بتا چکیں مگر افسوس سعد میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی یہاں سے جا چکا تھا۔" ماہ نور نے تاسف کے ساتھ کہا اور اٹھ کر بڑے میاں کے کان کے قریب گئی۔

"بتائیں تو انکل سعد کی مدر کا مرڈر کس نے کیا تھا' کیا واقعی بلال سلطان قاتل ہیں ان کے؟"

بڑے میاں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"آپ رابعہ آنٹی کو جانتے ہیں کیا؟" ماہ نور نے بلند آواز میں دوسرا سوال کیا "رابعہ کلثوم جو مولوی سراج سرفراز کی بیوی ہیں۔"

"ارے اسی مولوی صاحب نے تو صاحب کے ہاتھ سے چھری چھین لی تھی اور رو رو کر کہنے لگے تھے۔ نہیں آپ قتل نہیں کر سکتے بھائی صاحب! میں آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے جاتا نہیں دیکھ سکتا۔" فضل حسین جیسے اچانک ماضی کی فلم کی ریل دیکھنے لگے تھے۔

"ہاں' مجھے معلوم ہے اور بلال سلطان نے چھری ان سے واپس چھین کر انہیں وہاں سے بھاگ جانے کا حکم دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ اگر وہ وہاں سے نہیں گئے تو وہ قتل ان دونوں میاں بیوی پر ڈال دیں گے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ وہ دونوں بے چارے بیگم صاحب کی لاش پر بیٹھ کر بین بھی نہ کر سکے تھے کہ پولیس کی وین آ گئی۔" فضل حسین کسی معمول کی طرح بولے۔

"اور بلال سلطان نے کہا 'لو سراج! قتل تم پر پڑنے والا ہے۔"

"ہاں' دونوں بے چارے ڈر کے مارے کانپتی ٹانگوں سے وہاں سے بھاگ لیے تھے' چند دنوں کی بچی تھی ان بی بی کی گود میں۔"

"مجھے یہ سب پتا ہے' بس یہ بتائیے کہ قتل کس نے کیا تھا۔"

"یہ مجھے بھی نہیں پتا۔" فضل حسین نے سر جھکایا "مجھے صاحب نے فون کر کے کہا۔ وہ اسی محلے کی طرف جا

رہے تھے جدھر بیگم صاحب رہتی تھیں۔ بولے تم بھی ادھر پہنچو میں جب پہنچا قتل ہو چکا تھا بیگم صاحب خون میں لت پت' آنکھیں نیم وا کیے پڑی تھیں میں نے دوسری چارپائی پر پڑی چادر اٹھا کر ان پر دی' اللہ معاف کرے نیم برہنہ لاش تھی۔"

"پھر قتل کس نے کیا ہوگا؟" ماہ نور نے کہا۔

"کچھ پتا نہیں صاحب نے تصویروں والی بی بی اور بچے کو بس میں بٹھا آنے کا بولا میں ذرا سوال جواب کرنے بیٹھتا بس نکل جاتی اس لیے ان دونوں کو لے کر کے بس اسٹاپ کی طرف نکل پڑا۔"

"بچہ؟" نور کے دماغ میں کچھ جھلملایا۔ "وہاں بچہ کہاں سے آ گیا؟"

"کچھ معلوم نہیں' تصویروں والی بی بی ایک نومولود کو گود میں اٹھائے صحن میں کھڑی تھیں جب میں ادھر پہنچا تھا بچہ روتا تھا تو بی بی اس کے منہ کے آگے دوپٹہ دے دیتیں اپنا۔"

"یہ تصویروں والی بی بی کون تھی آخر؟" ماہ نور اس مسلسل ذکر پر جھنجلا کر بولی۔

"وہ جو تصویریں بناتی تھیں۔ بصورت شکل کی اچھی وچھی نہیں تھیں مگر تصویریں بہت اچھی بناتی تھیں' اسلام آباد میں رہتی ہیں' ہم دونوں کو آٹا' راشن بھیجتی ہیں کبھی کبھی۔" اب کے میمونہ بی بولیں۔

"شکل کی اچھی نہیں' تصویریں بناتی ہیں' اسلام آباد میں رہتی ہیں۔" ماہ نور نے ذہن میں دہرایا اور جیسے اس جگسا پزل کا ایک ٹکڑا اپنی جگہ پر فٹ بیٹھ گیا۔

"کیا وہ بچہ ان تصویروں والی کا تھا؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"پتا نہیں۔" فضل حسین کا ہلتا ہوا سر اور بھی تیزی سے ہلا۔ "مگر اللہ معاف کرے جس حالت میں ہم نے اللہ جنت نصیب کرے بیگم صاحب کو دیکھا کیے یوں لگتا تھا مانو ابھی کوئی زچہ بچہ جن کر فارغ ہوئی ہوں اور قتل کر دی گئی ہوں۔"

"کلک' کلک۔" ماہ نور کے دماغ میں تیزی سے چند اور بتیاں روشن ہوئیں۔

"فلزا ظہور کا دکھ۔" اسے سعد کے نوٹ کے الفاظ یاد آ گئے۔

"کھاری سعد کا بھائی ہے۔" سردار چاچا کی گواہی۔

"دی آرٹسٹ!" سعد کے فون میں محفوظ نمبر کے مالک کا نام۔

"دی آرٹسٹ کے الفاظ۔۔۔ بے تکلفی کا عالم۔"

اس نے باری باری میمونہ بی اور فضل حسین کو مشکور نظروں سے دیکھا' پہلی بار اس کی خواری بے مقصد نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ بیس منٹ تک کسی سے فون پر بات کرنے کے بعد فارغ ہوئی تھیں' فون بند کر کے انہوں نے ایک لمبا سانس لیا تھا اور پھر ان کی نظریں خلا میں کسی ایک نکتے پر جم گئی تھیں۔

پچھلے کچھ عرصے سے جس بات کا انہیں یقین ہو چلا تھا اس روز وہ ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ گئی تھی۔

"یا اللہ' دنیا میں کیا کیا ہوتا رہتا ہے' حیرت انگیز' عجیب اور ناقابل یقین واقعات۔" انہوں نے سوچا۔

"اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ ماہ نور کے ساتھ جو لڑکا ہمارے گھر آیا تھا وہ شہناز کا بیٹا تھا تو کیا تم بری طرح چونک نہیں جاؤ گی۔" اسی روز انہوں نے خدیجہ سے کہا تھا اور چاول کی پلیٹ میں کانٹا اور چمچ چلاتی خدیجہ کے ہاتھ رک

گئے تھے۔

"مگر فلزا تو شہناز کا بیٹا کسی بس اسٹاپ پر رکھ آئی تھی۔" خدیجہ نے کہا۔ "کیا اس بچے نے یوں سروائیو کرلیا؟"

"نہیں، یہ وہ بچہ نہیں ہے غالباً" یہ تو شہناز کے شوہر ہی کے پاس پلا بڑھا ہے مگر اسے خود علم نہیں کہ اس کی ماں کون تھی، غالباً" شہناز کے شوہر نے اپنے کرتوت چھپانے کی خاطر بچے کو بتایا ہی نہیں کہ اس کی ماں کون تھی۔"

"شہناز کے شوہر کے کرتوت۔" خدیجہ نے حیرت سے فاطمہ کو دیکھا۔

"ارے بھئی وہی جو فلزا نے سنایا تھا، چھرے سے شہناز کی گردن کاٹ دی۔"

"اگر وہ شخص اتنا سمارٹ تھا کہ حقیقت کو اتنے عرصے تک چھپائے رکھنے میں کامیاب رہا تو کیا اس نے اس بچے کو تلاش نہیں کیا ہوگا جسے فلزا بس اسٹاپ پر رکھ آئی تھی۔" خدیجہ نے کہا۔

"اس کا مجھے علم نہیں۔" فاطمہ نے سر ہلایا "فلزا ابھی تو ادھوری کہانی سنا کر فرار ہوگئی۔"

"اس کا تمہیں علم نہیں تو اس کا تمہیں کیسے علم ہوگیا۔" خدیجہ نے سوال کیا۔

"اس کا خود اس لڑکے نے بتایا۔" فاطمہ نے سکون آمیز لہجے میں کہا۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ نے ماسی رشیدہ کو چیختے چلاتے اپنی بات سناتے سنا اور وحشت اور سراسیمگی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھا۔

"اٹھ نی سعدیہ! خورے وہ شیدائی کیا کر بیٹھا ہے؟" ماسی رشیدہ نے جنونیوں کی طرح اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔ سعدیہ نے چپل پہنی تھی یا نہیں اس نے سر پر دوپٹہ اوڑھا تھا یا نہیں اُسے خود بھی ہوش نہیں رہا تھا اور وہ ماسی رشیدہ کے ساتھ باہر کی طرف بھاگی تھی۔

"وہ ادھر۔۔۔ ادھر دودھ لوڈ کرانے گیا تھا" اس نے حواس باختگی کے عالم میں باہر کھڑے ماسٹر کمال کو بتایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ٹائم ہوگیا دودھ لوڈ کرانے کا۔"

"اوئے کدھر نیم ہوگیا تھا دودھ لوڈ کرانے کا۔" ماسٹر کمال نے صافہ کندھے سے اتار کر دوبارہ رکھتے ہوئے کہا اور دوسری سمت بھاگنے لگا۔

"اوئے منڈیو، اوئے جوانو، اوئے بھج کے (بھاگ کے) کھاری کو پکڑو اوئے، اوئے دیکھو اسے لبھو (ڈھونڈو) وہ بھاگتے ہوئے چلا رہا تھا، سعدیہ اور رشیدہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

مولوی سراج کو ظفر لمبڑ نے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی تھی "بڑا کوئی امیر کبیر، اونچی شان والا بندہ لگتا ہے مولوی جی یہ لمبی گاڑی پر بیٹھ کر آیا ہے۔" ظفر لمبڑ نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کی لمبائی کا بیان کیا۔

"کوئی مسافر ہوگا، دو گھڑی مسجد میں آرام کرنا چاہتا ہوگا۔" مولوی صاحب نے بے نیازی سے کہا۔

"لیں مولوی جی!" ظفر لمبڑ ہنسا "اتنے امیر ادمی نے، ہمارے پنڈ کی مسجد میں ہی آکر آرام کرنا ہے نا" اس مسجد کی عمارت سے لمبی تو اس کی گاڑی ہے، اس میں اول نمبر اے سی بھی چلتا ہوگا" آرام کرنا ہوتا تو اسی میں لیٹ کر آرام کرلیتا مسافر۔ اور پھر ادھر بابے شاہ عالم کا دربار بھی تو ہے، چوبیس گھنٹے جس کا لنگر چلتا ہے، آرام کرنا ہوتا تو ادھر کرتا پھر وہ تو ادھر آیا ہے، آپ کا نام لے کر پوچھتا ہے، آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

مولوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

"میرا تو ایسا کوئی واقف نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔

"پر وہ تو آپ کا واقف ہے نا۔" ظفر مسکرایا۔ "آپ مل لیں مولوی جی، ہوسکتا ہے مسجد کے لیے چندہ ہی دے جائے چوبارہ پکا کرا لیجیے گا، صحن میں پنکھے لگوا لیجیے گا، جنریٹر خرید لیجیے گا مسجد کے لیے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ یہ تو خیال نہیں آیا۔ مولوی صاحب کو تسلی محسوس ہونے لگی "بلا لو بھئی بلا لو اندر۔"

وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور چہرے پر معتبری طاری کرلی۔ آنکھیں بند کرکے تیزی سے تسبیح کے دانے گرانے لگے۔ آنے والے کے انتظار میں چند لمحے گزارنے کے بعد ذرا کی ذرا کو آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ آنے والا جھک کر اپنے بوٹ اتار رہا تھا مولوی صاحب کی نظریں سیاہ پالش شدہ چمکتے قیمتی بوٹوں پر پڑیں اور انہوں نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"السلام علیکم سراج سرفراز، پہچانا!" چند لمحوں بعد انہیں اپنے قریب سے آتی آواز سنائی دی اور انہوں نے آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا۔ اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر لحہ بھر میں ان کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ تم کام کرتی ہو اور میں سارا دن ادھر بیٹھا آرام کرتا ہوں۔" سعد نے نادیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"ابھی تم مکمل صحت یاب نہیں ہوئے، جب ہوجاؤ گے تو تم بھی کام کرنا۔" نادیہ نے اس کے کپڑے لانڈری باسکٹ میں رکھتے ہوئے جواب دیا "میں تمہیں کام کرنے سے بالکل منع نہیں کروں گی کیونکہ اس ملک میں ایک عام آدمی کی حیثیت میں رہنے کے لیے تمہیں کام تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں وہاں بھی ایک عام آدمی کی حیثیت ہی میں رہتا تھا۔" وہ روکھائی سے بولا۔

"کیا واقعی؟" وہ ہنس دی "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ حیثیت عام آدمی کی سی تھی۔"

"تم طنز کررہی ہو بلکہ کرتی رہتی ہو۔"

"نہیں، میں طنز نہیں کرتی۔" وہ اس کی شرٹ تہہ کرتے ہوئے اس کے سامنے آبیٹھی۔ میں صرف تمہیں یاد دلاتی ہوں۔"

"یہ کہ ایک عام آدمی کی حیثیت میں بالکل بے کار انسان ہوں کیونکہ میری عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔" اس نے ناراضی سے کہا۔

"نہیں، یہ کہ ایک خاص آدمی کی حیثیت میں تم بہت کارآمد شخص ہو۔" نادیہ کھلکھلا کر ہنس دی، سعد نے جواب نہیں دیا۔ وہ بات کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ اس روز ڈیڈی کے والٹ کو دیکھ کر تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا تھا" نادیہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"والٹ دیکھ کر نہیں اس میں موجود تصویر دیکھ کر۔" وہ ابھی بھی اس کی طرف دیکھے بغیر بولا تھا۔

"وہ تصویر؟ نادیہ کو یاد آیا کس کی ہے وہ تصویر؟"

"وہ میری ماں کی تصویر ہے" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری ماں!" نادیہ چونکی "لیکن تم نے تو انہیں دیکھ نہیں رکھا؟"

"میں نے انہیں دیکھ نہیں رکھا مگر میں انہیں کھوج چکا ہوں۔"

"ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" وہ دل سے خوش ہوتے ہوئے بولی "کہاں ہیں وہ کدھر رہتی ہیں؟"

"وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ مر چکی ہیں۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولا تھا۔

نادیہ کو یک دم ایسا لگا کہ اردگرد بالکل سناٹا پھیلنے لگا تھا ہر چیز خاموش اور جامد ہو چکی تھی۔

"اوہ مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔" اس نے بدقت کہا۔ "کیا ہوا تھا انہیں' بیمار تھیں کیا۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ انہیں قتل کیا گیا تھا۔" سعد کا لہجہ مزید بے تاثر ہوا۔

"قتل۔" نادیہ نے چیخنے کے سے انداز میں کہا۔ "کس نے کیا ان کا قتل اور اور کیوں کیا؟"

"تمہارے محبوب اور عزیز از جان ڈیڈی نے" اب کے سعد نے براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" نادیہ کا رد عمل فطری تھا۔

"ہونہہ!" سعد کے چہرے پر تمسخرانہ تاثر ابھرا "اسی لیے تو تمہیں کہتا ہوں آنکھیں اور دھیان کھلا رکھا کرو۔"

"لیکن ڈیڈی ایسا نہیں کر سکتے' وہ ایسا کیوں کریں گے۔" نادیہ نے بے یقینی سے کہا۔

"تمہیں پتا ہے کہ ایک بار ممی کو میں نے یہ تصویر اور والٹ دکھایا تو تصویر دیکھ کر ممی اس کو پھاڑ کر پھینک ڈالنا چاہتی تھیں' ان کا کہنا تھا کہ یہ اس عورت کی تصویر تھی جو بلال سلطان کے دل پر راج کرتی تھی اور جس کی وجہ سے ممی کو ڈیڈی کی زندگی میں وہ حیثیت نہیں ملی جس کی وہ مستحق تھیں' میں نے بہت مشکل سے ممی سے یہ تصویر بچائی تھی۔"

سعد نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"جس عورت کی ایسی حیثیت ڈیڈی کی زندگی میں تھی' ڈیڈی اس کو قتل کیسے کر سکتے تھے۔" نادیہ نے سوال کیا۔

کچھ دیر یونہی بے یقینی سے نادیہ کو دیکھتے رہنے کے بعد سعد نے سر جھٹکا۔

"سب ڈراما ہے۔" اس نے نادیہ سے کہا۔ "تم نہیں جانتیں کہ ڈیڈی خود ایک کتنا بڑا ڈراما ہیں۔" اس نے نادیہ کے چہرے پر پھیلی حیرت دیکھ کر دھیان دوسری طرف پھیر لیا۔ ڈیڈی کو اپنا آئیڈیل ماننے والی نادیہ کے لیے ان کے بارے میں بولے گئے یہ الفاظ یقیناً" بہت سخت تھے۔

"میرے پاس بہت سارے شواہد ہیں۔" اس نے ایک مرتبہ پھر نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری بے گناہ اور معصوم ماں کے قتل سے چل کر پاؤں کے سارے خون آلود نشان ڈیڈی کی طرف جاتے ہیں۔"

"لیکن......" نادیہ نے کہنا چاہا لیکن سعد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کرا دیا۔

"یہ ہی نہیں بیچاری فلزا ظہور کو ایک بچے کا تحفہ دے کر اس سے وہ بچہ حادثاتی طور پر گما دینے والی ذات بھی ڈیڈی ہی کی ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ ماں بچے کی جدائی میں سسکتی رہی اور بچہ چودھری سردار کے فارم ہاؤس پر ملازموں کی طرح پلتا رہا اور اس سارے ڈرامے کے مرکزی کردار یعنی ڈیڈی نے کبھی عمر بھر اس بچے کو یاد تک نہیں کیا' جو فلزا ظہور سے ہی سہی ان کا اپنا بچہ تو تھا۔"

"فلزا کون؟" نادیہ نے پوچھا۔

"ہے بے چاری قسمت کی ماری ایک دکھی عورت۔" سعد نے سر جھٹکا "میں کبھی اس کی پینٹنگز کا مفہوم نہ سمجھ پاتا اگر ڈیڈی کے چیلسی والے گھر پر فلزا کا پورٹ فولیو نہ دیکھ لیتا۔"

"وہ بچہ تمہارا نصف برادر ہوا تا پھر تو جیسے میں تمہاری نصف بہن ہوں۔" نادیہ نے کہا۔

"اوہ ہاں!" نادیہ کی بات سے سعد کو یاد آیا "ایک اور مثال تم ہو ڈیڈی کے پتھر دل ہونے کی۔ دو عورتوں سے دو بیویوں سے بے وفائی کے بعد ڈیڈی نے تمہاری ماں کے ساتھ قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا' تمہیں پیدا کیا اور پھر ایک نیا ڈراما رچا کر تم دونوں کو بھی اپنی زندگی سے فارغ کر دیا۔ تمہارے چلے جانے کے بعد میں نے انہیں کبھی

بھولے سے بھی تمہارا ذکر کرتے نہیں سنا۔" سعد کو لگا' ڈیڈی کے بارے میں ایک تلخ سچ سنا کر ہی وہ نادیہ کو قائل کر سکتا تھا۔

"خیر وہ تو کہانی ہی دوسری ہے۔" نادیہ کا دل ڈیڈی کی طرف سے بالکل صاف تھا۔ وہ حقائق کی جمع تفریق کرتے رہنے کے بعد ہی اس عمر کو پہنچی تھی۔

"لیکن تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے' ڈیڈی کی سنگ دلی اور بے حسی تمہارے اور ان کے درمیان فاصلے کیوں نہ کھڑے کر سکی۔" نادیہ نے اس سے براہ راست سوال کیا "جبکہ تم اس عورت کے بیٹے تھے' جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے قتل کر چکے تھے۔"

"میں!" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "میں ان کی مجبوری بن گیا تھا۔ مجھے وہ دنیا کے سامنے اپنا بیٹا ڈکلیئر کر چکے تھے اور پھر رشتوں کے ایک ہجوم کو ٹھکرانے کے بعد کسی ایک سے متعلق رہنا بھی ایک مجبوری تھی' سو انہوں نے مجھے اپنا لیا۔ مگر کیا اپنایا؟" اس نے نادیہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "انہوں نے میری تربیت میں اتنے خلا اور سوال چھوڑ دیے کہ میں نہ وہ رہا جو وہ مجھے بنانا چاہتے تھے نہ وہ بنا جو خود بننا چاہتا تھا۔ میرا وجود مجسم سوال' مجسم تلاش بن کر رہ گیا۔ میری ماں سے متعلق ہر سوال سے اجتناب نے ڈیڈی کے سامنے میری نظروں میں ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا اور ان ہی سوالوں کے جواب ڈھونڈنے نے مجھے روپ بہروپ کے چکر میں ڈال دیا۔ بستی بستی قریہ قریہ کا مسافر بنا دیا میں خود کو سب کچھ اپنے پاس موجود ہوتے ہوئے بھی خالی ہاتھ ہی محسوس کرتا رہا۔"

"اور اسی روپ بہروپ نے' بستی بستی قریہ قریہ کے سفر نے تمہیں جو ماہ نور سے ملا دیا اسے تم کیا قرار دو گے خوش قسمتی یا کچھ اور؟" نادیہ نے اس کی بات سنتے سنتے کہا' نادیہ کا سوال سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے گم صم ہو گیا۔

"بد قسمتی۔" پھر اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ اسے بد قسمتی کہنا چاہیے۔" نادیہ حیرت سے بولی۔

"ہاں!" وہ اٹھ کر بالکنی کی طرف چلا گیا۔ اس کا چہرہ نادیہ کی نظروں سے چھپ گیا تھا۔ "انسان کسی کو شدت سے چاہنے لگے اور اسے صرف اس وجہ سے اپنا نہ سکے کہ اس کی ذاتی زندگی میں بہت سے تضادات ہیں تو اسے بد قسمتی کے علاوہ اور کیا قرار دیا جا سکتا ہے۔" نادیہ کو محسوس ہوا کہ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"اگر ایسا بھی ہے تو ماہ نور سے تمہارے تعلق کو اس سے کیا لینا دینا' تمہیں چاہیے آگے بڑھو اور اسے اپنا لو بس۔" نادیہ اس کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔" وہ بالکنی میں کھڑا سامنے کا منظر دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ ایک اکیلی لڑکی نہیں ہے' اس کا ایک خاندانی پس منظر ہے' والدین' بھائی' رشتہ دار' برادری اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ کسی نئے شخص کو اپنے خاندان میں خوش آمدید کہنے سے پہلے اس کی اچھی طرح جانچ کرتے ہیں اور میرے تضادات کیا ہیں اس کے سگے چچا کو بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ ایک قاتل باپ کا بیٹا' ایک ایسے باپ کا بیٹا جس کا دوسرا سگا بیٹا اس کے چچا ہی کے فارم ہاؤس پر پلتا رہا...... نہیں۔" سعد نے سر جھٹکا "میں اس جانچ کا سامنا نہیں کر سکتا تھا' میں اس لڑکی کو جس سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی ہے یوں لیٹ ڈاؤن نہیں کر سکتا تھا۔"

"ایک بات بتاؤ۔" نادیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں پوچھو۔" اس نے مڑ کر دیکھا۔

"ماہ نور بھی تم سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔"

"اگر ٹوٹ کر محبت کرنے سے آگے بھی کوئی درجہ ہوتا ہے تو وہ اس درجے پر کھڑی ہے۔"

نادیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"پھر بھی تم اسے بغیر کچھ کہے' بتائے چھوڑ آئے۔"

"ہاں پھر بھی' کیونکہ میں اسے کوئی دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"

"اس کے لیے تمہارے یوں چلے جانے سے بڑھ کر بھی کوئی دکھ ہوگا بھلا بتاؤ۔" نادیہ کو غصہ آنے لگا۔

"یوں وہ مجھے ایک غیر مستقل مزاج' لاپروا' جذباتی' احمق شخص سمجھ کر بھول جائے گی۔ مجھ سے وہ پہلے بھی شاکی رہتی تھی' اسے میرے کسی اظہار کا انتظار رہتا تھا جو خوش قسمتی سے میں نے نہیں کیا اس کی مجھ سے توقعات کم تھیں' وقت کے ساتھ ساتھ بالکل ختم ہو جائیں گی۔"

"اوہ میرے خدا!" نادیہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ "کیسے کیسے مفروضوں پر زندگی گزار رہے ہو تم۔" اس نے غصے اور ناراضی بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ ہو جائے گا' وہ ہو جائے گا۔ مجھے تو رہ رہ کر اس لڑکی کا خیال آرہا ہے' کیا حال ہوگا اس کا۔"

"وہ ٹھیک ہے' نارمل ہے' اپنے چند کورسز مکمل کرنے کے لیے شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔" سعد واپس کمرے کی طرف مڑا۔

"تمہیں کیسے معلوم۔۔۔ کیا تم اس سے رابطے میں ہو؟" نادیہ نے کہا۔

"میں احمق ہوں جو اس سے رابطے میں ہوں گا۔" اس نے سر جھٹکا۔

"پھر؟"

"میری اس کی پڑوسن خالہ سے بات ہوئی' انہوں نے ہی بتایا۔"

"پڑوسن خالہ سے اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون کیا تھا تم نے۔" نادیہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"نہیں۔" اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کھولتے ہوئے کہا۔ "میں نے انہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میری ہاں جو ان کی کزن تھی۔ قتل ہو چکی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ ان کی کزن تھیں۔"

"تمہارے پاس موجود تصویر دیکھ کر۔" اس نے کہا اور ٹی وی پر چلتا پروگرام دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ درختوں کے ایک کنج میں یوں بیٹھا تھا کہ کسی کو نظر نہ آسکے۔ زندگی کے اہم ترین فیصلے پر عمل کرنے کے لیے اسے ایسے ہی گوشہ تنہائی کی ضرورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھی سی پڑیا تھی' جس میں بند سوغات کا استعمال اس کا رشتہ دنیا اور دنیا والوں سے منقطع کر دینے والا تھا۔ کچھ دیر ہاتھ میں پکڑی پڑیا کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی' آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کی ٹکریاں تیر رہی تھیں ڈھلتی سہ پہر کے اس آسمان کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ اس نے فضا میں اڑتے پرندوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے' وہ اسی آسمان کو تکتے' انہی پرندوں کو چہچہاتے سنتے اور اڑتے دیکھتے دیکھتے بڑا ہوا تھا۔ بچپن میں وہ سبزیوں اور پھولوں کی پنیریوں کو چونچیں مار کر برباد کرتے پرندوں کے پیچھے ہاہو کا شور مچاتے بھاگتا' ان کو یہاں سے وہاں اڑاتا پھرتا تھا۔ جال لگا کر دعوتوں کے لیے پکڑے جانے والے بٹیروں اور چڑیوں کو ہاتھ میں پکڑ کر ان کی سہمی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے باتیں کرتا تھا "اوئے کیوں آئے او ایدھر' نہ ایدھر آوندے نہ پھڑے جاوندے' ہن دسو میں تہانوں کیویں بچاواں (اوئے کیوں ادھر آئے نہ ادھر آتے نہ ہی پکڑے جاتے' اب بتاؤ۔ میں تمہیں کیسے بچاؤں) وہ ان سے کہتا جاتا اور قریب موجود بٹیرے' چڑے حلال کر کے ان کے پر اتارتے بندوں سے نظر بچا کر ان میں سے چند ایک کھلی فضا میں اڑا دیتا تھا۔ ان چند پرندوں کو یاد کرتے ہوئے جن کو اس نے حلال

ہونے سے بچا لیا تھا اس کی آنکھوں سے جاری آنسوؤں نے قطار باندھ لی۔

"اور یہ درخت۔" پھر روتے روتے اس نے خود پر سایہ کیے درختوں کو دیکھا۔ وہ اس کی نظروں کے سامنے جڑیں پکڑتے رہے اور اس کی نظروں کے سامنے ہی بڑے ہوتے آسمان کو چھوتے محسوس ہونے لگے تھے۔

"پیپل کے اس درخت کے پتوں کو ہاتھوں میں دبا دبا کر ان کی روٹیاں پکاتا تھا بچپن میں اور آم کے اس درخت سے کیری امبیاں چنتے بڑا ہوا' کسی وقت کا کھانا پسند نہیں آتا تھا تو ان امبیوں (کیریوں) میں پودینے کے پتے ملا کر پیسا نمک مرچ ملا کر روٹی کے ساتھ کھا لیتا' اسے اپنی زبان پر اس چٹنی کا ذائقہ محسوس ہونے لگا۔ آنسوؤں کی قطار مزید بندھ گئی۔

آسمان پر موجود بادلوں کی ٹکریاں ایک جگہ جمع ہونے لگیں' آسمان کا ہلکا نیلا رنگ ان بادلوں کے پیچھے چھپنے لگا۔

"جب کوئی نیک بندہ مرتا ہے نا تو بارش ہونے لگتی ہے' آسمان بھی اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر روتا ہے۔" ماں جنت کہا کرتی تھی۔

"جے اج رات نوں مینہ وس جائے تے فیر اید ھا مطلب میں نیک بندہ ساں (جو آج رات بارش برس جائے تو اس کا مطلب میں نیک بندہ تھا) اس نے سوچا "چھڈ دی" پھر اس نے سر جھٹکا۔ "نیک بندہ ہوندا تے حرام موت مردا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ننھی پڑیا کی طرف دیکھا اور رونے لگا۔

یہ وہ موسم تھا جب گندم کی فصل کاٹی جاتی تھی۔ فضا میں اڑتی دھول اسے گندم کی کٹائی کے منظر یاد دلانے لگی۔ (بندے کٹائی کرتے تو وہ دوڑ دوڑ کر کبھی سب کو پانی پلاتا اور کبھی لسی پلاتا۔ گندم کے خوشوں کو ایک جگہ باندھتا اور پھر سب کو زردہ پلاؤ کھلاتا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا۔

اسی موسم میں ہر طرف میلے لگتے تو وہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ منگو کے میلے پر جاتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے بابے منگو کے میلے کی رونقیں گھومنے لگیں' جھولے' اسٹال' کھیل تماشے' میلے کو یاد کرتے کرتے اسے ماہ نور اور میلے کے سائیں کی یاد آنے لگی۔

سعد باؤ کے نام سے اس کے دل میں ہوک اٹھنے لگی۔

ہائے ککھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں
اوکھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں

اس کے کانوں میں سائیں کی آواز گونجنے لگی۔

"واہ سعد باؤ جی تسی کہندے کھاری من موجی بندہ ہے اور اب آپ ہی کی وجہ سے کھاری موت کے دہانے پر پہنچ گیا۔" اس نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھے۔

"لیکن سعد باؤ کا اس میں کیا قصور' نہ وہ چڑیل ادھر آتی نہ میرے کان میں نئی بات پڑتی۔ جسے سنتا ہوں وہ ہی ماننے سے انکار کر دیتا ہے میں تو نہ اپنے جوگا رہا نہ بیچاری سعدیہ کے جوگا رہا۔"

"سچی گل ہے کہ بندا بے خبر ہی رہے تو چنگا ہوتا ہے' خبر مل جائے تو اس پر بڑا ہی مشکل ویلا آجاتا ہے۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

سعدیہ کہتی ہے چودھری صاحب آئیں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا' لیکن کیا پتا چودھری صاحب آئیں تو کیا نئی بات سنا دیں' بہتر ہے بندہ اس سے پہلے ہی دنیا سے چلا جائے۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑی پڑیا پر گرفت مضبوط کرلی۔

"میں مخول نئیں بننا چاہتا' میں تماشا نئیں بننا چاہتا ہاتھ جوڑے اور فریاد کی۔ میری کسی نے نہ سنی۔ چلو جی نہ سنیں میں نے کون سا دنیا میں بیٹھے رہنا ہے۔ وہ سب مزے کریں میں تو جا رہا ہوں۔"

اپنے جانے کا سوچ کر اس کا دل لرزنے لگا ہاتھ میں پکڑی پڑیا کھولتے ہاتھ لرزنے لگے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے پڑیا میں بندھی دو کیڑے مار گولیاں نکالیں۔ یہ دو گولیاں اس کا ناتا دنیا سے ہمیشہ ختم کر دینے والی تھیں۔

"اتنا آسان ہوتا ہے دنیا سے چلے جانا کیا اتنا آسان ہوتا ہے خود بڑھ کر موت کو گلے لگانا۔" نظر چکرانے لگی۔ زندگی اور زندگی کی ساری لطافتیں اپنے حسین رنگوں کے ساتھ نظروں کے آگے رقص کر رہی تھیں۔

"اوئے کھاری اوئے' اوئے کھاری کدھر چلا گیا تو اوئے؟" درختوں کے جھنڈ سے باہر سے آتی آواز اس کے کان سے ٹکرائی یہ ماسٹر کمال کی آواز تھی۔

"اوئے کھاری نہ اوئے میریا پترا' کوئی پٹھا کام نہ کر بیٹھنا۔"

"کھاری! کدھر ہو تم' اللہ کے واسطے سامنے آؤ۔" سعدیہ پکار رہی تھی۔ قدموں کی آوازیں اور زندہ انسانوں کی پکاریں قریب آتی جا رہی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑی گولیاں لرزتے ہاتھ سے منہ کے قریب لے جاتے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"اوئے کھاری! اوئے رحم کر اپنی جوانی پر' اپنی جوان بیوی پر" وہ کہہ رہا تھا زندگی کی لطافتوں کا رقص تیز ہوئے چلا جا رہا تھا۔ موت کی نیند سلا دینے والی گولیوں والا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔

"اوئے مینوں بچالو ماسٹرجی' میں مرچلا" (مجھے بچالیں ماسٹرجی' میں مرچلا۔) ایک چیخ نما آواز اس کے منہ سے نکلی تھی۔

ماسٹر کمال اس آواز پر چونکا اور درختوں کے کنج کے اندر داخل ہو گیا۔ اڑی ہوئی زرد رنگت' فق ہوتے چہرے اور خوف زدہ نظروں کے ساتھ سامنے بیٹھا کھاری تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ماسٹر کی نظریں اس کے پاؤں کے قریب گری پڑیا اور دو گولیوں پر پڑیں اور اس نے سکھ کا سانس لیا۔

"کھاری نوں سنتے ہی خیراں نیں اوئے منڈیو آؤ اس کو یہاں سے اٹھاؤ۔" اس نے پکار کر باہر پھرتے ملازمین سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میری پیاری سہیلی بہیلی -"

بعد سلام کے عرض ہے کہ یہاں سب خیریت ہے۔ خدا خدا کر کے موسم کی گرمی ختم ہوئی' پرسوں ساون کی پہلی بارش ہوئی اور موسم کھل سا گیا جمعرات کی جھڑی لگی آج تک جاری ہے' سب پیڑ' پودے درخت بہتے دھل گئے' ہماری مسجد کی نئی چھت کچی مٹی کی ہے۔ پکی نہیں' ہاں وہ جگہ جگہ سے ٹپکنے لگی۔ کتنے ہی برس ہو گئے کچی چھتوں والے مکانوں کی عادت نہیں رہی' تمہارے سنگ بیتے سال پرانی سب عادتیں بھلا گئے۔ مولوی سراج کا جگر بڑا مضبوط ہے بولا "مٹی اور توڑی محلے والے منگوا دیں گے تم اللہ کا نام لو اور لیپائی شروع کر دو۔"

ہائے میری بہن' اس پتھر دل سے کوئی کیا کہے کہ آخری دنوں سے ہوں ایسی حالت میں گھٹنوں سے پیٹ جوڑ کر کیا بیٹھوں گی اور لپائی کیا کروں گی' مگر اس کو یہ بات کیسے سمجھاؤں وہ تو پانی سے بھرے بھاری ڈول اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے کو بھی معمولی کام سمجھتا ہے' مونگ اور ماش کی پتلی پانی بھری دال کی کٹوری میں روٹی کے نوالے ڈبو ڈبو کر یوں کھاتا ہے جیسے زندگی کا آخری کھانا کھا رہا ہو۔ اسے موسم کی گرمی' سردی خاصے کے معیار اور کام کی سختی کسی بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اتنے سال تمہاری ڈیوٹی میں گزار کر بھی اسے نہ سلیقہ چھو کر گزرا نہ ادب آداب سیکھ پایا اور میرا یہ حال کہ ذات کی میراثن' در در تالیاں پیٹ پیٹ کر گانے بجانے والی تمہارے ساتھ رہ کر مغل شہزادیوں کے سے نخرے سیکھ گئی۔ اب زندگی یہاں مشکل لگنے لگی ہے' پھر بھی تمہاری ہدایتوں پر عمل

کرتے ہوئے فقر' غنا' توکل اور صبر پر عمل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

تم سناؤ کیسی ہو' یہ اچھا کیا کہ سلائی کڑھائی شروع کر دی' تمہارے سلیقے اور ہاتھ کی صفائی سے میں خوب واقف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ہاتھ کے بنے صوفوں کے غلاف' سرہانوں کے غلاف اور چادریں خوب بکیں گی۔ چکن کاری تم نے کہاں سے سیکھی یہ ضرور بتانا' مجھے پتا تو نہیں کہ یہ کیسی ہوتی ہے مگر خیال آتا ہے کہ خوب شاندار کام ہو گا یہ بھی۔ دیکھ لو اللہ بھی انسان کے رزق کے لیے کیسے کیسے سبب بناتا ہے۔ میری مانو تو اس شخص دولہا بھائی کو کبھی معاف نہ کرنا' تمہارے ان حالات کا سب کا سب ذمہ دار وہی شخص ہے۔ نہ وہ زندگی میں آتا نہ طیفا تمہارا دشمن بنتا۔

میری مانو پچھلے صحن کا دروازہ کنڈا لگا کر بند رکھا کرو بلکہ اس میں تالا ڈال کر رکھو بڑا سا۔ دل ہر وقت تمہاری طرف اٹکا رہتا ہے۔ مولا تمہیں محفوظ رکھے' تمہاری شان اونچی رکھے' دل اڑتا ہے تمہارا سوچ کر۔ ایک یہ مولوی سراج ہے مجال ہے بلال سلطان کے خلاف کوئی بات سن جائے۔ یہ اس کا بہت بڑا وکیل ہے بھئی۔ اسی لیے تو کہتی ہو کسی اونچ نیچ' سرد گرم سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہاں! تمہارے کہنے پر ادھر ادھر بہت ڈھونڈنے کے بعد ان ماسٹر صاحب کا پتا چلا ہے۔ جن کے گھر پر ٹیلی فون لگا ہے۔ ایک گلی چھوڑ ان کا گھر ہے ایک روز میں گئی تھی ان سے نمبر لینے' بیچاروں نے ٹیلی فون بھی سرپوش میں چھپا رکھا تھا۔ دیکھ کر مجھے خوب ہی ہنسی آئی۔ ٹیلی فون کا نمبر لکھ کر بھیج رہی ہوں' ضرور فون کرنا' ماسٹرجی کہہ رہے تھے' چھ منٹ کی کال بک کرائے گا کوئی تو ہم آپ کو اطلاع دے پائیں گے' تو چھ منٹ سے کم کی کال نہ بک کرانا۔

دائی سیماں نے مجھے دو ہفتے بعد کا وقت بتایا ہے' میرا دل ابھی سے گھبراتا ہے۔ دعا کرنا میں ساتھ خیریت کے فارغ ہو جاؤں۔ اس حالت میں یہاں صرف میرا اللہ ہے اور میں ہوں۔۔۔ مولوی سراج سرفراز کی بلا سے بچہ پیدا کرتے میری چٹنی بنے یا مربہ۔ وہ تو یہ ہی کہے گا۔ "یہ کون سا غیر معمولی کام ہے رابعہ بیگم! ساری دنیا کی عورتیں بچہ پیدا کرتی ہیں۔" ہونہہ جانے دو' مولوی سراج سرفراز کی بات کو کیا اہمیت دینی۔ اب رخصت ہوتی ہوں چٹھی کا جواب ضرور اور جلد دینا' تمہیں میری قسم۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

فقط تمہاری بہن' رابعہ کلثوم

☼ ☼ ☼

ماسٹر کے گھر پر مولوی سرفراز سراج اور ان کی بی بی کے لیے ٹیلی فون پر ایک پیغام کا مکالمہ۔۔۔

"بھائی صاحب! میں لاہور سے رابعہ بی بی کی بہن شہناز بات کر رہی ہوں۔ دونوں کو پیغام پہنچا دیجیے کہ فوراً لاہور پہنچ جائیں۔"

"پیغام تو پہنچا دیں گے بہن' لیکن ان کا لاہور پہنچنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کی بی بی کے ہاں چند دن پہلے ہی ولادت ہوئی۔ اللہ نے بچی عطا فرمائی ہے ان کو' زچگی کی حالت میں کیسے سفر کریں گی وہ؟"

"ٹھیک ہے۔ بہن! ابھی لڑکا بھیج کر پیغام پہنچاتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیے۔"

☼ ☼ ☼

"گھبرا کیوں گئے سراج سرفراز' لگتا ہے پہچانا نہیں۔ ہاں بھئی' بہت سال جو گزر گئے ملاقات ہوئے۔"

آنے والے نے مولوی سراج کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ مولوی سراج کے حلق سے آنے والے کی بات کے جواب میں الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔ ان پر ایک عجیب سی رقت طاری ہو رہی تھی۔ ان کی آواز بھرانے لگی تھی اور آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

"بڑی مشکل سے مگر اتفاقاً" تمہارا سراغ لگا میرے ہاتھ سراج! یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔" آنے والے نے سراج سرفراز کا ہاتھ پکڑ کر انہیں نیچے صف پر بٹھاتے ہوئے کہا اور خود بھی ان کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"لیکن ایک مختصر عرصے کی تلاش کے بعد میں نے تلاش کرنا چھوڑ دیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ایک مختصر عرصے کی تلاش کے بعد گویا میں نے کچھ بھی کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سب کچھ جیسے آپ ہی آپ ہوتا رہا' میں تو بس نظارہ کر رہا تھا۔"

مولوی سراج نے دائیں بائیں دیکھا اور کچھ کہنا چاہا۔ الفاظ ایک مرتبہ پھر اس کے حلق میں پھنس گئے۔

"مگر اس وقت میں اپنی کرنے تو نہیں آیا نا۔" پھر اس نے نرمی سے مولوی سراج کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"اس وقت تو میں تمہاری سننے آیا ہوں کدھر رہے' کہاں گم ہو گئے تھے؟"

"ق۔۔۔ ق۔۔۔ قت۔" مولوی سراج کے منہ سے کانپتے لرزتے الفاظ نکلے۔ "قت۔۔۔ قتل کا کیا ہوا۔"

انہوں نے بمشکل الفاظ ادا کیے اور مسجد کے داخلی دروازے کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہاں کوئی کھڑا ہو۔ مہمان نے بھی ان کی نظروں کی تقلید میں دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دھیان دوبارہ مولوی صاحب کی طرف کر لیا۔

"وہ۔۔۔ وہ ایک بھولی بسری کہانی بن گیا۔"

"ک۔۔۔ کس پہ پڑا؟" مولوی صاحب نے اس شخص سے آنکھیں چراتے ہوئے پوچھا۔

"تم پر نہیں پڑا' تم فکر نہ کرو۔" وہ مسکرایا۔ اس کے یہ الفاظ جیسے جادو کا سا اثر کر گئے۔ مولوی سراج سرفراز کے عظیم جثے کے اندر دھڑکتے دل' اس کی رگ رگ' نس نس۔۔۔ ریشے ریشے کے کونوں' کھدروں میں نجانے کب سے چھپا ہمہ وقت کا ایک خوف رینگ رینگ کر باہر نکلنے لگا۔ انہیں یکایک اپنا وجود' دل' دماغ سوچ سب ہوا سے بھی ہلکی محسوس ہونے لگی۔ انہیں ایسا لگا ان کا جسم جو نجانے کب سے چابکوں کی زد میں تھا۔ یکایک کسی انتہائی آرام دہ' نرم گرم' سایہ دار مقام پر آ ٹھہرا ہو۔

انہوں نے برسوں کے تکلیف دہ اس احساس سے نجات حاصل کرنے پر ایک لمبا گہرا سانس لیا۔ لیکن اس سانس کے ساتھ ہی انہیں اتنے برسوں کی خواری' خوف اور آبلہ پائی یاد آنے لگی اور ایک شدید قسم کا غصہ' ناراضی اور تناؤ ان کے اعصاب سے آ چمٹا۔

"مجھ پر نہیں پڑا اور ہم اب تک چوروں کی سی زندگی گزارتے آئے۔ کبھی ایک جگہ چھپ کبھی دوسری جگہ چھپ' بستی بستی اپنی شناخت چھپاتے' لوگوں کے سوالوں سے بچتے۔۔۔ آپ کی دھمکی ہماری زندگیوں کے کتنے سال کھا گئی بھائی صاحب! کچھ معلوم بھی ہے۔" ان کی سرمہ لگی آنکھیں ناراضی اور غصے کے احساس کے تحت جلنے لگیں۔

"وہ دھمکی۔۔۔" آنے والے نے شدید حیرت کے ساتھ مولوی سراج کو دیکھا۔ "یا میرے خدا۔" اس نے اپنا سر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور چند لمحوں کے بعد مولوی صاحب کی طرف دوبارہ دیکھا۔

"سچ کہتی تھی مرحومہ' سراج سرفراز دماغ سے نہیں گردوں سے سوچتا ہے اور اسے دیکھو رابعہ بی بی کو' کیسی عقل مند اور قیافہ شناس بنتی تھی' باتوں باتوں میں اگلے کی عزت اتار بھی لیتی تھی اور اسے بادشاہ بھی ثابت کر دیتی تھی۔ وہ بھی تم جیسے گھامڑ کے ساتھ رہ رہ کر اتنی ہی گھامڑ ہو گئی۔ بخدا مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"تو کیا لگائی نہیں تھی دھمکی' خدا کی قسم سراج قتل تم پر ڈال دوں گا۔" مولوی صاحب نے ناراضی بھری نظروں سے دیکھا۔ اس وقت ان کو خود اپنا آپ برسوں بعد گلیور محسوس ہو رہا تھا اور اپنے سامنے بیٹھا شخص ایک ننھا سا

بونا نظر آ رہا تھا۔ جس ایف آئی آر کے خوف نے ان دونوں میاں' بیوی کو اتنے برس ادھر ادھر بھگایا' کہیں مستقل ٹھکانا بنانے نہیں دیا۔ اپنی شناخت چھپانے پر مجبور کیے رکھا۔ سعدیہ کی پیدائش کا اندراج تک کرانے سے روک دیا۔ وہ تو بقول اس شخص کے کبھی کٹی ہی نہیں تھی اور وہ ہر لمحے کسی بھی نئی آہٹ کی آواز سن کر اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگتی محسوس کرتے رہے۔ ان کا جسم پولیس کے ٹارچر سیل کے اوزاروں کا تصور کر کے خوف سے کانپ کانپ جاتا رہا۔

"تم اس دھمکی کو سچ سمجھے تھے کیا؟" اس شخص نے جس کا نام بلال سلطان تھا سوال کیا۔

"آپ میری اوقات اور بساط کو کیا سمجھتے ہیں بھائی صاحب! آپ کی دھمکی نے میری زندگی کو روگ لگا دیا۔" سراج سرفراز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں نے۔۔۔" بلال سلطان نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی دم کوئی تیز قدموں سے بھاگتا مسجد کے صحن میں داخل ہوا۔

"مولوی جی' مولوی جی۔۔۔" آنے والا ہانپتے ہوئے بولا۔ "بڑا قہر پڑ گیا ہے جی' کھاری نے کیڑے مارنے والی گولیاں کھالی ہیں' چھیتی کرو مولوی جی! سعدیہ باجی کا کوئی حال نہیں۔"

مولوی صاحب کے چہرے کی نسوں میں تازہ تازہ اترتا خون ایک مرتبہ پھر نچڑ سا گیا ان کا رنگ زرد اور چہرہ دوبارہ سے فق ہو گیا۔

"مولوی جی! بھین جی کو میں لے آیا ہوں' دیر مت کرو باہر موٹر سائیکل کھڑی ہے' دیر کرنے والی بات کوئی نہیں ہے جی۔" آنے والا کہہ رہا تھا اور مولوی صاحب اپنا صافہ سنبھالتے پل میں کھڑے ہو گئے۔ آنے والے مہمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

"تمہارے داماد نے گولیاں کھالی ہیں' آپ نے دیکھا ہم پر ہر دم کیسا کیسا کڑا وقت پڑتا ہے۔"

"میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ' کہاں ہیں تمہاری بیٹی اور داماد" بلال سلطان کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ادھر ہیں جی فارم ہاؤس پر۔" اطلاع لانے والے نے ہاتھ سے کسی سمت اشارہ کیا۔

"اوہ فارم ہاؤس۔" بلال سلطان نے کہا۔ "ادھر تو مجھے بھی جانا تھا۔" انہوں نے تیزی سے جوتے پہنے اور ایسا کرتے ہوئے ان کی نظر سراج سرفراز کے رنگ اڑے پرانے کھسے پر پڑی' جس میں سراج کے پاؤں بے بسی سے محفوظ تھے۔

"اچھا جی!" اطلاع دینے والے نے کہا "پھر لگے آؤ میرے پیچھے' مولوی جی!" اس نے سراج سرفراز کو مخاطب کیا۔ "آپ باؤ صاحب کے ساتھ آ جاؤ گڈی پر' میں بھین جی کو لے کر پہنچتا ہوں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

مولوی سراج سرفراز نے خفا نظروں سے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

"چلو سراج دیر کرنے والا معاملہ تو نہیں ہے۔" بلال سلطان داخلی دروازے تک پہنچ کر بولے۔

"تمہاری وجہ سے آپ کو تکلیف ہو گی بھائی صاحب!" مولوی صاحب نے اسی خفا لہجے میں کہا۔

"تمہاری بیٹی میری بیٹی اور تمہارا داماد بھی میرے بیٹوں جیسا ہی ہے سراج مجھے کیا تکلیف ہو گی۔" وہ تیزی سے بولے "جلدی کرو اب کہیں لیٹ نہ ہو جاؤ۔" وہ داخلی دروازے سے باہر نکلے۔ اطلاع دینے والا ٹوپی برقعے میں چھپی رابعہ کلثوم کو موٹر سائیکل پر اپنے پیچھے بٹھائے آگے اڑا جا رہا تھا۔ بلال نے اپنی گاڑی کے لاک ریموٹ کنٹرول سے کھولے اور سراج سرفراز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مولوی جی کیوں نہیں آئے صابر بیٹا؟" رابعہ کلثوم نے موٹر سائیکل والے سے پوچھا تھا۔

"وہ لگے آ رہے ہیں جی پیچھے گاڑی میں' شہر والے کسی پروہنے کے ساتھ۔" صابر نے جواب دیا۔ رابعہ کلثوم

نے حیران ہوتے ہوئے گردن ذرا سی موڑ کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے ایک لمبی سیاہ گاڑی کچے پکے 'اونچے نیچے راستوں پر چلتی آرہی تھی۔

"سراج سرفراز کو کسی نے گاڑی میں لفٹ دے ڈالی۔" رابعہ کلثوم کے دل میں سوال اٹھا لیکن اگلے ہی لمحے کھاری کے متعلق دل دور خبر اس خیال پر حاوی ہو گئی۔

"اللہ جی میرے کھاری کو سلامت رکھنا' اللہ جی میری سعدیہ کا سہاگ سلامت رکھنا۔" وہ مسلسل دعا کیے جا رہی تھیں۔

✲ ✲ ✲

"چوہدری جی! چوہدری صاحب" فارم ہاؤس میں چوہدری سردار کی گاڑی داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے فارم ہاؤس کے ملازم گاڑی کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

"کیا ہو گیا کاکا! خیر تو ہے؟" چوہدری سردار نے اپنی سیٹ کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

"کھاری نے خودکشی کرلی ہے جی' اس نے گندم والی گولیاں کھالی ہیں۔" دل دہلا دینے والی خبر ہر طرف سے ان کے کان میں پڑی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی فلزا ظہور کا دل بھی چوہدری صاحب کے دل کے ساتھ ساتھ بیٹھ گیا۔

"اوئے کم بختو! یہ کیا سنا رہے ہو" چوہدری صاحب یکایک جذبات میں آتے ہوئے بولے۔ "کدھر ہے کھاری' کیا حالت ہے اس کی' اوئے تم سے ایک اتنے سے لڑکے کی حفاظت نہ ہوئی ذلیلو! کیا کہا کسی نے اسے جو وہ گولیاں کھا بیٹھا الو کے پٹھو!"

وہ گرج رہے تھے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ فلزا ظہور نے بھی تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ باہر کھڑے نتھے سے ہجوم کی موجودگی کے احساس سے خود بخود اس کا ہاتھ اپنے گلے میں جھولتے اسکارف تک گیا اور اس نے اسے سر پر اوڑھ لیا۔

"ادھر جی!" ایک شخص نے ایک سمت اشارہ کیا' وہ شخص زارو قطار رو رہا تھا۔

"ادھر جی ماسٹر کمال نے اسے ڈھونڈا ہے کنج کے اندر جی' وہ ادھر پڑا تھا۔ پتا نہیں مر گیا کہ بچ گیا' ماسٹر جی کسی کو ادھر جانے نہیں دے رہے۔"

چوہدری سردار تیزی سے فارمنگ ایریا میں موجود کنج کی طرف بڑھے۔ فلزا ان کے پیچھے تھی۔

✲ ✲ ✲

"ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق
لرزے ہے موج مے تیری رفتار دیکھ کر"
ثابت ہوا ہے' ثابت ہوا ہے
گویا ثابت ہو گیا ہے گردن بلال سلطان پر خون خلق
نہیں نہیں خون خلق نہیں
خون مدر آف سعد سلطان
گو ان کا نام نامعلوم ہے اب تک

ماہ نور' فضل حسین اور میمونہ بی تک رسائی کے بعد ہاتھ آنے والی معلومات کی خوشی میں مگن تھی اور اس وقت ہاتھ آئی معلومات کے نوٹس بناتے ہوئے اپنے بابا کے منہ سے ہزاروں بار سنا شعر دہرانے چلی جا رہی تھی۔ شعر دہراتے دہراتے اس نے اس کا مفہوم تازہ تازہ ہاتھ لگی معلومات سے جوڑ دیا۔

"گردن فلزا ظہور پر خون خلق۔"

اچانک اس نے شعر کا تعلق فلزا ظہور سے جوڑ دیا۔

آخ' اس کو اپنے حلق میں کڑواہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ "مجھے تو پہلی نظر میں وہ خاتون مشکوک سی لگی تھیں' دیکھا اس کا تعلق جڑ گیا نا قتل کی اس پراسرار واردات سے۔" اس نے سوچا۔ "اس کو دیکھو سعد کہاں کہاں پہلی ملاقات میں اسے مس ہیولیشیم قرار دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا وہ Caldro میں ابلتا محلول پلانے والی مخلوق تھی' کہاں اس کا نمبر خصوصی رنگ ٹون کے ساتھ فون میں محفوظ کر رکھا ہے اور اس کے دکھ پر رویا جا رہا ہے۔" وہ جھنجلانے لگی تھی۔

"خیر فی الحال تو ثابت ہو گیا ہے گردن نجانے کس کے خون مدر آف سعد۔" پھر اس نے سر جھٹک کر اپنا دھیان دوبارہ شعر کی طرف کر لیا۔ اور اس دوران اپنے لیپ ٹاپ پر نیا ٹیب کھول کر سوشل ویب سائیڈ پر اپنا اکاؤنٹ چیک کرنے لگی۔

"اُفوہ اتنے سارے نوٹی فیکیشنز۔" وہ حیران ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"کب سے میں لاگ ان نہیں ہوئی ادھر۔" یاد کرتے کرتے نوٹی فیکیشنز چیک کر رہی تھی۔

اس سلمان کو تو صرف نئے نئے پیجز لائیک کرنے کے سوا کوئی کام نہیں' سلمان سے متعلق نوٹی فیکیشنز چیک کرتے کرتے وہ مسکرائی۔ سلمان نے اس دوران بیسیوں نئے پیجز پسند کیے ہوئے تھے۔ یونہی بے دھیانی میں اس نے سلمان کے پسند کردہ ایک صفحے کو کلک کر دیا۔ یہ سیاحت سے متعلق کوئی غیر ملکی صفحہ تھا۔ جس پر مختلف سیاحتی مقامات کی تصویروں اور ان کے متعلق معلومات کی بھرمار تھی صفحے کو اوپر نیچے کرتے ہوئے دیکھتے دیکھتے اپنے باکس کی طرف جاتے ہوئے اچانک اس کی نظر ایک تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر ایک اتنے مانوس شخص کی تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ زندگی میں پہلی بار جہاز کا سفر کر رہی تھی۔ اور یہ سفر کرنے سے پہلے اسے ٹی وی پر دیکھے ایسے پروگرام یاد آتے رہے تھے جن میں ہوائی حادثوں کی ویڈیوز دکھائی جاتی تھیں۔ اس کا دل ایک انجانے خوف کے تحت بلاوجہ دھڑک رہا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ سفر کرنے والی ضوفشاں اور یسی آنٹی کے لیے جیسے یہ ایک معمولی بات تھی۔

"کتنی عجیب بات ہے نا سارہ! ہم جہاز میں سفر کر رہے ہیں' سفر کر کے ایک سے دوسرے ملک میں چلے جائیں گے اور یہ سفر بھی ہم عام مسافروں والے اکانومی کلاس میں نہیں بزنس کلاس میں کریں گے' جیک پاٹ ہاتھ لگنا اسے ہی کہتے ہیں غالباً" جیک پاٹ "ائیر پورٹ پر چیک ان کرتے ہوئے یسی آنٹی نے اس کے کان میں کہا تھا۔

"جو ہم اب تک گزارتے آئے وہ ایک خواب تھا یا یہ ایک خواب ہے یسی آنٹی! میں فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔" اس نے نیچی آواز میں جواب دیا تھا۔ یسی آنٹی نے یہ جواب سن کر اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔ سیاہ ٹراؤزر پر سفید کرتی پہنے' سیاہ جیکٹ میں ملبوس وہ ایک ہاتھ سے اپنے سامان کی ٹرالی خود گھسیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے بال جدید انداز میں ترشے ہوئے تھے اور اس کے چہرے کی رنگت صحت مندی کی چمک سے مالا مال تھی۔

"اور جو ہم جاپان جاتے چین کے بجائے تو کیا خبر ہمیں وہاں رکو مل جاتا۔" یسی آنٹی نے اور سرگوشی کی۔ ایک آسودہ زندگی کا سکون اور اطمینان یسی کے چہرے سے بھی جھلکتا تھا۔

"آپ نے غلط کہا یسی آنٹی' رکو جاپانی نہیں پاکستانی تھا۔ اسے ملنا ہو گا تو پاکستان میں ہی ملے گا۔" سارہ نے اپنے فون کے ہینڈز فری کو کان میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"پاکستان کون سا چھوٹا ملک ہے' یہاں رکو کال جانا کون سا آسان کام ہوگا" سیمی نے سرد آہ بھری۔ "مگر یہ دنیا جس طرح کے عجیب اتفاقات سے بھری پڑی ہے اس میں یہ ناممکن بھی نہیں کہ رکو ہم سے آ ٹکرائے" اس نے سوچا اور پھر اپنے ارد گرد چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھ کر چہرے پر ہائی سوسائٹی لیڈی کا تاثر سجا کر رعب داب کے ساتھ آگے چلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"شاید تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تمہیں زندہ اور صحت مند دیکھ کر میں کتنا خوش ہوں۔" وودن زادے نے اسکائپ پر سعد سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم میری زندگی میں پیش آنے والا پہلا معجزہ ہو" وہ کہہ رہا تھا "تم جانتے ہو تمہارے ڈاکٹرز بالکل مایوس تھے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میری زندگی تمہاری ضد کا نتیجہ ہے۔" سعد نے جواب دیا تھا۔

"نہیں یہ میری ضد کا نہیں تمہاری بہن کی دعاؤں اور اس کے ایمان کا نتیجہ ہے۔ یہ اللہ کی مرضی کا نتیجہ ہے۔" وودن نے جواب دیا۔

"جہاں تک میں اندازہ کر سکتا ہوں' تمہاری یہ سوچ ایک بڑے انقلاب کی نشان دہی کر رہی ہے۔" سعد چونکا۔

"ہاں شاید۔" وودن نے مسکرا کر سر ہلایا "تمہارے ساتھ تمہارے لیے ہسپتالوں میں گزارے وہ چند دن شاید انقلاب ہی کا باعث بنے۔ مجھے تمہاری بہن کی دعاؤں اور اللہ پر ایمان نے ہلا کر رکھ دیا۔"

"اوہ خوب!" سعد کے چہرے پر عجیب سا طنز ابھرا "اچھی بات ہے۔" اگلے لمحے اس نے چہرے کے تاثر کو چھپا لیا تھا۔

"تمہاری بہن کو مغرب میں عمر گزار دینے کے باوجود پراسرار مشرق کے فسوں نے اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔"

"ہاں معصوم ہے اور نادان بھی۔" سعد نے کہا۔

"تمہاری سوچ ہے کہ وہ کتنی سمجھ دار ہے۔" وودن نے اس سے اختلاف کیا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہو۔"

"تو کیا تم متاثر نہیں ہو۔"

"میری بات اور ہے' میری وہ بہن ہے اور اس رشتے کے ناتے مجھے اس سے جتنا پیار ہے اس میں اس کی معصومیت اور نادانی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔" سعد کا لہجہ سپاٹ ہوا۔

"اور مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے نادان وہ نہیں تم ہو' دوست تم اپنے ساتھ ہونے والے معجزے کو سمجھ نہیں پا رہے۔" وودن کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

"میں جس ذہنی درجے پر کھڑا ہوں' وہاں موت' زندگی دونوں ہی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔"

"اس کا مطلب میرا اندازہ درست تھا' اس روز دیر ڈیل سلی رنگ کے سب سے اونچے مقام پر تم دانستہ سلی انگ کرنے گئے تھے۔ جبکہ موسم اور سورج کا زاویہ اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔" وودن نے چونک کر کہا۔

"تمہارا خیال ہے میں جس ذہنی درجے پر کھڑا ہوں' وہاں انسان آسانی سے خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔"

"یہ مجھے نہیں معلوم" وودن نے سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ جس ذہنی درجے پر تم کھڑے ہو وہاں انسان مثبت اور منفی کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے سب منفی دکھائی

ے لگتا ہے۔ اور یہ ذہنی تنزلی کی ایک بری مثال ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ میرے دوست احباب اور وہ لوگ جو مجھے جانتے تھے مجھے 'مسٹر پرفیکٹ' کہہ کر پکارتے ...؟" سعد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"وہ ان کی خام خیالی تھی شاید۔" وودن ہنس دیا "پرفیکشن انسان کی خوبی نہیں ہے' پرفیکٹ ہونا انسان کے ...قدر میں لکھا ہی نہیں۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تم نادیہ سے مرعوب ہو رہے تھے۔"

"مرعوب نہیں میں اس کی خوبیوں کا قائل ہو رہا تھا۔ ایسے میں بھی میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ایک پرفیکٹ ...ی ہے۔ غالباً" ایسا تو وہ خود بھی اپنے لیے کہلوانا پسند نہیں کرے گی۔"

"الفاظ کا گھماؤ پھراؤ بات کے معنی نہیں بدل سکتا۔" سعد کا لہجہ سپاٹ ہوا۔

پچھلے پندرہ منٹ سے سعد کے پیچھے کھڑی ان دونوں کی گفتگو سنتی نادیہ نے بے چینی سے چھت کی طرف دیکھا۔ سعد کے بعض رویے اس کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتے تھے۔ اس نے وودن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سعد کی تلخ باتیں سن کر بھی ناراض نہیں لگ رہا تھا۔

"بات کے معنی بدل کون رہا ہے' بدلنا چاہتا کون ہے دوست" وودن مسکرایا تھا۔ "فی الحال تم ان سب فلسفوں کو چھوڑ کر اپنی نئی زندگی سے لطف اٹھاؤ اور مجھے یہ بتاؤ کہ پکاڈلی میں کپڑا بچھا کر گٹار بجاتے ہوئے پیسہ کمانا کب سے شروع کر رہے ہو۔"

"شاید بہت جلد۔" سعد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"شاید کا لفظ ساتھ مت لگاؤ' کہو بہت جلد۔" وودن نے کہا۔ "انسان کے ارادے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں امارت سے غربت تک' محل سے فٹ پاتھ کا سفر کرنے کا بہت شوق ہو رہا تھا نا۔ شاید اسی لیے اللہ نے تمہیں موت کے منہ سے بچا لیا۔"

"طنز کر رہے ہو۔" سعد نے کہا۔

"حقیقت بیان کر رہا ہوں۔" وودن مسکرایا۔ "برائے مہربانی اپنے روزانہ کے تجربات مجھے میل کرنا نہ بھولنا۔"

"ضرور۔" سعد نے کہا اور اسکائپ کال بند کر دی۔

"تم اسے تنگ کر رہے تھے یا وہ کہہ رہے تھے جو کہنا چاہ رہے تھے۔" نادیہ اس کے عقب سے نکل کر سامنے آ گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔" سعد نے ابرو چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے تمہارا مزاج خراب ہو رہا ہے' تم گستاخ ہو رہے ہو اور تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو۔" نادیہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ سعد نے جھلا کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"اب یہاں ماہ نور ہوتی تو یقیناً" تمہارے مزاج میں بہتری لا سکتی تھی۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"بند کرو نادیہ! برائے مہربانی بند کر دو اس موضوع کو۔" سعد تلخ ہوتے ہوئے بولا "میں اس موضوع سے جتنا بچنا چاہتا ہوں۔ اتنا ہی تم یہ موضوع چھیڑ کر بیٹھ جاتی ہو۔"

سعد کی تلخ بات سن کر نادیہ کو برا نہیں لگا تھا' بلکہ وہ چپکے سی مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

کنج سے کھاری کو تین بندے اٹھا کر باہر کھلی فضا میں لائے تھے۔ اسے اس وقت تک وہاں لائی گئی چارپائی پر لٹا

دیا گیا تھا' کھاری پر غشی طاری تھی۔ ماسٹر کمال نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور اپنے صافے سے اس کو ہوا دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر آیا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ سعدیہ اور ماسی رشیدہ چارپائی کی پائنتی کے قریب بیٹھی کھاری کے تلوے سہلا رہی تھیں۔

"او جی مینوں بچالو' ہائے ماسٹر جی موت بڑی ڈاھڈی شے ہے' میں اجے مرنا نہیں چاہندا' ماسٹر جی مینوں کدھرے لے چلو' مینوں بچالو" کھاری نیم بے ہوشی کے عالم میں سر ادھر ادھر مارتا بول رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا میرے بیٹے' میں تجھے مرنے نہیں دوں گا۔" ماسٹر کمال چہرے پر کپڑا پھیرتے ہوئے اسے چمکارتا جا رہا تھا۔

"میں نے گندم والی گولیاں کھالی ہیں ماسٹر جی!" کھاری نے آدھی آنکھیں کھول کر کہا تھا۔ سعدیہ اور ماسی رشیدہ گھبرا کر سر پیٹنے لگی تھیں۔ ماسٹر کمال نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دونوں کو خاموش کرا دیا اور ہاتھ ہی کے اشارے سے انہیں سمجھانے لگا کہ کھاری پر صرف خوف طاری تھا اس نے گولیاں نہیں کھائی تھیں۔ کسی نے چارج ایبل پیڈسٹل فین لا کر کھاری کے سرہانے رکھا۔ چہرے پر براہ راست ہوا پڑنے سے وہ ذرا پرسکون ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔

"کدھر ہے کھاری' کیا ہوا اس کو' او ئے کم بختو کھاری کو کچھ ہو گیا تو میں نے تم سب کو فائر مار دینے ہیں لائن میں کھڑا کر کے۔" اسی وقت جذبات میں آئے چودھری صاحب گرجتے برستے وہاں پہنچ گئے ان کے پیچھے سراسیمہ فلزا بھی تھی۔

"ستے ہی خیراں نیں چوہدری جی' کھاری کو کچھ نہیں ہوا۔" چودھری سردار کو دیکھ کر ماسٹر کمال ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"اس کی حالت غیر ہو رہی ہے اور تم کہہ رہے ہو اسے کچھ نہیں ہوا۔" چودھری صاحب تیزی سے چارپائی کے قریب پہنچے۔

"کملا ہے چودھری صاحب! شیدائی ہے' بڑا بہادر بن کر گولیاں کھانے چلا تھا" ماسٹر کمال نے پرسکون لہجے میں کہا "ڈر گیا ہے' گولیاں اندر کنج میں نیچے گری پڑی ہیں' یہ ان کی دہشت سے ہی نیم بے ہوش ہو گیا۔" چوہدری سردار ذرا مطمئن ہو کر کھاری پر جھک گئے۔

"سعدیہ باجی کی امی جی آگئیں' بھین جی آگئیں۔" کسی نے آواز لگائی اور اس منظر میں رابعہ کلثوم آن کھڑی ہوئیں۔ ارد گرد کھڑے ہجوم کی وجہ سے انہوں نے برقعے کا جالی دار نقاب اوپر نہیں اٹھایا تھا' لیکن چارپائی پر بے سدھ پڑے کھاری کو دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ ماں کو سامنے دیکھ کر سعدیہ لپک کر ان کے سینے سے جا لگی تھی۔ دونوں ماں بیٹیاں بلند آواز میں رو رہی تھیں۔

"مولوی جی بھی پہنچ گئے ہیں جی!" ایک اور آواز آئی اور اسی منظر میں تیز قدموں سے چلتے مولوی سراج سرفراز کے ساتھ بلال سلطان بھی داخل ہو گئے۔ روتی ہوئی آپا رابعہ اور سراسیمہ کھڑی فلزا ظہور کی بیک وقت بلال سلطان پر نظر پڑی تھی۔ ماضی کی کہانی کے سب اہم کردار برسوں بعد ایک منظر میں اکٹھے ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میرا پہلا پاکستانی دوست' میری زندگی کا پہلا آنکھوں دیکھا معجزہ۔" کے اسٹیٹس کے ساتھ سعد سلطان کی تصویر امریکا کے کسی شخص نے سیاحت نامی اس صفحے پر اپ لوڈ کر رکھی تھی جسے ماہ نور کے بھائی سلمان نے پسند کیا تھا اور جیسے ماہ نور اپنے بھائی کی تقلید میں دیکھنے کے لیے نظروں کے سامنے روشن کر چکی تھی۔

وودن زادے نامی شخص کی اپ لوڈ کی وہ تصویر ماہ نور کے لیے بھی معجزہ ثابت ہوئی تھی۔

"کون کہتا ہے کہ ڈھونڈے سے کچھ نہیں ملتا۔ کون کہتا ہے کہ لگن سچی بھی ہو تو مشن ادھورے رہ جاتے ہیں۔" ماہ نور کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

اس نے اسی دم اس شخص وودن زادے کے پروفائل کو پڑھا اور اس کے نام ایک طویل پیغام لکھنے کے بعد اسے دوستی کی درخواست بھی بھیجی تھی۔

سعد سلطان' وودن زادے کے لیے معجزہ کیسے ثابت ہوا تھا۔

سعد سلطان کہاں اور کس حال میں تھا۔

اسے سعد سلطان تک پہنچنا تھا۔

وودن زادے کے نام پیغام ان تین باتوں کو مرکز میں لیے ہوئے تھا۔

نصف شب کے قریب وودن زادے کی طرف سے اس پیغام کا جواب اور دوستی کی درخواست قبول کرنے کا پیغام آچکا تھا۔

"We found love in a hopeless place"

نصف شب کے قریب ماہ نور کے کمرے میں رائی حانہ کا گیت زور زور سے بجتا سنائی دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اختر نے اپنی کٹیا سے باہر نکل کر باہر کے منظر کا نظارہ کیا۔

"سائیں جی خیر تو ہے نا۔۔۔ مجھے آواز دے لی ہوتی" گھاس پھونس کی آگ جلاتا عبدالودود اٹھ کر اختر کے قریب آیا۔

"کوئی کام نہیں تھا برخوردار! اس لیے آواز نہیں دی۔" اختر نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی دم جاتا ہے کہ اس ویرانے میں رونق لگنے لگے گی۔" عبدالودود سامنے دیکھتا ہوا بولا۔ "جدید ترین ماڈل کی قیمتی ترین گاڑیوں سے لے کر موٹر سائیکل آٹو رکشے' سائیکلیں' سائیں جی بہتر ہو گا ادھر ایک پارکنگ اسٹینڈ بنوالیں' بعض لوگوں کو بڑی دقت ہوتی ہے لوگ کسی اصول کے بغیر پارکنگ کرتے ہیں اور خواتین تو اکثر ہی شکوہ کرتی ہیں۔ ملک صاحب سے بولیں ادھر فائبر گلاس کا سائبان بھی لگوا دیں' ڈیرا ڈیرا لگنے لگے گا۔" اختر نے دلچسپی اور توجہ سے عبدالودود کی بات سنی اور سامنے دیکھنے لگا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر ڈوبتا سورج۔ بڑھتی شام کے سائے بڑھا رہا تھا۔

کونجاں وانگ مولیاں دیس چھڈے

سب' شبیہ تے فقیر دا دیس کیا

اگلے لمحے اس خاموشی اور تنہائی کے سکوت میں اختر کی مترنم آواز سنائی دینے لگی تھی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

اس زہر بجھی تنہائی میں
اک عمر گزاری ہے ہم نے
دن رات اُداسی چپکے سے
سانسوں میں اُتاری ہے ہم نے
کچھ میرے دل کی بات سنو
کچھ اپنے دل کی بات کہو
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو
ہم پیاسے ہیں صحرا کی طرح
تم بہتے ہو دریا کی طرح
ہم خشک جزیروں کے باسی
تم ہو گھنگھور گھٹا کی طرح
کچھ دیر ہمارے تن من میں
خوشبو کی طرح چپ چاپ بہو
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

عرفان صادق

گھر سے نکلے دیر ہوئی ہے، گھر کو لوٹ چلیں
گونگی راتیں دھوپ کڑی ہے، گھر کو لوٹ چلیں

دُور سے تیرے میت آئے ہیں تجھ سے پریت نبھانے
روزن پر زنجیر پڑی ہے، گھر کو لوٹ چلیں

دھیمے دھیمے آنچل والی آج بھی آس لگائے
دروازے پر آن کھڑی ہے، گھر کو لوٹ چلیں

بستی بستی چرچا جن کا سنتے سنتے آئے
شہر میں آ کر بات کھلی ہے، گھر کو لوٹ چلیں۔

کل چغتائی ہم وحشی تھے، آج بھی ہم دیوانے
کب سے اپنی آس لگی ہے گھر کو لوٹ چلیں

زاہد حسین چغتائی



تھی جس کی جستجو وہ حقیقت نہیں ملی
ان بستیوں میں ہم کو رفاقت نہیں ملی

اب تک ہیں اس گماں میں کہ ہم بھی ہیں دہر میں
اس وہم سے نجات کی صورت نہیں ملی

رہنا تھا اس کے ساتھ بہت دیر تک مگر
ان روز و شب میں مجھ کو یہ فرصت نہیں ملی

کہنا تھا جس کو اس سے کسی وقت میں مجھے
اس بات کے کلام کی مہلت نہیں ملی

کچھ دن کے بعد اُس سے جدا ہو گئے منیر
اس بے وفا سے اپنی طبیعت نہیں ملی

منیر نیازی

روح کو جسم کی پوشاک میں رکھا گیا تھا
میں بہت خوش تھا مجھے خاک میں رکھا گیا تھا

میں نے اُس وقت بھی خالق سے بغاوت کی تھی
عشق جب خانۂ ادراک میں رکھا گیا تھا

ایک مٹی سے بنائے گئے میں اور چراغ
اور پھر دونوں کو اک طاق میں رکھا گیا تھا

میں نے اُس رات بہت دیر تلک گریہ کیا
ہجر جب دیدۂ نم ناک میں رکھا گیا تھا

میرا مصلوب ہوا عشق گواہی دے گا
میں سیہ بخت سدا خاک میں رکھا گیا تھا

میثم علی آغا

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ کھلے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص رات (تہجد) کو زیادہ نماز پڑھے، اس کا چہرہ دن کو خوبصورت ہو جاتا ہے۔"

قرآن پاک،

سیانے کہتے ہیں قرآن گلاب کی صورت، پھول کی مانند ہے۔ پتی در پتی، پتی در پتی۔ اوپر کی پتی اٹھاؤ تو نیچے ایک اور پتی۔ مفہوم در مفہوم۔ اوپر کا مفہوم اٹھاؤ تو نیچے ایک اور مفہوم۔ اوپر سطحی اور نیچے کا شناتی۔

(اقتباس تلاش۔ ممتاز مفتی)

نوال افضل کھمن۔ گجرات

روز کا وظیفہ،

ہر روز کا ایک وظیفہ ہے۔ یاد رکھیے کہ مجھے اپنے آپ کو درست کرنا ہے اور اپنا آپ سنوارنا ہے۔ (اشفاق احمد)

وصیت،

ایک شخص کی مرتے وقت وصیت۔

"بیٹا! ڈیفنس والی بیس کوٹھیاں تم لے لینا اور تم میرے سب سے چھوٹے اور پیارے بیٹے ہو، اس لیے کینٹ والے پندرہ بنگلے تمہارے اور بیگم تم! تم گلگشت والی بائیس کوٹھیاں رکھ لینا۔"

اس شخص کی وصیت سن کر نرس اس کی بیوی سے کہنے لگی۔

"لگتا ہے آپ کے شوہر کے پاس بہت ساری جائیداد ہے۔"

اس کی بیوی نے بے زاری سے جواب دیا۔

"کہاں کی جائیداد، یہ تو دودھ والا ہے اور اپنے گاہکوں کے گھر بتا رہا تھا۔"

حیرت،

ایک نوجوان سے اس کے دوست نے پوچھا۔

"جس بدصورت لڑکی سے تم محض دل لگی کر رہے تھے۔ جب اس کے باپ کے سامنے تم نے شادی کی تجویز رکھی تو اسے حیرت تو ہوئی ہوگی؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "حیرت... ابھی اس کی یہ حالت ہوئی کہ بندوق اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔"

نمرہ۔ اقرا۔ کراچی

مرمت،

ایک صاحب کو ورکشاپ کے مالک نے فون کیا۔

"جناب! میں کار ورکشاپ سے بول رہا ہوں۔ آپ کی بیگم صاحبہ ابھی ابھی اپنی کار مرمت کے لیے لائی ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ..."

ان صاحب نے اکتائے ہوئے لہجے میں بات کاٹ کر کہا۔

"اچھا بھئی، جتنے پیسے خرچ ہوں گے، میں ادا کر دوں گا۔"

ورکشاپ کا مالک بولا۔ "جناب میں کار کی مرمت کے بارے میں بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ ورکشاپ کی مرمت کون کرائے گا؟"

عذرا ناصر۔ کراچی

قوت ارادی،

دو دوستوں کی کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی۔ ایک نے دوسرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے، کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے ہو؟"

"دراصل میں نے شراب، جوا اور عورتوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا ہے۔" دوسرے دوست نے بتایا۔

"اوہ... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم زبردست قوت ارادی کے مالک ہو۔" پہلے دوست نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ حرکتیں چھوڑنے کے لیے بڑی قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"قوت ارادی کا تو مجھے معلوم نہیں۔ مجھے تو یہ حرکتیں اس لیے چھوڑنی پڑیں کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔" پہلے دوست نے جواب دیا۔

مدیحہ یوسف۔ کراچی

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عید،

عید کے دن جب لوگ کاشانۂ خلافت پر حاضر ہوئے تو کیا دیکھا کہ آپ رضی اللہ عنہ دروازہ بند کر کے زار و قطار رو رہے ہیں۔ لوگوں نے حیران ہو کر تعجب سے عرض کیا۔

"یا امیر المومنین! آج تو عید کا دن ہے۔ آج تو شادمانی و مسرت منانے کا دن ہے۔ یہ خوشی کی جگہ رونا کیسا؟"

آپ رضی اللہ عنہ نے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا۔ "اے لوگو! یہ عید کا دن بھی ہے اور وعید کا دن بھی ہے۔ آج جن کے روزے نماز مقبول ہو گئے تو بلاشبہ ان کے لیے عید کا دن ہے۔ لیکن جن کی نماز و روزہ مردود کہہ کر منہ پر مار دیا گیا ہو اس کے لیے آج وعید کا ہی دن ہے اور میں اسی خوف سے رو رہا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ میں مقبول ہوا ہوں یا رد کر دیا گیا ہوں۔"

ارم کمال۔ فیصل آباد

طرز تخاطب،

ایک تاجر نے ایک بہلول کو دیکھا تو کہنے لگا۔

"یا شیخ! میں کون سا مال خریدوں کہ مجھے فائدہ ہو؟"

بہلول نے کہا۔ "روئی اور لوہا خرید لو۔"

تاجر نے ایسا ہی کیا۔ کچھ عرصے میں اس کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی اور تاجر کو بہت زیادہ فائدہ ہوا۔ کافی عرصے کے بعد تاجر نے ایک بار پھر بہلول کو دیکھا تو کہنے لگا۔

"اے پاگل بہلول۔ اس سال میں کون سا مال خریدوں کہ مجھے فائدہ ہو؟"

"اس سال پیاز اور تربوز خرید لو۔"

تاجر نے ایسا ہی کیا لیکن کچھ ہی دن میں پیاز اور تربوز سڑ گئے۔ اس مرتبہ تاجر کو بہت نقصان ہوا۔ تاجر نے بہلول سے جا کر اس غلط مشورے کے بارے میں دریافت کیا تو بہلول نے کہا۔

"اے تاجر! تم نے پہلی بار مجھے یا شیخ کہہ کر پکارا تھا اس لیے میں نے عقل و منطق کے ساتھ تمہیں مشورہ دیا تھا لیکن دوسری بار مجھے پاگل کہہ کر مخاطب کیا۔ اس لیے میں نے تمہیں پاگل پن میں مشورہ دیا۔ پس تم اپنے نقصان کے خود ذمہ دار ہو کیونکہ کوزے میں سے وہی نکالا جاتا ہے جو اس میں ڈالا گیا ہو۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

محبت،

ایک دن میں نے پوچھا۔ "جناب یہ محبت ہوتی کیا ہے؟"

بابا جی نے فرمایا۔

"محبت دوسرے کے اندر چھپی ہوئی خوبی کا نقاب اتارنے کا نام ہے۔"

(اشفاق احمد۔ بابا صاحب)

نوال افضل کھمن۔ گجرات

اطلاع،

خواب آئینے ہیں
آنکھوں میں لیے پھرتے ہو
دھوپ میں چمکیں گے
ٹوٹیں گے تو چبھ جائیں گے

(بشیر بدر)

نوال افضل گھمن ۔ گجرات

شادی شدہ

سردار جی نینا سنگھ کے ساتھ سمندر کے کنارے ایک بینچ پر بیٹھے اس پر فدا ہوئے جا رہے تھے ۔ ایک سپاہی کو وہ حرکتیں ناگوار گزریں تو وہ ان دونوں کے سر پر آ پہنچا اور کچھ یوں مکالمے ہوئے ۔

"اوئے ! یہ دن دہاڑے کیا ہو رہا ہے ؟"

"باتیں کر رہے ہیں ... تجھے کیا تکلیف ہے ؟"

"شرم نہیں آتی ... باتیں ایسے ہوتی ہیں ؟"

"چلا جا یہاں سے ... میں پولیس کمشنر سے شکایت کروں گا کہ تم شادی شدہ لوگوں کو بلاوجہ تنگ کرتے ہو ۔"

"تم شادی شدہ ہو ؟"

"ہاں ... ہم شادی شدہ ہیں ۔"

"تو یہ راز و نیاز تم گھر پر کیوں نہیں کرتے ... یہاں سیکڑوں لوگ آتے جاتے ہیں ۔"

سردار جی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے ۔

"یہی تو مشکل ہے بھا یا جی ... میری پتنی بڑی ظالم ہے اور اس کا آدمی غصے کا بہت تیز ہے ۔ ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تل جاتا ہے ... مجبوراً یہاں آتے ہیں ۔"

صائمہ عمران ۔ جوہر ٹاؤن

محبت

شیکسپیئر نے "ہیملٹ" میں لکھا ہے "محبت انسان کو پاگل کر دیتی ہے ۔ محبت دماغ کا ایک خلل ہے کہ اگر کوئی انسان اس خلل میں مبتلا ہو جائے تو اس کا علاج مشکل ہے ۔ سارے خواب ، سارے چہرے ، سارے مناظر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں صرف ایک چہرہ آنکھوں میں منجمد ہو جاتا ہے ۔ "محبوب کا چہرہ ۔"

نسبت زہرا ۔ کہروڑ پکا

دل سے نکلے کچھ لفظ

☆ اپنے ارد گرد اعمال کے چراغ جلاؤ تاکہ موت کے راستے سے گزرتے وقت تمہیں تاریکی کا احساس نہ ہو ۔

☆ اگر تم کسی کو گدھا کہتے ہو تو وہ تمہیں گھوڑا کبھی نہیں کہے گا ۔

☆ اگر تمہیں زیورات کا شوق ہے تو کان میں سوراخ تو ہو گا ۔

☆ فیصلہ چھوٹا ہو یا بڑا ، اس میں غلطی کا امکان گھاس کی اس نرم کونپل کی طرح ہوتا ہے جو کسی بھی جگہ کسی بھی لمحے سر اٹھائے چپ چاپ لہرانے لگتی ہے ۔

ارم ۔ فیصل آباد

کم عمری میں بچے سبزی پسند کرنا سیکھ سکتے ہیں

ایک تازہ تحقیق کے مطابق اگر بچوں کو دو سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے سبزی دی جائے تو وہ نئی سبزیاں کھانا پسند کرنا سیکھ سکتے ہیں ۔ لیڈز یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف سائیکالوجیکل سائنسز سے تعلق رکھنے والے اور اس تحقیق کے لکھاری پروفیسر ہیتھر ہیگنگ نے کہا ۔

"اگر بچے دو سال سے کم عمر ہوں تو نئی سبزیاں کھائیں گے کیونکہ وہ نئے تجربات کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں ۔"

انہوں نے کہا ۔ "دو سال کے بعد بچے نئی چیزیں آزمانا پسند نہیں کرتے اور اس خوراک کو بھی مسترد کرنا شروع کر دیتے ہیں جو انہیں پہلے پسند تھی ۔"

ان کا کہنا تھا کہ "اگر آپ کا بچہ چڑچڑا ہے یا سبزی پسند نہیں کرتا ، ہمارے مطالعے سے پتا چلا ہے کہ پانچ سے دس دفعہ اسے سبزی پیش کرنے سے فرق پڑ جائے گا ۔"

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

رابعہ رشید ———— حویلی بہادر شاہ

شہر کو برباد کر کے رکھ دیا اس نے منیرؔ
شہر پر یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا

ثنا اُجالا ———— بھلوال

گمنام سی بستی میں بڑے سویرے ہیں
کچھ سنو ہماری بھی ، ہم بالکل اکیلے ہیں
جذبہ ہے ، احساس ہے ، خیال ہے
اک عشق ہے جس کے دل میں بسیرے ہیں

ثمینہ اکرم ———— کراچی

آنکھ کسی کے چہرے پر اور دل میں دھیان کسی کا
ہم بھی کیا ہیں بات کسی سے ، وہم و گمان کسی کا
وہ تو کچھ اوروں کی خاطر بھی جینا تھا ورنہ
روح میں اب تک پھیل گیا ہوتا سرطان کسی کا

مقدسہ ———— فیصل آباد

گزر رہی ہے تذبذب میں زندگی اپنی
نہ ہم یقین کی جانب نہ ہم گماں کی طرف

ملائکہ کوثر ———— بسم اللہ پور

تو جانتا ہے میرے گناہوں کی حد نہیں
میں جانتا ہوں تیرا کرم بے حساب ہے

ثمینہ کوثر عطاری ———— ڈوگہ گجرات

نہ سوال سود و زیاں کا کر ، ہے وہ کیا جو تجھ کو ملا نہیں
میرے ہمسفر تو یقین کر ، مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں
ہیں تیرے کرم کی ہی بارشیں جو سدا ہیں میرے حال پر
کروں تجھ سے کوئی گلہ کبھی ، یہ محبتوں کا صلہ نہیں

شبانہ جاوید ———— کراچی

پھر یاد آ گئیں مجھے محرومیاں مری
دل بیٹھ سا گیا ہے دعا کو اٹھا کے ہاتھ
جانے کس آستین سے پکارے مرا لہو
منصف عدالتوں میں بیٹھے چھپا کے ہاتھ

شائستہ اکبر ———— گڈو کالونی

جاناں دل کا شہر ، نگر افسوس کا ہے
تیرا میرا سارا سفر افسوس کا ہے

گوشی سیال ———— مظفر گڑھ

اک حرف تسلی کا اک لفظ محبت کا
خود اپنے لیے اس نے لکھا تو بہت رویا
پہلے بھی شکستوں پہ کھائی شکست اس نے
لیکن وہ تیرے ہاتھوں ہارا تو بہت رویا

صائمہ جبی ———— کراچی

رعونتوں میں نہ اتنی بھی انتہا ہو جائے
کہ آدمی نہ رہے آدمی ، خدا ہو جائے
تعلقات میں گنجائش تو ہوتی ہے
ذرا سی بات پہ کیا آدمی خفا ہو جائے

حافظہ سمیرا ———— 157 این بی

کچھ مجھے سیدھے سادے راستوں سے بیر تھا
کچھ بھٹک جانے کا باعث جستجو اس کی بھی تھی
بات بڑھنے کو تو بڑھ جاتی لیکن نظر
کچھ وہ بھی کم گو تھا ، چپ رہنے کی خو مجھے بھی تھی

حراقریشی ——— ملتان

دیکھ کر جلوہ غش ہوئے موسیٰؑ
داغ مجھ کو حجاب نے مارا

نوال افضل گھمن ——— گجرات

نہ چاہت کے انداز الگ
نہ دل کے تھے جذبات الگ
تھی ساری بات لکیروں کی
تیرے ہاتھ الگ میرے ہاتھ الگ

شبنم شمشاد ——— بزمان

رُک گئی زندگی بس اک موڑ پر
اس کے بن یونہی موسم گزرتے گئے
دل کے آنگن میں روتی رہیں حسرتیں
آنکھ زندہ رہی، خواب مرتے گئے

نخبہ اکرم ——— گاؤں کوٹلی

یہ خاموشی بھی ہماری انا کا پردہ ہے
سوال کرتے رہو اور جواب رہنے دو
سفر کا ساتھ ہے، یہ منزلوں کا ساتھ نہیں
گزر ہی جائیں گے لمحے حساب رہنے دو

مسرت الطاف ——— کراچی

وہ ساتھ تھا تو عجب دھوپ چھاؤں رہتی تھی
بس اب تو ایک ہی موسم ٹھہر گیا مجھ میں

فوقیہ رباب چیمہ ——— بورے والا

آنکھ کی دھرتی کا ٹکڑا کتنا شور آلود تھا
آنسوؤں کے ذائقے کڑوے کسیلے ہوگئے
تونے دیکھا ہی نہیں آہوں کا بے پروا خرام
ہم نے دیکھا، دیکھ ہم ویران ٹیلے ہوگئے

اقرا ملک ——— گوجرانوالہ

ہوئی جو شام تو پھر تیرے در پہ آ بیٹھا
میں شال اوڑھ کر اک مہرباں اداسی کی
تمام شہر ہے اک کشمکش کے موسم میں
دلوں میں ٹھہر گئی ہے خزاں اداسی کی

ہاجرہ عرفان ——— سیالکوٹ

بچھڑنے کا ارادہ ہو تو مجھ سے مشورہ کرنا
محبت میں کوئی بھی فیصلہ ذاتی نہیں ہوتا

آمنہ اجالا ——— ڈہرکی

ذرا دیکھو تو دروازے پہ دستک کون دیتا ہے
محبت ہو تو کہنا کہ یہاں اب ہم نہیں رہتے

موناشاہ قریشی ——— کبیر والا

یہ اور بات کہ میری انا جتا نہ سکی
مجھے جنوں تیرا ہر اک جنوں سے بڑھ کر رہا

کلثوم تمنا ——— نوشہرہ

ہم ایک دن نکل آئے تھے خواب سے باہر
سو ہم نے رنج اٹھائے حساب سے باہر

حرا شاہ ——— شجاع آباد

بعد مدت اُسے دیکھا لوگو
وہ ذرا بھی نہ بدلا لوگو
دوست تو خیر کون کس کا ہے
اُس نے دشمن بھی نہ سمجھا لوگو

ثمرہ، اقرا ——— کراچی

کون کہتا ہے کہ جان سے پیارا نہیں رہا
یہ اور بات ہے کہ اب وہ ہمارا نہیں رہا

کوثر ناز ——— حیدرآباد

وہ جو روٹھا ہے تو اسے منانے کا قصد چھوڑ دو
اچھا موقع ہے پہلو سے دھر جاتے ہیں

ارم کمال ——— فیصل آباد

تمہارے حسن کو حاصل غرور میرا ہے
وہ جام ہے مگر اس میں سرور میرا ہے
اسی کا نام ہے شاید تعلق خاطر
سفر میں تم ہو مگر بدن پہ چور چور میرا ہے

سحر سہیل ——— کراچی

ہمیشہ آئینوں کے ہی مقدر میں کیوں چوٹیں
کبھی یہ معجزہ بھی ہو کہ پتھر چوٹ کھا جائیں

امت الصبور

خاتون کی ڈائری

نوشابہ منظور کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر افتخار عارف کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

تھکن تو اگلے سفر کے لیے بہانہ تھا
اسے تو یوں بھی کسی اور سمت جانا تھا

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی
اسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا

متاع جاں کا بدل ایک پل کی سرشاری
سلوک خواب کا آنکھوں سے تاجرانہ تھا

ہوا کی کاٹ شگوفوں نے جذب کرلی تھی
تبھی تو لہجۂ خوشبو بھی جارحانہ تھا

وہی فراق کی باتیں، وہی حکایت وصل
نئی کتاب کا ایک اک ورق پرانا تھا

قبائے زرد نگار خزاں پہ سجتی تھی
تبھی تو چال کا انداز خسروانہ تھا

فوزیہ کی ڈائری سے

بات فکر کی ہو یا جذبے کی، غم عشق کی ہو یا غم روزگار کی، فسانہ ہو یا غم دوجہاں کا قصہ۔ شکیب جلالی کا منفرد لب و لہجہ اور ان کا رومانی رکھ رکھاؤ الگ ہی نظر آتا ہے۔

آپ کی یادگار کھو بیٹھے
ہم غم بے کنار کھو بیٹھے

ان کے جلووں کو زندگی کہہ کر
ہم نظر کا وقار کھو بیٹھے

آپ سے مل کر ہم نے کیا پایا
اپنے دل کا قرار کھو بیٹھے

غم کی تشنہ لبی تو قائم ہے
آپ سا غم گسار کھو بیٹھے

ان سے ہم اس قدر قریب ہوئے
زندگی کا وقار کھو بیٹھے

ہر حقیقت فریب لگتی ہے
جب کوئی اعتبار کھو بیٹھے

جس پہ نازاں ہیں قربتیں
وہ شبِ انتظار کھو بیٹھے

فریحہ شبیر کی ڈائری سے

شبنم شکیل کی اس غزل کو میں نے ایف ایم پہ سُنا اور سُن کر کتنی دیر کھوئی رہی۔ کیا محسوس کرتی رہی بیان کرنا مشکل ہے۔ قارئین کی نذر۔

سوکھے ہونٹ، سلگتی آنکھیں، سرسوں جیسا رنگ
برسوں بعد وہ دیکھ کر مجھ کو رہ جائے گا دنگ

ماضی کا وہ لمحہ مجھ کو آج بھی خون رُلائے گا
اُکھڑی اُکھڑی سانسیں اس کی بکھروں جیسے ڈھنگ

دل کو تو پہلے ہی درد کی دیمک چاٹ گئی تھی
روح کو بھی اب کھاتا جائے تنہائی کا زنگ

انہی کے صدقے یارب میری مشکل آساں کر دے
میرے جیسے اور بھی ہیں جو دل کے ہاتھوں تنگ

کیوں نہ اب اپنی چوڑیوں کو کرچی کرچی کر ڈالوں
دیکھی آج اک سندر ناری پیلی پیا کے سنگ

شبنم کوئی تجھ سے ہارے جیت پہ مان نہ کرنا
جیت وہ ہو گی جب جیتو گی اپنے آپ سے جنگ

کسی سبب، کسی نسبت کسی تعلق سے
نگاہِ یار میں کوئی سوال تو ہوتا

وہ بے وفا تو نہیں مگر پھر بھی بے وفائی میں
جہاں میں کوئی بھی اُس کی مثال تو ہوتا

میں پائمال ہوا جس طرح سے محبت میں
کچھ اُس طرح سے کوئی پائمال تو ہوتا

میں اُس کی راہ میں آنکھیں بچھا تو دوں
وہ لوٹ آئے گا یہ احتمال تو ہوتا

معاملاتِ جنوں کے سوا شبنمؔ تم کو
کسی ہنر کسی فن میں کمال تو ہوتا

السہ ملک کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر شبی فاروقی کی یہ خوبصورت غزل اپنی قارئین بہنوں کے لیے۔

بچھڑتے وقت اُسے کوئی ملال تو ہوتا
اُجڑ گیا ہے کوئی یہ خیال تو ہوتا



آمنہ اجالا کی ڈائری سے

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جذبے اور احساسات بھی بدل جاتے ہیں۔ اعتبار ساجد کی یہ غزل اسی تاثر کا اظہار ہے۔

کتنی بدل چکی ہے رُت، جذبے بھی وہ نہیں رہے
دل پہ تیرے فراق کے صدمے بھی وہ نہیں رہے

محفلِ شب میں گفتگو ہوئی تو یہ کھلا
باتیں بھی وہ نہیں رہیں، لہجے بھی وہ نہیں رہے

جلیے بدل کے رکھ دیے شبِ فراق نے
آنکھیں بھی وہ نہیں رہیں، چہرے بھی وہ نہیں رہے

یہ بھی ہوا کہ تیرے بعد شوقِ سفر نہیں رہا
جن پہ بچھے ہوئے تھے دل، رستے بھی وہ نہیں رہے

میری خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

عظمیٰ شکور..... سرگودھا

ہم چھ بہن بھائی ہیں، بہنیں بڑی اور بھائی چھوٹے میں منجھلی ہوں ابو کی لاڈلی ہوں، میرے ابو بہت گریٹ ہیں میں نے ان جیسا حوصلہ کسی میں نہیں دیکھا۔

(1) مجھے رسالے پڑھنے کا خبط ہے پاگل پن کی حد تک پڑھتی ہوں شاعری میری کمزوری ہے کوئی اچھا شعر مجھ سے بچ کے نہیں جاسکتا اور جہاں تک خود لکھنے کا سوال ہے تو میں افسانے، اقتباس وغیرہ بہت پیار سے لکھ ڈالتی ہوں کہ خود مجھے بھی پتا نہیں چل پاتا۔ ویسے عمیرہ احمد نے متاثر کیا اور احمد فراز میرے فیورٹ ہیں۔

(2) ویسے تو مجھ میں صرف خوبیاں ہی ہیں ہاں مگر آپ کہتی ہیں تو ڈھونڈ ڈھانڈ کے خامیاں بھی بتا دیتی ہوں، بھروسا بہت جلد کر لیتی ہوں، فوراً" دوستی کر لیتی ہوں اور سب کہہ ڈالتی ہوں اور خود کا بات بے بات رو پڑنا مجھے پسند نہیں، خوشی میں بھی آنسو بہا رہی ہوتی ہوں اور تو اور کہانیاں پڑھ کر رو رہی ہوتی ہوں۔ ڈرامے میں کوئی ایسا سین آتا ہے تو ٹشو گیلے ہو جاتے ہیں اف کیسی بے وقوف ہوں میں!

خوبیاں:۔ میں سچ بولتی ہوں، کبھی پروا نہیں کرتی اس کا انجام کیا ہوگا جو دل میں ہے زبان پہ ہوتا ہے۔ جھوٹ بولوں تو ہنسی آجاتی ہے اور جب آتی ہے تو آئے جاتی ہے، خود نہ ہنسوں تو آنکھیں ہنستی ہیں۔ اور ہمدرد ہوں ہر غریب کی مدد کرتی ہوں کہ یہ بے چارا ایسا کیوں ہے اس کے بھی ارمان ہوں گے، خاص کر کشمیریوں پر دکھ ہوتا ہے شدید دکھ، میں نے ان پر "خون کی بوندیں" لکھا تھا جو پسند کیا گیا۔ حساس انتہائی اور دوسروں کی فکر خوامخواہ میرے کندھوں پر سوار رہتی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ سے تعلق چپکے چپکے کافی عرصے سے ہے لیکن کبھی اپنی تحریر نہیں بھیجی جیسے ہی یہاں سے سفید جھنڈی دکھائی گئی۔ میں اپنی تحریریں سمیٹ کے پہنچ جاؤں گی بس اک اشارہ اور ہم میدان میں۔ محبت سے جیت لیں گے دل سب کے! اس رسالے میں وہ بات ہے جو اور کسی میں نہیں، یہ کسی قسم کا مکھن نہیں بلکہ حقیقت ہے قارئین جانتے ہیں کہ میں صرف اور صرف سچ کہہ رہی ہوں اور ویسے بھی کہتی ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔

(3) اف مجھے بے انتہا شوق ہے کہ سالگرہ مناتی جاؤں اور گفٹ لینے کا اس سے بھی زیادہ، آٹھ اکتوبر کو میں نے دنیا کو رونق بخشی اور جب سے اب تک رونق ہی رونق ہے یوں لگتا ہے لفظ بولتے ہیں جیسے بارش کی بوندیں کوئی گیت سناتی ہوں جیسے بادلوں کی گرج میں کوئی پیغام چھپا ہو کہ جیسے سمندر کی لہریں کچھ کہنے کو بے تاب ہوں کہ جیسے چاند کی خاموشی کو زبان مل جائے، جگنو راستہ دینے کو پرے ہٹ گئے ہوں۔ چمکتی بجلی آنکھوں میں نئے خواب آنے کی نوید دے۔ سورج کی تپش جذبوں میں رنگینی لے آئے ساحل کی گیلی ریت روح کے آرپار ہو جائے۔

پسندیدہ شعر!

تیری بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز
کچا تیرا مکاں ہے کچھ تو خیال کر

شبنم شمشاد..... یزمان

1۔ مجھے اپنا نام نہیں پسند، ہاں ایک بہت برجستہ بات، کالج میں ایک خاتون ملنے آئیں تو میرا نام سن کے کہنے لگیں "آپ تو واقعی شبنم لگتی ہو"

خیر میرا نام شبنم شمشاد ہے اور مس میتھمیٹکس

کہلوانا بھی پسند ہے۔ اور زینب کا شبو کہنا اور اک بہت پیاری اسٹوڈنٹ کا مس جی کہنا۔

"آئی یو بی" میں ایم ایس سی میتھس کے لیے اپلائی کیا ہے' پلیز دعا کریں میرا ایڈمیشن ہو جائے۔ (آمین)

فی الحال جاب اور دوسری مصروفیات زندگی بس ڈھیر سارا سوچنا اور بہت کچھ کرنے کی لگن' میرے خواب میرا سرمایہ ہیں اور کچھ خوابوں کو سوچنا اور دیکھنا بھی کتنا دلفریب ہوتا ہے نا۔

(2) خوبیاں اور خامیاں یہ تو لازم و ملزوم ہیں' پرفیکٹ تو کوئی بھی نہیں سوائے پیارے آقا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے۔

پہلی خامی کبھی کبھی بہت ہائپر ہو جاتی ہوں بہت زیادہ ایموشنل' پھر تو بس اس کی خیر نہیں جو میرے سامنے آئے۔

اپنی ذات کے بارے بہت لاپروا ہوں اور اس کے علاوہ بہت سارے لوگوں کے بقول "بہت گھنی ہو تم"

خوبیاں یہ کہ بہت اچھی اور پیاری لڑکی ہوں' ذہین ہوں محنتی ہوں اور میرے ایک ٹیچر نے کہا تھا کہ "شبنم بہت پیاری' اچھی اور نیک سیرت لڑکی ہے"

بہت اچھی دوست بھی ہوں (ہے نا زینب؟)

(آہم ہم ہم) آئی تھنک بس کافی ہے اتنا۔

(3) خواتین سے وابستگی کافی پرانی ہے ہاں مگر اب جابز اور پڑھائی کی وجہ سے اتنا ٹائم نہیں ملتا' لیکن پھر بھی مجھے مطالعے کا بہت شوق ہے اچھا لٹریچر میری کمزوری ہے۔

بہت سارے ناول جو پڑھے' وہ ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ گئے "من و سلویٰ' لاحاصل' ہم تمہیں جیت کر ہارے ہیں' مصحف اور اور بھی بہت سارے۔

بلاشبہ میں نے ان ناولز میں سانس لیتے کرداروں سے بہت کچھ سیکھا۔

پرانی رائٹرز جو جانے کہاں کھو گئیں۔ انہیں واپس لے آئیں پلیز۔

(4) سالگرہ باقاعدہ تو نہیں مناتی ہاں مگر اسٹوڈنٹس کے دیے ڈھیروں تحائف اور گزرے وقتوں کے دوستوں کا پیار بہت یادگار ہے۔ بہت سارے دوست جو سالگرہ کے لمحوں کی طرح کھو گئے ان فیکٹ

ہزاروں منزلیں ہوں گی ہزاروں کارواں ہوں گے
نگاہیں ہم کو ڈھونڈیں گی نہ جانے ہم کہاں ہوں گے

(5) شاعری بہت اٹریکٹ کرتی ہے مجھے خاص طور پہ تب جب ہماری ساری فیلنگز' سارے دکھ اور ساری خوشیاں بس ایک شخص سے منسوب ہو جائیں۔

تم کئی بار مل چکے ہوتے
تم جو ملتے اگر دعاؤں سے

دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

سائرہ پرواعلی.... کوٹ چھٹہ

1۔ میرا نام سائرہ پروا کرن ہے۔ ہماری کاسٹ صدیقی ہے کوٹ چھٹہ سے میرا تعلق ہے۔ میرا اسٹار عقرب ہے۔ مجھے سرات کلام کا سبزہ اور شور و غل بہت پسند ہے۔ ڈوبتے سورج کا منظر بہت اٹریکٹ کرتا ہے۔ ڈریسز میں فراک' چوڑی دار پاجامہ اور راجستھانی ساڑھی بے حد پسند ہے۔ سردیوں میں جینز کی جیکٹ پہنتی ہوں۔ بعض اوقات بہت لمبی سڑک پر تنہا چلنے کو دل کرتا ہے۔ آئس کریم چاکلیٹ اور اسٹرابری فلیور میں پسند ہے۔ گول گپے کی میں دیوانی ہوں۔ میوزک سننا اور پھولوں سے باتیں کرنا بھی پسند ہے۔

میرے دو بھائی اور ایک سسٹر رمشا ہے۔ اپنی امی کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔ اللہ کے بعد اپنی امی سے مجھے بے انتہا محبت ہے۔ میری دو پرنسز صالحہ علی اور منیعتہ الجنت ہیں جو میرے لیے جان سے بھی بڑھ کر ہیں آپ سب سے ریکویسٹ ہے کہ میرے بھائی کے لیے دعا کرنا کہ ذیشان کا پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں ایڈمیشن ہو جائے (آمین)

ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں چار چاچو اور ان کی فیملیز سب اکٹھے مل کر رہتے ہیں' سارا دن ہنسی مذاق' بہت مزا آتا تھا پھر میری شادی ہو گئی۔ جوائنٹ فیملی سے سنگل فیملی میں آنا پڑا۔ علی ایک ہی بھائی ہے۔ اور نندیں ساری میرڈ ہیں۔ شروع میں تو تنہائی میں دل بے حد گھبرایا پھر آہستہ آہستہ خود کو ایڈجسٹ کر لیا' پھر صالحہ ہوئی تو اس کی قلقاریوں سے پورے گھر میں رونق و ہلچل مچ گئی۔

خوشی ملی تو کئی درد مجھ سے روٹھ گئے
دعا کرو' میں پھر سے اداس ہو جاؤں

2۔ اپنی خوبیاں و خامیاں تو کوئی دوسرا انسان ہی بتا سکتا ہے۔ اب میں خود سے آپ کو کیا بتاؤں؟ نادیہ جہانگیر سے پوچھا اس نے کہا۔

"تم بہت معصوم' کیوٹ ہو سائرہ۔ تمہیں لوگوں کو پرکھنا نہیں آتا جس کی وجہ سے تم جلدی دھوکا کھا جاتی ہو۔"

نبیلہ عزیز کہتی ہیں!

"تمہارا نام معصومہ یا گڑیا ہونا چاہیے۔ پیاری لڑکی! لوگوں کی پہچان کرنا سیکھو ورنہ یہ تمہیں روند کر گزر جائیں گے۔"

رضوانہ کہتی ہے۔

"سائرہ آپی! آپ کی آواز بہت اچھی ہے۔ دل کرتا ہے کہ آپ کو ہر وقت سنتی رہوں" (تھینکس رضوانہ) میں ہر کسی پر بہت جلد اعتماد کر لیتی ہوں اب آپ اسے میری خوبی کہیں یا خامی۔ حد سے زیادہ حساس ہوں منافقت مجھے بالکل نہیں پسند۔ بہت زیادہ خوش اخلاق ہوں۔ خوش مزاج بالکل بھی نہیں ہوں۔ رونا اور سہنا یہ دو کام ایسے ہیں جو میں زور و شور سے کرتی ہوں۔

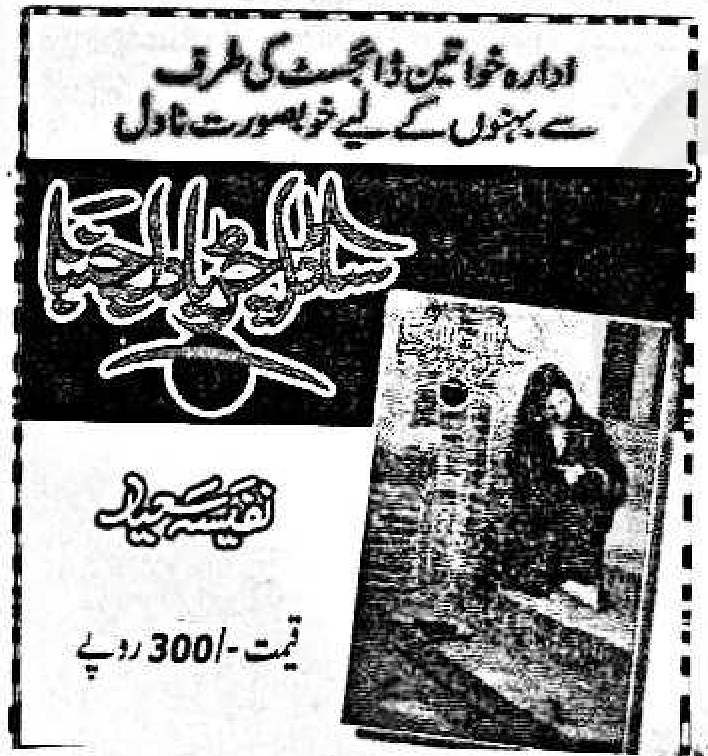
3۔ خواتین ڈائجسٹ سے تعلق نو' دس سال پرانا ہے جب میں 7th کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی تو چھپ چھپ کر پڑھا کرتی تھی (امی پڑھنے نہیں دیتی تھیں) خواتین رسالہ ہمارے گھر 25 سال سے آرہا ہے۔ میری پیدائش سے بھی پہلے۔ (امی پڑھتی تھیں نا) تو مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا چسکہ کیوں نہ لگتا۔ پہلے میں کتاب میں ڈائجسٹ رکھ کر پڑھا کرتی تھی۔ کہیں امی نہ دیکھ لیں پھر امی نے فرسٹ ایئر میں مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کی پرمیشن دی تو ایسا لگا کہ ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

نمرہ احمد کا "بیلی راجپوتاں کی ملکہ" فائزہ افتخار کا "روگ" سعدیہ عزیز آفریدی کا "ماں کا شفو" عنیزہ سید کا "کوہ گراں تھے ہم" ساجدہ حبیب کا "کانچ کا شہر + شہر شکست آرزو"۔ یہ ایسے شاہکار ہیں جن کو بھلانا میرے بس میں نہیں۔

4۔ میری امی نے میری ہر سالگرہ منائی ہے۔ جب چھوٹی تھی تو تمام رشتہ داروں کو بلا کر میری برتھ ڈے شاندار طریقے سے سیلیبریٹ کرتے تھے۔ بڑی ہو گئی تو گھر پر ہی کیک' پزا' چرغہ بروسٹ' برگر وغیرہ منگوا کر اپنی فیملی کے ساتھ اس دن کو یادگار بنا لیتے تھے پھر شادی ہو گئی۔ بچوں اور گھرداری میں ایسی الجھی۔ سالگرہ کا دن آتا ہے اور آ کر گزر جاتا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا۔

ہم تمہیں بھولنے کا سوچیں گے
جب کبھی دل پہ اختیار ہوا

☆





نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

ام ایمان قاضی۔۔۔ کٹ چٹھہ

پچھلے دنوں خواتین کے دفتر اپنی کہانیوں کی بابت دریافت کرنے کی غرض سے فون کیا تو پتا چلا کہ ایک بہت سینئر رائٹر جو میری ہی ہم نام ہیں' ان کی شکایت ہے کہ ان کے نام کے ساتھ لکھنے کی غیر اخلاقی حرکت کیوں کی گئی۔ آپا! میں حرفوں' لفظوں کی شناسائی کے ساتھ ہی آپ کے ادارے کے تینوں ڈائجسٹ سے وابستہ ہو گئی تھی اور یقین کریں' میں نے اس نام کی کسی رائٹر کا نام نہیں دیکھا۔ میرے اصل نام کی دو' تین بہت اچھی رائٹرز لکھ رہی ہیں۔ میری بیٹی کا نام ایمان ہے جو چھ سال کی ہے' جب پہلی کہانی بھیجی تو ام ایمان کے نام سے لکھ بھیجی۔ تاہم چھ ماہ سے میں ام ایمان قاضی لکھ رہی ہوں۔ اگر میرے سامنے یہ نام گزرا ہوتا تو میں ہرگز ایسا نہ کرتی۔ اگر محترمہ کو تکلیف پہنچی ہے تو میری معذرت قبول کریں۔ ادارہ سے درخواست ہے کہ نئی تحاریر پر تو ام ایمان قاضی تحریر ہے۔ پرانی اگر قابل اشاعت ہوں تو قاضی کا اضافہ کیا جائے (مہربانی ہوگی) میرے حواسوں پر تو آج کل سائرہ رضا سوار ہیں۔ سائرہ! اپنی نظر اتار لیا کریں۔ ماشاء اللہ ہر کہانی پر گرفت مضبوط' مربوط انداز بیان اور الفاظ و بیان انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ۔ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ہم جیسے لوگ تو اندھیرے میں ٹاکک ٹوئیاں مارنے والے ہیں۔

رخسانہ رخشی اینڈ اللہ ملک۔۔۔ ملتان

سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ تمام افسانے اپنی مثال آپ تھے اور ناولٹ بھی تمام زبردست تھے۔ تمام سلسلہ وار ناول بھی اچھے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مکمل ناول بھی نمبرون تھے۔ خواتین ڈائجسٹ کے تمام رنگ رنگ سلسلے بھی دلچسپ ہیں۔ کھانے کی ترکیبوں میں "گلاب جامن" بنانے کی ترکیب پسند آئی اور اسے نوٹ بھی کر لیا۔ اس کے علاوہ رنگا رنگ پھول بھی اپنے اندر ایک دل فریب خوشبو سموئے ہوئے تھے۔

ج :۔ رخسانہ اور رخشی! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں۔

عفیفہ۔۔۔ سرگودھا

واہ سائرہ رضا! جب سے محبت داغ کی صورت پڑھا ہے کچھ اور پڑھا جا رہا ہے' نہ بولا جا رہا ہے' الفاظ نہیں تعریف کے۔ اللہ آپ کے قلم کو اور طاقت دے۔ (آمین)

ج :۔ عفیفہ! صرف ایک کہانی پر تبصرہ اور کہانیاں نہیں پڑھیں آپ نے؟

روشنی۔۔۔ عارف والا

خواتین ڈائجسٹ ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ سائرہ رضا اور سمیرا حمید کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ سائرہ رضا سے ریکویسٹ ہے پلیز سلسلے وار ناول لکھیں۔

ج :۔ سائرہ رضا جلد سلسلے وار ناول لکھیں گی۔

رابعہ اسلم وڑائچ۔۔۔ رحیم یار خان

چھ سال کے بعد دوبارہ سے قلم اٹھایا اور دوبارہ لکھنے میں میرے بہت اچھے شوہر کا کمال ہے۔ جو مجھے ٹائم بھی دیتے اور ڈائجسٹ بھی لا کر دیتے اور میری ساری پرانی کہانیاں نکال کر ان کو پڑھ کر کہا کہ تم نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ شادی کے بعد بچوں کی مصروفیت' جوائنٹ فیملی میں وقت ملتا ہی کب تھا۔ مگر میں نے اب وقت نکال ہی لیا۔ جولائی کا شمارہ اتنا اچھا لگا کہ کیا بتاؤں؟ راشدہ رفعت کی تحریر "جواب جاہلاں" بہت ہی دلچسپ تھی۔ ہم بھی اسی فارمولے پر عمل کرتے ہیں اور ماشاء اللہ خوب عزت اور پیار بھی ملتا ہے۔ قانتہ رابعہ کے مہمان تو بہت اچھی عادتوں کے مالک تھے۔ صائمہ بشیر کا مکمل ناول "گمان" لاجواب رہا۔ سائرہ رضا کی کاوش دل کو موہ لینے والی تھی۔ یہ تو وہ بات ہو گئی۔

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

واقعی ہم سوچتے ہیں فلاں کام فلاں دن۔ فلاں مہینے یا اگلے سال کریں گے۔ مگر نجانے ہمارے پاس اتنا وقت ہے بھی یا نہیں۔ میری بہن' بیٹیاں ہیں۔ میں کبھی ان کو رسالے پڑھنے سے منع نہیں کروں گی۔ کیونکہ ادارہ خواتین کی یہ خاصیت اور یہ معیار رہا ہے کہ اس میں انتہائی سبق آموز تحریریں شائع ہوتی ہیں' جن کو پڑھ کر ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ آسیہ مقصود کی تحریر بھی نائس تھی اور اب بات کروں گی جولائی کے شمارے میں ٹاپ آف دی لسٹ تحریر کی۔ جی جناب کنیز نبوی کا مختصر افسانہ طعنہ بہت بہترین لاجواب' عمدہ اور بہت اعلا۔ واقعی یہ رب ہے جو سب کو دیتا ہے اور کھلاتا ہے۔ انسان واقعی بہت جلد باز اور جاہل واقع ہوا۔ تکبر کرتا ہے اور وہ بھی چھوٹی سی نیکی پر۔ بہت خوب صورت دن گزرے ہیں ان ڈائجسٹ کے ساتھ۔ جب گھر میں لگے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر رخسانہ نگار عدنان کے ناول میں یوں کھو جانا۔ جیسے سب کچھ سامنے ہو رہا ہو۔ امی کی آوازیں نہ سنائی دینا' پتا تو تب ہی لگتا جب لہراتی ہوئی ۔۔۔ چپل ٹھاہ کر کے لگتی۔ نہ کھانے کا ہوش' نہ کہیں جانے کا شوق۔ بس ڈائجسٹ ہی ڈائجسٹ اور بہت کچھ سیکھا۔ زندگی گزارنے کا طریقہ ان ہی تحریروں نے سکھایا۔ مجھے فخر ہے خود پر اور تمام قارئین اور مصنفین پر' جو پڑھنے اور لکھنے کے لیے اتنا وقت نکالتی ہیں۔ ورنہ آج کل انٹرنیٹ اور موبائل نے نئی نسل کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جگہ جگہ پر نیٹ کیفے ہونے کے بجائے لائبریریاں ہونی چاہئیں۔

ج :۔ پیاری رابعہ! کافی عرصہ بعد آپ کا خط دیکھ کر خو[شی] ہوئی۔ یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کے شوہر [آپ] کی خوشی اور پسند کا خیال رکھتے ہیں۔ اور آپ کو خوا[تین] ڈائجسٹ لا کر دیتے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی [کے] لیے شکریہ

کنول (عائشہ) مشتاق۔۔۔ گجرات

میں نے تب خواتین پڑھنا شروع کیا تھا جب "جو تو کوہ گراں تھے ہم" کی تیسری قسط آئی تھی۔ کزن [کا] ڈائجسٹ ہاتھ میں لیا' پڑھنا شروع کیا اور پڑھتی ہی گئی۔ اس کے بعد میں ہر ماہ چھپ چھپ کے ایک فرینڈ [سے] ڈائجسٹ منگواتی رہی۔ میٹرک کے امتحانات سے فار[غ] ہو کر باقاعدہ ابو سے منگوانے لگی۔ بہت ضد کرنا پڑتی تھ[ی] ابو کہتے ہیں کہ مت پڑھا کرو' نظر خراب ہو جائے گی۔ [امی] کہتی ہیں کہ گھر کے کام کیا کرو۔ اب میں فرسٹ (I.C.S) کے ایگزام سے فارغ ہوئی ہوں اور بھائی [سے] ڈائجسٹ منگواتی ہوں۔ اتنی منتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ابو [کہتے] ہیں کہ اگر میرے 80 فیصد سے زیادہ مارکس آ گئے [تو] پھر وہ مجھے نہیں روکیں گے پڑھنے سے۔ اب آتے [ہیں] ڈائجسٹ کی طرف۔ آج کل "عہد الست" کچھ زیادہ فیورٹ بن گیا ہے۔ "جھوک دیپ" بہت ہی خو[ب] صورت ناولٹ تھا۔ بکران پر بہت غصہ آیا۔ "گمان" [میں] موحد ذوالفقار کا کردار بہت جان دار تھا۔ نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل" دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

ج :۔ کنول! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے شکریہ۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کے 80 فیصد ما[رکس] آجائیں اور آپ کے ابو آپ کو ہر ماہ خود رسالہ لا کر [دیں۔] کہانی ضرور لکھیں۔ اچھی تحریریں کے لیے ہما[رے] دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ اسکیچ کے لیے معذ[رت] خواہ ہیں' شائع نہیں ہو سکتے۔

فوزیہ حمید۔۔۔ فیصل آباد

چودہ سال پہلے میں نے خواتین ڈائجسٹ پڑھنا [شروع] کیا۔ میں یہ ایک ماہ بعد سیکنڈ ہینڈ لیتی ہوں۔ میں [..] مریضہ ہوں۔ میں نے ایف اے کیا ہے اور قرآن کی مع ترجمہ و تفسیر حاصل کی ہے۔ انیقہ انا' فوزیہ ثمر[ہ] نواب زادی سونگی کے خط شوق سے پڑھتی ہوں۔

ج :۔ پیاری فوزیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید' آپ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہے کہ آپ دین و دنیا کی تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ اللہ آپ کو ہمت و استقامت عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

نازیہ۔۔۔ سیالکوٹ

ٹائٹل بہت خوب صورت لگا۔ میں خواتین ڈائجسٹ کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ کچھ لوگ ڈائجسٹ کو اچھا نہیں سمجھتے' لیکن میرے خیال میں ہر لڑکی کو یہ ڈائجسٹ پڑھنا چاہیے۔ اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔
ج :۔ نازیہ! جو لوگ ڈائجسٹ کو اچھا نہیں سمجھتے' انہوں نے ہمارے ادارے کے پرچے نہیں پڑھے ہیں۔ ایک بار وہ یہ پرچے پڑھ لیں تو یقیناً" ان کی رائے بدل جائے گی۔

فری گل۔۔۔ بنوں

ٹائٹل سے لے کر بیوٹی بکس تک سب کچھ بہت شان دار تھا۔ نمرہ احمد کی تو اسٹوری بیسٹ ہوتی ہی ہے ماشاء اللہ۔ نمل بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ "عہد الست" بھی سپر ہٹ ہے۔ سلسلے وار ناول بھی اچھے تھے۔
ج :۔ فری! آپ کے شہر میں تو شمالی وزیرستان سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے' آپ ان کی مہمان داری میں مصروف ہوں گی۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سبرین' زیبا۔۔۔ سنگم پورہ لاہور

ہم پندرہ سال سے آپ کی خاموش قاری ہیں۔ جس بات نے ہمیں مجبور کیا' قلم اٹھانے پر "بن مانگی دعا" ہے۔ عفت سحر نے ہمیں پرانی رائٹرز کی یاد دلا دی۔ جنہوں نے میری ذات ذرہ بے نشاں' ایمان امید اور محبت' شہزادت' اک دعا نے بچالیا' جیسی کہانیاں پڑھی ہیں۔ آج جب بھی نیا پرچا ان کے ہاتھ میں آتا ہے تو وہی تحریریں ڈھونڈتی ہوں۔ پلیز ان لوگوں کو واپس لے آئیں۔ یا وہ تحریریں پھر سے شائع کردیں۔ تاکہ آج کی بچیاں بھی وہ تحریریں پڑھ سکیں۔ پھر ان کو پتا چلے کہ ہم اتنے سالوں سے خواتین ڈائجسٹ کے دیوانے کیوں ہیں۔
ج :۔ سبرین اور زیبا! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ پرانی کہانیوں کو دوبارہ شائع کرنے والی تجویز اچھی ہے' لیکن آپ جیسی ہماری بہت سی قارئین ہیں جنہیں یہ کہانیاں اب تک یاد ہیں اور ان کے پاس وہ رسالے بھی محفوظ ہیں جن میں یہ کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' لیکن صرف ایک کہانی پر تبصرہ؟ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

زیب النساء' شاہین کوثر۔۔۔ شالامار لاہور

بہت سال پہلے ہم نے گھر والوں سے چھپ کے پڑھنا شروع کیا تھا' لیکن اب تو یہ ہماری زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ ہم نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے' جو اپنی بچیوں کو خواتین پڑھنے سے روکتے ہیں' وہ ایک بار اسے پڑھ کے تو دیکھیں' ان کو پتا چلے کہ وہ کتنی بڑی غلطی کررہے ہیں۔ یہ بچیوں کے لیے اک درس گاہ ہے' جب ہم نے اسے پڑھنا شروع کیا تھا' تب ہم بھی کسی کی بیٹیاں تھیں۔ اب کسی کی بیوی اور ماں ہیں۔
ج :۔ زیب النساء اور شاہین! آپ نے ٹھیک لکھا۔ جو لوگ یہ رسالے پڑھنے سے روکتے ہیں۔ انہیں کم از کم ایک بار یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ ان رسالوں میں کیا شائع ہورہا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ان کے گھروں میں ٹی وی چینلز' موبائل اور انٹرنیٹ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

اقراء ملک۔۔۔ گوجرانوالہ

سادہ سی خوب صورت ماڈل بہت ہی زیادہ پیاری لگی۔ خاص کر آنکھیں۔ سب سے پہلے "بن مانگی دعا" پڑھی۔ شکر ہے خدا کا "ایبہا اس جہنم سے نکل گئی۔ "کوہ گراں تھے ہم" کہانی کھل تو رہی ہے' لیکن سمجھ میں نہیں آتی۔ "نیکیوں کے موسم بہار" میں اپنا نام نہ دیکھ کر دکھ اور افسوس ہوا۔ "گمان" بہت ہی بہترین کہانی تھی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہوا کہ جب ہیرو اور ہیروئن ملتے ہیں تو تھوڑا رومانس بھی دکھایا کریں' کہانی کا مزا ہی اس میں ہے۔ افسانوں میں ابھی "چاند سا مکھڑا" اور "طعنہ" پڑھی۔ بہت ہی زیادہ زبردست۔ "طعنہ" بہت اچھی کاوش ہے کنیز نبوی کی۔ سائرہ رضا اور فائزہ رابعہ کا تو نام ہی کافی ہے۔ پڑھے بغیر ہی پتا ہے۔
ج :۔ پیاری اقرا! ہمیں بھی بے حد افسوس ہے کہ سروے میں آپ شامل نہ ہوسکیں۔ آپ کا خط کافی لیٹ موصول ہوا' اس لیے ہم شامل نہ کرسکے۔ خواتین کی

پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

انعم اسلم۔۔۔ نامعلوم شہر

جولائی کے رسالے کے بارے میں تذکرہ نہیں کروں گی' کیونکہ ابھی تک ڈائجسٹ نہیں ملا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ خواتین ڈائجسٹ سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ محترمہ سائرہ رضا کے ناول ہیں۔ پہلے ان کا بہترین ناول "اب کر میری رفوگری" بہت اچھا تھا اور اب "محبت داغ کی صورت" ویل ڈن سائرہ آپی۔ "ماہ تمام" بہت اچھا ناول تھا اور عفت سحر طاہر کا ناول بھی بہت اچھا جارہا ہے۔
ج :۔ انعم! آپ خط پر اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں۔ آئندہ خط لکھیں تو اپنا شہر ضرور لکھیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بیا۔۔۔ چیچہ وطنی

اس ماہ کا پورا خواتین ڈائجسٹ بہت اچھا تھا۔ اسپیشلی نمرہ آپی کا ناول۔
ج :۔ بیا! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نائلہ اصغر۔۔۔ حافظ آباد

خواتین' شعاع اور کرن کو پڑھتے ہوئے چودہ سال گزر گئے۔ عفت آپی کا ناول تنقید کا شکار ہے' لیکن مجھے پسند ہے۔ آخر اس ماہ معمہ حل ہوگیا۔ ایبہا اور معیز کا رشتہ واضح ہوگیا۔ کہانی آگے جاکر اور دلچسپ ہوگی۔ عفت جی ازمیرٹ بہت یاد آتا ہے۔ نبیلہ ابر راجہ بہت یاد آتی ہیں۔ کبھی آئیں نا زبردست سے ناول کے ساتھ۔ آئیں گی نا۔
ج :۔ پیاری نائلہ! ازمیرٹ کی کمی تو ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن عفت جی فی الحال ناول کی مصروفیت کی وجہ سے لکھ نہیں پارہی ہیں۔

رابعہ۔۔۔ کراچی

میں خواتین کی مستقل قاری ہوں۔ خط بھی لکھا تھا' لیکن وہ شائع نہیں ہوا۔ کیا نئے لوگوں کی کوئی جگہ نہیں ہوتی خواتین میں؟
ج :۔ رابعہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا خط شائع نہیں ہوا۔ لوگوں کی جگہ نہ ہوتی تو اتنے سارے لوگ کیسے نظر آتے خواتین ڈائجسٹ میں۔

فرحانہ عبدالقادر۔۔۔ کراچی

آپ کو پتا ہے' آج اور ابھی اس وقت جبکہ لوڈشیڈنگ اور حبس کی شدت اور بچوں کی چھٹیوں میں دن رات کی تمیز بندہ بھول بھول جائے ایسے میں' میں نے خط لکھنے کے لیے پین ہاتھ میں کیوں تھاما؟ سمیرا حمید اور سائرہ رضا کے لیے۔۔۔ کہ ان مصنفین کی تعریف نہ کرنا اور ان تک نہ پہنچانا' یہ میں کرہی نہیں پائی۔ بے حد الگ اور نئے انداز سے سجی ان کی تحریریں' موضوعات کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر حساس طبیعت' نہ جانے کیسے "احساس" کو اپنی کہانی میں اور اپنے کرداروں میں ڈالتی ہیں کہ ہمارے دل اس "احساس" کو محسوس کرتے ہیں' ذہن قبول کرتا ہے اور سوچ کو متحرک کرکے یہ ہی احساس ہمیں خود احتسابی کے راستے کی جانب بہت آہستگی کے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ سائرہ رضا' فائزہ افتخار' عمیرا احمد' رخسانہ نگار (پرانی تحریریں ان کی) سب کا خلا کتنی آسانی سے صرف سائرہ نے پر کردیا۔ ہاں ادارے قائم و دائم رہتے ہیں۔ اسی چمک دمک کے ساتھ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں' پر کاش کہ لوگ سمجھیں کہ جو بنیاد ہو کامیاب سفر کی کہ جس نے ہاتھ بڑھا کر منزل تک پہنچنے میں مدد کی ہو' انہیں یوں بھلایا نہیں جاتا' بہرحال۔۔۔ انسانوں کے حوالے سے معاشرے کے تضادات' محتاط انداز' غیر ضروری تفصیلات سے پرہیز کرتے ہوئے سادہ' آسان دلچسپ اور سب سے بڑھ کر پیچیدہ معاملات کی طرف اشارہ اور اس کے بعد دوٹوک' واضح اجلے اور روشن حل کی جانب رہنمائی۔۔۔ بالکل یہ خوبیاں سائرہ رضا کے سوا کس میں ہوسکتی ہیں۔ اس بار سائرہ رضا نے دل جیت لیے۔ شروع سے آخر تک اپنی گرفت اور کہانی کا سحر قائم رکھا۔

تنزیلہ ریاض آپ کو علم ہے کہ میری پسندیدہ مصنفہ ہیں اور ان کا ناول ابھی کرداروں کے گرد گھوم رہا ہے' کہانی کی شکل اختیار نہیں کی۔ عفت سحر طاہر یار آپ ابھی افسانے یا مکمل ناول میں ہی اپنی بات کہیں۔

معذرت کے ساتھ "کوہ گراں تھے ہم" میں کہیں کچھ کمی رہ گئی ہے کہ عنیزہ اپنے ساتھ ہم سب کو چلا تو رہی ہیں' مگر اکثر خود ہی کھو جاتی ہیں اور ہم حق دق۔۔۔ باقی ماشاء اللہ خواتین کے سب سلسلے اچھے جارہے ہیں۔ سب کو

ساتھ لے کر چلتے ہوئے اور سچ کہوں تو اس بار کا شمارہ من کو بھا گیا۔ بس ایسے ہی اپنی چمک دمک برقرار رکھیے کہ ذرا سی بھی ماند پڑے چمک تو ہم بوکھلا بوکھلا جاتے ہیں کیا ہے ناکہ دل کے رشتے عجیب ہوتے ہیں اور خواتین و شعاع تو دل سے جڑے ہیں۔

ج :۔ پیاری فرحانہ! کہاں غائب ہو جاتی ہیں آپ؟ اتنا طویل وقفہ نہ دیا کریں۔ یقین کریں کہ اچھا لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اچھا تبصرہ، تنقید کرنے والوں کی کمی بھی بہت محسوس ہوتی ہے۔ پچھلے ماہ آپ کا سروے اور تبصرہ اس وقت موصول ہوا جب پرچا تیار ہو چکا تھا اور پریس جا رہا تھا۔ شامل نہ ہو سکا، جس کا ہمیں افسوس ہے۔ تنزیلہ تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ کہیں نہ کہیں ہم سب سے ہی کوئی نہ کوئی کوتاہی تو ہو ہی جاتی ہے۔ اب باقاعدگی سے شرکت کیجیے گا۔ مصروفیت کا تو ہمیں اندازا ہے، لیکن اپنوں کے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔

کوثر ناز۔۔۔ حیدر آباد

خواتین کے سلسلے وار ناول میں سے میں عفت سحر کا ناول "من مانگی دعا" پڑھتی ہوں۔ عفت اچھا لکھتی ہیں۔

ج :۔ پیاری کوثر! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ معذرت خواہ ہیں آپ کی تحریریں قابل اشاعت نہیں ہیں۔

حیا بنگش۔۔۔ کوہاٹ

اس بار خواتین 8 جولائی کو ملا۔ ہمیشہ کی طرح بہترین۔ کہنی سُنی میں مدیر کی باتیں سنیں۔ انٹرویوز بھی اچھے لگے۔ سب سے پہلے عفت آپی کا ناول "من مانگی دعا"

پڑھا۔ معیز پر بہت ہی غصہ آیا ہے مجھے۔ کوئی اتنا بھی بے حس ہو سکتا ہے کیا۔ "عہد الست" میں زارا اور شہروز کی کمی بہت محسوس ہو رہی ہے۔ پلیز تنزیلہ آپی ان دونوں کا کردار زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ ایمل رضا کا ناولٹ اور صائمہ بشیر کا ناول "گمان" پڑھ کر مزا آیا۔ اس بار بیسٹ افسانے کنیز نبوی کا "طعنہ" قانتہ رابعہ کا "مہمان" اور سائرہ رضا کا "ادھوری داستان" تھے۔ نمرہ کو فرصت سے پڑھوں گی، مجھے یقین ہے ان کا یہ ناول بھی ہمیشہ کی طرح ٹاپ پر رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ مستنصر حسین تارڑ کے اقوال پڑھ کر اچھا لگا۔ ثمینہ اکرم اور لائبہ انور کے شعر پسند

آئے۔ خاتون کی ڈائری میں وردہ بٹ کی غزل پسند آئی۔ آپی آخر میں آپ سے ایک بات کہنی ہے کہ کیا میری طرح ہر نئے لکھنے والے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔ انتظار۔۔۔

ج :۔ پیاری حیا! خواتین پر تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کی تحریریں پڑھ لی گئی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ قابل اشاعت نہیں ہیں۔

مونا شاہ قریشی۔۔۔ کبیر والا

پہلی بار خواتین ڈائجسٹ میں خط لکھنے کی جرأت کر رہی ہوں اور وجہ؟ تنزیلہ ریاض کا ناول "عہد الست" ہے۔ عفت سحر جی کی تو ویسے میں بہت بڑی فین ہوں۔ "من مانگی دعا" بھی اچھا ناول ہے، مگر فی الحال صرف اچھا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے تمام سلسلے اچھے ہیں، مگر ایک سلسلہ "نفسیاتی الجھنیں" بیسٹ ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی طویل تحاریر مجھے بہت پسند ہیں۔ امثل شہزاد اور سحر ساجد کافی اچھی رائٹرز ہیں۔ چھٹی کلاس میں تھی جب سے پڑھ رہی ہوں سرسری سے گزر جاتی تھیں، مگر پھر بھی لازمی پڑھتی تھی۔ مگر پچھلے چار سالوں سے اب مستقل پڑھنا شروع کیا ہے۔ زندگی سے آگاہی اور حالات سے ٹکراؤ بہت کچھ سیکھا ہے اور ہمیشہ مثبت پہلو تلاشا ہے۔

ج :۔ مونا! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی، آئندہ خط لکھیں تو ساری کہانیوں پر تبصرہ کریں۔

مدیحہ چیمہ۔۔۔ جگہ کا نام نہیں لکھا

"عہد الست" "کوہ گراں" بہت الجھا دیتی ہیں یا پھر میں خود الجھن محسوس کرتی ہوں۔ "من مانگی دعا" بیسٹ ہے۔ انداز پرانا ہے، پھر بھی بیسٹ ہے۔ انتظار رہتا ہے۔

باقی تمام ناول بھی بیسٹ ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جس طرح کی محبت ناول میں ہوتی ہے، ویسی حقیقت میں کبھی نہیں ہوتی۔ کوئی بھی اتنا مخلص ہوتا ہے، نہ کیئرنگ۔ یہ میرا اپنا تجزیہ ہے۔

ج :۔ جی مدیحہ! آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ کہانی میں رنگ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مبالغہ ضرور شامل کرنا پڑتا ہے، جبکہ حقیقت بالکل مختلف ہوتی ہے۔

نور یب فاطمہ۔۔۔ گاؤں حیات گڑھ گجرات

خواتین ڈائجسٹ سے میرا تعلق نہ تو سالوں پر محیط ہے اور نہ گزشتہ کئی ماہ سے۔ فقط مئی اور جون کا شمارہ پڑھنے کے بعد میں خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ تو جناب منشاء پاشا سے باتیں کر کے خوب لطف اٹھایا۔ عفت سحر جی آپ واقعی سحر پھونکتی ہیں۔ اس کے بعد باری آتی ہے نایاب جیلانی کے ناول "عدل اور جزا" کی تو اس چھوٹی سی پہاڑی لڑکی پر بے حد، بے حساب، بے پناہ اور بے شمار پیار آیا۔ ماہ تمام آمنہ جی ویل ڈن۔ تحریر کا اینڈ زبردست، نگہت سیما کا افسانہ "ہری چک" ایک اچھی تحریر تھی۔ جون کے شمارے میں سائرہ رضا کا مکمل ناول "محبت داغ کی صورت" جب ایک دفعہ پڑھنا شروع کیا تو دل میں خود بخود جگہ بنتی گئی، پیاس بڑھتی گئی اور ہم سیراب ہوتے گئے۔ جولائی کا شمارہ ابھی ملا ہے زیر مطالعہ ہے۔

ج :۔ نور یب! ہمیں اندازا ہے کہ آپ کے گاؤں میں پرچا بہت تاخیر سے پہنچتا ہے۔ اس لیے آپ کا خط شامل کر رہے ہیں۔ آئندہ جلد بھجوانے کی کوشش کیجیے گا۔

نوشابہ منظور۔۔۔ بھریا روڈ

مغرب سے کچھ دیر پہلے ابو جی نے لاکے دیا، جلدی جلدی ڈائجسٹ کو سرسری سا دیکھا، پہلے تو مجھے محسوس ہوا کہ روزے کی وجہ سے چیزیں دو، دو نظر آ رہی ہیں، مگر دوبارہ دیکھا تو پتا چلا کہ "ادھوری داستان" اور "عہد الست" دو، دو دفعہ چھپے ہوئے ہیں۔ جھوک دیپ سرے سے ڈائجسٹ میں تھی ہی نہیں۔ کچھ صفحے آگے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھے ہی نہیں۔ خیر اب جو پڑھا ہے اس پہ تبصرہ حاضر ہے۔ "من مانگی دعا" بھی اب اچھا ہوتا جا رہا ہے۔ "کوہ گراں" میں لگتا ہے کہ اب یہ ساری گتھی سلجھنی ہے۔ مگر نہ جی ہر شخص اپنی شناخت ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ کھاری سعد اور اب پریا رانی کا ماضی۔ سائرہ جی کا ناول "ادھوری داستان" بہت زبردست تھا۔ "مہمان" بھی رمضان المبارک کے حوالے سے اچھی کاوش تھی۔ مکمل ناول "گمان" بہت پسند آیا۔ خاص طور پر یہ موحد ذوالفقار باتوں کا کھلاڑی جانتا تھا۔ کس کو کس طرح شیشے میں اتارنا ہے۔

وہ جانتا تھا، دوستی کے رشتے میں دراڑ ڈالے بغیر محبت کا رشتہ نہیں بن پائے گا۔ سو اس نے نفرت اور بدگمانی کا رشتہ قائم رہنے دیا۔ وہ جانتا تھا یہاں محبت کے بجائے نفرت استعمال کرنی ہے۔ بعد میں کبھی بھی نفرت کو محبت سے ضرب دے لے گا اور حاصل جواب محبت آئے گا۔

ج :۔ نوشابہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ اکثر بائنڈنگ کی غلطی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے ایسی صورت میں آپ اپنے بک اسٹال والے کو پرچا دے کر تبدیل کرا لیا کریں۔

قارئین متوجہ ہوں!

1 خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7 خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ادارہ خواتین۔ 37 اردو بازار کراچی۔

سفر کمال کے

سائرہ رضا

وہ جو مستنصر حسین تارڑ نے کیے وہ کہلائے "سفر شمال کے" جو ہم نے کیے انہیں ہم نے نام دیا "سفر کمال کے۔"

جی ہاں! جب پاکستان ریلوے کی عام سی ٹرین کی اکانومی کلاس کا ایمرجنسی سفر اختیار کرلیا جائے تو وہ سفر کمال ہی کا سفر ہوگا۔

مجھے ٹرین بڑی رومانٹک لگتی ہے۔ ایسی محبت جس سے یادیں جڑی ہوتی ہیں۔ ٹرین کا ذکر آتے ہی ہم سب نوسٹلجک ہوجاتے ہیں۔ دراصل ٹرین ہمیں ان تمام لوگوں تک پہنچا آتی ہے جن سے ہم محبت کرتے ہیں یا جو ہم سے محبت کرتے ہیں اور محبت آزمائش کا دوسرا نام ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ محبت کے سفر میں کٹھنائیاں نہ ہوں۔ سو جو ہوگا دیکھا جائے گا کی بنیاد پر سفر کا آغاز کردیا۔ وہ ہی ناک کی سیدھ میں چلتا ٹریک۔۔۔ وہی گردو پیش کے مناظر، معاشرتی علوم کی کتاب بتاتی ہے پاکستان خوب صورت ہے۔

مولانا صاحب کہتے ہیں سورۃ رحمٰن میں بتائی گئی تمام نعمتوں سے مالا مال ہے۔

مفکر کہتا ہے، ستائیسویں رمضان کو یہ ملک ملا انعام ہے۔

ہم سب کو سنتے ہیں اور مانتے ہیں، میں کہتی ہوں سنی سنائی کو گولی ماریں، ٹرین کا سفر اختیار کریں آپ کو خود پتا چلے گا پاکستان کیا ہے؟ خوب صورتی، نعمت اور محبت جو تاحد نگاہ پھیلے سبزے کو دیکھ کر امڈ کر دل میں پیدا ہوتی ہے۔

مگر داغ تو چاند میں بھی ہے۔ جہاں سبزے کا اختتام ہوتا ہے، وہاں ایک عدد اسٹیشن ہوتا ہے۔ بے رنگ عمارت پیلا بلب تھکا ماندہ ایک آدھ قلی، آوارہ گھومتے چند صحت مند کتے اور اگر اسٹیشن آباد ہے تو ایک جملے میں بات ختم کرتے ہیں، فقط گندگی۔ گندگی اور بدانتظامی، ٹنڈو آدم آیا تو میں نے آپ سب کی پیاری سدرۃ المنتہیٰ۔ کو فون کیا۔

"تمہارے شہر سے گزر رہی ہوں۔ کس طرف منہ کرکے تمہیں آواز لگاؤں۔ وہ سامنے چھت پر تم ہی ہو نا؟"

"جدھر دل کرے آواز دے دیں۔ بس یہ ہے کہ میں ٹنڈو آدم میں نہیں "ٹنڈو محمد خان میں ہوں۔"

"کیا۔" ساری طراری دھری کی دھری رہ گئی۔ اتنی بڑی غلطی سننے میں۔ اب کیسے شرمندگی کا ازالہ ہو۔

"ہاں ہاں ہیلو سدرہ۔ سگنل کمزور ہوگئے ہیں "آپ کی آواز نہیں آرہی۔ اچھا خدا حافظ۔" فون کو اٹھا کر بیگ میں بند کردیا، مبادا غلطیاں کرتی ہی جاؤں۔

روہڑی کا پانی 1996ء میں بھی میٹھا مگر گدلا تھا جیسے کسی نے مٹی گھول دی ہو۔ اٹھارہ برس گزر گئے کسی کو اسٹیشن پر صاف پانی دینے کا خیال آیا ہی نہیں۔ برف یا تو پچاس کی لو یا سو کی۔۔۔ ورنہ جاؤ جہنم میں۔۔۔ (یعنی ٹرین میں)

خانیوال اسٹیشن پر ناشتے کے اسٹال والے نے روح فرسا خبر سنا کر حیران کردیا۔ جی۔۔۔ اب اسٹیشن پر حلوہ پوری بیچنا حکومت نے بند کردیا ہے۔

(حالانکہ موجودہ حکومت تو حلوے مانڈے کی خاصی شوقین ہے؟)

لاہور اسٹیشن کے رکشا ڈرائیورز کا بس چلے تو آپ کو سامان سمیت گود میں اٹھا کر رکشے میں بٹھالیں۔ بھاؤ نہ بنے تو وہیں زمین پہ پٹخ بھی جاتے ہیں۔ سالوں بعد لاہور کو دیکھا۔ اگر ایک لفظ کہوں تو سبزہ، خوشبو، ہریالی کی باس۔۔۔ جو کراچی کے کسی گملے سے بھی نہیں پھوٹتی۔

لاہور کی خاص بات۔۔۔ ڈھکن والے رکشے۔

"آپی! ڈھکن نہیں۔۔۔ دروازے۔۔۔ دروازوں والے رکشے۔" حمیرہ نے تصحیح کی۔

"نہیں حمیرا ڈھکن۔۔۔ مجھے لگتا ہے کوئی مجھے ٹکر میں بند کردیتا ہے۔" آپی محترمہ نے ہر رکشے والے سے بحث کی۔ "آخر تم نے یہ ڈھکن کیوں لگائے ہیں؟"

"لیڈیز پسند کرتی ہیں بہن جی۔۔۔"

"ہائے میری پیاری لاہوری بہنو! کیا واقعی؟"

اقبال پارک تب گئی تھی، جب فراک نیکر پہنتی تھی۔ آج میری بیٹی نے یہ پہنا تھا۔ اور آج میری مخاطب میری لاہوری بہنیں ہی ہیں۔ بلکہ لاہوری نہیں سارے پنجاب کی خواتین (مرد بھی۔۔۔)

بہت بچپن میں بھی نوٹ کیا کرتی تھی۔ مگر اس بار زیادہ نوٹ بھی کیا اور دل بہت دکھا بھی۔۔۔ وجہ ایک ہی۔۔۔ "آخر آپ لوگ پانی کا اتنا زیاں کیوں کرتی ہیں؟" دیکھیے۔۔۔ رکیے۔۔۔ ٹھہریے۔ مجھے جھٹلانے سے پہلے یا اپنی صفائی دینے سے پہلے جان لیں۔

میرا مشاہدہ و جائزہ ہمیشہ سے بہت گہرا رہا ہے اور یہ بات تو بہت بچپن سے میرے دماغ میں موجود ہے، جب شاید میں جماعت چہارم کی طالبہ تھی تب اپنی نانی اماں کے گھر پانی کا زیاں دیکھتی تھی۔ ٹب بھر چکے ہوتے اور پانی دھار و دھار گٹر میں جارہا ہے، ہم کراچی کے سیکھے سکھائے بچے سارا دن ٹونٹیاں بند کرتے کوئی نہ کوئی بڑا کھول دیتا "ارے بہنے دو پانی۔ نالیاں صاف ہورہی ہیں۔ ٹھنڈا میٹھا صاف پانی۔۔۔

اور یہی حال اب بھی میں نے دیکھا۔ آپ جانتی ہیں کراچی جیسے روشنیوں کے شہر میں، میں ایک کولر میٹھا پانی روز کی بنیاد پر سو روپے کا لیتی ہوں۔ یعنی دودھ بھی تین ہزار مہینہ اور پانی بھی۔۔۔ کراچی میں پینے کے

لیے علیحدہ سے میٹھا پانی لیا جاتا ہے اور عام گھریلو استعمال کے لیے کھارے پانی کے ٹینک خریدے جاتے ہیں اور آپ لوگ دروازوں' گلیوں' چوباروں کو پائپ لگا کر اندھا دھند دھوتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاتھ نپے تلے ہیں۔ حمیرا کے لاکھ کہنے پر بھی میری ہمت نہ ہوئی کہ پائپ سے براہ راست کپڑے نچوڑوں' ڈونگے بھر بھر کے ڈالتی رہی۔

دنیا میں پینے کے میٹھے پانی کے ذخیرے کل پانی کی مقدار کا صرف تین فیصد ہیں اور وہ بھی خاتمے کے دہانے پر۔۔۔ ہم تو دوران وضو بھی ایک پیر سے دوسرے پیر کے وقفے میں ٹونٹی بند کر دیتے ہیں۔ ٹونٹی کے نیچے برتن رکھتے ہیں اور جمع ہونے والے پانی کو گملے میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر ایک نعمت میسر ہے تو کیا اسے ایسے ہی ضائع کر دیں گی۔ اپنے بچوں پوتوں۔۔۔ پڑپوتوں اور آگے ان کے بچوں کے لیے بچا کر نہ رکھیں گی؟ مرتے وقت زمین کے اوپر ہزار گز کا بنگلہ وراثت اور زمین کے نیچے دو بوند پانی بھی نہ چھوڑیں گی۔

ہم سو سو صفحات کے ناول لکھ لیتی ہیں کسی چھوٹی سی بات کو نمایاں کرنے کے لیے کہ اگر ڈائریکٹ نصیحت کریں تو سب ہی منہ بنائیں گے۔ میں نے یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی یہ احمقانہ کام کرنے کی کوشش کی بس کہنا صرف یہ ہے کہ دس بالٹیوں کا کام آٹھ یا سات سے کرنے کی کوشش کرکے دیکھ لیں۔

واپسی کا سفر براستہ ملتان تھا۔ محاورہ سن رکھا تھا پھل دار جھاڑی جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ آموں سے لدے درختوں کو دیکھ کر یقین آگیا' ماشاء اللہ۔۔۔

آم زمین پر اتنے جھکے ہوئے تھے کہ گمان ہوا آم' تربوز کی طرح کہیں بیل پر تو نہیں لگتے؟

لاہور کی سب سے حیران کن اور ناقابل قبول بات۔۔۔ یہاں ہائی ایس ویگنز میں مرد و عورت کندھے سے کندھا جوڑ کر چپک کر بیٹھ جاتے ہیں محرم نامحرم کا مسئلہ ہی نہیں۔۔۔ کراچی میں الگ کیبن ہوتے ہیں اور اگر ایسی صورت حال ہو تو قتل و غارت شروع ہو جائے۔ کسی کا بھی اس جانب دھیان نہیں۔ کیوں آخر کیوں؟ صد حیرت۔

لاہور میں دو چیزوں کو دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بیان کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ایک کچھ گھروں کے اوپر لگے سولر انرجی کے پینل اور دوسرے ریلوے اسٹیشن پر لکڑی اور شیشے کا جھونپڑی نما کیبن۔۔۔ جو دراصل ایک بک شاپ تھی۔ اسلامی' معاشرتی' بہت بڑے ادیبوں کے ساتھ ہمارے شمارے بھی رکھے تھے۔ نجانے کتنی ہی دیر میں وہاں کھڑی کتابیں کھنگالتی رہی۔

واپسی کے سفر میں کسی اسٹیشن کے نلکے میں پانی کی بوند نہ تھی' ساٹھ ساٹھ روپے کی بوتل (ہمیں تو صاف سازش کی بو آرہی تھی' پانی بند کر دو تاکہ پیاسے عوام مجبوراً" بوتلیں خریدیں۔۔۔ آپ سب کو میری ذہانت پر تو یقین ہے نا کیسے اندر کی بات نکالی)

صبح چار بجے کینٹ اسٹیشن کراچی پہنچے۔ شہر قائد سو رہا ہے۔ ملگجے اجالے میں سریے اور کنکریٹ سے بنے انسانی ہاتھوں کے آسمان کو چھوتے پہاڑ (بلند عمارتیں) آلودگی کے باعث سیاہ نظر آتے ہیں۔

یہاں پنجاب جیسی ہریالی اور سبزے کی باس کا گمان بے وقوفی ہے' مگر ساحل کی جانب سے آتی ہوائیں بالوں کو اڑاتی ہیں آنچل سے چھیڑ خانی کرتی ہیں جسم کو گدگداتی ہیں (یہی ہوا دراصل وہ منتر ہے۔ جو کراچی سے باندھ دیتا ہے)

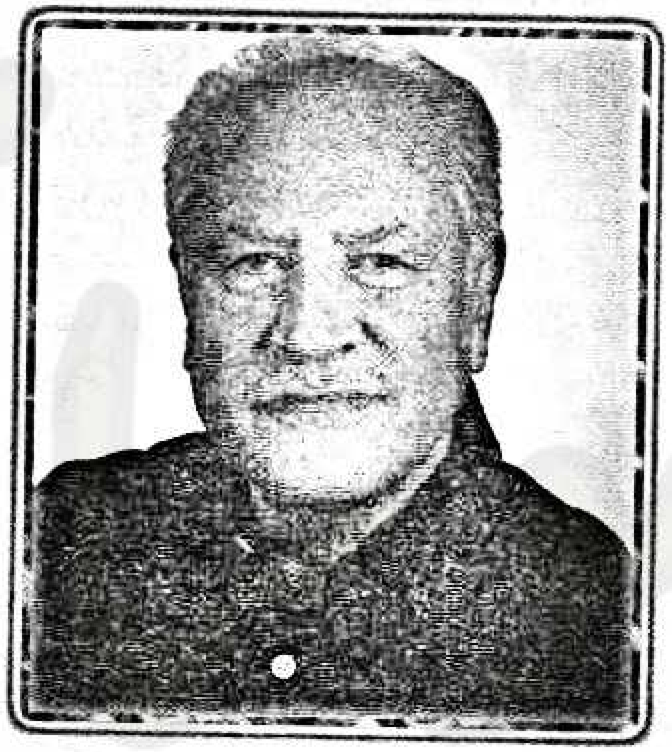
ہاں! ایک عجیب سی چیز دونوں شہروں میں مشترک دیکھی۔ کل صبح لاہور اسٹیشن جاتے ہوئے چوبرجی کے فٹ پاتھ پر سوئے انسان اور آج۔۔۔ اولڈ کراچی کی تاریخی عمارات کے فٹ پاتھوں پر بھی سوتے بے گھر انسان تو۔۔۔

ثابت یہ ہوا غریب اور بے گھر دنیا کے کسی بھی خطے میں ہوں' ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ ننگے' سوکھے چمرخ' بکھرے اور اجڑے پنجرڑے۔

☆

خبریں وبریں

واصفہ سہیل



عذاب

معروف کالم نگار اور صحافی رضا علی عابدی کہتے ہیں کہ "اگر آج میں بنوں میں ہوتا تو کیا ہوتا' یہ سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ خدا جانے مجھ پر اور میرے گھرانے پر کیا گزر رہی ہوتی۔ تپتی دھوپ میں لمبی قطاروں میں کھڑا میں اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوتا اور اپنے بھوکے پیاسے بچوں کو تسلی کا پیغام بھیجتا کہ بس اب راشن ملنے ہی والا ہے۔ (اور کبھی کبھی یہ انتظار "انتظار لاحاصل" بھی ہوتا ہے)

یہ ایک کرب اور ایک بلا کی کہانی ہے۔ بے گھر ہونے کی تکلیف کیا ہوتی ہے ہم کیا جانیں (اور جان کر بھی انجان بن جائیں تو؟) اپنے گھروندوں میں روکھی سوکھی سہی' چین کی زندگی بسر کرنے والوں سے کہا جائے کہ راتوں رات نکل جاؤ (کس کے ڈر سے؟) اور یہ جانے بغیر چلتے جاؤ کہ جانا کہاں ہے۔ (تقسیم کے وقت کم از کم منزل کا تو پتا تھا) تو ان کے دل و دماغ پر کیا گزرتی ہے (یہ ہم کیوں سوچیں؟) ہماری چشم تصور کور ہو جائے مگر وہ منظر نہ بنا سکے گی (کیا ہماری آنکھیں کور نہ ہو گئی ہیں؟) اس پر ستم یہ کہ قیامت کی گرمی اور لمبے دنوں کے طویل روزے کی حالت میں تپتی ہوئی دھوپ میں سانپوں جیسی بل کھاتی قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ ان کی ٹانگیں کمزور ہو جائیں اور وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر قطار میں کھسکتے جائیں۔ یہ عذاب ہے سب عذاب۔۔۔ اور عذاب بھی ایسا کہ ایک جانب یہ حال ہو اور دوسری جانب قوم راتوں کو جاگ جاگ کر فٹ بال کے مقابلے دیکھ رہی ہو اور اس بحث میں الجھی ہو کہ فلاں کھلاڑی یہودی ہے یا نہیں۔"

رضا علی عابدی مزید کہتے ہیں کہ "یہ وہ گھڑی تھی' جب ساری قوم سارے کام دھندے چھوڑ کر ان خانماں' ہم وطنوں کا ہاتھ بٹانے نکل کھڑی ہوتی۔ ان کے دکھ دور کرتی' اس تباہی کے منظر کو حیرت سے دیکھنے والے سہمے ہوئے بچوں کو بہلاتی۔ پردہ دار خواتین۔۔۔ وہ خواتین جنہیں مرجانا منظور ہے مگر مرد ڈاکٹرز کو زبان دکھلانا گوارا نہیں' ان کا آسرا بننے کے لیے لیڈی ڈاکٹرز نکل پڑتیں۔" (رضا صاحب! یہ کوئی مارننگ شو تھوڑی ہے جہاں پبلسٹی بھی ہوتی اور پیسے بھی ملتے ہیں)

وانٹڈ

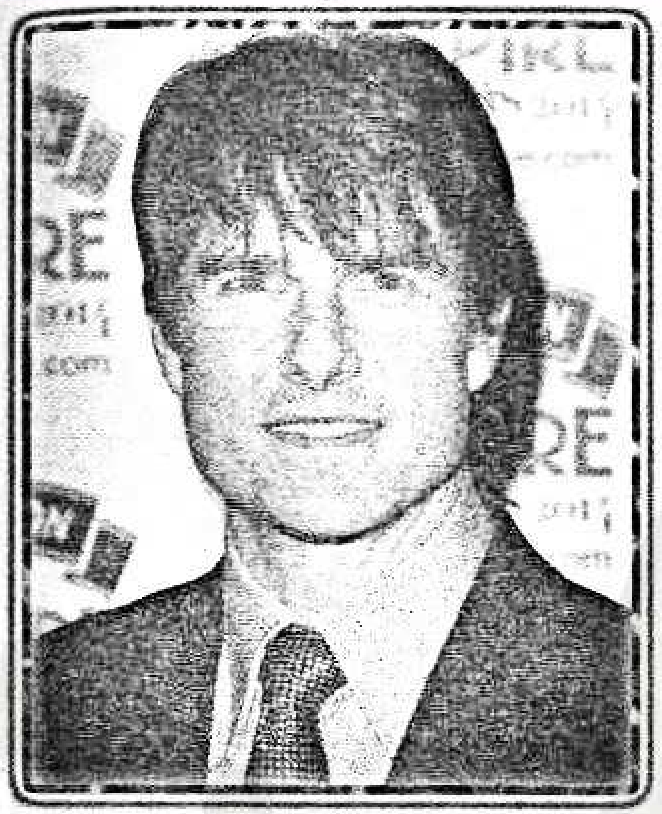
سید نور کی فلم "بھائی وانٹڈ" کی شوٹنگ میں مصروف ماڈل مریم علی کو بھارت کے معروف پروڈیوسر شرد کپور نے اپنی نئی فلم میں مرکزی کردار کے لیے کاسٹ کر لیا ہے۔ مریم علی نے بھارتی فلم میں کام کرنے کی ہامی بھر لی ہے۔ اور وہ جلد ہی شوٹنگ کے لیے دبئی چلی جائیں گی۔ (ماننے والی بات ہے

بھئی۔۔۔ شاہ جی جسے متعارف کروائیں یا جسے اپنی فلم میں مرکزی کردار دیں' وہ عروج پر کیسے نہ پہنچے) فلم کی ابتدائی عکس بندی کے دوران ہی مریم کو بالی ووڈ سے آفر آگئی ہے۔ اب لالی ووڈ کے پروڈیوسر کو یہ فکر لاحق

ہوگئی ہے کہ ان کی ہیروئن کہیں ابھی ہی نہ چلی جائے اور ان کو فلم کا نام "بھائی وانٹڈ" کے بجائے "ہیروئن وانٹڈ" کرنا پڑ جائے۔

اسٹاروار

سننے میں آیا ہے کہ ہالی ووڈ کے مشہور سپر اسٹار ٹام کروز اسٹار وارز سیریز کی اگلی فلم میں ہیریسن فورڈ' مارک ہیمل اور کیری فشر کے ساتھ نظر آئیں گے۔ ٹام کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ ان دنوں تواتر کے ساتھ سائنس فکشن موویز میں کام کر رہے ہیں۔ تاہم اطلاع ہے کہ اسٹار وارز میں ان کا کردار دوسری سائنس فکشن فلموں کے بالکل برعکس ہوگا۔ (وہ اس میں مزاحیہ کردار ادا کریں گے؟) اس سے پہلے ٹام کروز نے جتنی فلموں میں بھی کام کیا' ان میں ان کا کردار مرکزی نوعیت کا تھا۔ دوسرے وہ سب سنجیدہ نوعیت کے کردار ہی کرتے آرہے ہیں۔ یہ ان کے کیریر کا مختلف ترین رول ہوگا۔ (دیکھنے کے بعد ہی بتائیں گے)





قابل غور

میں عبدالقادر ہوں سے شہرت پانے والے فہد مصطفیٰ آج کل ایک ٹی وی شو کر رہے ہیں جس میں وہ اوٹ پٹانگ حرکات کرنے اور کروانے کے بعد انعامات بانٹتے ہیں۔ پروگرام میں زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ یا مڈل کلاس لوگ شریک ہوتے ہیں۔ رمضان المبارک میں اس طرح کے پروگرام کرنا اول تو مناسب نہیں ہے لیکن اگر آپ اتنے ہی ضرورت مند ہیں تو تھوڑا سا رمضان کا احترام ہی کرلیں۔ کیونکہ انعام جیتنے پر وہ مرد و عورت کی تخصیص کے بغیر اپنے ساتھ ڈانس کرواتے ہیں اور آفرین ہے ہماری قوم پر کہ بیوی شوہر کی موجودگی میں اور بیٹی باپ اور بھائی کی موجودگی میں ناچنے لگ جاتی ہے۔ اور گھر والے ذرا سے انعام کی خاطر تالیاں پیٹتے ہیں۔ باریش افراد بھی اسی طرح رقص کرتے ہیں۔ اس پروگرام کے تمام حصے۔۔۔ اگر بے ہودہ کہے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ فہد مصطفیٰ اپنے پروگرام میں اگر کوئی اچھی بات نہیں کرسکتے تو کم از کم مخرب اخلاق جملے بھی نہ بولیں۔ ایک پروگرام میں وہ ایک بچے سے کہتے نظر آتے ہیں کہ پہلے لڑکی دیکھتے ہو

یا آنکھ مارتے ہو۔ (پہلے آپ بتائیں فہد!) حالانکہ اگر پروگرام میں بنیادی معلوماتی سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا جائے اور ہلکے پھلکے تفریحی سیگمنٹ رکھیں جائیں تو ہم اپنے نوجوانوں اور بچوں

کو ایک اچھا تفریحی پروگرام دے سکتے ہیں۔ فہد مصطفیٰ اور پروگرام پروڈیوسر ہماری اس تجویز پر غور کریں تو بہتر ہے۔ کیونکہ ہم ابھی تک "نیلام گھر" نہیں بھولے ہیں۔

فن

فلم اسٹار لیلیٰ بھی خبروں میں رہنے کا فن خوب جانتی ہیں۔ اب نئی بات لے کر آئی ہیں کہ میں اگر کسی سے ہنس کر بات بھی کرلوں تو اسکینڈل بنا دیا جاتا ہے۔

دراصل شوبز فیلڈ ہی ایسی ہے کہ جہاں پر آئے روز نئے اسکینڈلز منظر عام پر آتے رہتے ہیں (یعنی آپ سمجھتی ہیں کہ؟) اس کا مقصد صرف سستی شہرت اور پبلسٹی حاصل کرنا ہے۔ (مان گئی نا آخر کہ یہ سب۔۔۔؟) آج کل میرے ساتھ بھی یہی سب ہو رہا ہے۔ (یعنی سستی شہرت حاصل کر رہی ہیں؟) کسی تقریب یا پارٹی میں ساتھی فنکار سے ہنس کر بات کرلی تو اگلے روز ہی یہ خبر چھپ جاتی ہے۔ جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے تو میں کہتی ہوں کہ جس نے چھاپی ہے اسی سے پوچھ لو۔ (یعنی اپنی جان چھڑالی)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ یونان کے عالم افلاطون نے کہا تھا کہ یا تو ایک فلسفی کو بادشاہ ہونا چاہیے یا ایک بادشاہ کو فلسفی' مگر یہ دونوں باتیں ممکن نہیں ہیں تو کم از کم ایک حکمران کو ایک اچھا اداکار ضرور ہونا چاہیے۔ مشرف اچھے اداکار تھے۔ وہ محفلوں میں سر پر شراب کا گلاس رکھ کر ناچتے بھی تھے اور ایسی ویڈیوز منظر عام پر آنے کے بعد بھی انہوں نے کبھی تردید نہیں کی۔



(آواز حق۔ اعجاز منگی)

☆ بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی اور الطاف حسین کی تاریخ پیدائش ایک ہے۔ دونوں 17 ستمبر 1950ء کو پیدا ہوئے۔

(بلاتکلف۔ متین فکری)

☆ سیانے کہتے ہیں دریا' مسلح مسافر' پنجے اور سینگ والے جانور' بادشاہ' آوارہ عورت اور کنجر پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے کہ کہیں بھی اور کسی جگہ بھی آپ کو مار دیں گے' بیچ دیں گے' بے عزت کردیں گے یا ایمان کا سودا کرلیں گے۔ اس لسٹ میں ٹی وی چینلوں کو بھی شامل کرنا چاہیے کہ سب سے زیادہ خطرہ ان ہی سے ہے۔ یہ خدا سے لڑنے پر دلیر ہیں۔ حدود کی پامالی میں شیر ہیں اور اخلاق باختگی کی شمشیر ہیں۔

(ڈاکٹر ضیاء الدین خان)

آپ کا باورچی خانہ

ثناء تبسم

ثنا تبسم.... فیصل آباد

1 ۔ کھانا پکاتے وقت سب سے پہلے پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہم تین بہن' بھائی ہیں۔ جس میں سے دو بھائی اور دونوں کی پسند مشرق اور مغرب جیسی۔ بڑے کو سبزیاں پسند ہیں تو چھوٹا دال کھانے کا شوقین ہے اور میں گوشت خور ہوں۔ ہفتے کے چھ دنوں میں (کیونکہ ساتواں دن یعنی جمعۃ المبارک ماموں کے گھر گزارا جاتا ہے۔) ہم تینوں کی پسند کا کھانا محبت کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے غذائیت سے بھرپور اور مزے دار کھانا بنایا جاتا ہے۔

2 ۔ امی کی وفات کے بعد گھر میں اچانک مہمانوں کا آنا تقریباً ختم ہی ہو چکا ہے۔ لیکن اگر آ بھی جائیں تو ہم اپنی سوئی ہو سلیقہ مندی اور سگھڑاپے کو جھنجھوڑ کے اٹھا ہی لیتے ہیں اور مہمان کو بٹھاتے ہیں کچن کے ساتھ والے کمرے میں' تاکہ ساتھ ہی مہمان کو کمپنی بھی دیتے رہیں اور بناتے ہیں چکن کڑاہی' جی ہاں! ترکیب نوٹ کرلیں۔

چکن کڑاہی

اجزا :

چکن	ایک کلو
گھی	ایک پاؤ
دہی	آدھی پیالی
ٹماٹر	چار عدد
پیاز	دو درمیانے سائز کے
لہسن ادرک کا پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چمچہ
سفید زیرہ بھنا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا' ادرک	باریک کٹا ہوا حسب پسند

ترکیب :

سب سے پہلے پیاز' ٹماٹر اور ہری مرچ کو تھوڑا سا پانی ڈال کر گرینڈ کرلیں۔ اس مکسچر کو کڑاہی میں ڈال کر درمیانی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں اور ساتھ ہی چکن ڈال کر پانچ منٹ پکائیں۔ اس کے بعد نمک' سرخ مرچ اور ہلدی ڈال کر ہلائیں اور پانچ سے سات منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ جب تقریباً" چکن گل جائے تو دہی میں سفید زیرہ' لہسن' ادرک کا پیسٹ اور کالی مرچ ڈال کر ہلا لیں۔ پھر اس میں گھی ڈال کر اچھی طرح سے بھون لیں۔ جب چکن گھی چھوڑ دے تو اس پر ادرک' ہری مرچ اور دھنیا ڈال کر 2 سے 3 منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ یہ چکن کڑاہی بیس سے پچیس منٹ میں تیار ہو جائے گی اور ان شاء اللہ بہت مزے کی بنے گی۔ اسے آپ نان یا روٹی کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں۔

3 ۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے' لیکن اس کے ساتھ باتھ روم بھی عورت کی سلیقہ مندی اور صفائی پسند طبیعت کو ظاہر کرتا ہے۔ میں ہر روز صبح گھر کی صفائی کے ساتھ کچن اور باتھ روم دونوں کی صفائی ساتھ میں کرلیتی ہوں۔ اس لیے ہفتہ وار اور مہینہ وار صفائی اتنے زیادہ تردد سے نہیں کرنا پڑتی۔

4 ۔ صبح کا ناشتا بہت ضروری ہے' لیکن میں سات بجے اٹھ کر خوب سارا پانی پیتی ہوں۔ تقریباً" 4 گلاس پانی لازمی پیتی ہوں۔ اس کے بعد 10 بجے ناشتا کرتی ہوں۔ دونوں بھائی نو بجے ناشتا کرکے یعنی رات کے سالن کے ساتھ پراٹھا کھایا۔ ایک نے

چائے پی اور دوسرے بھائی نے لسی پی لی لو جی! عام دنوں کا ناشتا سادہ سا ہے۔ لیکن جمعۃ المبارک کو نان کے ساتھ کبھی پائے کا سالن' کبھی چنے اور حلوہ پوری اور کبھی سال میں ایک یا دو دفعہ نہاری کا ناشتا ہوتا ہے۔ میں ناشتے میں عموماً" سادہ بریڈ اور ہاف فرائی انڈا چائے کے ساتھ لیتی ہوں۔ لیکن جمعے کے روز سب کا ناشتا ایک ہی ہوتا ہے ہم تینوں اکٹھے ہی ناشتا کرتے ہیں۔ ویسے تو کوکنگ مجھے میرے ماموں نے سکھائی ہے۔ لیکن ایک سویٹ ڈش جو کہ مجھ سے فرمائش کرکے بنوائی جاتی ہے۔ وہ مجھے میری امی نے سکھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔ (آمین)

کسٹرڈ

اجزا :

دودھ	ایک کلو
چینی	ایک پاؤ یا اپنی پسند کے مطابق
برفی	ایک پاؤ
کسٹرڈ پاؤڈر	چار کھانے کے چمچے
جیلی	ایک پیکٹ
پائن ایپل	ایک ٹن

ترکیب :

دودھ کو گرم کرکے اس میں چینی اور برفی ڈال کر اسے اچھی طرح پکالیں۔ پھر علیحدہ باؤل میں تھوڑے سے دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر مکس کرلیں۔ اس مکسچر کو پکتے ہوئے دودھ میں ڈال کر گاڑھا ہونے تک پکائیں' پھر اس کے بعد اسے ٹھنڈا کرلیں۔ جیلی کو علیحدہ سے گرم پانی میں ڈال کر پکالیں اور اسے کسی بھی باؤل میں ڈال کر ٹھنڈا کرلیں۔ جب کسٹرڈ خوب ٹھنڈا ہو جائے تو اس پر پائن ایپل اور جیلی کاٹ کر ڈال دیں۔ آگے مہمانوں کو سرو کریں اور خود بھی کھائیں۔ پسند آئے تو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اگر پسند نہ آئے تو آپ سے کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ دوبارہ کوشش کریں۔

5 ۔ ہائے اللہ جی! کیوں زخموں کے ٹانکے ہی ادھیڑ دیے۔ زندگی میں ایک بار احمد ماموں نے یہ عیاشی کروائی ہے۔ بھائی میرے اس کام میں بہت کاہل ہیں۔ (مجھے ساتھ لے جانے کا معاملے میں) خود تو ہر مہینے ایک بار تو ضرور ہی باہر کھانا کھاتے ہیں اور میرے لیے باہر کا کھانا گھر میں ہی لا کر دے دیتے ہیں' اوپر سے احسان کہ "آج تمہیں باہر کا کھانا کھلایا ہے۔" ہائے ری قسمت! ویسے احمد ماموں اکثر اپنی فیملی کے ساتھ مجھے اور نمرہ جو کہ میری خالہ زاد بہن ہے اسے بھی لے جاتے ہیں' لیکن آئس کریم یا فالودہ کھانے کے لیے' کیونکہ کھانا گھر میں سب ماموؤں اور خالاؤں کی فیملیز ایک ساتھ اکٹھا ہی کھاتے ہیں۔ لیکن اب میں نمرہ کو ساتھ لے کر کبھی کبھار سموسے' چاٹ یا فرائی فش وغیرہ قریبی آئس بار پلس ریستوران سے کھا آتی ہوں۔ لو جی! اس روکھی پھیکی زندگی میں کوئی رنگ تو ہو۔ جب بھی ہم دونوں جاتی ہیں خالہ سے پوچھ کر ہی جاتی ہیں' بنا اجازت کبھی گھر سے باہر نہیں گئے۔

6 ۔ ہر چیز موسم کے لحاظ سے ہی اچھی لگتی ہے۔ جیسے سبز چائے سردیوں میں اچھی لگتی ہے اور سکنجبین اور روح افزا گرمیوں میں فرحت بخش ہوتے ہیں۔ اسی طرح کریلے گوشت یا قیمہ بھرے کریلے گرمیوں میں مزا دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح گاجر کا حلوہ سردیوں میں مزا دیتا ہے۔ اس لیے موسم کو مد نظر رکھتے ہوئے کھانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

7 ۔ اچھا کھانا پکانے کے لیے محنت کے ساتھ خلوص اور محبت کی بھی قائل ہوں۔ پر خلوص ہو کر کوئی بھی کام کریں گے تو ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔

8 ۔ کچن کے حوالے سے میں یہ ٹپ دوں گی کہ کوئی بھی کچن کا یا کچن سے باہر کا کام ہو۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور درود شریف پڑھ کر شروع کریں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ! کامیابی اور برکت نصیب ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں سے ہم مسلمانوں اور پاکستانیوں کو اس مہنگائی کے دور میں حلال روزی کمانے اور کھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

☆



آپ کے بچوں کا لنچ باکس

صبا سحر

آج کل بچے روایتی کھانے زیادہ پسند نہیں کرتے اور بازار کے جنک فوڈز کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے بچوں کو گھر کے بنے صاف ستھرے اور صحت بخش کھانوں کی طرف راغب کرنا ضروری ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ روزانہ ان کے لنچ باکس کے لیے ایسا کیا بنایا جائے جو انہیں پسند آئے اور وہ رغبت سے کھائیں۔ اس ماہ یہ سلسلہ آپ کے اسی مسئلے کو دور پیش رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔

براؤن بریڈ سینڈوچ

ضروری اجزا :

براؤن بریڈ	دو سلائس
چکن کے ریشے	چار کھانے کے چمچے
ٹماٹر، سلاد پتا	ایک ایک عدد
پنیر	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ابلے چکن کے ریشے کر کے پنیر کے ساتھ مکس کریں اور ایک سلائس پر لگائیں۔ اس پر ٹماٹر رکھیں۔ پھر سلاد پتا اور دوسرا سلائس رکھ دیں۔ جھٹ پٹ اور مزے دار براؤن سینڈوچ تیار ہے۔

ذائقے کی تبدیلی کے لیے بنائیں ویجی ٹیبل اوپن سینڈوچ۔ اس کے لیے تین کھانے کے چمچے مایونیز میں سفید مرچ، تھوڑی سی بند گوبھی اور باریک کٹا ہوا کھیرا ڈال کر مکس کریں۔ سلائس سینک کر یہ آمیزہ رکھیں۔ اس کے اوپر دوسرا سلائس ڈھک دیں۔ تکون شیپ میں کاٹ لیں۔ کیچپ کے ساتھ لنچ باکس میں رکھ دیں۔

ویجی ٹیبل چاؤمن

ضروری اجزا :

نوڈلز	ایک پیکٹ
بند گوبھی	آدھا کپ
ہری پیاز، شملہ	آدھا کپ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

نوڈلز ابال کر رکھ لیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے دو لہسن کے جوے کوٹ کر سنہری کریں، پھر اس میں نوڈلز ڈال دیں۔ کٹی ہوئی سبزیوں کے ساتھ نمک، پسی کالی مرچ اور سویا ساس ڈال کر چند منٹ تک پکائیں پھر اتار لیں۔ کبھی کبھی اس میں چکن بھی شامل کر کے لطف دوبالا کیا جا سکتا ہے۔

کرسپی چکن

ضروری اجزا :

چکن	دو پیس
انڈا	ایک عدد
پنیر	آدھا کپ
بریڈ کرمبز، کارن فلور	دو، دو کھانے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

بغیر ہڈی کے چکن کی بڑی بوٹیوں کو کوٹ کر چپٹا کر لیں۔ انڈے میں پنیر، میدہ، نمک، پسی سیاہ مرچ ڈال کر پھینٹ لیں۔ چکن پیسز کو انڈے میں ڈبو کر کارن فلور میں لپیٹیں، پھر انڈے میں ڈبو کر بریڈ کرمبز میں رول کریں اور ایک بار پھر انڈے میں ڈبو کر چند منٹ کے لیے فریج میں رکھ کر گہرے گرم تیل میں تل لیں۔ فرنچ فرائز اور کیچپ کے ساتھ اپنے بچوں کے ہمراہ کریں۔

جھٹ پٹ پزا

ضروری اجزا :

چکن کے ریشے	ایک کپ
اسپیگٹھی، پنیر	ایک، ایک کپ
انڈا	ایک عدد
شملہ مرچ، ٹماٹر	ایک، ایک عدد
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

ابلی ہوئی اسپیگٹھی میں انڈا، نمک، کالی مرچ، چکن اور لہسن پیسٹ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے آنچ ہلکی کر دیں پھر اسپیگٹھی کا آمیزہ ڈال کر پھیلا دیں۔ اس پر شملہ مرچ اور ٹماٹر باریک باریک لمبائی میں کاٹ کر پھیلا دیں۔ پنیر بھی ترش کر چھڑک دیں۔ ڈھک کر کچھ دیر پکنے دیں۔ چیز پگھل جائے اور پزا سیٹ ہو جائے تو احتیاط سے اتار لیں۔ بچوں کو بے حد پسند آئے گا۔

چکن شاشلک

ضروری اجزا :

چکن بوٹیاں	ایک کپ
شملہ، پیاز، ٹماٹر	دو، دو عدد
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
کیچپ	آدھا کپ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

بوٹیوں میں نمک، اجینو موتو، سرکہ اور کالی مرچ کا پیسٹ سا بنا کر مکس کریں۔ سبزیوں کو چوکور کاٹ لیں۔ شاشلک اسٹک پر پہلے چکن بوٹی، پھر پیاز کا چوکور ٹکڑا، پھر شملہ مرچ اور ٹماٹر پروئیں، ایک اسٹک میں تین دفعہ یہ سیٹ بنائیں اور سینک لیں۔ اسٹک تیار ہو جائیں تو اس پر کیچپ ڈال دیں۔ ابلے ہوئے چاول کے ساتھ لنچ باکس میں سیٹ کریں۔

کرسپی سوئٹ نوڈلز

اجزا :

چکن	آدھا کپ
نوڈلز	ایک پیکٹ
ہری پیاز	ایک عدد
انڈا	ایک عدد
چینی	دو کھانے کے چمچے
سفید سرکہ	ایک چوتھائی کپ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

چکن کی بوٹیاں لمبائی میں کاٹ لیں۔ تیل گرم کر کے ہری پیاز ڈالیں۔ پھر لہسن پیسٹ اور چکن ڈال کر بھونیں۔ ذرا سا پانی شامل کر کے چکن گلائیں، پھر کٹی مرچ، چینی اور سرکہ ملا کر اتار لیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے ابلے ہوئے نوڈلز ہلکے سے فرائی کریں۔ اس کے اوپر چکن والا آمیزہ ڈال کر ہلکا سا مکس کر لیں۔

✡

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

ریحانہ.... کراچی

س :۔ میری عمر 35 سال ہے۔ ہم چھ بہنیں، دو بھائی ہیں۔ ابو کا انتقال ہوچکا ہے۔ چار بہنوں کی شادی ابو نے اپنی زندگی میں ہی کردی تھی۔ ایک بہن کی شادی ابو کی وفات کے بعد ہوئی۔ اب دونوں بھائیوں کی شادی بھی ہوچکی ہے۔ میری شکل و صورت معمولی تھی۔ تعلیم بھی صرف میٹرک تھی۔ ایک، دو رشتے آئے، لیکن بات نہ بنی۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے بھائیوں کے اپنے بچے ہیں۔ ان کی آمدنی بھی زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ کہیں میری شادی کی بات کرتے ہیں تو شادی کے اخراجات کا مسئلہ ہے۔ بھابھیوں کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں ہے تو میں بہت برا بھی نہیں ہے۔ میری عمر کافی زیادہ ہوچکی ہے۔ کچھ سال اور نکل گئے تو پھر شادی کا امکان بھی ختم ہوجائے گا۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھائیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بتائیں کیا کروں؟

ج :۔ اچھی بہن! اس میں شک نہیں کہ جن حالات میں آپ ہیں۔ وہ مشکل ہیں لیکن رشتوں کا مسئلہ ہر دوسرے گھر کا مسئلہ ہے۔ آپ نے اپنی بہنوں کے بارے میں نہیں لکھا۔ آپ کو اپنی بہنوں سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ بہنیں آپس میں بے تکلف ہوتی ہیں، ہر طرح کی بات کرسکتی ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے آپ کی شادی کے لیے کوشش بھی کی ہو، لیکن کامیابی نہ ہوئی ہو۔ لیکن آپ نے اب تک صرف شادی کے انتظار میں بیٹھ کر غلطی کی۔ آپ کو اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے تھا۔ اگر یہ ممکن نہیں تھا تو سلائی سیکھ لیتیں۔ کوئی ہنر حاصل کرتیں۔ اس سے آپ کا وقت آسانی سے کٹ جاتا اور تھوڑی بہت آمدنی کا ذریعہ بھی ہوجاتا۔ آپ اب بھی اس طرف توجہ دیں۔ کوئی کورس کرلیں۔ میٹرک تک پڑھا ہے۔ گھر میں چھوٹے بچوں کو بھی پڑھا سکتی ہیں۔

عالیہ.... لاہور

ج :۔ اچھی بہن! آپ نے اپنی جو خوبیاں لکھیں ہیں۔ وہ یقیناً" آپ میں ہوں گی۔ آپ کے مطابق آپ شوہر سے عمر میں کم ہیں۔ شکل و صورت میں ان سے بہتر ہیں۔ خاندان کے لحاظ سے بھی ان سے برتر ہیں۔ لوگوں سے میل ملاقات۔ مہمان داری میں طاق ہیں۔ خاندان میں زیادہ مقبول ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ میں ایک کمی بھی ہے کہ آپ شدت پسندی کا شکار ہیں۔ آپ کے ہاں معافی کا خانہ نہیں ہے۔ ایک شخص جس نے کروڑوں کی مالیت کا گھر آپ کے نام کردیا۔ کبھی اخراجات کی تنگی نہ ہونے دی۔ ساری آمدنی آپ کو دی۔ ماضی میں اس کا کردار بے داغ رہا جس کا آپ اعتراف کرتی ہیں، اگر وہ کسی وقتی لمحاتی کمزوری کا شکار ہوگیا تو کیا اس کو معاف نہیں کیا جاسکتا؟ بھلایا نہیں جاسکتا؟

جبکہ یہ بھی واضح ہوچکا ہے کہ اسے پھنسانے کے لیے باقاعدہ جال بچھایا گیا تھا۔ آپ نے صرف ایک بار کی غلطی کو دل میں بٹھالیا۔ اتنا اثر لیا کہ آپ اپنا بچہ کھو بیٹھیں۔ جبکہ آپ نے اس عورت کو مارا پیٹا بھی اور اس کے

گھر پر اسے دھمکیاں بھی دلوائیں، وہ معاملہ ختم بھی ہوگیا۔ آپ کے شوہر بھی نادم و شرمندہ ہیں، آپ سے رو رو کر، پاؤں پر سر رکھ کر معافیاں مانگ چکے ہیں۔ اگر ان کی فطرت میں خرابی ہوتی یا پہلے انہوں نے ایسا کچھ کیا ہوتا تو وہ اتنے نادم نہ ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ ان سے شدید محبت کرتی ہیں اسی لیے آپ کو اتنا دکھ ہوا لیکن وہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔

اچھی بہن! انسان خطا کا پتلا ہے۔ بڑے سے بڑا زاہد بہک سکتا ہے۔ اس سے غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ آپ کے شوہر دوہری شخصیت کے مالک نہیں ہیں۔ بس ایک غلطی سمجھ لیں۔ یہ کوئی محبت یا عشق نہیں تھا۔ ایک وقتی لمحاتی کمزوری تھی جس کا وہ شکار ہوئے۔

اطمینان رکھیں آپ کے شوہر آپ کے ہی ہیں، انہوں نے آپ کی جگہ کسی کو نہیں دی۔ نہ ہی آپ کی امانت میں خیانت کی۔ وہ صرف آپ کو ہی چاہتے ہیں۔ جو ہوا اسے بھول جائیں، اسی میں بہتری ہے۔

س علی.... گجر خان

ج :۔ اچھی بہن پہلی بات تو یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ گھر والوں کا رویہ آپ کے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ والد تو آپ کی پیدائش پر ہی خوش نہیں تھے، لیکن والدہ، چھوٹی بہن اور بھائی کیوں متنفر ہیں؟ والدہ بھی آپ سے بے زار ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے، جبکہ آپ قرآن پاک حفظ کرچکی ہیں۔ جس کا بڑا درجہ ہے۔ آپ کے گھر والوں کو تو آپ کی قدر اور عزت کرنا چاہیے۔

دوسری بات کہ وہ آپ کی شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے جبکہ آپ کی شادی کی عمر ہوچکی ہے، اور آپ کی عمر کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بھی بن چکی ہیں۔ اس صورت حال میں جبکہ گھر میں کوئی بھی آپ سے خوش نہیں ہے تو انہیں جلد شادی کرکے آپ سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے تھا۔ رشتے نہیں آتے یا شادی نہ کرنے کی کوئی اور وجہ ہے؟

آپ اپنی والدہ سے قریب ہونے کی کوشش کریں۔ شاید وہ آپ کے لیے کچھ کرسکیں، ویسے اس مسئلہ کا حل تو یہی ہے کہ آپ کی شادی ہوجائے اور آپ اس ماحول سے نکل جائیں۔

حنا.... گوجرانوالہ

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ آپ کے والدین آپ پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ یہ موجودہ دور اور حالات کا تقاضا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو احتیاط کرنا چاہیے۔ اگر وہ آپ کو کہیں جانے سے منع کرتے ہیں تو اس میں یقیناً" کوئی مصلحت ہوگی وہ آپ کی بھلائی چاہتے ہیں اگر وہ کسی چیز کو نہیں چاہتے یا کوئی بات انہیں ناپسند ہے وہ ہرگز نہ کریں۔ اس میں اپنے اوپر جبر نہیں کریں بلکہ یہ سب خوشی سے کریں، اپنے والدین سے نہایت نرمی اور محبت سے پوچھ لیں کہ وہ کیوں منع کررہے ہیں پھر آپ دیکھیں گی کہ آپ کو زندگی میں کتنی راحت، کتنی خوشیاں ملیں گی۔

بیوٹی بکس

امت الصبور

مہوش عزیز..... سرگودھا

س : میرا مسئلہ ـــــ میرے تیزی سے گرتے ہوئے بال ہیں۔ اگر کچھ دن مزید ایسے ہی گزرے تو آدھی گنجی تو ہو چکی ہوں، پوری گنجی بھی ہو جاؤں گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا وجہ ہے؟ کوئی فکر یا پریشانی بھی نہیں ہے۔ غذا بھی متوازن لیتی ہوں۔ دودھ پھل اور سبزیاں بھی۔ ڈاکٹر سے بھی کئی بار دوائی لے چکی ہوں۔ سر کے اگلے حصے میں تو بال بہت ہی کم ہیں۔ میں بہت سارے ٹوٹکے اور طرح طرح کے تیل لگا چکی ہوں۔ لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ پلیز پلیز آپی! اس کا کوئی حل بتائیں۔ گھریلو شیمپو بنانے کا بھی طریقہ بتائیں۔

ج : پیاری مہوش! آپ کی صحت اچھی ہے۔ آپ متوازن غذا لے رہی ہیں، ڈاکٹر سے بھی مشورہ کر چکی ہیں اور کئی دوائیاں بھی استعمال کر چکی ہیں لیکن بال بدستور گر رہے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ یہ موروثی مسئلہ ہو "عموماً" دیکھنے میں آیا ہے کہ والدین کے بال کم ہوں تو بچوں کے بال بھی کم ہوتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ جو شیمپو استعمال کر رہی ہیں، وہ آپ کے بالوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ بالوں کے لیے بالکل ہلکا بے بی شیمپو استعمال کر کے دیکھیں۔ ممکن ہے اس سے خوشگوار اثرات ہوں اور بال گرنا رک جائیں۔

گھریلو شیمپو بنانے کا طریقہ ہے کہ گلیسرین سوپ کو گرم پانی میں ڈال کر پگھلا لیں پھر اس میں ایک انڈا ملا لیں، اس سے سر دھوئیں۔ اس سے بالوں پر خوشگوار اثرات ہوں گے۔ ہفتہ میں کم از کم دو بار بالوں میں نرم ہاتھوں سے تیل کا مساج کریں۔

سلمیٰ وقار..... ملکانی شریف

س : میری شادی ہونے والی ہے، ہمارے ہاں بیوٹی پارلر میں تیار ہونے کا رواج نہیں۔ میں میک اپ کے بارے میں چند باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔

۱ بلشر کس طرح استعمال کیا جاتا ہے؟

۲ آئی لائنر کیسے لگایا جاتا ہے؟

۳ فاؤنڈیشن کا انتخاب کرتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

ج : ۱ بلشر لگانے سے پہلے آپ مسکرائیں۔ تاکہ آپ کے رخسار ابھر آئیں۔ رخساروں کے ان ابھار پر بلشر لگائیں۔ اس طرح آپ صحت مند دکھائی دیں گی۔ اسے اچھی طرح بلینڈ کرلیں تاکہ بلشر قدرتی دکھائی دے۔

کبھی بھی بلشر کو رخساروں سے نیچے نہ لگائیں۔ بہت زیادہ نیچے لگایا گیا بلشر کا رنگ یہ ظاہر کرے گا جیسے آپ بے حد تھکی ماندی ہیں، نہ ہی بلشر کو ناک سے زیادہ قریب لگائیں۔ ورنہ سب کی توجہ آپ کی ناک کی جانب مبذول ہوگی۔

کبھی بھی بلشر کو اپنی آنکھوں سے زیادہ قریب نہ لگائیں۔ اس طرح آپ دوسروں کی توجہ اپنی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں، سوجن اور جھریوں پر مبذول کرادیں گی۔

۲ آج کل آئی لائنر کا رواج دوبارہ آگیا ہے۔ اپنی اوپری پلک کے کنارے سے بیرونی کنارے تک ایک پتلی لائن لگائیں۔ نچلی پلک پر ہرگز نہیں۔ جب یہ سوکھ جائے تو اسی رنگ کی نرم نوک والی پنسل کو اپنی بنائی ہوئی لائن کے اوپر پھیر دیں۔ پھر کاٹن سے ہموار کرلیں۔

کالا آئی لائنر کبھی استعمال نہ کریں۔ ڈارک گرے یا چاکلیٹ کلر کا استعمال کریں۔

۳ فاؤنڈیشن کا انتخاب کرتے ہوئے آپ درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں، اس کے لیے ایسے شیڈ کا انتخاب کریں جو آپ کی اسکن ٹون سے مشابہ ہو ہلکا یا گہرا ہرگز نہیں۔ شیڈ چیک کرنے کے لیے ہاتھ کی الٹی سطح پر شیڈ لگانا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ شیڈ اپنے چہرے پر لگا کر ہی چیک کرنا چاہیے۔

چہرے پر فاؤنڈیشن نقطوں کی شکل میں لگائیں۔ پھر نم اسفنج کی مدد سے اچھی طرح بلینڈ کرلیں۔ چہرے کے علاوہ اپنی گردن پر بھی لگائیں۔